ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

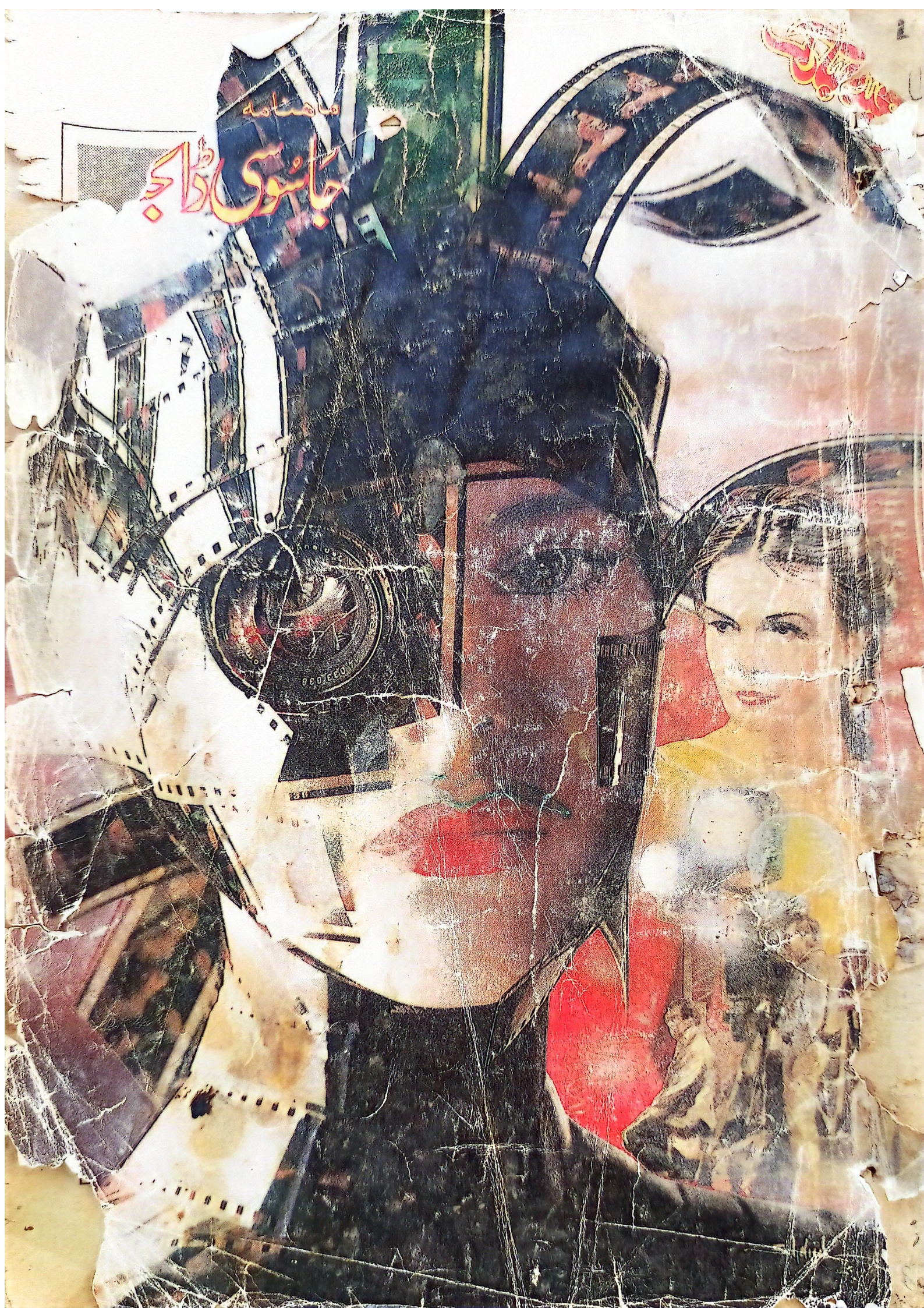

جاسوسی ڈائجسٹ

بشکریہ اے ڈی چشتی صاحب ۔ پاکپتن

Scanned By: AMAN ULMUSTAFA 0333-4585215

قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں نامہ و پیام، محبتوں کے سلسلے۔
11 چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ

اسلام آباد اغوا کیس سے متاثر ہو کر لکھی جانے والی سنسنی خیز داستان۔
18 لہو کے تاجر — علیم الحق حقی

ایک چھوٹی سی خرابی کے سبب جنم لینے والی سبق آموز کہانی۔
67 خرابی — نجمہ مودی

بے وفائی پر ایک مختلف انجام کی کہانی۔ ایک ہی زاویے کے دو پہلو۔
71 معاہدہ — نسیم جاوید رشید

ہمارے آپ کے گرد بکھرے ہوئے کرداروں کی داستان ہزار رنگ۔
78 سرکش — محمود احمد مودی

تین سر بریدہ لاشوں اور ایک سراغ رساں کی بروقت کاروائی کا ماجرا۔
117 بروقت — پاکیزہ حسان

طاغوتی قوتوں کے مقابل جذبۂ ایمانی سے سرشار مجاہدین کے صبر و استقامت کی حکایت۔
122 پروازِ عقاب — اقبال کاظمی

پبلشر: معراج رسول ○ مقام اشاعت: سعید منشن بلیو ریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی ○ پرنٹر: ابن حسن ○ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم۔ کراچی۔ تار کا پتا: مجاسوسی کراچی

مدیر اعلیٰ، سراج رسول
مدیر، ابعاد رسول، سید انور فراز
منتظم اعلیٰ غلام اکبر بابو، شاہد حسین

انسان اور جانور کے درمیان انسیت اور یگانگت کی پُر تجسس داستان۔
خوف — عائشہ جمال — 163

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر ہڈیوں میں اُتر رہے تھے
شکاری — احمد اقبال — 168

قتل کی ایک واردات کی دلچسپ سُراغ رسی اور قانون کے محافظوں کی پریشانی۔
سوئمند غلط فہمی — شگفتہ شام — 207

عہد سلجوقی تنازع کے پس منظر میں ایک دلچسپ نیوز بکر۔ ایک بریف کیس کا قصہ۔
بادشاہ — غلام زبیر — شگفتہ کریم — 221

اُن لوگوں کی کہانی جو اولاد کے آرام کے لیے پولیس میں بڑھے ہوئے ہیں۔
قید بامشقت — عبدالقیوم شاہ — 230

ایک بھٹکی ہوئی رُوح، ایک کہانی کار اور ایک فلمی زہرہ جبیں کی داستان حیرت۔
دوسرا شخص — سرور اکرام — 262

بزدلی کی بہادری کے واقعات قارئین کی فرمائش جس کی تکمیل میں کافی عرصہ لگ گیا
اداکار — احمد اقبال — 284

Scanned By: AMAN MUSTAFA 0333-4585215

جلد: 24 ○ شمارہ: 3 ○ مارچ 1994 ○ قیمت: 23 روپے ○ قیمت سعودی عرب: 10 ریال ○ زرِ سالانہ: 300 روپے ○ خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر: 220 کراچی 1

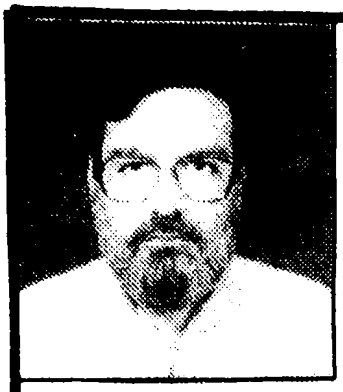

آہ..... مرزا غلام کبریا (بیگ صاحب)

فون آیا کہ بیگ صاحب اسپتال میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون○

چند ہی روز پہلے کی بات ہے کہ سبین اور طاہر کی بیٹی کے عقیقے میں جاتے ہوئے وہ صوفیانہ انداز میں بیگم اقلیم علیم کو سمجھا رہے تھے کہ بیماری سے اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے اور وہ خود مسلسل اس امتحان سے گزر رہے تھے۔ وہ موروثی اعتبار سے شکر سازوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ کمپیوٹر پر خود ہی شکر کی ناپ تول کر لیتے تھے۔

گئے دنوں میں ہم میں سے کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ دوستانہ مزاج اور میٹھی طبیعت رکھنے والے اس کڑیل نوجوان پر کبھی بیماریوں کا ایک لشکر بھی دھاوا بول سکتا ہے۔ چند برس سے بیماریوں نے یلغار کی تو بیگ صاحب نے جسم و جاں اور ارادے کی پوری قوت سے ان کا مقابلہ کیا کیونکہ اپنے ہر حریف سے پوری صلاحیتوں کے ساتھ لڑنا' بھاری تن و توش والے اس سرخ و سفید اور ضدی شخص کی سرشت میں شامل تھا۔ کئی بار لیاقت نیشنل اسپتال والے ڈاکٹر ارشد' جو بیگ صاحب کے خصوصی ذاتی معالج کا درجہ حاصل کر چکے تھے' بھی ان گھمسان کے معرکوں سے مایوس ہو گئے۔ لوگ جیبوں میں ٹوپیاں چھپائے کسی خبر کے منتظر رہے لیکن بیگ صاحب ہر بار موت کے بے رحم جبڑوں کو چیر کر سرخرو ہوتے رہے مگر اس بار وہ اسپتال میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد چپکے سے خالق حقیقی کی طرف چل دیے کیونکہ دو رمضان ہی ان کی والدہ مرحومہ کی تاریخ وفات ہے۔ وہ کئی روز سے اسی تاریخ کو جانے کا ذکر کر رہے تھے اور یہاں بھی ان کی قوت ارادی جیت گئی' سب ہار گئے۔ ان کی بیماری اور پھر معذوری میں سب نے مقدور بھر ان کی دل جوئی کی مگر دل و جان سے اور شب و روز جو خدمت مرحوم کی بیوہ نے کی' وہ واقعی ازدواجی خلوص و محبت کی ایک تابناک مثال ہے۔

طب و جراحت کے جتنے کمالات میرے اس برادر عزیز نے پچھلے چند برسوں میں سہے' شاید کسی نے پوری عمر میں نہ جھیلے ہوں گے۔ ہاں' ان سے پہلے بیگ صاحب بہت زندہ دل اور یار باش ہوا کرتے تھے۔ پابند صوم پہلے ہی تھے۔ حج کرنے کے بعد باریش اور پابند صلوۃ بھی ہو گئے تھے۔ لوگوں کو مار مار کر کھلانا اور خوش ہونا ان کا مسلک تھا۔ لندن میں جراحت قلب سے پہلے اور بعد میں اقبال صاحب نے بڑی تندہی سے ان کی خبر گیری کی۔ بعد میں بیگ صاحب نے ضد کر کے انہیں دو تین بار کھانے پر مدعو کیا۔ اقبال صاحب ہر بار اپنی بیماری دل پر واویلا کرتے رہے۔ بیگ صاحب ان کی سنی ان سنی کر کے' ان کی پلیٹ میں مرغن غذائیں ڈالتے رہے۔ اپنی دعوت کی بے اعتدالیوں کے بارے میں انہیں اپنے اللہ پر بہت ناز رہتا تھا۔ ایک بار اقبال صاحب کی بے بسی اور بے چارگی قابل دید تھی۔ معدہ تعاون سے انکاری تھا اور بیگ صاحب سر پر سوار تھے۔ جیت بیگ صاحب کی ہوئی۔ خمیازہ اقبال صاحب اور ان کے فرزند نے بھگتا۔

بیگ صاحب کے سرخ و سفید رنگ کی رعایت سے انوار صدیقی انہیں لال بیگ کہہ کر چڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ دوستوں نے جب بھی انہیں اشتعال دلانے کی کوشش کی' انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ "یار! وہ اپنا یار ہے۔ جو کہتا ہے' محبت سے کہتا ہے۔ اسے کہنے دو۔ وہ خود بھی دل کا مریض ہے۔"

اپنے سے چھوٹی دو بہنوں اور ایک بھائی کو کندھا دینے کے بعد بیگ صاحب کا دل داغ داغ تھا۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ ان کا کام ہی اپنے پیاروں کی تدفین' قل اور چہلم کا انتظام کرنا رہ گیا ہے۔ وہ بھول چکے تھے کہ اپنی بیماری سے پہلے وہ ہر سال دفتر میں دعوت افطار و طعام کا اہتمام کرتے تھے۔ وہ روز اول سے ہی اس ادارے سے وابستہ تھے۔ ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہاں انہیں مالک و مختار کل کا درجہ حاصل تھا۔ صحت مندی کے دنوں میں بھی جو چاہتے' کرتے تھے۔ جو نہ چاہتے' اس پر انہیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ جاتے جاتے بھی بیگ صاحب نے روایت اور وضع داری برقرار رکھی۔ پانچویں رمضان کو ان کے قل کے بعد ہونے والی افطار اور طعام بھولی ہوئی روایت کی تجدید نہیں تو اور کیا تھی؟

قارئین' دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ بیگ صاحب کی مغفرت فرمائے۔ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے کیونکہ ایک دن ہر ذی روح کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

چیک چیک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! السلام علیکم۔

ماہِ رمضان کی برکتیں جاری ہیں مگر ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں بھی گرمی آچلی ہے۔ سرحد میں تحریکِ عدم اعتماد کی ہنگامہ خیزی کے بعد حالات نے ایک نئی کروٹ بدل لی۔ اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ اسی ماہ ایک افسوس ناک واقعہ اسلام آباد میں پیش آیا جب اسکول کے طلبا کو یرغمال بنالیا گیا۔ علیم الحق حقی چونکہ آج کل ایبٹ آباد ہی میں مقیم ہیں اور جائے واردات سے خاصے نزدیک۔ لہٰذا ان کی تیز رفتاری ملاحظہ ہو کہ فوراً اس موضوع پر کہانی روانہ کردی اور ہم بھی مجبور ہوگئے کہ اسے فوراً ہی آپ کے سامنے پیش کردیں' اس وقت یہ معاملہ گرما گرم بھی ہے' بعد ازاں اس تازہ کاری کا سارا لطف غارت ہوجاتا۔ امید ہے اس برق رفتاری پر آپ حضرتِ علیم کو دل کھول کر داد دیں گے۔ چلتے چلتے عید کی پیشگی مبارک باد قبول کیجیے کہ گزشتہ ماہ سے "پیشگی مبارک باد" کی رسم چلی آرہی ہے۔ آیئے اپنی انجمن ہاؤ ہو کی طرف۔

پرنس اے بی کشمیری اس ماہ پہلے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں طویل ترین تبصرے کی جھلکیاں ملاحظہ فرمایئے۔ "لیجیے اب کی بار تھوڑی سی تفصیلی ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہوں اور ذرا مختلف قسم کے تبصرے کے ساتھ حاضری دے رہا ہوں۔ (آیئے آیئے' مل لیتے ہیں آپ سے بھی) ہوسکتا ہے کہ اسی قسم کا تبصرہ آپ کو کبھی کسی اور قاری نے بھی بھیجا ہو۔ دراصل عموماً... تبصرے جاسوسی کے انتظار سے شروع ہوتے ہیں اور سرورق کے تیسرے رنگ پر جاکر اختتام پذیر ہوجاتے ہیں۔ میرا یہ تبصرہ ایک ایسی گاڑی کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے جس نے ریورس گیئر لگایا ہوا ہے یعنی پس ورق سے لے کر جاسوسی کے طویل انتظار پر جاکر میرا یہ تبصرہ اختتام پذیر ہوگا۔ (یعنی ہم اُلٹے' یار اُلٹا' بات اُلٹی) اور پھر یہ ریورس تبصرہ بھی قدم بہ قدم اور مرحلہ وار قسم کا ہی ہے۔ بہرحال موجودہ فروری کے "جاسوسی ڈائجسٹ" کا پس ورق ایک سگریٹ اشتہار لیے ہوئے تھا۔ اس اشتہار کو دیکھ کر خود بخود نتھنوں میں سگریٹ کا بدبودار دُھواں گھسنے لگا جس سے مجھے اُبکائیاں آنا تو قدرتی بات ہے نا۔ ویسے اس اشتہار کے ذریعے یہ پیغام خوب دیا جارہا ہے کہ سگریٹ پیجئے اور بلی نما حسیناؤں کو دیکھیے۔ اگر اس اشتہار کا اصل مقصد یہی ہے تو پھر میں تو اس امتحان میں سراسر اور ٹوٹلی طور پر ہی فیل قرار دیا جاؤں گا کیونکہ مجھے سگریٹ سے تو اس طرح نفرت ہے جیسے آج کل کی ماڈرن خواتین کو سادگی سے نفرت ہوچلی ہے۔ البتہ ایک اور بات جو میرے حق میں بہتر جارہی ہے کہ مشرقی خواتین کی اکثریت سگریٹ نوشی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے اپنی کچھ نہ کچھ ٹورین ہی جائے گی۔ بہرحال اس سگریٹی اشتہار میں نہ تو مجھے باگڑ بلے جیسا ہیرو مرد پسند آیا اور نہ ہی باگڑ بلی جیسے حسینہ ہیروئن۔ ویسے میرے خیال میں انکل اگر آپ پس ورق کے لیے کوئی اچھا سا اشتہار چن لیں تو بہتر ہوگا کیونکہ اس اشتہار کے ذریعے کیا آپ نوجوان نسل کی بگڑتی ہوئی شکل کو مزید بگاڑنے پر نہیں تلے ہوئے ہیں؟ (یہ احساس ہمیں بھی ہے مگر کیا کریں۔ اصلی دودھ' گھی' مکھن فروخت کرنے والوں کو اشتہار دینے کا خیال ہی نہیں آتا) البتہ ایسے اشتہار اندرونی صفحات میں کسی جگہ انکا دیے جائیں تو نہ صرف آپ کی آمدنی ویسی کی ویسی رہے گی بلکہ اس اشتہار کی ٹائٹل والی انفرادیت اور اثرات بھی کم ہوسکتے ہیں۔ (آپ کے خیال میں اندر اس پر کسی کی نظر ہی نہ پڑے گی۔ آپ کے ایسے ہی کسی مشورے کی ٹی وی والوں کو سخت ضرورت ہے لیکن آپ تو ٹی وی غالباً دیکھتے ہی نہیں ہوں گے) امید ہے کہ اس تجویز پر ضرور غور فرمائیں گے۔ پس ورق کا اندرونی صفحہ خالی اور صاف دیکھ کر عجیب سا لگا اگر آپ اس جگہ کسی اور رنگین اشتہار کو چپکا دیتے تو کیا حرج تھا۔ (ایک رنگین اشتہار سے نوجوان نسل کے بگڑنے کا اندیشہ! دوسرے سے آپ کا ایمان بھی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔) ان سادہ صفحات کو پُر کرنے کی کوشش کیجیے تاکہ "جاسوسی" کی رنگینیوں میں مزید اضافہ ہو۔ یہ ایک اور غور طلب بات ہے جو آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں۔ اُمید ہے جوابی رسید عنایت فرمائیں گے اور میرے خیال میں اب تبصراتی گاڑی کو تھوڑا مزید ریورس کرکے سرورق کے تیسرے رنگ میں پارک کروں۔ سرورق کا تیسرا رنگ جمایا فرحان شیخ نے اور جسے عنوان دیا گیا "دو قاتل" کا اگرچہ مصنف "جاسوسی ڈائجسٹ" کے میدان میں نئے ہی لگتے ہیں لیکن اپنے قلم کے زور کو انہوں نے اچھا استعمال کیا اور اس تحریر کو لمحہ بہ لمحہ اور قدم بہ قدم دلچسپ سچویشنز سے منسلک کرکے اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ قاری ہر قدم اور ہر لفظ پر سنسنا اُٹھتا اور آگے پڑھنے کے لیے بے تاب ہوجاتا۔ "جاسوسی ڈائجسٹ" کے مزاج کے عین مطابق یہ تحریر اگرچہ اپنے واقعات کے لحاظ سے اور موضوع کے اعتبار سے لاجواب تحریر تھی لیکن اس کا عنوان "دو قاتل" کچھ خاص نہ تھا۔ بہرحال اگر موجودہ تحریر کا تفصیلی اور بغور جائزہ لیا جائے تو یہ تحریر بالکل سرورق کو ہی مدِنظر رکھ کر ضبطِ تحریر میں لائی گئی۔ اس تحریر میں گولف جیسے باوقار مگر ہماری سمجھ میں نہ آنے والے کھیل کو بالکل آسان اور دلچسپ لفظوں میں پرو کر اس طرح پیش کیا گیا کہ اب میں بھی گولف کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننے لگا ہوں۔ (یہ بات گولف کے اور اس کے کھلاڑیوں کے حق میں اچھی نہیں ہے۔) داؤد ملک کا کردار اس تحریر میں ایک ایسے انسان اور کھلاڑی کا تھا جو اس قدر چھپے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے قریبی ساتھی بھی ان کی اصلیت سے واقف نہیں ہوپاتے۔ جبکہ جمیل کی صورت میں ان لاتعداد نوجوانوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو اپنے اندر بیش بہا ٹیلنٹ رکھتے ہیں لیکن ذرائع نہ ہونے کی بدولت وہ اپنے ٹیلنٹ کو استعمال کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسری طرف اصغر پٹھان کی صورت میں پٹھانوں کی خوبصورت عکاسی کی گئی کہ پٹھان لوگ جذباتی ضرور ہوتے ہیں لیکن اپنے جوش و ولولے کو غلط استعمال میں لانے سے بھی

انتباہ
جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحقِ ادارہ محفوظ ہیں کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

حتی الامکان پرہیز ہی کرتے ہیں۔ سعیدہ کی صورت میں ایک محبت کرنے والی اور وفا شعار بیوی کے کردار کو اُجاگر کیا گیا۔ الغرض اس ایک تحریر میں کئی تحریروں کو سمو کر پیش کیا اور ان کو آپس میں اس قدر خوبصورتی اور جامع انداز میں ملایا گیا کہ کہیں بھی جھول دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ ہی پڑھنے میں کسی قسم کی بوریت اُٹھانی پڑی۔ "جاسوسی ڈائجسٹ" کا دوسرا رنگ "زنجیرِ عذاب" تھا جسے سرور اکرام نے تحریر کیا تھا ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ اس رنگ میں تبصراتی گاڑی پارک کرتے ہی میں تو سر پکڑنے پر مجبور ہو گیا کہ ہر دفعہ ہی سرورتی رنگ کے لیے سرور اکرام کا انتخاب کیوں؟ کیا اس کا کوئی جواب آپ کے پاس ہے۔ (یہی اعتراض آپ شاد صاحب کے سلسلے میں بھی کریں گے اور ممکن ہے بات آگے بڑھے تو اور بہت سے مصنف اس اعتراض کی زد میں آجائیں۔ مزید جو تجاویز اور مشورے آپ نے تحریر فرمائے ہیں وہ آپ کی ناواقفیت کی دلیل ہیں) "زنجیرِ عذاب" میں ایک ایسی عورت کی داستانِ عبرت کو پیش کیا گیا جو خود سری اور مغروریت کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ میرے خیال میں مس جاسوسی، مس ماہ رخ اور مس ایشیاء کو اس عورت سے سبق لینا چاہیے کہ ایسی خواتین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ بہرحال اگر دیکھا جائے تو اس تحریر میں سرورق کو زبردستی ہی ٹھونسا گیا حالانکہ گولف جیسے کھیل اور اس میدان کے تذکرے کی کوئی تک نہیں بنتی تھی لیکن اس بار بھی سرور اکرام صاحب نے حسب معمول سرورق کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ البتہ اگر اس تحریر کو سرورق کو پسِ پشت ڈال کر دیکھا جائے تو یہ ان افراد کے لیے ایک تازیانہ ہے جو خود فریبی میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ ہر سرحد عبور کر جاتے ہیں اور پھر آخر میں ان کا انجام انتہائی افسوسناک ہی ہوتا ہے۔ ایسے افراد خواہ مرد ہوں یا عورت دونوں اصناف ہی اس قسم کے زمرے میں آتے ہیں۔ موجودہ معاشرے کے حالات و واقعات میں سے ایک تلخ پہلو پر لکھی جانے والی تحریر اپنے اندر ایک خاص قسم کی مقصدیت لیے ہوئے تھے۔ عظمیٰ کی صورت میں منفی افراد کی شکل دکھائی، جبکہ دوسری طرف عورت کا دوسرا پہلو فوزیہ کے کردار کی صورت میں سامنے لایا گیا کہ اگر عورت صابر اور محبت کرنے والی ہو تو وہ ہر جگہ اور ہر گھر میں ایڈجسٹ ہو سکتی ہے اور جنت کا سماں پیدا کر سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جو غور طلب بات اس تحریر میں پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہر بچے کی پرورش میں ماں کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اگر ماں چاہے تو اپنے بچے کو جس صورت چاہے ڈھال سکتی ہے۔ جس طرح کے اس تحریر میں عظمیٰ نے نومی کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق ڈھالا۔ بالکل اسی طرح معاشرے میں بھی عورت کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اگر وہ چاہے تو اس معاشرے کو بنا، یا بگاڑ سکتی ہے اور ہمارے معاشرے کا تلخ پہلو یہی ہے کہ مرد مرد کا اتنا دشمن نہیں ہو رہا جتنا عورت عورت کے لیے مہلک دشمن ثابت ہو رہی ہے۔ اگر عورت عورت سے دشمنی چھوڑ دے اور صلح و صفائی سے رہنے لگے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معاشرہ جنت کا نمونہ بن جائے۔ (کیا آپ خواتین کو سوکن سے صلح کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں؟) مرد کی اصلاح میں بھی عورت کا ایک خصوصی کردار ہوتا ہے اور مرد کو صحیح راستے یا غلط راستے پر ڈالنے کے لیے عورت جو کردار ادا کر سکتی ہے وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اگر عورتیں مثبت سوچ کی حامل ہوں گی تو مرد بھی خود بخود صحیح راستے کا تعین کر لیں گے البتہ بعض مرد حضرات کو بھی اپنی سوچ اور قول و فعل میں تبدیلی کی ضرورت ہے کیونکہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بلکہ دونوں ہاتھوں سے ہی بجتی ہے۔ بہرحال اس تحریر میں اگر عورت کے ایک بھیانک پہلو کو عیاں کیا گیا ہے تو وہاں عورت کے شفیق و ہمدرد پہلو کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک اچھی اور اصلاحی تحریر ثابت ہوئی۔ اب کی بار تبصراتی گاڑی ریورس کرنے سے سرورق کے پہلے رنگ میں جا پہنچا۔ ابتدائی رنگ پر حسبِ معمول عبدالقیوم شاد کو چوکڑی مار کر بیٹھے دیکھ کر غصہ تو بڑا آیا لیکن آپ کی پالیسی کے سامنے ہم کیا کر سکتے ہیں کہ آپ ہی اس رسالے کے ڈکٹیٹر ہیں جو چاہیں شامل کریں جو چاہیں نہ کریں۔ "خانہ برانداز" ایک عام سا موضوع لیے ہوئے تحریر تھی۔ آج کل کے معاشرے میں دیانت داری اور ایمان داری کی جو سزا لوگوں کو ملتی ہے اور پھر نوجوان نسل کو تباہی کی طرف لے جانا اور امرا کی سرگرمیوں کا احاطہ کیے ہوئے یہ تحریر کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ اگرچہ اس معاشرے میں شرف الدین جیسے آفیسر خال خال ہی نظر آتے ہیں لیکن جہاں بھی ہیں وہاں ان کے ساتھ زیادتیوں اور ظلم کی انتہا کر دی جاتی ہے۔ دوسری طرف اسرار احمد کی صورت میں اس نوجوان نسل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اپنے حالات سے تنگ آکر ہر ناجائز کام کرنے پر تُل جاتے ہیں اور بڑے لوگوں کے لیے کٹھ پتلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس تحریر میں بھی اگرچہ سرورق کو کچھ خاص کوریج نہیں دی گئی لیکن پھر بھی حالات و واقعات کی روانی میں سرورق کو پرو دیا گیا جس کی وجہ سے یہ تحریر سرورق کے مطابق ہی رہی۔ عبدالقیوم شاد اگرچہ ایک مستند اور رواں اندازِ بیاں کے حامل لکھاری ہیں لیکن ان کا فقط سرورتی تحریروں کے ساتھ حاضری دینا ان کے لیے انتہائی نقصان دہ بن رہا ہے۔ (وہ کس طرح؟) اگر وہ یہی تحریر "جاسوسی ڈائجسٹ" کے اندرونی صفحات کے لیے لکھتے تو وہ اس تحریر کے حالات و واقعات کو مزید پھیلا کر نہ صرف اس تحریر میں وسعت پیدا کر سکتے تھے بلکہ دلچسپی کا بھی اچھا خاصا سماں پیدا کر سکتے تھے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ہم قارئین کو بھی کم از کم ایک عدد طویل طبع زاد تحریر یا ناول پڑھنے کو مل جاتا۔ (ایسے ہی موقعوں پر ایک محاورہ بولا جاتا ہے "سوجھے نہ موت کی دھار، مورا ہرا لالا بنا" آپ کی اس تجویز پر سر پیٹنے کو دل چاہتا ہے) ایک اور قدم پیچھے ہٹا تو میں عائشہ جمال کی "رازداں" سے ٹکرا گیا۔ ہاں یہ ہوئی نا بات! جاسوسی موضوع پر مبنی یہ جاسوسی تحریر "جاسوسی ڈائجسٹ" کے مزاج کے عین مطابق رہی۔ "جاسوسی ڈائجسٹ" کا ہمیشہ سے یہی طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ ایسی ہی منفرد اور لاجواب تحریریں پیش کر کے قارئین کا دل جیت لیتا ہے۔ اس تحریر میں سپر پاورز کے درمیان کھیلے جانے والے جاسوسی کھیلوں کے بخیے ادھیڑے گئے اور پھر اس تحریر میں جاسوسی کے سائنٹفک انداز کو بھی سامنے لایا گیا۔ اگر نولینڈ تھوڑی سی مزید عقلمندی کرتا اور گولاشا کو اپنے طور پر جاسوسی کرنے دیتا اور وہ خود صرف پیغامات کو تبدیل کرنے اور رقم حاصل کرنے میں ہی لگا رہتا تو وہ بہت جلد اچھی خاصی رقم حاصل کر لیتا اور پھر (اب آپ نے کہانی کے کرداروں کو بھی مشورے دینے شروع کر دیے!) بہرحال المختصر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس تحریر کے موضوع کے ساتھ ساتھ مصنفہ کی مہارت بھی کام آئی۔ اگلا اسٹاپ اوہ۔۔۔ نہیں میرا مطلب ہے کہ اس سے پچھلا اسٹاپ مہتاب خان کی "دوڑ" پر ہوا جو کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک مشرقی تحریر سے مشابہ تھی یعنی یہ کہ مشرق میں بھی اکثر جھگڑے وغیرہ بچوں سے شروع ہوتے ہیں اور بالآخر بڑے ان میں ملوث ہو جاتے ہیں۔۔۔ اس تحریر میں مصنفہ نے ترجمے کے لیے ایک اچھی تحریر کا انتخاب کیا ہے۔ بلی اور جونا تھن دو بچوں سے شروع ہونے والی کہانی اپنے اندر کروٹیں بدلتی ہوئی تحریر ثابت ہوئی۔ اسی مناسبت سے یہ تحریر ایک خوب صورت مقصد لئے ہوئے تھی کہ بچوں کے آپس کے جھگڑوں میں بڑوں کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہئے۔ احمد اقبال فلسفہ اندازِ بیان کے حامل بہترین اور مستند لکھاری مانے جاتے ہیں لیکن اس سلسلے میں وہ

اپنی وہ مخصوص روانی کو کھوتے جارہے ہیں' یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ مصنف اس تحریر کو مزید آگے سے آگے بڑھانے کے چکر میں ایم آر ایس کے سربراہ یعنی سکندر سے ایسے احمقانہ فعل کروانے پر تُل گئے ہیں جس کی کوئی تُک سمجھ میں ہی نہیں آرہی۔ احمد اقبال اب اس تحریر کو سچویشنز کے سارے نہیں بلکہ فلسفیانہ باتوں اور تھوڑے بہت مزاح کے سہارے ہی آگے بڑھا رہے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ موجودہ قسط میں رابعہ' چوہدری دلاور کے قابو میں آگئی جبکہ خود سکندر صاحب پولیس کے ہتھے چڑھ گئے اور انہی دونوں سچویشنز کے دوران ہی تمام تر قسط کو پورا کیا گیا اور آخر میں دلاور کی ایک نام نہاد بہن کو اس تحریر میں ڈال کر تحریر کو مزید طول دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر احمد اقبال صاحب اب ایک بار پھر جاسوسی ڈائجسٹ کے لئے مزاحیہ تحریریں لکھنا شروع کردیں تو اس سے نا صرف وہ جاسوسی میں اپنی موجودگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے قلم کو رواں رکھ سکتے ہیں بلکہ ہم قارئین کو بھی خاطر خواہ محظوظ کرسکتے ہیں۔ (لیجئے' ادھر آپ کی زبان سے بات نکلی' ادھر وہ ہوگیا جو آپ نے چاہا) مختصر تحریروں میں سے ایک تحریر حاضر دماغ رہی۔ سب سے پہلا اعتراض تو اس پر یہ کہ اس کا اسکیچ مصور صاحب نے تحریر کے مطابق نہیں بنایا۔ البتہ اس تحریر نے مختصر ہونے کے باوجود بھی اچھی خاصی دلچسپی سے ہم کنار کیا کیونکہ اس تحریر کا عنوان کافی سوچ سمجھ کر بہت خوب صورت اور برجستہ رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے آخر تک دلچسپی ہنوز برقرار رہی۔ اس تحریر میں ایک لڑکی کی ذہانت کے کرشمے دکھائے گئے۔ اگرچہ کسی خاتون قسم کی چیز سے اس قسم کی ذہانت کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن ہو سکتا ہے کہ ایسا کبھی کبھی ہوجاتا ہو کیونکہ خدا قادر المطلق ہے۔ وہ پتھروں کے اندر جانوروں کو پال سکتا ہے اور انہیں روزی فراہم کرسکتا ہے تو پھر ایک خاتون کو ذہانت جیسی گراں قدر چیز کیسے عنایت نہیں کرسکتا۔ اس تحریر کو اگرچہ ایک نو آموز رائٹر عمیر شاہ نے ترجمہ کرکے پیش کیا لیکن انداز بیاں کی روانی اور سچویشنز کو واضح کرنے کے لئے کافی محنت و قابلیت نے اس تحریر کے تاثرات کو کافی بلند کیا۔ واہ! واہ! اثر نعمانی صاحب کو اس دفعہ جاسوسی کے صفحات پر دھرنا مارے ہوئے بیٹھے دیکھا تو دل گارڈن گارڈن نہیں بلکہ گرانڈیل گرانڈیل ہوگیا۔ اگرچہ اس دفعہ اثر نعمانی صاحب پیری میسن کی وکالتی جنگ کے بجائے ایک اور طویل سنسنی خیز ناول لئے ہوئے تھے لیکن اپنے مخصوص دلکش انداز بیاں اور لاجواب ترجمہ نگاری کی بنا پر مسحور کرتے چلے گئے۔ اس طویل ترین انگلش ناول نے وہی مزہ دیا جو کہ جاسوسی ڈائجسٹ کا خاصا ہے۔ ہر ماہ جاسوسی ہمارے لئے کوئی نہ کوئی ایسی خاصے کی چیز ضرور پیش کرتا ہے جس سے دل اش اش کر اُٹھتا ہے اور قاری جاسوسی ڈائجسٹ کا گرویدہ سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہیڈلے چیز کے طویل ناول کی تلخیص میں جس قدر نعمانی صاحب نے مہارت کا ثبوت دیا وہ لائق تحسین ہے۔ اس طویل ناول میں اگرچہ موضوع وہی ایک عام سا مغربی قسم کا ہی رکھا گیا یعنی ایک دولت مند کی دولت اور اس کی جوان بیوی اور اس کی وصیت۔ یہی موضوع اس تحریر کا تھا لیکن جو منفرد پہلو اس میں رکھا گیا وہ ہرمین کی بیٹی شیلا کے کردار کا تھا جس نے اپنے باپ کی کثیر دولت کو ٹھکرا کر اپنے لئے ایک نئی زندگی کو قبول کیا۔ آج کل اکثر مغربی طویل ناول دولت مند بوڑھوں کی نوجوان بیویوں اور ان کی وصیت کے گرد گھومتے رہتے ہیں اور یہی کچھ اس تحریر میں بھی سامنے لایا گیا لیکن مصنف کی سچویشنز اور کرداروں کے درمیان دوڑنے کافی محظوظ کیا۔ قاری اختتامی مرحلہ تیزی سے پڑھنے پر مجبور ہوجاتا ہے محمود احمد مودی نے اگرچہ ایک بہت دلچسپ اور اچھا سلسلہ شروع کیا ہے لیکن اب وہ شاید تھوڑا بوکھلا اُٹھے ہیں کہ وہ اس سلسلے کو آگے کیسے بڑھائیں اور یا پھر وہ بیٹھے بٹھائے فلاسفی میں پی ایچ ڈی کرنے چل پڑے ہیں۔ بہرحال بات کوئی ہے ضرور کیونکہ مودی صاحب نے اس سلسلے میں فلسفے کو اس طرح ٹھونسنا شروع کردیا ہے جیسے بھارتیوں نے اپنی فوج کو زبردستی کشمیر جیسی جنت ارضی میں گھسا رکھا ہے۔ جنوری کی قسط میں بھی مصنف نے زرتاج اور چوہدری افضل اور پھر زرتاج اور جانو کے درمیان ایسی فلسفیانہ ہاکی کھیلی کہ ہم تو منہ ہی تکتے رہ گئے اور اس موجودہ قسط میں مصنف نے ہر چیز کے بخیے ادھیڑنے شروع کردیئے یعنی کہ جنگل' حویلی' کھنڈر' حتیٰ کہ ان لکڑی کی پیٹیوں کی بھی تفصیل بتانے پر تُل گئے جن میں اسلحہ لایا گیا تھا۔ (کہانی میں ڈیمانڈ کے مطابق جزئیات نگاری بھی ضروری ہوتی ہے) اور پھر مودی صاحب پر شاید ایک بار پھر فلاسفی کا دورہ پڑا اور وہ چوہدری افضل اور نورین کے درمیان فلسفہ جھاڑنے پر تُل گئے۔ میرے خیال میں اگر اب چوہدری کو جانو کے پورے گروہ کا علم ہو ہی گیا ہے تو وہ تیزی سے اس گروہ کے خاتمے کے لئے کوشاں ہوجائے۔ اس طرح چوہدری صاحب دوبارہ ایکشن میں نظر آئیں گے تو اس تحریر کی دلچسپی مزید بڑھے گی۔ اس موجودہ قسط میں بھی تھوڑا بہت ایکشن جو دکھلایا گیا اس میں بھی خمیسو خان چوہدری پر ریوالور تان کر فلسفیانہ باتوں میں اُلجھا رہا۔ البتہ موجودہ قسط کا اختتام اچھے اور دلچسپ مرحلے پر کیا گیا اور ہاں ان دو تحریروں کے درمیان یعنی فسادِ جوانی اور سرکش کے درمیان عذابِ رفاقت بھی تو تھی جسے انگریزی سے اردو الفاظ میں نسیم جاوید نے ڈھالا تھا۔ اس تحریر کو مشرقی انداز میں ظاہر ہونے کا دعویٰ کیا گیا جو کہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ ایسی تحریریں اور ایسے واقعات صرف اور صرف مغرب کا ہی حصہ ہیں۔ کیونکہ مشرق میں کوئی جوڑا اتنی طویل رفاقت کے بعد ایک دوسرے سے اتنا بیزار نہیں ہوتا کہ دوسرے کو ختم کرنے کی سوچے اور یا پھر کسی دوسرے کے ختم ہونے پر سکھ کا سانس لے۔ تحریر مجموعی طور پر مغربی معاشرے کی ہی عکاسی کرتی ہے اور ایک عام سے موضوع کی حامل یہ تحریر رہی اور پھر مصنف نے اس تحریر کو اگرچہ بہتر انداز میں ہی ترجمہ کرکے پیش کیا لیکن گھسے پٹے موضوع کی بنا پر اس تحریر نے کچھ زیادہ محظوظ نہیں کیا۔ رشتوں کے خونی بندھن میں بندھی ہوئی کامل ظہیر کی تحریر اپنا خون بھی ایک اور عام سی اور غیر متاثر کُن تحریر رہی۔ اگرچہ اس تحریر میں منفرد موضوع کو زیر بحث لایا گیا لیکن بے تکی سچویشنز اور ہلکی کردار نگاری کی بنا پر اس تحریر میں وہ مزہ پیدا نہ ہوسکا جو کہ اس تحریر کا موضوع کے اعتبار سے حق تھا۔ بہرحال اس سے پہلی تحریر دعوے دار جسے نجمہ مودی صاحبہ نے پیش کیا وہ بالکل مشرقی معاشرے کی عکاس تحریر تھی کیونکہ مشرق میں ایسے افراد کی کوئی کمی نہیں جو لمبی لمبی چھوڑنے میں بالکل عار محسوس نہیں کرتے اور پھر ان کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ بھی مشرق میں بکثرت پائے جاتے ہیں جو کہ اپنی سوچ کے مطابق بالکل صحیح تجزیہ پیش کرتے ہیں لیکن لوگ ان کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے اور اسے صرف مذاق ہی سمجھا جاتا ہے۔ مصنفہ نے ایک مختصر سی تحریر کے ذریعے معاشرے کے تضادات کی جس خوب صورتی سے عکاسی کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ پروازِ عقاب اگرچہ میں مکمل اقساط کے ساتھ پڑھنا چاہ رہا تھا لیکن قارئین کی تعریفوں اور پسندیدگی نے مجھے مجبور کردیا کہ میں اسے پڑھنے پر مجبور ہوگیا اور ان چار اقساط میں اس طرح کھو گیا کہ ہوش ہی اس وقت آیا جب چاروں اقساط اختتام کو پہنچیں اور آخر میں باقی آئندہ منہ چڑانے میں مصروف تھا۔ خالی ہاتھوں' ڈنڈوں اور زمانۂ قدیم کے فرسودہ ہتھیاروں کے ساتھ مجاہدین کا جدید اسلحے' ٹینک' ہیلی کاپٹرز اور طیاروں سے لیس روسی فوج سے جہاد کرنا ایسے جذبے کی عکاسی کرتا ہے جو صرف اور صرف آزادی کا مفہوم ہی سمجھتا ہے اور کسی دوسری قیمت کو قبول نہیں کرتا' سوائے آزادی

کے۔ مصنف نے اس تحریر کو مختلف داستانوں اور ٹکڑوں میں بانٹ کر پورے افغانستان کے افغانوں کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ بہرحال اس تحریر میں مصنف کے رواں اندازِ بیاں اور لاجواب کردار نگاری نے ایسے شکنجے میں جکڑلیا کہ قاری ان واقعات میں گم سا ہو جاتا ہے اور اب ہو جائے بات اس محفل کی جس میں ہم قارئین کی نوک جھونک چلتی ہے یعنی چینی نکتہ چینی۔ مس جاسوسی کی اِدھر اُدھر کی ہانکنے کی عادت دیکھ کر کان سے مکھی اُڑائی اور دیگر خطوط کی طرف متوجہ ہوا تو ایک بار پھر حیرت کا جھٹکا لگا کہ عطیہ شاہ صاحبہ خواتین کو "بے چاری" کہنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں تو خواتین ایسی بے چاریاں ہوتی ہیں جو اپنی چھ انچ کی زبان سے چھ فٹ کا بندہ "غپ غوں" کر سکتی ہیں۔ اللہ بچائے ایسی بے چاریوں سے اور لیجیے شبنم کوکب صاحبہ نے تو مس جاسوسی کی کیا خوب صورت مثال دی ہے کہ کفن پھاڑ کر بولی ہیں۔ واقعی ہم بھی اس مثال کے قائل ہیں۔ مس اے ون کو مردوں کی طرف سے بولتے دیکھ کر جی ٹھنڈا ہو گیا کہ کیا اچھی مثالیں پیش کی ہیں اور اپنے مشتاق بھائی تو واقعی سیاسی لیڈر بنتے جا رہے ہیں جو ایسی ڈپلومیٹک گفتگو کرنے لگے ہیں اور جہاں تک رکاش بھائی کی پرنس گروپ والی بات ہے تو میرے خیال میں یہ مناسب نہیں کیونکہ گروپ بازی کافی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ خواہ وہ کہیں بھی کیوں نہ ہو۔ مس ایشیا اور مس رخ خان کی غیر موجودگی سے اپنی غیر موجودگی کے دکھ کو ذرا کم کیا کہ چلو ہمارے ساتھ تو جو ہوئی سو ہوئی آپ نے ان دونوں کی بھی زبان پکڑلی۔ سرورق اس دفعہ اگرچہ اپنے مخصوص رنگ لئے ہوئے تھا لیکن ذاکر صاحب نے سرورق پر جاسوسی کے معیار کے مطابق پیوشن کو ظاہر کیا جس کی وجہ سے سرورق انتہائی بھلا لگا۔"

رخسانہ انجم اپنی رائے کے پھول نواب شاہ سے یوں نچھاور کرتی ہیں۔ "اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے ہیں۔ میں تقریباً ۴ سال کے بعد اپنے پیارے دوست و غم خوار جاسوسی ڈائجسٹ پر تبصرہ کر رہی ہوں۔ کہتے ہیں کتابیں بہترین دوست اور ساتھی ہوتی ہیں' میں اس کی سو فیصد تائید کرتی ہوں۔ جاسوسی' سسپنس اور اب بے حد پیارے سرگزشت سے بڑھ کر اپنا ساتھی میں نے کسی کو نہیں پایا۔ جب یہ میرے گھر آجاتے ہیں تو جو مسرت ہوتی ہے وہ میں بتا نہیں سکتی اور اب تبصرہ جو پورا ڈائجسٹ چاٹ کر کیا ہے' حاضر ہے۔ سرورق حسب سابق خوب صورت اور باوقار جاسوسی کے شایان شان تھا۔ پڑھنے کا آغاز چینی نکتہ چینی سے کیا کہ میٹھا مجھے بہت پسند ہے۔ آپ نے رمضان المبارک کی مبارک باد دی ہے' خیر مبارک۔ شکاری' احمد اقبال کا یہ شاہکار مجھے اپنی پہلی قسط سے شکار کیے ہوئے ہے۔ اس دفعہ سکندر کی جذباتی غلطی نے جو رنگ دکھائے الامان۔ رابعہ بھی روٹھی نظر آرہی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ بجائے دل کے دماغ سے کام لیا کریں۔ اسکیچ بہت پیارا تھا' اداس لڑکی رابعہ لگتی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ "خانہ برانداز" ہمارے معاشرے کا وہ رنگ ہے جو ہر شریف آدمی کے لیے تازیانہ ہے۔ کیا عورت اتنی سفاک اور بے رحم بھی ہو سکتی ہے' جس کی فطرت میں چاند کی ٹھنڈک' نرمی' محبت اور وقار رکھی گئی ہے' وہ خون کے رشتوں کو بھی اس طرح پامال کر سکتی ہے؟ زنجیر عذاب کچھ اس طرح کی ہی ایک خوفناک' پُرتجسس فلم کے مانند سرور اکرام کی تحریر تھی۔ سرورق کا تیسرا رنگ دو قاتل گولف کے کھیل سے مکمل واقفیت رکھنے والوں کے لیے دلچسپ اور مفید ثابت ہو سکتی تھی' ہمیں کوئی خاص مزہ نہ دے سکی۔ (حالانکہ اس میں گولف کا کھیل اتنا زیادہ نہ تھا جتنے دوسرے واقعات تھے) کامل ظہیر کی ماخوذ کہانی اپنا خون پڑھ کر سوچ رہی ہوں جب محترمہ نانی صاحبہ پاگل پن میں ایسے کارنامے انجام دے رہی ہیں تو ہوش مندی میں دو شوہروں کو اگلے جہاں پہنچانا ان کے لیے کیا مسئلہ رہا ہوگا۔ دوڑ' بہت فاسٹ اور دلچسپ لگی' سوائے انجام کے۔ دعوے دار مغربی معاشرے کی کہانی کہ جس معاشرے میں شادی ایک جھنجٹ اور غیر ضروری چیز سمجھی جاتی ہے' وہاں بیوی کی بے وفائی پر ایسی کڑی سزا دینا مغرب کے ایک نئے پہلو کی نشاندہی ہے۔ پروازِ عقاب' افغانیوں کی آزادی کی جدوجہد کی کیا خوب داستان ہے۔ اس میں جو دشوار گزار راستوں کی تصویر کشی کی گئی ہے' پڑھ کر لگتا ہے کہ یہ راستے ہمارے سامنے ہیں' خاص طور پر کوہِ ہندوکش سر کرنے کا احوال بہت خوب تھا۔ سرکش کے افضل چوہدری صاحب جو پچھلی قسطوں سے ڈاکوؤں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مودی صاحب کی ڈاکوؤں کے بارے میں معلومات قابل رشک ہیں۔ (جی ہاں' ان کی تحریر کا یہ پہلو ہمارے لیے بھی باعث حیرت ہے) افضل چوہدری کو خمیسو نے جس طرح اپنے قبیلے یعنی ڈاکوؤں کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور پھر نازک صورت حال کے بعد اس کا جہنم واصل ہونا اور اس کے بعد اب انسپکٹر رحیم گل سے ٹکراؤ' اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ اس دفعہ جیمز ہیڈلے چیز کا ناول فساد جوانی کے نام سے اثر نعمانی نے تلخیص کیا۔ جیمز ہیڈلے چیز ایسا ناول نگار ہے کہ جس کے نام سے ہی اس کی کہانی کے بہترین ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہیلگا کا طرز عمل جس طرح سے اپنے شوہر کی وفات کے بعد بدل گیا' تعجب خیز تھا اور پھر اس کی بیٹی شیلا کا باپ کی تمام دولت ٹھکرا دینا آج کل کے دور میں اس سے زیادہ حیران کن۔ بہرحال کہانی ایک ہی نشست میں ختم کیے جانے کے قابل تھی۔ مختصر کہانی حاضر دماغی مختصر ہونے کے باوجود جامع' دلچسپ اور ایک لڑکی کی ذہانت کی عملی تفسیر تھی۔ اس دفعہ کی تراش خراش بھی عمدہ تھی اور نئی بھی۔"

وحید عامر کا اظہار رائے' بورے والا سے "چند ماہ کے قلیل عرصے کی غیر حاضری کے بعد ایک مرتبہ پھر آپ کی خوب صورت محفل میں قدم رنجہ فرما رہے ہیں۔ امید ہے کہ میری حاضری گراں نہیں گزرے گی اور مجھے بھی اپنی چارمنگ محفل میں تھوڑی سی جگہ عنایت فرمادیں گے۔ اس بار جاسوسی خلاف معمول ۳ تاریخ کو ہی موصول ہو گیا۔ سرورق دیکھتے ہی ذاکر صاحب کی تعریف میں لمبے چوڑے قلابے ملانے لگا۔ واہ واہ کیا سرورق تھا! ایک کونے میں خوب صورت حسینہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد چینی نکتہ چینی سے محظوظ ہوئے۔ محمد اقبال صاحب کا تبصرہ واقعی انعام کے قابل تھا لیکن میں اس بات پر حیران ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے اتنا لمبا تبصرہ لکھنے کے لیے وقت کیسے نکالا؟ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ ڈاکٹر بننے کے لیے دن رات پڑھنا پڑتا ہے۔ اب ترتیب کے لحاظ سے باری ہے پرواز عقاب کی مگر میں معذرت خواہ ہوں کہ ابھی یہ تحریر پڑھ نہیں سکا۔ اس کے بعد باری ہے دعوے دار کی۔ نجمہ مودی کی یہ مختصر سی تحریر بھی بہت قابل تعریف ہے۔ اپنا خون کامل ظہیر کی بھول بھلیوں سے بھرپور تحریر تھی جو اپنے اندر بہت سی نصیحتیں بھی لیے ہوئے تھی۔ مشکل وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔ ویسے نانی اماں نے کام بہت اچھے وقت پر سرانجام دیا۔ ایک پاگل نے دوسروں کو پاگل بنا دیا۔ ویسے میرے خیال میں یہ دنیا بھی ایک پاگل خانہ ہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ (آپ کا خط سامنے ہے' ہم خیال تو ہونا ہی پڑے گا) اور اب باری ہے اس تحریر کی جو اب لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن چکی ہے لیکن میں ان میں شامل نہیں ہوں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مودی صاحب اس کہانی کو غیر ضروری طوالت دے رہے ہیں اور ان کی یہی بات مجھے پسند نہیں ہے۔ اب اس قسط کو ہی لے لیں۔ پوری قسط میں ایک سفر ہی

طے کیا گیا ہے۔ مودی صاحب کہیں کہیں کڑوی باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جو ہم سب کے لیے یقیناً لمحۂ فکریہ ہوتی ہیں لیکن ان باتوں کا بھی اس وقت تک فائدہ نہیں ہوگا جب تک وہ ان تمام باتوں کے ذمے دار عناصر کو بے نقاب نہیں کریں گے۔ (مودی صاحب کو آپ بی بی سی کا نمائندہ بنانے پر کیوں بہ ضد ہیں۔ وہ ایک کہانی کار ہیں' انہیں ان کے مقام پر ہی رہنے دیں۔ یاد رکھیں! ادیب معاشرے کا بے حد حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات وواقعات سے جو بھی اثر قبول کرتا ہے' اس کی جھلک اپنی تحریر میں بڑے مؤثر انداز میں دکھاتا ہے۔ رپورٹنگ اس کا کام نہیں ہوتا) عذاب رفاقت پرانے موضوع پر لکھی گئی تھی' اس لیے زیادہ مزہ نہیں آیا۔ فساد جوانی اثر نعمانی کا ایک تازہ ترین شاہکار جو یقینی طور پر اس مرتبہ کے جاسوسی کی جان تھا۔ مغرب کی معاشرت میں کئی ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جنہیں بے نقاب کرنا ضروری ہے۔ اس تحریر کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے رنگ اس کی خوب صورتی میں اضافہ کررہے تھے۔ ہمارے معاشرے میں بھی اکثر ایسے واقعات اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ حاضر دماغ عمیر شاہ کی ایک عمدہ تحریر تھی۔ شکاری خلاف توقع اور خلاف روایت اس مرتبہ کافی فاسٹ تھی۔ احمد اقبال نے تھانے میں ایک پان والے پر پولیس کے تشدد کا نقشہ جس طرح کھینچا میرے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ہماری پولیس غریب لوگوں کے ساتھ جیسا سلوک کرتی ہے اسے پڑھ کر تو خون کھولنے لگتا ہے۔ ایسے غیر انسانی تشدد کی مثال پوری دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ دوڑ' مہتاب خان کی ایک اچھی' نصیحت آموز تحریر تھی۔ رازداں کے بارے میں' میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اس تحریر نے بور نہیں ہونے دیا اور اپنا فرض بخوبی ادا کیا۔ اب باری ہے سرورق کے رنگوں کی۔ پہلا رنگ حسب معمول عبدالقیوم شاد کا تھا۔ شاد صاحب نے معاشرے کے ایک اہم مسئلے پر قلم اٹھایا اور اپنا حق ادا کردیا۔ اب میں کیا کہوں! میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں ہیں جن سے میں شاد صاحب کو خراج تحسین پیش کروں۔ اس تحریر کا ایک ایک لفظ سیدھا دل پر اثر کرتا ہے۔ کہانی کا تانا بانا جس خوبصورتی سے بُنا گیا ہے وہ بہت ہی قابل داد ہے۔ شاد صاحب نے معاشرے کے ان ناسوروں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ شاد صاحب میری طرف سے بہت بہت مبارک باد قبول فرمائیں۔ سرور اکرام کا سرورق کا دوسرا رنگ بھی خاصا جاندار تھا۔ اس کہانی کا مرکزی خیال "جیسا کروگے ویسا بھروگے" کی مثال تھا۔ سرورق کا یہ دوسرا رنگ پہلے رنگ سے اچھا نہیں تو اس سے کم بھی نہیں تھا۔ سرورق کا تیسرا رنگ بھی اپنی جگہ بہترین تھا۔ یہ تحریر سرورق کے عین مطابق لکھی گئی تھی۔ اس تحریر کی تعریف نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی۔ اس تحریر کے نشیب وفراز نے اس کو آٹھ چاند لگادیے۔"

مس آتش فشاں (طوفان گروپ) کی آتش فشانی' کراچی سے "سرورق کے رنگوں میں نیا پن نظر آرہا تھا۔ ایک کہانی میں ایک خودغرض عورت اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے تو دوسری میں کوئی لڑکا کسی ٹھیکے دار کو اغوا کرلیتا ہے اور آخری میں تو چلو تھوڑا بہت سسپنس موجود تھا کہ جناب قاتل کو ہم آخر تک نہیں پہچان پائے۔ یہ "چیز" پتا نہیں کیا بلا ہیں۔ نام تو ہم نے سنا تھا لیکن ان کی اس واہیات ناول کی تلخیص بھی پڑھنی پڑی۔ اس بے تکی کہانی کو ترجمہ کرنے پر اثر نعمانی صاحب کو مبارک باد' دراصل شکریہ اور مبارک باد جیسے فضول الفاظ ہم ضائع نہیں کرتے لیکن عید قریب ہے لہٰذا آپ کو اور تمام قارئین کو عید سعید کی پیشگی مبارک باد۔ یہ آپ کے افضل چوہدری اب کسی کام کے نہیں رہے۔ (ہمارے کیوں ہونے لگے' ہوں گے آپ کے) انہیں حسیناؤں سے ملنے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور شکاری میں سکندر اعظم بھی ایک ملکۂ حسن کے گرویدہ ہوگئے' شاید وہ رابعہ سے اپنی توہین کا بدلہ لے رہے ہیں۔ مغربی کہانیاں کافی دلچسپ تھیں۔ ایک میں تو ایک صاحب بچوں کے پیچھے ایک قتل کردیتے ہیں تو رازداں میں ایک..... ایجنٹ دو جاسوسوں کو ماردیتا ہے اور آپ کی وہ چینی نکتہ چینی میں کیپٹن اپنی حکومت بنائے بیٹھے ہیں۔ آخر یہ بلا شرکت غیرے صدر بنے تو کیسے بنے۔ (غیروں نے اکیلا چھوڑ دیا تھا تو انجام یہی ہونا تھا) ادھر تو ہر ایک بذات خود ایک حکمران ہے۔ ادھر جنگل کا قانون چلنا چاہیے۔ یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ جس طرح ہر شخص اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا' اسی طرح ہر خاتون لڑنے کے فن میں ماہر نہیں ہوتی۔ (ماہر نہ ہونے کے سبب شکست کا خطرہ رہتا ہے لہٰذا پہلے اس فن میں مہارت.... ضرور حاصل کرلینی چاہیے) یہ آپ کی مس ایشیا لگتا ہے مقابلۂ حسن جیت کر آرہی ہیں۔ (کیا مصیبت ہے' ہر برائی چیز ہمارے نام سے منسوب کی جارہی ہے) اگر کسی نے دن میں دیکھ بھی لیا تو ڈر جائے گا۔ (ڈرنے کے لیے تو آپ کا نام سننا بھی کافی ہے) یہ جاسوسی خالہ جنہوں نے غالباً مارچ ۱۹۹۳ء میں حیات صاحب کو بچہ کہا تھا جو آپ سے بڑے نہیں تو چھوٹے بھی نہیں ہوں گے۔ (حیات صاحب تو ہمارے بڑے بھائی ہیں! ہم مل چکے ہیں ایک بار ان سے) یہ محترمہ اتنی "بزرگ" ہونے کے باوجود آپ کو انکل کہتی ہیں؟ (یہ شغل تو اکثر "بزرگان چینی نکتہ چینی" میں فرمارہے ہیں) آپ کو اس کا نوٹس لینا چاہیے (بہت اچھا' ابتدا آپ ہی سے کرتے ہیں' خبردار!) اور یہ "رکاش" کہاں سے نازل ہوگئے؟ (جہاں سے سب نازل ہوتے ہیں) ہم ان کی دُم لگادیں گے' ٹھوڑی پہ بینگن' پیشانی پہ ٹنڈا چسپاں کروادیں گے۔ اگر جاسوسی خالہ ہماری ماتحت رہتی ہیں تو ٹھیک ورنہ یہ عمل ان کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہم ان کے خطوط "ہائی جیک" کرسکتے۔ انکل جی' آپ بھی کان کھول کر سن لیں (خبردار! خبردار! ہمارے کان بہت حساس ہیں' ان کے آس پاس ہم کوئی بھنبھناہٹ برداشت نہیں کرسکتے) اگر آپ نے ہمارے خلاف ایک حرف بھی کہا تو یہ سارا عمل آپ پر بھی دُہرایا جاسکتا ہے۔" (پس ثابت ہوا کہ آتش فشاں کا کام ہے آگ اُگلنا)

گلشن اقبال کراچی سے **کیپٹن مشتاق** لکھتے ہیں "فروری کے شمارے کا سرورق مایوس کن رہا۔ ٹائٹل پہ حسینہ بس ایویں تھی۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ گولف کے کھلاڑی کو بھی ٹائٹل کی زینت بنایا گیا۔ اتنے بور گیم کا کھلاڑی' واللہ سارے سرورق کا بیڑہ غرق کردیا۔ اشتہاروں کی بھرمار سے نکلنے کے بعد ایوان میں داخل ہونے سے پہلے کیفے ٹیریا یعنی فہرست میں رکے۔ وہاں متعدد ایجنڈے زیر غور رہے پھر قارئین چلیں ایوان میں؟ جی چلیے لیکن ذرا دھیان سے' ایوان میں زلزلہ آیا ہوا ہے۔ (یہ کس کی آمد کی جانب اشارہ ہے؟) تو قارئین ایک بار پھر فیصلہ جمہوریت پسند گروپ کے حق میں ہوا۔ یعنی محمد اقبال ملتان والے صدارت کی کرسی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ان کی ابتدائی پُرزور تقریر نے ایوان میں سکتہ طاری کردیا۔ اس کے بعد ایک نئی ہستی' ایک نیا نام جو بے نام تھا یعنی مس اے ون کی باتیں اے ون تھیں۔ مس جاسوسی کے متعلق موصوفہ کے ریمارکس حقیقت پسندانہ تھے۔ رکاش بھائی آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن ایسا فیصلہ صرف جنرل باڈی ہی کرسکتی ہے۔ پارٹی کا نام تو تجویز کردیا ہے یعنی جمہوریت پسند گروپ' آگے میرے اعلیٰ ظرف دوست اور معزز خواتین جس کو بھی سربراہ بنانا چاہیں وہ آئندہ شمارے میں اپنی رائے کا اظہار کردیں اور اپنی پارٹی پوزیشن بھی واضح کریں۔ مس جاسوسی جی آپ حد سے بڑھ رہی ہیں' بخدا ہمارے صبر کا امتحان مت لیں۔ ہوش کے ناخن لیں۔ (فی الحال تو ان کے ناخن بدلنے کا کوئی

ارادہ نظر نہیں آتا' حسب سابق جوش کے ناخن ہی استعمال ہو رہے ہیں) مس اے ون اور شبنم کو کب سے مشورہ کرلیں۔ نہیں تو آصفہ تو فیصل آباد میں موجود ہیں۔ اگر ان سے بھی آپ کا قبلہ درست نہ ہو تو ہمارے پرنس کشمیری حاضر ہیں۔ میں بھی آپ کی مدد کرسکتا ہوں لیکن آپ سے منہ ماری کرکے میں اپنا اسٹینڈرڈ لو نہیں کرسکتا۔ اب ایوان کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ پہلا مسئلہ پرواز عقاب' آدم درانی اس دفعہ ایکشن میں رہے۔ کیپٹن اعظم بے نے روسی کرنل کے روپ میں اپنا کردار خوب نبھایا۔ افغانستان کی تاریخ کے متعلق اچھی باتیں رقم کی جارہی ہیں' موجودہ قسط میں قدیم قبائل کے تاریخی پس منظر سے روشناس کرایا گیا' میرے جیسے لوگ جدید افغانستان میں ایک عجوبے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ دعوے دار نجمہ مودی کی مختصر اور دلچسپ تحریر تھی۔ کہانی کا انجام خلاف توقع چونکا دینے والا تھا۔ تیسرا مسئلہ اپنا خون' اس میں تو وہ بات ہوگئی کہ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں' بڑے میاں سبحان اللہ۔ مثال غالباً اُلٹی ہوگئی ہے۔ بہرحال کہانی کی مناسبت سے اسے درست تصور کریں۔ اندھے انتقام کی دلچسپ کہانی تھی۔ چوتھا مسئلہ سرکش کی تازہ قسط خمیسو خان کے زیر زمین عشرت کدے کے اردگرد گھومتی رہی۔ اندرون سندھ ایسے زیر زمین عشرت کدے کی دریافت حیران کن ہے۔ آخر میں خمیسو اور افضل کی جنگ نے بڑا مزہ دیا۔ پانچواں مسئلہ فساد جوانی (یہ ہے حقیقی مسئلہ آپ کے لیے) اثر نعمانی کی پُراثر تحریر تھی۔ بیلا کی فتنہ انگیزیاں عروج پر رہیں لیکن ٹیری نے اسے مات دے دی۔ یہ طویل ناول اپنے اندر اتنی دلچسپی سموئے ہوئے تھا کہ شروع کرنے کے بعد اسے ختم کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ چھٹا مسئلہ حاضر دماغ ایک اچھوتی تحریر تھی۔ ویسے اکثر لوگ ان حالات میں ہوش حواس کھو بیٹھتے ہیں لیکن فرن نے کمال کردیا۔ (اکثر لوگ کہانیوں کا مرکزی کردار بھی تو نہیں بنتے۔ کہانیاں تو غیر معمولی لوگوں اور واقعات سے ہی جنم لیتی ہیں) ساتواں مسئلہ شکاری میں احمد اقبال نے اپنی پُراثر تحریر میں اس طرح جکڑ لیا جیسے ایلفی جوڑ کو پکڑ لیتی ہے۔ ایک ہی نشست میں ۴۰ صفحے ختم کرنا آسان تو نہیں میرے لیے۔ روایتی پولیس تفتیش' اور پولیس والوں کا حسن سلوک اور خوش بیانی تو قابل تعریف ہی ہے لیکن احمد اقبال نے اپنے جداگانہ طرز تحریر سے پولیس کے ڈائیلاگ کو مزید چٹ پٹا کردیا۔ پہلی قلابازی اس وقت کھائی جب منسٹر ہاؤس میں چوہدری دلاور نمودار ہوا اور وہی انداز گفتگو' ایک دم ٹھنڈی ٹھنڈی گفتگو بالکل قلفی کی طرح ٹھنڈی اور اوپر سے نصیحتوں کا پٹارہ کیا کہنے۔ دوسری قلابازی رابعہ نے سکندر بخت کے ساتھ روکھی ملاقات کرکے کھلائی۔ تیسری قلابازی سب پر نمبر لے گئی۔ یعنی اپنے چوہدری دلاور کی بہن غزالہ میدان میں کود پڑی ہے۔ یہ آفت کی پرکالہ نہ جانے سکندر کو کون سی گولی فٹ کرتی ہے؟ قصہ مختصر' قسط شاندار تھی اور بڑی مزے دار تھی۔"

سیّد آسیہ زیدی کا تبصرہ' نہ معلوم شہر سے "اس مرتبہ جاسوسی ڈائجسٹ پہلی تاریخ کو ہی مل گیا' مت پوچھیے خوشی سے برا حال ہوگیا۔ اس کے اوپر اتنے خوب صورت سرورق نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ رسالہ لینے کے بعد فوراً کھولنے کو دل چاہا مگر گاڑی کے جھٹکوں کی وجہ سے نہ پڑھ سکے۔ اس وجہ سے سرورق پہ اچھی خاصی تحقیق کرڈالی۔ انکل' یہ ہر دفعہ لڑکی کا منہ کھلا ہوا کیوں ہوتا ہے (سرورق پر آکر حیران ہوجاتی ہیں) اور بال ہمیشہ ہی براؤن ہوتے ہیں۔ (ہاں' یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ شاید ذاکر صاحب کے پاس کالا رنگ ختم ہوگیا ہے) شکر ہے کہ اس دفعہ لپ اسٹک کا شیڈ دوسرا ہے اور یہ جو نیلے سوٹ والا آدمی ہے نا (ہاں ہاں) یہ تو ہمارے محلے میں ہی رہتا ہے مگر بے چارہ کولف کی الف بے بھی نہیں جانتا بلکہ جنرل اسٹور چلاتا ہے (سچ! نہیں بھئی' ایسا کیسے ہوسکتا ہے) بس یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جو آدمی الٹا پڑا ہے' خون اس کا ہے یا اس آدمی کی اسٹک زخمی ہے؟ (اسٹک ہی کا کمال معلوم ہوتا ہے) بہرحال مجموعی طور پر سرورق بہتر تھا اور اب آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ (تو اب تک کیا ہو رہا تھا؟) سب سے پہلے شکاری پڑھی مگر پچھلی قسطوں والا مزہ مفقود تھا۔ سکندر کو چوہدری دلاور اور پیڈرو کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو... دل چاہا کہ خود ہی چیخ کر منع کردیں مگر جب انہوں نے رابعہ کی نہیں سُنی تو ہماری کیا سنتے' بہتر تھا کہ ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے رابعہ کو تھما دیتے مگر جناب ایسا نہیں ہوسکا اور ہم دل مسوس کر ہی رہ گئے۔ اس کے بعد سرورق کے تینوں رنگ باری باری پڑھے۔ (باری باری ہی پڑھے جاسکتے تھے) حسب توقع اس بار بھی پہلے نمبر پر عبدالقیوم شاد تھے۔ انہوں نے ایماندارانہ زندگی گزارنے والے افسر کا حال لکھا ہے۔ وہ تو اب شاذ و نادر ہی کسی محکمے میں ہو۔ اس کہانی سے ایک سبق یہ ملا کہ بیویوں اور اولادوں سے محتاط رہو۔ دوسرا یہ کہ انسان جب انتقام اور دولت حاصل کرنے پر اتر آئے تو وہ اندھا ہوجاتا ہے اور اپنا اچھا برا نہیں دیکھ پاتا۔ مجموعی طور پر پہلا رنگ نہایت سبق آموز اور دلچسپ تھا۔ انجام پر دل دُکھی ہوگیا۔ اب آتے ہیں دوسرے رنگ کی طرف۔ یہ بھی انتقامی جذبوں پر مبنی ایک انتہائی ذراوٹی کہانی تھی۔ ہمیں تو عظمیٰ پہ غصہ اور نومی اور اس کے امی ابو پر افسوس ہوا کہ انہوں نے اپنا بچہ کھو دیا اور نومی نے اپنا بھولپن اور یہ سب کچھ ایک انتقامی جذبے کی بنا پر ہوا۔ کیا ایک عورت اپنی بہن سے اس حد تک نفرت کرسکتی ہے؟ (اس سوال کے جواب کے لیے اپنے ارگرد نظر دوڑائیں) سرورق کا تیسرا رنگ واقعی دلچسپ تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ دیو آنند کی کسی فلم کی اسٹوری پڑھ رہے ہیں۔ ہم تو واقعی آخر تک چکرائے رہے کہ یا اللہ آخر قاتل ہے کون مگر جب قاتل کا نام سامنے آیا تو حیران ہوگئے۔ وہ قاتل مجموعی طور پر ایک بہترین ذہنی مشق تھی۔ فرحان شیخ کو اتنی بہترین کہانی پر مبارک باد۔ اس دفعہ سرکش گھوڑے کے ساتھ ساتھ پڑھی یعنی آخر تک گھوڑا ہی گھوڑا۔ جنگل میں اتنے اعلیٰ پیمانے پر کی کلب کی منظر کشی واقعی قابل تعریف ہے اور خمیسو کی ذہانت کی تو داد دینی پڑے گی کہ کس طرح ولن نے کہانی کے ہیرو افضل چوہدری کو بے وقوف بنائے رکھا۔ پرواز عقاب پڑھ کر سواد آگیا۔ بہترین کہانی لگی ہے اور مجاہدین کی جدوجہد کی تاریخ وار جس طرح سے منظر کشی کی گئی' بہت ہی مبارک باد۔ دعوے دار بھی اپنے لحاظ سے بیک وقت کھٹی میٹھی کہانی تھی۔ مختصر مگر دلچسپ پیرائے میں انتقام پذیر ہوئی۔ کامل ظہیر کی اپنا خون نے بھی ٹھیک ٹھاک رنگ جمایا۔ نانی جان نے آخر اپنے پاگل پن کا ثبوت دے ہی دیا اور وہ بھی انتہائی ذہانت سے۔ عذاب رفاقت پڑھ کر دل افسردہ ہوگیا۔ فساد جوانی پڑھی تو منہ کا ذائقہ ہی بدل گیا۔ واقعی اس ناول کو پڑھ کر ساری شکایات دور ہوگئیں۔ حاضر دماغ' واقعی ایک حاضر دماغ لڑکی کی داستان تھی' پڑھ کر مزہ آیا۔ مہتاب خان کی دوڑ بھی ایک اچھی اور دلچسپی سے بھرپور تحریر تھی۔ رازداں پڑھی اور تجزیہ کیا تو جواب ملا کہ جس کا کام اسی کو ساجھے والا معاملہ ہے۔ یہ بھی ایک اچھی تحریر تھی۔"

(بی بی! آپ نے آخر میں جن باتوں کی وضاحت کی ہے' اس سلسلے میں غور کیا جائے گا۔ آپ نے یہ تک نہیں لکھا کہ خط کس شہر سے روانہ کیا ہے' پتا تو درکنار)

اظہر کی لاہور سے گل افشانی "پچھلے ماہ حاضری دینے کی معقول وجہ موجود تھی اور آپ نے مجھے اس کی ترغیب بھی دی تھی مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ مجھے عورتوں کے ساتھ لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ (ہر کام آتے آتے ہی آتا ہے' اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے) بہت بہت شکریہ

مس اے ون کا جنہوں نے مجھ بے زبان کی حمایت کی۔ مس اے ون حلقۂ نسواں میں ایک منفرد اور خوش گوار اضافہ ہیں۔ (جی ہاں' نام سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' منفرد بھی ہیں اور خوش گوار بھی) چینی نکتہ چینی میں حقیقت پسند خواتین کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ رکاش پرنس گروپ کے تعریفی الفاظ پڑھ کر شرمندگی سی ہوئی۔ کیپٹن مشتاق لفظوں کے انتخاب میں ابھی تک کچے ہی ہیں۔ مشتاق صاحب! کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے کو پٹائی کرنا نہیں کہتے اور پھر آپ نے جو حکومت اور حکومتی پارٹی وغیرہ بنائی ہے' یہ محض مارشل لائی جمہوریت کی ایک بھونڈی کوشش ہے۔ مس جاسوسی کی موجودہ آمد کم پُرشور تھی۔ مجھے خوش فہمی ہے کہ شاید انہیں عقل آگئی ہو یا عقل ٹھکانے آگئی ہو۔ بہرحال یہ تو اب اگلے ماہ ہی پتا چلے گا۔ پرواز عقاب ہنوز ہمارے سینوں پر مونگ دل رہی ہے۔ اس کے ختم ہونے کا شدید انتظار ہے اور اس کے بعد ہماری پسند کی کہانی کا نمبر ہے۔ ناول شائع کرنے کا شکریہ۔ اسے پڑھتے ہوئے اچھا وقت گزرا۔ شکاری اپنا وقار قائم رکھے ہوئے ہے۔ سرکش سے پھر گلہ۔ مودی صاحب بہت اچھا ایکشن لکھتے ہیں مگر یہ ایکشن دکھانے کے لیے وہ کتنا انتظار کراتے ہیں' کتنا بور کرتے ہیں' اس کا مجھے اندازہ ہے۔ خدا خدا کرکے کوئی تھرلنگ موڑ آتا ہے اور ساتھ ہی باقی آئندہ۔ ٹیمپو تھوڑا تیز کریں فار گاڈ سیک۔ آخری کہانیوں میں فرحان شیخ نے گولف کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کیا مگر پوری کہانی پڑھنے کو پھر بھی جی نہیں چاہا۔ لطیفے بور ہوتے جارہے ہیں اور کارٹونوں پر کیا سنسر عائد ہے؟" (گزشتہ چند سال سے جو کارٹون دساور سے آرہے ہیں' وہ واقعی ناقابلِ اشاعت ہیں۔ وجہ مغرب کی مادر پدر ترقی ہے)

شمائلہ شاہین کا نوازش نامہ' ملتان سے "کافی عرصے بعد اس چٹ پٹی محفل میں شریک ہورہی ہوں۔ (پھر تو یقیناً تیے میں خوب ہری مرچیں ڈال کر لائی ہوں گی) میرا خیال تھا کہ خاموش رہ کر حالات کا جائزہ لوں گی مگر پرنس اونگا بونگا صاحب کو شاید میری غیر حاضری پسند نہیں آئی۔ (یہ عقیدت مندی ہے ان کی آپ سے) اور انہوں نے میرے رینک پر مشکوک ہوتے ہوئے میرا کورٹ مارشل کروادیا۔ مسٹر آپ کا اور میرا کوئی جھگڑا نہیں' اس لیے آپ اپنی چونچ بند رکھیں اور وہ شاہین کے نام سے لیٹر میرا نہیں تھا فار یور کائنڈ انفارمیشن۔ (آخری جملے کا اردو ترجمہ ضروری ہے) اب میں کہانیوں کی طرف آتی ہوں۔ شکاری تو میری دل پسند کہانی ہے۔ البتہ سرکش بہت سُست جارہی ہے۔ سرورق کے رنگوں میں سے زنجیرِ عذاب بہت ہی پسند آئی۔ واقعی جب عورت کچھ کرنے پہ آئے تو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ (کیا یہ جملہ بھی فار ہز کائنڈ انفارمیشن ہے؟) البتہ تیسرا رنگ سرورق کے عین مطابق تھا۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں اس لیے تبصرہ نہیں کرسکتی۔ اس دفعہ نکتہ چینی میں ملتان کے محمد اقبال صاحب کامیاب ہوئے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ مس اے ون نے کسی ایک پارٹی میں شریک ہونے کے لیے انتہائی فضول کوشش کی ہے۔ کیپٹن مشتاق کا لیٹر سیاسی الفاظ سے اس قدر بھرا ہوا تھا کہ مشکل سے ہی ہضم ہوا۔ مس جاسوسی کا شکریہ کہ انہوں نے ہمیں یاد رکھا۔ اگلے مہینے انشاء اللہ عید الفطر ہوگی' تمام قارئین اور جاسوسی کے تمام ورکرز کو پیشگی عید مبارک۔"

حسنین محمد گھانچی کی تحریر کراچی سے "سرورق خاصا خوب صورت اور رنگین تھا۔ سب سے پہلے چینی نکتہ چینی میں سرسری نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہاں تو اچھا خاصا میدانِ جنگ بنا ہوا ہے اور باقاعدہ مورچے بنے ہوئے ہیں اور گروپ بنے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے پروازِ عقاب پڑھی اور بہت ہی پسند آئی اور آئندہ ماہ اس کی آخری قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا اور امید ہے کہ اختتام اچھا رہے گا۔ اس کے بعد ہم سرورق کے رنگوں کی دنیا میں داخل ہوئے۔ سارے رنگ ماشاء اللہ اچھے تھے۔ خانہ برانداز عبدالقیوم شاد صاحب کی بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ اس کے علاوہ زنجیرِ عذاب سرور اکرام صاحب کی تحریر جو کہ عورت کی نفرت سے بھرپور تھی مگر جس رنگ نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھا دو قاتل۔ جناب فرحان شیخ صاحب کی ایک یادگار تحریر جو بہت مزے دار اور تجسس سے بھرپور تھی۔ جب کہ اپنا خون' حاضر دماغ' دوڑ اور رازداں بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ دعوے دار اور عذابِ رفاقت میں کوئی مزہ نہیں آیا۔ اس کے علاوہ فساد جوانی اثر نعمانی نے لطف دوبالا کردینے والا ناول پیش کیا۔"

مس ایشیا کا مورچہ کراچی سے "اس بار بھی جاسوسی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ملا اور ہمارے خوب صورت ہاتھوں میں ستارے کے مانند جگمگایا۔ اس بار سرورق منفرد لگا۔ سرورق دیکھنے کے بعد ہم نے ہائی جمپ لگائی اور محفلِ دشمناں میں جا پہنچے۔ کیونکہ اس بار دوست کم اور دشمن زیادہ تھے۔ مس اے ون پر نظر پڑی ہمیں تو یہ اے ون سے زیادہ مس بی ٹو لگیں۔ ویسے محترمہ جتنا بھی پوز کرلیں مس جاسوسی جیسی شہرت حاصل نہیں کرسکتیں۔ مس بی ٹو کو موم بتی کی روشنی میں لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ صبح کا انتظار کرلیتیں۔ رکاش صاحب اب آپ اتنے بھی چھوٹے کاکے نہیں ہیں کہ ہم لڑکیوں کو چچی' خالہ اور آنٹی بنادیا اور جناب' ہمارا دل ہمیشہ گارڈن گارڈن ہی رہتا ہے' اوّل ٹائم ٹیپی ٹیپی۔ آپ کی طرح سڑے پوچے نہیں رہتے ہم اور انکل جی' ہم بونگے صاحب کو ایسے ہی برا بھلا کہتے رہے۔ اب پتا چلا کہ ان کی ڈور تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور کیپٹن صاحب بونگے صاحب کو اتنا مت بھلایئے کہ پھول کر ڈھول کی طرح پھٹ ہی جائیں پھر آپ کو ایسا بونگا لیڈر کہاں سے ملے گا۔ پرنس آف جاسوسی صاحب واقعی چائے اور ڈائجسٹ کا کیا میل' ہم تو کھانا کھاتے ہوئے رسالہ پڑھتے ہیں۔ گھر والے اور خاص کر ہماری چھوٹی بہن بہت ناراض ہوتی ہیں۔ علیہ شاہ ہمارے گروپ میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔ ان کی باتیں پڑھ کر بونگے صاحب کسی پریشر ککر کی طرح کھول رہے ہوں گے۔ سرکش نے اس دفعہ خاص مزہ نہیں دیا۔ پہلی کہانی پروازِ عقاب بہت اچھی جارہی ہے۔ سرورق کے تینوں رنگ اپنی مثال آپ تھے۔ شکاری اور باقی کہانیوں سے ابھی ملاقات نہیں ہوسکی۔"

O☆O

ان قارئین کے نام جن کے خطوط جگہ کی کمی کے باعث شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

حکیم خان' ضلع صوابی۔ محمد ظفر اقبال' اوکاڑہ سے سیّد علی عمران' سیّد حسنات بخاری' سلیم کھرل' محمد شوکت لاشاری اور دوسرے۔ محمد امیر خان' کلور کوٹ۔ حبیب الرحمٰن' ٹنڈو جامی۔ محمد جاوید اقبال' وہاڑی۔ آصفہ' فیصل آباد۔ ظفر اقبال' ابو ظبی۔ طارق حسن تبسم' ذوالفقار علی شان' خوشاب۔ عبدالسلام' سانگھڑ چک نمبر ۳۔ شاہد علی تشنہ' پاڑیوں سندھ۔ احمد ضیا بونگا' پھالیہ گجرات۔ کلرک غلام رسول ملک' نیو کینٹ سرگودھا۔ اے زیڈ پرویز' پھالیہ گجرات۔ میاں ظفر اقبال ظفری' سیالکوٹ کینٹ۔ محمد عبداللہ' شیخوپورہ۔ اسٹار مینگل فرام حیدر آباد۔

O☆O

لہو کے تاجر

علیم الحق حقی

بچے دشمن ہی کے کیوں نہ ہوں، لائقِ شفقت و محبت ہوتے ہیں۔ وہ لوگ آج بھی زمانۂ جاہلیت میں ہیں جو اپنے جائز و ناجائز مقاصد کی تکمیل کے لیے معصوم بچوں کو اغوا کرتے ہیں اور اُنہیں یرغمال بناتے ہیں۔ اس ماہ ایسا ہی ایک واقعہ چند روز پیشتر پیش آچکا ہے جب پشاور کے ایک اسکول سے طلبہ کی خاصی بڑی تعداد کو اغوا کرکے اسلام آباد لے جایا گیا۔ یہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی ذی ہوش اس سے نظریں چُرائے یا اس کا اثر قبول کیے بنا رہے۔ خصوصاً ایک ادیب تو ویسے بھی کچھ زیادہ ہی حساس طبع ہوتا ہے۔ وہ تو جو کچھ لکھتا ہے اپنے اِرد گرد وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر ہی لکھتا ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایسے ہی لمحوں کا شاخسانہ ہے۔ اس کہانی میں علیم الحق حقی نے ایک ایسی ہی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے جب چند دہشت گردوں نے ایک اسکول کے طلبہ کو یرغمال بنا لیا تھا۔ علیم کی یہ تحریر صرف اغوا ہوئے تاوان ہی کی داستان نہیں بلکہ اس کی دیگر جہتیں بھی خاصی چشم کُشا اور قابلِ غور ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پھیلنے والی ایک بُرائی سے لے کر ملک و قوم کے دیگر داخلی اور خارجی معاملات پر محیط یہ کہانی یقیناً یادگار ثابت ہوگی۔

اس معصوم دوشیزہ کا احوال جو کھیل ہی کھیل میں دہشت گرد بن گئی تھی

لہو کے تاجروں کی سفاکی اور سیاہ کاریوں کا لرزہ خیز ماجرا

اس نے ریوالور کو روشنی کے سامنے کیا اور آہستہ آہستہ اسے گھما کر دیکھا مگر اس پر کہیں گرد کا کوئی ذرہ بھی نہیں تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے سائلنسر کو ریوالور کی نال پر فٹ کیا پھر اسے کپڑے کی اس صافی میں لپیٹ دیا جس سے اس نے تیل دینے کے بعد ریوالور کی صفائی کی تھی۔

چند لمحوں کے لیے شہناز کا خوف معدوم ہوگیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے بابر کو ریوالور کی صفائی کرتے دیکھ رہی تھی۔ بابر کی انگلیوں میں اسے رقص کا سا ردھم محسوس ہوا تھا۔ اس نے ریوالور کے پُرزے الگ کرکے انہیں سفید کپڑے پر رکھا اور پھر ان کی صفائی کی تھی۔ اس کے بعد وہ پرزے دوبارہ ریوالور کا روپ اختیار کر گئے تھے اور اسی لمحے شہناز کا خوف پھر لوٹ آیا تھا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ یہ اہتمام کس لیے ہو رہا ہے۔ اسے یعنی شہناز کو ایک شخص کو قتل کرنا تھا اور اس وقت کا تعین ایک ہفتے پہلے کرلیا گیا تھا۔ وہ بڑی توجہ سے سُنتی اور تفصیلات ذہن نشین کرتی رہی تھی مگر اس وقت اور بات تھی۔ اب تو وہ دن..... وہ وقت آپہنچا تھا۔ اب یہ حقیقت تھی کہ اسے ایک شخص کو قتل کرنا تھا..... بابر کے خواب کی تعبیر کے لیے..... اس کے منصوبے کی تکمیل کے لیے۔ یہ سوچتے ہی خوف نے اس کے جسم کو شل کردیا۔ اگر وہ بابر کی خواہش کے مطابق عمل نہ کرسکی..... یا عمل کیا مگر بابر کی توقعات پر پورا نہ اتر سکی تو..... تو کیا ہوگا؟ اس نے جواب دیے بغیر اس سوال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

"چلو بھئی..... اب تیار ہو جاؤ۔" بابر کہہ رہا تھا۔

شہناز جانتی تھی کہ وہ تباہی اور بربادی کے اس راستے پر قدم رکھ رہی ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے مگر فوراً ہی اس نے سوچا

Scanned By: AMAN ULLAH 0333-4585215

کہ تباہ و برباد تو وہ پہلے ہی ہو چکی ہے۔ سب کچھ چھن چکا ہے اور پچھلی بربادی کے بعد ہی واپسی کا راستہ کب اس کے لیے کھلا تھا۔ حالانکہ اس بار تو اسے اس کا علم بھی نہیں تھا کہ واپسی ممکن نہیں ہے۔ وہ تو کھیل ہی کھیل میں برباد ہوئی تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب کی بات ہے..... چار سال..... پانچ سال پہلے کی۔ ہاں..... کوئی پانچ سال پہلے کی ہی تو بات تھی۔

یادوں کے دریچے کھلنے لگے.....

○☆○

انسان کو تباہ کرنے والے دن کوئی انوکھے تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں۔ عام طور پر وہ عام سے دن ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو وہ تباہ ہونے والے کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ تو بعد میں ان کی نحوست کا پتا چلتا ہے۔ شہناز کے لیے وہ دن بہت چپکے سے، بہت خوبصورتی کے ساتھ آیا تھا۔ اس روز سائرہ پہلی بار کلاس میں آئی تھی۔

شہناز کا تعلق کراچی کے ایک معزز مگر متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کے والد ایک سرکاری محکمے میں گریڈ ۱۴ کے افسر تھے۔ والدہ خالص گھریلو عورت تھیں۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ سب سے بڑا بھائی والد کے محکمے میں ہی کلرک تھا۔ باقی دو بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ ان میں ایک اس سے چھوٹا تھا۔ وہ خالص سفید پوش گھرانا تھا جسے مہنگائی کے اس دور میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا پڑتا تھا اور یہ بڑا مشکل کام تھا۔

شہناز نے میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا تو اسے لگا کہ وہ اچانک بڑی ہو گئی ہے۔ وہ خوبصورت اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ تین چار دن میں ہی کلاس کی لڑکیوں سے گھل مل گئی بلکہ تین لڑکیوں سے تو اس کی گہری دوستی ہو گئی۔ ان کے آخری پیریڈ خالی ہوتے تو بھی وہ گھر نہ جاتیں بلکہ کامن روم میں بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔ کالج بند ہونے کے وقت ہی وہ گھر جانے کے لیے نکلتیں۔

کلاسیں شروع ہوئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ سائرہ نے اسی کالج میں داخلہ لیا۔ وہ اتنے دن کسی اور کالج میں داخلے کے لیے کوشش کرتی رہی تھی۔ وہاں ناکامی کے بعد اس نے مجبوراً اس کالج میں داخلہ لیا تھا۔ سائرہ ہر اعتبار سے دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی۔ پہلے پیریڈ میں ہی مس نسیم نے اسے لیکچر پلا دیا۔ "بی بی..... یہ کالج ہے۔ یہاں تم تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتی ہو۔" انہوں نے درشتی سے کہا۔ "یہاں کوئی فیشن شو نہیں ہو رہا ہے۔ یہاں تمہیں طالبہ بن کر آنا پڑے گا۔ یہاں تو ناخن پالش تک نہیں چلے گی۔"

شہناز کو سائرہ پہلی ہی نظر میں بھا گئی۔ وہ اسے دیکھ کر یہ سوچتی رہی کہ یہ لڑکی آخر کس ہیروئن سے ملتی ہے۔ اس کے ترشے ہوئے بال، چہرے پر ہلکا سا میک اپ..... وہ واقعی بہت حسین لگ رہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا انداز بڑا پیارا تھا..... عام لڑکیوں سے مختلف۔ اس کے انداز میں بڑی خود اعتمادی تھی۔ شہناز یہ تو طے نہیں کر سکی کہ سائرہ کس ہیروئن سے ملتی ہے لیکن اس نے اسی روز کامن روم میں سائرہ سے دوستی کر لی۔ اب ان کے گروپ کی عددی طاقت پانچ ہو گئی۔ وہ چاروں، سائرہ سے بہت مرعوب ہو گئیں۔ وہ واقعی ہر اعتبار سے ان سے مختلف تھی۔ اسے مختلف اسٹائل کے بال بنانا آتے تھے۔ میک اپ کرنا وہ جانتی تھی۔ آزاد وہ بہت تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ والد تھے اور ایک چھوٹا بھائی جو ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ والد کا الیکٹرونکس کا بڑا کاروبار تھا۔ کالج کے قریب ہی فیشن ایبل بستی میں ان کا بنگلا تھا۔ دن بھر گھر میں ایک ملازمہ کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

اب خالی پیریڈز میں کامن روم میں فیشن کی کلاسیں ہونے لگیں۔ شہناز، نائلہ، انجم اور رشیدہ کے بال چھوٹے ہوتے گئے۔

"مجھے بھی یہ سب کچھ سکھا دو نا۔" ایک دن نائلہ نے سائرہ سے کہا۔ "میں بھی تم جیسی بننا چاہتی ہوں۔" وہ شہناز کے دل کی بھی آواز تھی۔

"میں تو نہیں بنا سکتی۔ انڈین فلمیں غور سے دیکھو تو خود ہی بن جاؤ گی۔" سائرہ نے بے پروائی سے کہا۔

"انڈین فلمیں؟" شہناز نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بھئی، انڈین فلمیں۔ وی سی آر پر۔"

"وی سی آر تو ہم میں سے کسی کے ہاں بھی نہیں ہے۔" رشیدہ نے سب کی نمائندگی کی۔

"میرے گھر میں تو ہے۔ رنگین ٹی وی بھی ہے..... چھبیس انچ والا۔" سائرہ نے فخریہ لہجے میں کہا۔ پھر فراخدلانہ پیشکش کی۔ "تم لوگ میرے گھر چل کر فلمیں دیکھ سکتی ہو۔"

"واقعی؟" انجم نے خوش ہو کر کہا۔ "لیکن کب؟"

"جب تم لوگوں کا جی چاہے۔ میرے ڈیڈی تو رات کو نو بجے سے پہلے واپس نہیں آتے۔ آ بھی جائیں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آج ہی چلو۔"

یہ گفتگو کامن روم میں آخری خالی پیریڈ کے دوران ہو رہی تھی۔ شہناز نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ "لیکن گھر جانے میں دیر ہو جائے گی۔"

"چھوڑو یار۔ کیا بیک ورڈ باتیں کرتی ہو۔" سائرہ نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے، گھر کے لوگوں کو تمہارے انتظار کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔"

"ایسی ہی بات ہے۔" شہناز نے شرمندگی سے کہا۔ دوسری سہیلیوں نے بھی اس کی تائید کی۔ "واقعی سائرہ، یہ تو ممکن نہیں۔"

"تو پھر چھوڑو۔ میری تو غرض ہے نہیں۔" سائرہ نے نخوت سے کہا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

لیکن انڈین فلموں کی ترغیب ایسی نہیں تھی جس سے وہ چاروں بچ سکتیں۔ ان کے درمیان سنگین اور کشیدہ خاموشی حائل تھی۔ چاروں اپنے اپنے طور پر اس مسئلے کا حل سوچ رہی تھیں اور پانچویں بیزار بیٹھی تھی۔ پھر اچانک انجم نے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں،

کل کالج کے بجائے تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہاں فلم دیکھ لیں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے تو ویسے بھی اس کالج سے کوئی دلچسپی نہیں۔" سائرہ نے کہا۔ "یہاں تو لیکچرار کی پوسٹ پر ملانیوں کو بھرتی کرلیا گیا ہے۔"

شہناز اختلاف کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ڈر تھا کہ سائرہ کا موڈ پھر خراب ہوجائے گا۔ پھر اس نے سوچا' ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔ "ہاں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔"

اگلے روز وہ پانچوں کالج کے قریب والے بس اسٹاپ پر پروگرام کے مطابق یکجا ہوئیں۔ وہاں سے وہ کالج کے بجائے سائرہ کے گھر کی طرف چل دیں۔ راستے میں ایک ویڈیو شاپ نظر آئی۔ سائرہ نے کہا۔ "بھئی یہاں سے فلم لے چلو۔ شہناز' ایسا کرو' تم جاکر فلم لے آؤ۔ ہم یہیں کھڑے ہیں۔" اس نے ایک فلم کا نام بتا دیا۔

شہناز کا دل ہولنے لگا۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی مگر سارہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔ پھر بیک ورڈ ہونے کا طعنہ اسے بہت بُرا لگتا تھا۔ چنانچہ وہ لرزتے قدموں سے دُکان کی طرف بڑھ گئی۔ ایک تو کالج کی یونیفارم میں ہونے کی وجہ سے اسے ویسے ہی چوری کا احساس ہورہا تھا اور پھر ویڈیو شاپ میں جانا اور فلم لینا۔ لیکن اسے اپنے فارورڈ ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرنا تھا۔

دُکان میں ایک جوان آدمی تھا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ اس نے بڑی خوش اخلاقی سے نرم لہجے میں پوچھا۔ "جی فرمایئے؟"

شہناز کو احساس تھا کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں بلکہ اسے تو لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کی ٹانگیں جواب دے جائیں گی اور وہ ڈھیر ہوجائے گی۔ اس نے بڑی ہمت کرکے فلم کا نام دُہرایا مگر اس کی آواز بُری طرح لرز رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ دُکان دار اسے جھڑک کر بھگا دے گا..... مگر دُکان دار نے ریک پر نظر ڈالی اور ایک کیسٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ پھر اس نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔ "آپ کا نام اور پتا؟" دُکاندار کے لہجے نے شہناز کو سہارا دیا۔ اس نے سائرہ کا نام اور پتا لکھوا دیا۔ دُکان دار نے رجسٹر میں اندراج کیا اور کہا۔ "جی..... لے جایئے۔ کرایہ پانچ روپے ہوگا۔"

شہناز کو حیرت ہوئی۔ دُکان دار نے بغیر کسی تصدیق کے اسے اپنی قیمتی کیسٹ دے دی تھی۔ بہرحال یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ تیزی سے دُکان سے نکلی۔ دُکان سے نکلتے ہی اس کے قدموں میں مضبوطی اور ٹھہراؤ آگیا۔ سہیلیوں تک پہنچتے پہنچتے اس کے انداز میں خود اعتمادی آگئی۔ انجم' رشیدہ اور نائلہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ یہ اس کے لیے بڑی بات تھی۔

گھر پہنچ کر سائرہ نے فلم لگا دی۔ ان لوگوں نے فلم دیکھی۔

> ایک صاحب کو قرض مانگنے والوں نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے دفتر کے باہر بورڈ لگوا دیا۔ جس پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔
>
> "ہم قرض مانگنے والے ہر دسویں آدمی کو کھڑکی میں سے نیچے دھکیل دیتے ہیں..... نواں آدمی ابھی ابھی باہر گیا ہے۔"

انہیں وہ بالکل نئی دنیا لگی۔ بہت بڑا کمرا..... بڑا ٹی وی۔ سب کچھ جیتا جاگتا لگ رہا تھا۔ فلم میں چند مناظر ایسے تھے جن پر انہیں شرم آئی مگر سائرہ کے "بیک ورڈ" والے طعنے نے انہیں خاموش کردیا۔

اگلی بار سائرہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ شہناز کو اس نے فلم کا نام بتا دیا تھا۔ شہناز دُکان میں نسبتاً زیادہ اعتماد کے ساتھ گئی۔ اس بار دُکان دار نے اس کا نام پتا بھی نہیں پوچھا۔ ہر بار واپسی میں وہ کیسٹ واپس کردیتی تھی۔

پہلے ہفتے میں انہوں نے دو دن کالج سے چھٹی کرکے فلمیں دیکھیں مگر پھر آہستہ آہستہ کالج کی چھٹیاں بڑھتی گئیں۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ ہفتے میں ایک بار بھی کالج نہیں گئیں۔ کبھی ان میں سے کوئی اس بات پر تشویش ظاہر کرتی تو دوسری لڑکی دلاسا دے دیتی کہ ابھی پڑھائی کہاں شروع ہوئی ہے۔ آخری چھ ماہ میں محنت کرلیں گے۔

ایک دن شہناز کیسٹ لینے گئی تو دُکان دار نے نرم لہجے میں کہا۔ "اپنا شناختی کارڈ دکھایئے۔"

وہ خوش مزاج آدمی ثابت ہوا تھا۔ اب وہ قدرے بے تکلفی سے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرلیتا تھا۔ شہناز نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

دُکان دار نے کارڈ کا جائزہ لیا اور بولا۔ "آپ رجسٹر میں اپنا نام کیوں نہیں لکھواتیں؟"

"دراصل ہم سائرہ کے گھر میں ہی فلمیں دیکھتی ہیں۔" شہناز نے وضاحت کی۔

"مجھ سے تو کیسٹ آپ لے کر جاتی ہیں۔ میں نام آپ کا ہی لکھوں گا۔" دُکان دار نے کہا۔ پھر شہناز کو پریشان دیکھ کر دلاسا دیا۔ "آپ جانتی ہیں کہ یہ محض رسمی کارروائی ہے۔"

شہناز مطمئن ہوگئی۔ واقعی اس میں حرج بھی کوئی نہیں تھا۔

انہیں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ فلموں میں آہستہ آہستہ عریانیت بڑھتی جارہی ہے۔ بلکہ وہ اس کی عادی ہوگئی تھیں۔ ان کے نزدیک اب وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی۔

پھر ایک دن اچانک ایک فلم دیکھتے ہوئے جیسے جادو ہوگیا۔ فلم کا منظر قطع ہوا اور اسکرین پر جو کچھ نظر آیا اس نے شہناز کو دونوں

ہاتھ آنکھوں پر رکھنے پر مجبور کردیا۔ نائلہ اور انجم کا بھی یہی ردِ عمل تھا۔ رشیدہ نے البتہ منہ دوسری طرف پھیرنے پر اکتفا کیا تھا۔ ان سب کے چہرے سرخ ہوگئے تھے۔

ایسے میں سائرہ کی آواز اُبھری۔ "میں دعوے سے کہتی ہوں کہ ہم سب اس لڑکی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں..... میرا مطلب ہے 'اندر سے۔ اور شہناز کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔"

اسی جملے کے نتیجے میں آنکھوں پر رکھے ہاتھ ہٹ گئے۔ چند لمحے وہ جیسے موازنہ کرتی رہیں پھر انہوں نے دوبارہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"سچ یار..... تم لوگ بڑی بیک ورڈ ہو۔" سائرہ نے تنک کر کہا۔

"یہ..... یہ تو بے شرمی ہے سائرہ۔" شہناز نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"لیکن یہاں کون ہے سوائے ہم لوگوں کے۔ کوئی مرد یہاں موجود ہوتا تو بے شرمی ہوتی۔" سائرہ نے دلیل دی۔ "اور پھر اس میں بھی کیا حرج ہے۔ آج کل کی سوسائٹی میں....."

"لیکن زلیخا بھی آسکتی ہے..... اور احمر بھی....." شہناز نے اعتراض کیا۔ زلیخا ملازمہ کا نام تھا اور احمر سائرہ کے چھوٹے بھائی کا۔

"چلو..... میں دروازہ بند کردیتی ہوں۔" سائرہ یہ کہہ کر اُٹھی اور جاکر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے پوری فلم دیکھی۔ فلم ختم ہونے کے بعد سائرہ نے کہا۔ "سچ کہتی ہوں، تم سب اس فلم والی لڑکی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو بلکہ میں تو کہتی ہوں، تم لوگوں جیسی حسین کوئی لڑکی ایسی کسی بھی فلم میں نہیں ملے گی۔"

تعریف نے ان لوگوں کو عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کو اور پھر خود کو دیکھنے پر مجبور کردیا۔ اس روز کے بعد آئینے کے سامنے ان سب کا انداز اور ہی کچھ ہوگیا۔

اس روز وہ کیسٹ واپس کرنے گئی تو اس سے نظریں نہیں اُٹھائی جارہی تھیں۔ اس نے کیسٹ اور پانچ روپے کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھا اور پلٹ کر چل دی۔ دُکان دار نے اسے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ "فلم کیسی تھی؟" دُکان دار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"اچھی تھی۔" شہناز نے کہا اور تقریباً بھاگتی ہوئی دُکان سے نکل گئی۔

اب بلیو فلمیں دیکھنا معمول بن گیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اب وہ یہ فلمیں شوق سے دیکھتی تھیں۔ دو ایک بار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے انہوں نے عام فلمیں دیکھیں مگر لطف ہی نہیں آیا۔ اس دوران وہ کئی معروف اداکاراؤں کی ایسی فلمیں دیکھ چکی تھیں۔ انہیں حیرت ہوئی تھی کہ اتنی بڑی اداکارائیں بھی.....! پھر ایک دن وہ فلم لینے گئی تو دکان دار کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ "عام فلم چاہیے تو لے جاؤ۔" اس نے بے حد رکھائی سے کہا۔ "خاص فلم نہیں دے سکتا۔" تھوڑے سے اصرار اور دُکان دار کے انکار کے بعد وہ سائرہ کے گھر پہنچی جہاں تمام سہیلیاں اس کی منتظر تھیں۔ شہناز نے صورتِ حال بتائی تو ان سب کی مایوسی کی حد نہ رہی۔

"کوئی بات نہیں۔" سائرہ نے انہیں تسلی دی۔ "کل پھر کوشش کرلینا۔"

لیکن اگلے تین روز تک دکان دار ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ سب چڑچڑی ہوگئیں۔ اب انہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ ان فلموں کے بغیر رہ ہی نہیں سکتیں۔ شہناز کی بھی یہی کیفیت تھی۔ زندگی ویران اور بے رنگ لگنے لگی تھی۔ پانچویں روز وہ دُکان دار کے سامنے گڑگڑانے لگی۔ "پلیز..... کچھ کریں۔"

"میں کچھ نہیں کرسکتا۔ باس کا حکم یہ ہے کہ اب خاص فلمیں کسی کو نہ دی جائیں۔" دکان دار نے کہا۔ "میں تو ملازم ہوں۔"

"آپ مجھے باس سے ملوا دیں۔" شہناز نے عاجزی سے کہا۔

"دیکھو..... پوچھتا ہوں باس سے۔" دکان دار نے کہا اور اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ شہناز کو وہ دروازہ پہلی بار نظر آیا تھا۔ درحقیقت وہ دیوار کا ہی ایک حصہ نظر آتا تھا۔ بظاہر اسے سرسری طور پر دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی دروازہ ہے۔ دکان دار اسے دھکیل کر اندر چلا گیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی واپسی ہوگئی۔ "چلی جاؤ۔ باس تم سے ملیں گے۔ اچھے موڈ میں ہیں۔" اس نے کہا۔ "لیکن ان سے بحث نہ کرنا۔ انہیں غصہ جلدی آجاتا ہے۔"

شہناز نے اندر قدم رکھا اور ٹھٹک گئی۔ دروازے سے ایک قدم آگے کھڑے ہوکر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ کمرے کا ماحول ایسا تھا کہ وہ مرعوب ہوکر رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ اب اسے شرم بھی آرہی تھی۔ دُکان دار کی بات اور تھی۔ کیا اب اس اجنبی شخص سے وہ ایسے کسی کیسٹ کی فرمائش کرے گی۔ اسی لمحے میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے مرد کی آواز نے مسئلہ حل کردیا۔ "آؤ..... یہاں چلی آؤ۔" اس نے پکارا۔ اور شہناز جیسے اس پکار پر جادو کی ڈور سے بندھی آگے بڑھنے لگی۔ قریب پہنچ کر اس نے دیکھا، وہ ایک خوبرو اور ادھیڑ عمر مرد تھا لیکن نجانے کیوں اس کی شخصیت اچھا تاثر نہیں چھوڑ رہی تھی۔

"آؤ..... بیٹھ جاؤ۔" اس شخص نے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شہناز واپس جانا چاہتی تھی۔ اس کا بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن دکاندار نے اسے بتا دیا تھا کہ اس وقت باس اچھے موڈ میں ہے لیکن اسے غصہ جلدی آجاتا ہے چنانچہ وہ بیٹھ گئی۔

"مسئلہ یہ ہے شہناز بی بی کہ آج کل پولیس بڑی سختی کررہی

ہے۔" اس شخص نے کہا۔ شہناز کو اس کے منہ سے اپنا نام سُن کر جھٹکا لگا مگر فوراً ہی پولیس کے تذکرے سے اس کا دم نکل گیا۔

"اس لیے میں نے اصغر کو کیسٹ دینے سے منع کردیا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے پولیس نے ہمارا رجسٹر چیک کیا تھا۔ تمہارے نام پر وہ اٹک گئے تھے۔ تمہارا پتا پوچھ رہے تھے مگر ہم نے نہیں دیا....."

شہناز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ "م..... م..... م..... میرا..... پ..... پ..... پتا....." وہ بُری طرح ہکلائی۔

وہ مسکرایا۔ "ہاں..... تمہارا پتا ہمارے پاس ہے لیکن رجسٹر میں صرف کالج کا نام لکھا تھا۔ وہ تمہارے کالج جانے کو کہہ رہے تھے....."

"کا..... کالج۔" شہناز کے ہاتھ پیر سُن ہوگئے۔ پولیس اس کے گھر اور کالج بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہ تصور ہی اس کے لیے مرجانے کے مترادف تھا۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کررہا تھا۔

"ہاں..... لیکن تم فکر نہ کرو۔ میرے پولیس میں بڑے تعلقات ہیں۔" اس شخص نے اکڑ کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کالج کم ہی جاتی ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم عزت دار گھر کی بیٹی ہو۔ میں انہیں نہ کالج پہنچنے دوں گا نہ تمہارے گھر۔ بلکہ میں تو کالج میں بھی تمہاری حاضریاں برابر کرادوں گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

شہناز کو اس وقت وہ شخص فرشتۂ رحمت لگا..... مہربان، مخلص، خیال رکھنے والا۔ اس وقت اس کی عزت اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے بے فکر رہنے کو کہہ رہا تھا۔

"مگر تم نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔" وہ شخص بولا۔ "ایک منٹ....." یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور دُکان میں کھلنے والے دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ ذرا سا کھول کر اس نے دکان میں جھانکا اور فوراً ہی واپس چلا آیا۔ "میرا خدشہ درست تھا۔" اس نے کہا۔ "دکان میں دو پولیس والے تمہارے متعلق پوچھ گچھ کررہے ہیں۔"

شہناز کے اوسان پھر خطا ہوگئے۔ "ا..... اب..... کک..... کیا..... ہوگا؟" وہ ہکلائی۔

"میں پھر کہوں گا کہ تم فکر نہ کرو۔" وہ مسکرایا۔ "آؤ میرے ساتھ۔ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم یہاں آئی ہو۔"

شہناز اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کمرے میں ویسا ہی ایک دروازہ اور بھی تھا جیسے دروازے سے گزر کر وہ اس کمرے میں آئی تھی۔ اس شخص نے وہ دروازہ کھولا اور شہناز کو ایک کمرے میں لے گیا۔ وہ ایک نسبتاً چھوٹا کمرا تھا۔ شہناز نے ایسے کمرے صرف فلموں میں ہی دیکھے تھے۔ اس میں صرف ایک بہت بڑا بیڈ تھا..... بہت خوبصورت بیڈ۔ بیڈ کے ساتھ ایک میز تھی۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔" اس شخص نے کہا۔

وہاں بیٹھنے کو بیڈ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شہناز بیٹھ گئی۔ اس پر پولیس والوں کا ہول سوار تھا۔ اس شخص نے فریج کھول کر ایک بوتل نکالی اور گلاس میں مشروب اُنڈیلا پھر اس میں پانی ملا کر وہ گلاس اس کے پاس لے آیا۔ "لو..... یہ شربت پی لو۔"

شہناز کا خوف دوچند ہوگیا۔ "جی۔ شکریہ۔ میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"پی لو ورنہ مجھے غصہ آجائے گا اور میں تمہیں اپنے کمرے سے نکال دوں گا۔ اس کمرے میں، میں کسی کو نہیں لاتا۔ وہ تو بس پولیس والوں سے بچانے کے لیے تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔"

شہناز کو دُکان دار کی بات یاد آگئی۔ اس نے گلاس اُٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ اسے پھندا لگ گیا۔ اس شخص نے جلدی سے بڑھ کر گلاس سنبھال لیا۔ "یہ تو بہت کڑوا ہے۔" شہناز نے فریاد کی۔

"ہاں۔ اس کی مٹھاس، کڑواہٹ پینے کے بعد کُھلتی ہے۔"

اس وقت تک شہناز بہت فلمیں دیکھ چکی تھی۔ "یہ شراب ہے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ اب جلدی سے اسے ایک گھونٹ میں پی جاؤ۔" اس نے گلاس شہناز کو تھما دیا۔ "تم سمجھ دار ہو۔ سمجھ دار لڑکیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

باہر پولیس تھی، رسوائی تھی اور موت تھی۔ اور اندر ایک ایسا مہربان شخص تھا جو اسے پولیس، رسوائی اور موت سے بچانے پر آمادہ تھا لیکن اسے غصہ جلدی آجاتا تھا۔ چنانچہ اس نے دل کڑا کرکے ناک بند کی اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا۔ اس کے حلق سے اندر تک آگ کی ایک لہر سی کھنچ گئی مگر چند ہی لمحوں میں اسے ایسا لگا جیسے وہ ہلکی پھلکی ہوگئی ہو۔

اس دوران وہ شخص الماری کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے الماری کھولی۔ وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بہت خوبصورت لباس تھا۔ وہ شہناز کی طرف بڑھا۔ "تم یہاں کالج کے یونیفارم میں

نگار ایوارڈ کے بانی مدیر "نگار"
الیاس رشیدی کی سرگزشت

مادام نورجہاں، اعجاز، شمیم آرا، رانی، زیبا، محمد علی، نیلو، ریاض شاہد، آسیہ، سنگیتا، مسرت نذیر اور دیگر فن کاروں کی ان کہی کہانیاں

مردِ درویش

ملاقات و گفتگو: علی سُفیان آفاقی

ایک ایسی سرگزشت جو پون صدی پر محیط ہے

ماہنامہ سرگزشت کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیجیے

ہوئیں تو پہچان لی جاؤ گی۔ پولیس والے تلاشی پر بھی اصرار کرسکتے ہیں۔ تم جلدی سے یہ لباس پہن لو۔"

شہناز اب عجیب کیفیت میں تھی۔ اس کا ذہن پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے وہ کپڑے لے لیے اور اِدھر اُدھر دیکھا۔

"کپڑے کہاں جاکر بدلوں؟" اس نے لڑکھڑاتی زبان میں پوچھا۔

"یہیں..... اسی کمرے میں۔ یہاں اور کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"تو آپ باہر چلے جائیں۔"

"ناممکن۔ جب تک تم کپڑے نہیں بدلو گی' میں باہر نہیں جاؤں گا۔" اس شخص نے درشت لہجے میں کہا۔ "دیکھو شہناز' اگر تم یہاں کالج کے کپڑ[illegible] ہوئیں تو میری پوزیشن خراب ہوجائے گی۔" شہ[illegible] نہیں آرہا تھا۔ ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔

"یا تو تم کپڑے بدل[illegible] پھر باہر جاکر پولیس والوں کا سامنا کرو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ شہناز نے اس کے حکم کی تعمیل کے لیے اس کی طرف پیٹھ کی ہی تھی کہ وہ بولا۔ "نہیں..... اس طرف رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سامنے ہی....."

اب شہناز کے پاس مدافعت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کرڈالی۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ سب کچھ سلولائیڈ پر منتقل ہورہا ہے۔ وہ دونوں ایک پوشیدہ کیمرے کے سامنے تھے۔

وہ اسے بھوکی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تم تو بہت حسین ہو شہناز۔ اور یہ لباس بھی تم پر بہت سج رہا ہے۔ پوری فلم انڈسٹری میں کوئی ہیروئن ایسی نہیں جس کے پاس تم جیسا حسن ہو۔ خیر' خود ہی دیکھ لینا۔ میں ذرا پولیس والوں کو نمٹا آؤں۔ تم یہاں اطمینان سے بیٹھو۔ میں فلم لگا جاتا ہوں۔ آرام سے فلم دیکھو۔"

بیڈ کے سامنے ٹی وی ٹرالی رکھی تھی۔ اس میں وی سی آر بھی تھا۔ اس شخص نے کیسٹ لگائی اور ٹی وی اور وی سی آر آن کرکے خود باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شہناز بستر پر بیٹھ گئی اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ ویسی ہی فلم تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام تک پہنچی تھی۔ وہ فلم دیکھتی رہی۔ وہ پوری طرح نشے میں تھی۔ اس وقت اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ پولیس والے بھی اسے یاد نہیں رہے جن کے خوف سے وہ اس کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ شخص واپس آگیا اور بے تکلفی سے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ "پولیس والے ٹلے نہیں ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ تم کیسٹ لینے ضرور آؤ گی۔" اس نے کہا۔

شہناز پھر خوف زدہ ہوگئی۔ "تو پھر اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ تم آرام سے اوپر ہوکر بیٹھو اور فلم دیکھو۔ وہ مایوس ہوکر چلے جائیں گے۔ تب تم گھر واپس چلی جانا۔"

شہناز پھر فلم دیکھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس شخص کی دست درازیاں شروع ہوگئیں۔ شہناز کو زیادہ بُرا بھی نہیں لگا۔ کچھ شراب کا نشہ تھا اور کچھ اس فلم کا نشہ جو وہ دیکھ رہی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ خود ایک فلم کی ہیروئن بن گئی ہے۔

کوئی تین گھنٹے بعد اس شخص نے کہا۔ "اب تم جاؤ۔ پولیس والے جاچکے ہیں۔"

شہناز کا نشہ اُتر چکا تھا اور طبیعت بہت بگڑ رہی تھی۔ اب اسے احساس ہورہا تھا کہ اس پر کیا بیت چکی ہے۔ وہ روئی دھوئی لیکن آخر اسے صبر آہی گیا۔

"جاؤ..... جاکر کپڑے بدل لو۔" اس شخص نے کہا۔ تب شہناز کو پتا چلا کہ اس کمرے میں ملحق باتھ روم بھی تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ جال بچھایا گیا تھا۔ یہ اسے بعد میں پتا چلا کہ سائرہ بھی ان لوگوں کی آلۂ کار تھی۔ اس پر یہ لوگ اسی انداز میں کئی سال پہلے قابو پاچکے تھے اور اس کے ذریعے جانے اس کے کالج کی کتنی لڑکیوں کو خراب کرچکے ہوں گے۔ تباہی اور بربادی کا وہ سلسلہ جانے کتنے گھروں تک پھیلا ہوا تھا۔

وہ کپڑے بدل کر باہر آئی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک اور دروازے کی طرف لے گیا۔ "اب کیسٹ لینے تم نہ آنا۔" اس نے کہا۔ "اپنی کسی سہیلی کو بھیجنا لیکن ایک ہفتے بعد' آج ہی کے دن یہاں ضرور آنا۔ نہیں آئیں تو پولیس تمہارے گھر پہنچ جائے گی۔" اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہی کوٹھی کا لان تھا..... اس کوٹھی کا جس میں وہ ویڈیو شاپ تھی۔ "سمجھ گئی ہو؟"

"سمجھ تو گئی ہوں لیکن....."

"آئندہ میرے سامنے لیکن ویکن کبھی نہ کرنا۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں پولیس کو تمہارے گھر اور کالج سے دور صرف اسی صورت میں رکھوں گا کہ تم میری ہر بات مان لو۔"

شہناز اس ایک دن میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی ہوگئی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اب اس کی سہیلیوں کی باری ہے مگر وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس روز وہ گھر واپس چلی گئی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے وہ کمرے میں بند پڑی رہی۔ اگلے روز وہ سائرہ کے گھر گئی۔ اس نے بتایا کہ اب وہ ویڈیو شاپ والے اسے فلم نہیں دیں گے۔ سہیلیوں کو کوئی تردّد نہیں ہوا۔ انجم فلم لینے چلی گئی۔

ایک ہفتے بعد شہناز وہاں گئی۔ اس روز اسے معلوم ہوا کہ ویڈیو شاپ کے مالک کا نام توقیر حسین ہے۔ توقیر نے شہناز کو اس کی اپنی فلم کی چند جھلکیاں دکھائیں۔ شہناز لرز کر رہ گئی۔ "اب تم ہر روز کالج جاؤ گی۔" توقیر نے کہا۔ "پہلے پیریڈ کے بعد تم کالج سے نکل آیا کرو گی۔"

"لیکن گیٹ بند کردیا جاتا ہے اور چوکیدار....."

"میں نے بات کرلی ہے۔ تم لوگوں کے لیے گیٹ کھل جایا کرے گا۔"

یوں شہناز اس جال میں پھنس کر ڈریم گرل سے کال گرل بن گئی۔ کالج میں ایک پیریڈ اٹینڈ کرکے وہ سائرہ کے گھر جاتی۔ وہاں فون پر توقیر کا بلاوا آجاتا تو وہ اس کی کوٹھی میں پہنچ جاتی۔ وہاں بڑے بڑے افسر تفریح کے لیے آتے تھے۔ وہی توقیر کے اثر رسوخ کا ذریعہ تھے۔

اس صورتِ حال کے باوجود نجانے کیسے اس نے انٹر کرلیا۔ توقیر نے اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلا دیا۔ اب وہ پوری طرح آزاد تھی۔

پھر اس کی زندگی کا وہ سیاہ دن آیا جس نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ اس روز پولیس نے ایک بنگلے پر چھاپا مار کر پانچ لڑکیوں اور پانچ مردوں کو گرفتار کرلیا۔ اخبار میں اس کی تصویر چھپ گئی۔ پولیس پوری "تفتیش" کے باوجود یہ پتا نہ چلا سکی کہ وہ بنگلا کس نے کرائے پر لیا تھا اور کون وہ گھناؤنا کاروبار چلا رہا تھا۔ لڑکیوں نے خوف سے زبان نہیں کھولی۔ اور "کسٹمرز" کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

ایسے میں بابر نے اسے چھڑایا' اس کی ضمانت کرائی۔ وہ بابر کے ساتھ ہی رہنے لگی۔ وہ گھر والوں کو کیا' کسی جاننے والے کو بھی منہ نہیں دکھا سکتی تھی۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ اس کے ماں باپ اس کی تصویر اخبار میں چھپنے کے چھ ماہ کے اندر اندر مر گئے تھے اور بھائی مکان بیچ کر کہیں چلے گئے تھے۔ اب اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا..... سوائے بابر کے۔

بابر کے کچھ عزائم تھے۔ وہ معاشرے کو سزا دینا چاہتا اور جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دولت کما کر طاقتور بننا چاہتا تھا۔ اس کام کے لیے وہ ہر بڑے شہر میں یونٹ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کے بغیر یہ کام ممکن نہیں۔ شہناز نے کہا کہ وہ بھی اس یونٹ میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ "اس کے لیے تمہیں اپنی اہلیت ثابت کرنا ہوگی۔ ایک آزمائش سے گزرنا ہوگا۔" بابر نے کہا اور اب آزمائش کا وقت آگیا تھا۔

وہ بابر کے ساتھ راولپنڈی چلی آئی تھی۔ اب اس کا نہ کوئی گھر تھا' نہ کوئی شہر۔ راولپنڈی میں ان کا یونٹ مکمل ہوگیا تھا۔ مشکور تو کراچی میں ہی بابر کے ساتھ تھا۔ وہ بابر کا ایسا مرید تھا جو اس کے ایک اشارے پر کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اس میں عقل نام کی چیز نہیں تھی۔ وہ بس حکم کا بندہ تھا۔

راولپنڈی میں انہیں شہلا اور نذیر ملے۔ ان دونوں کے ساتھ بھی ایک ایک کہانی تھی۔ شہلا کی کہانی تو شہناز سے ملتی جلتی تھی۔ نذیر کو معاشرے کے دولت مندوں سے سنگین شکایات تھیں۔ اس کی بیٹی کو ایک سال پہلے بلڈ کینسر ہوگیا تھا۔ وہ ایک کارخانے میں معمولی کاریگر تھا۔ حکومت کے لوگوں سے لے کر عام دولت مندوں کے آگے تک ہاتھ پھیلاتا پھرا تھا مگر کہیں اس کی شنوائی نہیں ہوئی تھی اور اس کی ننھی بیٹی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی تھی۔

وہاں بابر نے شہلا کی آزمائش کی تھی۔ شہلا آزمائش میں پوری اُتری تھی لیکن اس کا انداز بابر کو پسند نہیں آیا تھا۔

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ پانچوں گاڑی میں بیٹھے شہر سے باہر جارہے تھے۔ وہاں کھیت ہی کھیت تھے۔ آبادی بہت کم تھی۔ اچانک بابر نے گاڑی روک دی۔ سامنے ہی کھیتوں میں ایک دہقان بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ بابر نے ڈیش بورڈ سے ریوالور نکال کر شہلا کو دیا اور سادگی سے کہا۔ "جاؤ..... اس شخص کو شوٹ کردو۔" شہلا متوحش ہوگئی۔ اس نے احتجاج کیا کہ وہ ایک معصوم آدمی ہے' اسے مارنے کا کیا فائدہ۔ اس پر بابر نے کہا کہ یونٹ میں شمولیت کے لیے یہ ضروری ہے ورنہ ابھی کار سے اُتر جاؤ۔ ہم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

شہلا دل کڑا کرکے کار سے اُتری اور دہقان کی طرف بڑھی۔ دہقان نے کھانا کھاتے کھاتے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے ریوالور کو نظرانداز کردیا جیسے وہ کوئی کھلونا ہو اور پھر کھانے پر جھک گیا۔ شہلا نے گولی چلائی۔ گولی دہقان کی آنکھوں کے درمیان پیشانی کے وسط میں لگی۔ وہ نوالہ ہاتھ میں لیے پیچھے کی طرف گرا۔ اس کے چہرے پر اس وقت بھی بے پروائی کا تاثر تھا۔ شہلا پر لرزہ چڑھ گیا تھا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چلاتی ہوئی کار کی طرف بھاگی۔ اس کے کار میں بیٹھتے ہی بابر نے کار دوڑا دی۔

وہ شاک شہلا پر کئی دن تک رہا۔ دہقان کا بے پروائی کے تاثر والا چہرہ اسے کئی دن ستاتا رہا۔ بابر کے نزدیک یہ کمزوری تھی۔ وہ شہلا کو ناپسند کرنے لگا۔

اور اب شہناز سوچ رہی تھی کہ وہ بابر کی ناپسندیدگی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ یونٹ ہی اب اس کا سب کچھ ہے..... اس کی فیملی ہے.....

"چلو بھئی۔ اب چل دو۔" بابر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ آزمائش کا وقت آپہنچا تھا۔

○☆○

کمال ان دنوں بہت پریشان تھا۔ پریشانی کی وجہ صوفیہ تھی۔ صوفیہ کے اور اس کے درمیان تلخی بڑھ گئی تھی۔ وجہ وہی تھی۔ صوفیہ کا کہنا تھا کہ وہ بعد میں ملازمت چھوڑ دے گی لیکن فی الحال صرف اس لیے اسکول کی جاب چھوڑ دینا کہ وہ شادی کررہی ہے' کچھ مناسب نہیں ہے۔ جبکہ کمال کا اصرار تھا کہ وہ شادی سے پہلے ہی استعفیٰ دے دے۔

فوج کے سابق کیپٹن کمال کی زندگی ابتدا ہی سے نشیب و فراز سے عبارت رہی تھی۔ اس نے ۶۷ء میں آرمی جوائن کی تھی تو اس کا مستقبل بہت تابناک تھا۔ وہ بہت اچھا فوجی تھا۔ اس کا ریکارڈ شاندار تھا۔ ۷۰ء میں اس کی پوسٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوگئی۔ ۷۱ء کی جنگ میں عسکری بے بسی کے باوجود اس نے کئی کارنامے انجام دیے۔ دسمبر میں وہ المیہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں پاکستان کے ۹۰

ہزار فوجیوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ جنگی قیدی بن گیا۔ اس ذلت آمیز قید کے دوران بھارتیوں نے پاکستانی فوجیوں کا مورال تباہ کرنے کے لیے وہ ہتھکنڈے استعمال کیے جو تاریخ پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رہائی کے بعد کمال نے ریٹائرمنٹ کا راستہ قبول کیا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اتنا پُراعتماد اور سخت جان نہیں رہا جو پاکستان کے فوجی جوان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

وطن واپسی کے بعد وہ ذاتی المیہ رونما ہوا جس نے اسے بھری دنیا میں اکیلا کردیا۔ اس کی واپسی کو دو سال ہوئے تھے اور وہ کراچی میں ایک کمرشل ادارے میں جاب کر رہا تھا کہ گاؤں میں نامعلوم افراد نے رات کو اس کے گھر پر حملہ کرکے اس کے پورے خاندان کو زندہ جلا دیا۔ اس کی پوری کائنات اس آگ میں جل گئی.... ماں' باپ اور چہیتی بہن۔ وہ ملازمت چھوڑ کر گاؤں واپس گیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ پولیس قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ پہلے تو اس نے باقی زندگی انتقام کے نام کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر اسے لاحاصل جانتے ہوئے اپنی زمین بیچ کر کچھ رقم اپنے پاس رکھی اور باقی فکسڈ پیازٹ میں رکھ دی۔ پھر اس نے ہمیشہ کے لیے آبائی گاؤں چھوڑ دیا۔

اس دوران اس نے کئی ملازمتیں کیں اور چھوڑیں۔ اس کا کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ بس کتابیں ہی اس کی دوست تھیں۔ انگریزی ادب اور فکشن سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ کمال یہ تھا کہ اس سب کچھ کے باوجود اس کی فطری خوش مزاجی رخصت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی اس کی زبان میں ماضی کا وہ زہر اُتر آتا تھا جو اس نے چپکے سے پی لیا تھا۔

پچھلے پانچ سال سے وہ مری کے پائن ووڈ کانونٹ اسکول میں جونیئر اور سینئر کیمبرج کے طلبا کو انگریزی ادب پڑھا رہا تھا۔ صوفیہ بھی تقریباً ڈیڑھ سال سے اسی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔ دونوں کے درمیان فیملی کا زیاں اور تنہائی ایک اہم قدرِ مشترک تھی۔ اس نے ان کے درمیان عمر کے فرق کو بھی مٹا دیا۔ یہ الگ بات کہ کمال کی عمر ۴۴ سال تھی لیکن وہ تیس پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ اب زندگی میں پہلی بار وہ اپنے اُجڑے ہوئے گھر کو آباد کرنا چاہتا تھا۔ اپنے باپ کی نسل کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

اس صبح کمال اسکول کے دفتر میں پہنچا۔ سیکریٹری مسز جعفری نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔ "کمال..... تم پہلے پرنسپل صاحب سے مل لو۔"

"خیریت؟ میرا خیال ہے مجھے نکالا جانے والا ہے۔" کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس کے برعکس وہ چاہتے ہیں کہ تم جاب چھوڑنے کا ارادہ ترک کردو۔ جاؤ' وہ اس وقت فارغ ہیں۔ مل لو۔"

کمال اسکول کے پرنسپل جمیل الرحمٰن کے کمرے کی طرف چل دیا۔ جمیل صاحب اسے پہلی ہی نظر میں بھا گئے تھے' اسی لیے وہ اب تک یہاں ٹِکا ہوا تھا۔ ورنہ اتنے عرصے اس نے کوئی جاب نہیں کی تھی۔

"آؤ کمال' بیٹھو۔" جمیل صاحب نے اس سے کہا۔ "کافی آنے ہی والی ہے۔"

"آپ یہ فرمائیں کہ مجھے اس ملاقات کا اعزاز کیوں حاصل ہو رہا ہے؟" کمال نے شگفتگی سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" جمیل صاحب نے دراز سے پاؤچ نکال کر پائپ بھرنا شروع کردیا۔ "یہ ملاقات تمہاری خواہش پر نہیں ہو رہی ہے؟"

کمال ہنسنے لگا۔ "پھر کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔ میں چلتا ہوں۔"

"اب آگئے ہو تو بیٹھو۔" جمیل صاحب نے جلدی سے کہا۔ "یہ بتاؤ' مستقبل کے لیے کیا ارادہ ہے؟" وہ پائپ سُلگانے لگے۔

"میں اب یہ جاب نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو پھر؟"

"میں گاؤں جاکر زمین خریدنا اور وہاں گھر بسانا چاہتا ہوں....."

"گھر تم یہاں بھی بسا سکتے ہو۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ لیکن میں پُرانے گھر کی راکھ سے نیا گھر تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم جیسے سمجھ دار آدمی سے ایسی جذباتیت کی اُمید نہیں تھی۔ سنو..... صوفیہ سے تعلقات کیسے چل رہے ہیں؟"

"وہی جھگڑا ہے..... جاب والا مگر اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ پہلی تاریخ کو میں ایک ماہ کا نوٹس دے رہا ہوں۔ اگلے ماہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"مجھے تو اُمید نہیں۔" جمیل صاحب نے پائپ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "صوفیہ بہت پیاری' معقول اور سمجھ دار لڑکی ہے اور تم اسے بہت پسند کرتے ہو۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" کمال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "پوری عمر میں ایک وہی تو پسند آئی ہے لیکن وہ بے کار کی ضد سے کام خراب کر رہی ہے۔ بہرحال میرا فیصلہ اٹل ہے۔"

"میرے خیال میں تو تم بے کار کی ضد کر رہے ہو۔ دیکھو' جب تم باپ بنو گے تو وہ خود جاب چھوڑ دے گی۔"

"چھوڑیے ان باتوں کو۔" کمال کا لہجہ اچانک تلخ ہوگیا۔ "یہ بتایئے' آپ نے کیوں بُلوایا تھا مجھے؟"

جمیل صاحب بھی سنجیدہ ہوگئے۔ "بات یہ ہے کمال کہ میں اپنے سب سے اچھے ٹیچر کو کھونا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں وائس پرنسپل کے عہدے کی آفر کر رہا ہوں۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرو۔ تنخواہ بہت معقول ہوگی۔"

اسی وقت چپراسی کافی لے آیا۔ کمال سوچ میں پڑ گیا۔ اسکول

بہت اچھا تھا۔ ملک بھر کے بڑے لوگوں کے بچے وہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔

"میرے پاس دو تجاویز ہیں تمہارے لیے۔" جمیل صاحب نے کہا۔ "ایک سال کی چھٹی لے لو اور اپنے آبائی گاؤں میں گھر بسالو۔ ایک سال تک میں کسی متبادل ٹیچر سے کام چلا لوں گا۔ ایک سال بعد واپس آجانا۔ دوسری یہ کہ موسم گرما کی ایک ماہ کی چھٹیوں میں ہنی مون منا آؤ اور واپسی پر وائس پرنسپل کی ذمے داریاں سنبھال لو۔ یہاں زمین میں تمہیں دلوا دوں گا۔ مکان کی تعمیر کے لیے اسکول سے قرضہ بھی مل جائے گا۔" کمال کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "ابھی کچھ نہ کہو۔ سوچنے کے لیے تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ صوفیہ سے بھی مشورہ کرلو پھر اطمینان سے مجھے حتمی جواب دے دینا۔ اب تم کافی پیو اور کوئی اور بات کرو۔ اوکے؟"

کمال کافی پی کر وہاں سے اُٹھ آیا۔ تیسری منزل پر اپنے کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے اس کا سامنا صوفیہ سے ہوگیا۔ "شام ساڑھے چھ بجے..... کیفے رم جھم میں۔" کمال نے گزرتے ہوئے کہا۔

صوفیہ رک گئی۔ "کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "اب بات کیا کرنی ہے؟"

"بات تو کرنی ہے۔ شام ساڑھے چھ بجے۔" کمال نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

وہ کلاس روم میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ طلبا کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ وہ سامنے کرکٹ اسٹیڈیم کی طرف دیکھتا رہا جو اب پھر سرسبز ہوگیا تھا۔ وہ سوچتا رہا..... کیا اس کی زندگی میں بھی کبھی بہار آئے گی؟ لیکن صوفیہ کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ آخر یہ صوفیہ اتنی ضدی کیوں ہے؟ پھر اس نے سوچا..... ضد تو میں بھی کر رہا ہوں۔ یہ نہیں سوچتا کہ اب میرے پاس ضد میں ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ پیریڈ شروع ہو رہا تھا۔ اب اسے کلاس لینا تھی۔

مسلسل تین پیریڈز نے اسے تھکا دیا۔ وہ سگریٹ پینے کی غرض سے فیکلٹی لاؤنج کی طرف چل دیا۔ عمارت میں ہر منزل پر ایک فیکلٹی لاؤنج تھا لیکن پہلی منزل کے لاؤنج میں پل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ دوسری منزل کا فیکلٹی لاؤنج نان اسموکرز کے لیے تھا۔ چنانچہ وہ چوتھے خالی پیریڈ میں تیسری منزل کے فیکلٹی لاؤنج میں جاکر سگریٹ پیتا تھا۔

لاؤنج میں پی ٹی انسٹرکٹر مظفر خان پہلے سے موجود تھا۔ وہ بے حد بھاری بھرکم سابق فوجی تھا۔ کمال کو اس پر حیرت تھی کہ اس کی مظفر خان سے کیسے بنتی ہے کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے..... بلکہ برعکس تھے۔ گرمی ہو یا سردی، مظفر ہمیشہ نیکر پہنے ہوتا تھا۔ جیسے موسموں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ وہ اپنی جمناز یم کی کلاسوں کو کسی آرمی سارجنٹ کے انداز میں چلاتا تھا۔ کمال کو اس پر رشک آتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی کلاس کو اس انداز میں نہیں چلا سکتا ورنہ لطف ہی کیا رہے گا۔

"آج تم بچوں پر کس انداز کا تشدد کر رہے ہو؟" اس نے مظفر سے پوچھا۔

"باسکٹ بال کھلا کر آرہا ہوں۔ کم بخت کوشش کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کا بھُرتا بنا دیں۔" مظفر نے جواب دیا۔ "اور تم سناؤ۔ آج بچوں کی کیسی برین واشنگ کر رہے ہو؟"

"میں یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آج انہیں کون سی کتاب شروع کرائی جائے۔"

"یہ بتاؤ، یہ کتابیں پڑھانے کا کیا حاصل ہے؟"

"اس سے انہیں زندگی کے..... اور خود اپنے بارے میں سمجھنے میں مدد ملے گی۔"

"کتابیں تو وہ بعد میں خود بھی پڑھ سکتے ہیں۔" مظفر نے اعتراض کیا۔

"اس وقت کا مطالعہ انہیں بعد میں کتابوں سے اخذ کرنے میں مدد دے گا لیکن تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ میرا کام ہی یہی ہے۔"

"تم بھی اچھے خاصے مسخرے ہو۔"

کمال نے مزید گفتگو سے بچنے کے لیے کتاب میں پناہ لی۔ کبھی کبھی اسے مظفر خان پر ترس بھی آتا تھا۔ وہ بے چارہ خود کو بہت اہم سمجھتا تھا کہ طلبا کو شرارت سے روکنے کے لیے وہ انہیں کھیل میں لگائے رکھتا ہے۔ سیدھا سادہ عام فوجی تھا۔ تعلیم کی اہمیت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ تو بس جسم کا آدمی تھا۔ وہ دوسرے ٹیچرز کی اہمیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

کمال یہ تعین نہیں کرسکا تھا کہ کون سی کتاب پڑھائی جائے۔

شاہ جہاں عرف جہانی استاد کی سرگزشت

طاہر جاوید مغل کے قلم کا

تاوان

اٹک جیل سے اغوا ہونے والے ایک قیدی کی آپ بیتی۔ پاکستان میں ہونے والی زیرِ زمین سرگرمیوں کا حقیقی احوال

ماہنامہ سرگزشت کے تازہ شمارے میں پڑھیے

کھانے کا وقفہ ہوگیا۔ لاؤنج میں ٹیچرز جمع ہونے لگے۔ کمال نے اپنا لایا ہوا سینڈوچ نکال کر کھایا۔ پھر وہ اپنی کلاس میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد طلبا کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کمال نے سوچا کتاب کے سلسلے میں طلبا ہی سے دریافت کیا جائے۔ وہ سینئر کیمبرج کی کلاس تھی۔

اس کے سوال کے جواب میں علی نے ہاتھ اُٹھایا۔ "میں تو کیچ ۲۲ پڑھنا چاہتا ہوں۔"

"اسکول والوں کے نزدیک یہ کتاب دینی نقطۂ نظر سے اچھی نہیں۔" کمال نے تبصرہ کیا۔

"تو کارپیٹ بیگرز کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"نہیں چلے گی۔" کمال نے کہا۔ "یہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پڑھنے والی کتاب ہے۔"

نازیہ توقیر نے ہاتھ اُٹھایا۔ کمال نے اسے بولنے کی اجازت دی۔ "جونی گوٹ ہز گن پڑھا دیں سر۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا نازیہ۔" کمال نے کہا۔ "یہ لائبریری میں موجود بھی ہے۔"

"چھوڑیں نا جی۔"

یہ رئیس کی آواز تھی جو کمال کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ وہ کلاس میں کم ہی آتا تھا اور جب بھی آتا تو گڑبڑ کرتا۔ کوشش کرتا کہ کوئی بھی پڑھنے نہ پائے۔ اسے منفرد بننے کا، سب سے مختلف رہنے کا خبط تھا۔ اس کے کپڑے ہمیشہ میلے ہوتے تھے۔ "کیا مسئلہ ہے رئیس؟" کمال نے پوچھا۔

"اب یہ کے جی والی پڑھائی ختم کریں جناب۔"

"جونی گوٹ ہز گن، جنگ پر بہت اچھی تنقید ہے۔ تم اسے بچوں کی کتاب قرار دے کر زیادتی کر رہے ہو رئیس۔"

"میں آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ آپ ایکسپرٹ ہیں۔ اگر آپ یہ فضولیات ہمارے حلق سے اُتارنا چاہتے ہیں تو یہی سہی۔"

"اچھا، یہ بتادو کہ تم کیا پڑھنا پسند کرو گے؟" کمال نے پوچھا۔

"میں ماؤ کی سرخ کتاب پڑھنا چاہتا ہوں۔ یا پھر مارکس کو پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھے چے گیوارا، کاسترو اور ہو چی منہ کی سوانح پڑھنا ہیں۔"

"ماؤ کا حشر اور روس کا انجام دیکھنے کے باوجود؟" کمال نے زہرخند کہا۔ "ویسے بھی کمیونزم سوشل اسٹڈیز کے تحت آتا ہے۔ ہم انگریزی ادب اور فکشن پڑھ رہے ہیں۔"

"میرے خیال میں ہم زندگی اور اس کے رویّے پڑھ رہے ہیں۔" رئیس نے تند لہجے میں کہا۔ "اس ملک میں عام لوگ کتنے ناخوش ہیں.... کتنے محروم ہیں۔ روس کے ختم ہوجانے سے کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔"

"سنو بیٹے، یہ سیاست دانوں اور حکمرانوں کا کام ہے۔ تم باہر نکل کر عملی زندگی کا آغاز کرو گے تو سیاست داں بن جانا۔ پھر حکمراں بننے کی کوشش کرنا اور اس کے بعد یہ سب کچھ ٹھیک کردینا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس ملک سے محرومی، غربت اور دکھ کا خاتمہ کردو گے۔"

اس پر سب ہنسنے لگے۔ رئیس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ "خدا کی پناہ.... آپ تو اڑیل بیل ہیں۔"

"اس پر بعد میں بات ہوگی۔" کمال نے بڑے تحمل سے کہا۔

"یہ زحمت نہ کریں۔ میں یہاں رکوں گا نہیں۔ جب آپ اپنی ٹاپ فارم میں ہوتے ہیں، تب بھی سخت بور کرتے ہیں۔"

"تمہاری یہ پرفارمنس کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ بہرکیف ایک دن میں اتنی توہین بہت ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں آپ مجھے شٹ اپ کہہ رہے ہیں؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ تمہاری سمجھ داری پر مجھے کبھی شک نہیں رہا۔" کمال نے کہا۔ اس نے ایک اور راؤنڈ جیت لیا تھا۔ یہ سب کچھ کسی اور کلاس میں ہوا ہوتا تو رئیس کو کلاس سے نکال دیا جاتا لیکن کمال جانتا تھا کہ طالب علم کو کلاس سے نکال دیا جائے گا تو وہ کچھ بھی نہیں سیکھ سکے گا۔ یہ بات رئیس بھی جانتا تھا۔ چنانچہ باقی پیریڈ عافیت سے گزر گیا۔

سب لوگ کلاس سے نکلنے لگے تو نازیہ، رئیس کے ساتھ ہولی۔ "تم سر کمال کو اتنا تنگ کیوں کرتے ہو رئیس؟"

رئیس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ہمیں قائل کرنا ان کا کام ہے۔ لیکن تم ان کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہو؟"

"دیکھو.... وہ بہت اچھے آدمی اور بہت اچھے ٹیچر ہیں۔ وہ اس سلوک کے مستحق نہیں۔ غور کرو تو وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔"

وہ سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ رئیس نے کہا۔ "مجھے وہ دلچسپ نہیں لگتے۔ ہمیشہ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے رہتے ہیں۔ کسی سے بات کرتے ہیں تو نظریں اس کے سر سے اوپر رکھتے ہیں۔ لگتا ہے، اس کے پیچھے دیوار سے باتیں کر رہے ہیں۔ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں وہ۔ کاش کبھی وہ زمین پر آئیں اور ہماری بھی سُنیں۔"

"تم پتا نہیں، کہاں کی ہانک رہے ہو۔" نازیہ بولی۔ "وہ دوسرے ٹیچرز سے زیادہ اپنے طلبا کی سنتے ہیں۔ تم ان سے جو چاہے پوچھ سکتے ہو۔ مگر تم انہیں غصہ دلاتے رہتے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے، تم یہ سب کچھ دل سے نہیں کرتے ہو۔ بس زبردستی...." یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

"ایک منٹ نازیہ۔" رئیس نے اسے پکارا۔ "یہ تم نے کیسے کہا...." لیکن نازیہ دور چلی گئی تھی۔ رئیس کو اس کی بات حقیقت سے قریب تر لگی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ بے ساختہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا تھا جو کمال صاحب کو پریشان کرے۔ نجانے کیوں؟ دوسری کلاسوں میں وہ اتنی بدتمیزی کرتا تو ٹیچر بپھر جاتے تھے، تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے تھے لیکن کمال سب سے مختلف تھا۔ وہ

ذہانت بھری یا پُرمزاح بات کو بے حد سراہتا تھا اور ایسی ویسی کسی بات پر طالب علم کو آرپار ہو جانے والی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ کبھی چیختا چلّاتا نہیں تھا۔ غصہ بھی اسے کم ہی آتا تھا۔ لیکن اس کی زبان میں نجانے کہاں سے ایسی تیز دھار آجاتی تھی کہ طالب علم خود کو کٹتا محسوس کرتا تھا۔ اس کا علاج رئیس نے یہ نکالا تھا کہ غیر متعلق یا ممنوعہ موضوع پر کمزور دلائل کے ساتھ تیز و تند بحث کرتا۔ ہٹ دھرمی، جہالت اور خود کو برحق سمجھنا..... یہ وہ انسانی کمزوریاں تھیں جنہیں کمال برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس چیلنج کا جواب دینا وہ ضروری سمجھتا تھا۔ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ رئیس وزیرِ داخلہ کا بیٹا ہے۔

○☆○

وہ چاروں ساتھ ہی گھر سے نکلے..... بابر، شہلا، شہناز اور نذیر۔ مشکور گھر میں ہی رہ گیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ گاڑی بابر ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے اس گاڑی پر فخر تھا۔ اس گاڑی کا باقاعدہ رجسٹریشن تھا۔ لائسنس بھی تھا مگر سب کچھ ایک جعلی نام سے۔ وہ بہت محتاط انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا..... ٹریفک کے تمام ضابطوں کا خیال رکھتے ہوئے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بے ضابطگی پر نگاہوں میں آئے۔ اسے افسوس تھا کہ نذیر اس کے ماسٹر پلان پر عمل ہوتے نہیں دیکھ سکے گا۔ نذیر کو اب ایک اور کام کرنا تھا۔ زیادہ اہم کام۔ اس نے نذیر کو راستے میں ہی اُتار دیا۔ بارش بہت تیز ہو رہی تھی لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ بالآخر اس نے گاڑی روک دی۔ ایک لمحے وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شہناز پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ شہلا، بابر کے برابر بیٹھی تھی۔ اس کی انگلیاں مضطربانہ انداز میں ڈیش بورڈ پر تھرک رہی تھیں۔

"شہناز..... تم تیار ہو؟" بابر نے پوچھا۔

"ہاں۔" شہناز نے بہت آہستگی سے کہا۔

"آواز سے تو نہیں لگتا۔" بابر نے کہا۔

"اب خواہ مخواہ اس کے پیچھے نہ پڑو۔" شہلا بولی۔ "وہ کہہ رہی ہے کہ تیار ہے تو شک کیوں کرتے ہو۔"

"میں واقعی تیار ہوں۔" شہناز نے کہا۔

"تمہیں بیس منٹ کار میں انتظار کرنا ہوگا۔" بابر بولا۔ "خوفزدہ مت ہونا۔ شہلا اور میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ ہم پورے وقت تم پر نظر رکھیں گے۔ تمہیں سب کچھ یاد ہے نا؟"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد شہناز نے کہا۔ "ہاں۔ مجھے یاد ہے۔"

بابر نے اس کا سر تھپتھپایا۔ "شہناز، تمہیں ہماری خاطر یہ کرنا ہوگا۔ مجھے یہ یقین ہونا چاہیے کہ میں تم پر اعتبار اور انحصار کرسکتا ہوں۔ مجھے یہ یقین دلانے کا یہ واحد طریقہ ہے۔ شہلا پہلے ہی مجھے مایوس کرچکی ہے۔ اب تم مجھے مایوس نہ کرنا۔ دیکھو، جمعرات کو ہم ایکشن میں ہوں گے۔ مجھے یقین ہونا چاہیے کہ تم اپنا اہم کردار بخوبی ادا کرسکو گی۔ اپنی آج کی کارکردگی سے تم یہ بات ثابت کرسکتی ہو۔"

"میں یہ کام اس طرح کروں گی کہ تم مطمئن ہو جاؤ۔" شہناز نے سسکتی آواز میں کہا۔

بابر دروازہ کھول کر کار سے اُتر آیا۔ "اس وقت ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ بیس منٹ بعد کار سے اُترنا اور اپنا کام کر دکھانا۔"

ان کے جانے کے بعد شہناز کا چہرہ دیر تک بے تاثر رہا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ونڈ شیلڈ کے پار دیکھتی رہی۔ ریوالور اس کی گود میں رکھا تھا اور شہلا کی ناکامی کا منظر اس کی نگاہوں میں پھر رہا تھا۔ وہ خود کو بابر کی نظروں میں کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی حقارت اور ناراضی کا تصور بھی اس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے گروپ سے نکالا جائے۔

آٹھ بج کر پچاس منٹ پر وہ کار سے اُتری۔ وہ لمبا رین کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ دونوں ہاتھ رین کوٹ کی جیبوں میں تھے لیکن رین

کرکٹ کے شائقین کے لیے خوش خبری

پاکستان کے اسٹار بیٹسمین جاوید میاں داد کی سرگزشت

ونڈر بوائے

- کرکٹ کی دنیا کے پس پردہ واقعات، تنازعات، سازشوں کے بارے میں چونکا دینے والے انکشافات
- "عمران نے ماجد خان سے مجھے ٹھیک کرنے کی اجازت مانگی" میاں داد
- "ویسٹ انڈیز میں پولیس آفیسر وسیم اکرم وغیرہ کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا"
- "میرے خلاف سازش پچھلے بورڈ نے تیار کی تھی۔ فیصلے پر حسیب احسن، ظہیر عباس وغیرہ کے دستخط ہیں"

ماہنامہ سرگزشت کا تازہ شمارہ خریدنا نہ بھولئے

کوٹ کی داہنی جیب کی سلائی اُدھڑی ہوئی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ریوالور والا ہاتھ اس نے اپنے لباس سے چپکایا ہوا تھا۔ وہ کامیابی کا عزم لے کر نکلی تھی۔ وہ بابر کی ناراضی سے خوفزدہ تھی لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی اس فیملی سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ کبھی کبھی اسے بابر دیوانہ لگتا تھا مگر جو کچھ بھی تھا' اب وہی اس کی فیملی تھی۔ وہ دنیا میں اکیلا رہنا نہیں چاہتی تھی۔

چنانچہ اب اسے کوئی شکار تلاش کرنا تھا!

O☆O

بابر اور شہلا سنیما کے سامنے والے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ سنیما کا کمپاؤنڈ پوری طرح سے اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا اشوک....."

"شش... بابر نے سرگوشی سے اسے ٹوکا۔ "بلا.... جب تک ہم یہاں ہیں' ہمیں اپنے اصلی ناموں سے گریز کرنا چاہیے۔"

"لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" بلا یا شہلا نے کہا۔ اور واقعی ریسٹورنٹ سنسان تھا۔

"پھر بھی....." اشوک یا بابر نے کہا۔ "ہاں.... تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"مجھ سے وہ ہسٹریا کی اداکاری کیوں کرائی تم نے؟"

"لڑکی پر پریشر ڈالنا ضروری تھا۔ ویسے تم نے بہت اچھی اداکاری کی۔ ایک اچھی خبر ہے۔ گوپال سے فون پر بات ہوئی تھی۔ تمام بڑے شہروں میں ہمارے یونٹ مکمل ہو چکے ہیں۔ میری تجویز مؤثر ثابت ہو رہی ہے کہ ہر یونٹ پر مقامی لوگوں کو استعمال کیا جائے۔ ہماری پہلی کامیابی کے بعد بیک وقت تمام شہروں میں ایسی دہشت گردی ہوگی کہ اس ملک کی بنیادیں ہل جائیں گی۔"

"ہونا بھی چاہیے۔ ہم بھارت ماتا کی اُمید ہیں۔ ہم لوگوں کی تربیت پر بہت دولت صرف کی گئی ہے۔"

"دیکھو' شہناز کیا کرتی ہے۔" اشوک نے کہا۔

"مجھے یقین ہے' وہ کامیاب رہے گی۔" بلا بولی۔ "وہ تمہاری نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

اسی وقت انہیں شہناز سنیما کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ "میری ٹائمنگ دیکھی تم نے۔" اشوک نے فخریہ لہجے میں کہا۔ اسی لمحے شو ختم ہوا اور کمپاؤنڈ فلم بینوں سے بھر گیا۔ "اب تو وہ مجھے نظر بھی نہیں آ رہی ہے۔ کاش یہ منظر میں قریب سے دیکھ سکتا۔"

O☆O

داؤد ۱۵ سالہ ازدواجی زندگی میں پہلی بار اپنی بیوی صادقہ کے ساتھ فلم دیکھنے آیا تھا۔ ورنہ وہ عام طور پر ٹی وی پر ہی فلم دیکھتے تھے۔ داؤد اس شام جلدی گھر آ گیا تھا۔ اس کے ۱۴ سالہ بیٹے ہاشم اور ۱۲ سالہ بیٹی ہاجرہ کو مہندی کی ایک تقریب میں جانا تھا۔ یوں انہیں فلم دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ ابتدا میں ان کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ پھر حالات بہتر ہوئے تو بچے بڑے ہو گئے تھے۔ ایسے میں فلم کے چونچلوں کا کسے خیال آتا۔ انہیں تو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ زندگی کی مصروفیتوں اور بچوں کے مستقبل کی فکر نے انہیں ایک دوسرے سے کتنا دور کر دیا ہے۔

داؤد نے ٹکٹ خریدے تو بارش شروع ہو چکی تھی لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اس روز تفریح کے موڈ میں تھا۔ ہال میں بیٹھتے بیٹھتے اسے محسوس ہوا کہ اس کی عمر پندرہ برس کم ہو گئی ہے۔ فلم شروع ہوئی تو اس نے بڑی محبت سے صادقہ کا ہاتھ تھام لیا۔ صادقہ نے حیرت سے اسے دیکھا مگر اسے بھی یہ بہت اچھا لگا تھا۔ دونوں فلم میں کھو گئے۔ کامیڈی پر داؤد کھل کر ہنس رہا تھا اور ٹریجڈی پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ فلم ختم ہوئی تو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ہال سے نکلے۔ وہ بہت خوبصورت وقت تھا جو اس نے بہت طویل عرصے کے بعد بیوی کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ دونوں ہی بہت خوش تھے۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہر نکلے' تب بھی بارش ہو رہی تھی۔ داؤد نے چھتری کھول لی۔ ہجوم کے درمیان چلتے ہوئے داؤد کو احساس ہوا کہ وہ کبھی اتنا خوش نہیں رہا جتنا اس وقت ہے۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ یادگار لمحات گزارے تھے اور وہ ان کی حدت سے سرشار تھا۔

اچانک اس کے جسم میں جیسے اذیت کا کوئی چشمہ پھوٹ نکلا۔ وہ اپنے آگے جانے والے شخص کی طرف گرا' اس سے ٹکرایا اور چھتری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ صادقہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی پھر وہ چیخنے لگی کیونکہ وہ اسے نہیں سنبھال سکتی تھی اور وہ گر گیا تھا۔

داؤد نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس سے بولا نہیں گیا۔ اس کے ہونٹوں پر خون کا ایک بلبلہ سا پھوٹا اور اس نے دم توڑ دیا۔ وہ اپنے پیچھے کھڑی اس عورت کو نہیں دیکھ سکا جس کے داہنے ہاتھ میں سائلنسر لگا ریوالور تھا....

O☆O

شہناز کو معلوم نہیں تھا کہ وہ خصوصیت سے اس شخص کی طرف کیوں متوجہ ہوئی۔ شاید چھتری کی وجہ سے..... یا اس کے محبانہ اور سرپرستانہ انداز کی وجہ سے جس سے وہ اپنی بیوی کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ یا شاید اس لیے کہ اس کے کندھے بہت چوڑے تھے۔ نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا مگر اس لمحے ریوالور میں جیسے جان پڑ گئی۔ وہ رین کوٹ کے نیچے خود بخود بلند ہوا.... اور فائر ہو گیا۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ نہ کوئی آواز پیدا ہوئی' نہ کسی نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ شخص آگے کی طرف گرا۔ اس کی بیوی چیخی۔ شہناز اپنی جگہ کھڑی اس شخص کو فرش پر گرتے دیکھتی رہی۔ "میں نے بڑی صفائی سے کام کر دیا۔" اس کے اندر کسی نے کہا۔ "میں نے اپنی اہلیت ثابت

کردی۔"

لوگوں نے خود ہی اسے لاش سے دور دھکیل دیا۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے خصوصیت سے اس کی طرف دیکھا ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔ وہ بھی اتنا ہی چونکی تھی جتنا دوسرے چونکے تھے۔ اس شخص کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔

بس پھر شہناز بڑی صفائی سے مجمع سے نکلی تھی۔ سنیما سے باہر آکر اس نے کار کی طرف رُخ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ لوگوں کو اب تک معلوم نہیں ہوا ہے کہ متوفی کو شوٹ کیا گیا ہے۔

بابر بھی شہلا کو لے کر کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ وہ جائے واردات سے قریب تر ہو کر گزرے۔ کمپاؤنڈ میں گیٹ کے قریب وہ شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ بابر نے اردگرد کھڑے لوگوں کے تبصرے دھیان سے سُننے کی کوشش کی۔

"کیا خیال ہے بھئی..... کیا معاملہ ہے؟"

"لگتا ہے' دل کا دورہ پڑا ہے بے چارے کو۔"

"میں اس کے پیچھے تھا کہ یہ اچانک آگے کی طرف گرا....."

"ارے..... یہ تو اس کے کوٹ کے نیچے سے خون نکل رہا ہے....."

اس آخری تبصرے کے ساتھ ہی کمپاؤنڈ میں دہشت پھیل گئی۔

بابر اور شہلا کار تک پہنچے۔ شہناز پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بابر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کردیا۔ شہلا اس کے برابر بیٹھ گئی۔ "میں تمہاری کارکردگی سے بہت متاثر ہوا ہوں شہناز۔" بابر نے کہا۔ "یہ بتاؤ' تم کیسا محسوس کررہی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بہت خوب! آج تو جشن ہونا چاہیے۔"

"یہ بتاؤ' میں ریوالور کا کیا کروں؟" شہناز نے پوچھا۔

"مجھے دے دو۔" بابر نے جیب سے رومال نکالتے ہوئے کہا۔ شہناز ریوالور دینا نہیں چاہتی تھی تاہم اس نے ہچکچاتے ہوئے ریوالور رومال پر رکھ دیا۔ بابر نے ریوالور ڈیش بورڈ میں رکھ دیا..... رومال سمیت۔ اسے یقین تھا کہ اسے کبھی شہناز کے خلاف قتل کا وہ ثبوت استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مگر پھر بھی.... احتیاطاً!

○☆○

دوسری طرف نذیر نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔ اس نے بڑی صفائی سے چرائی ہوئی وین کا کنیکشن بدلا اور کھلے ہوئے تار سمیٹ کر ایک سوئچ سے منسلک کردیے۔ پھر اس نے گاڑی کی نمبر پلیٹ ہٹا کر بابر کی دی ہوئی نمبر پلیٹ نصب کی۔ اس کے بعد وہ گاڑی لے کر چل دیا۔

بارش اب بھی تیز ہو رہی تھی۔ نذیر نے وائپر چلا دیے۔ وائپرز کی آواز سے اسے نیند آنے لگی۔ وہ اس وقت بہت پُرسکون تھا۔ طمانیت کا احساس غیر معمولی تھا۔ گاڑی گیراج میں کھڑی کرکے اس نے گیراج کے دروازے بند کیے اور مکان میں داخل ہوا۔ مشکور بدستور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ "یہ لوگ ابھی واپس نہیں آئے؟" اس نے مشکور سے پوچھا۔

مشکور نے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ "نہیں۔"

"کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوگئی ہو۔" نذیر نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"بابر کے ہوتے ہوئے کوئی گڑبڑ نہیں ہوسکتی۔" مشکور نے بے حد اعتماد سے کہا۔

نذیر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "مجھے بابر کی فکر نہیں۔" اس نے کہا۔ "وہ تو محفوظ فاصلے پر ہوگا۔ میں شہناز کی طرف سے فکرمند ہوں۔ وہ بڑی آسانی سے غلطی کرسکتی ہے۔"

"تم وین لے آئے؟" مشکور نے پوچھا۔

"ہاں' گیراج میں کھڑی ہے۔" نذیر نے غور سے مشکور کو دیکھا۔ وہ بہت قناعت پسند اور آسانی سے مطمئن ہونے والا شخص تھا۔ بابر نے اسے سر چھپانے کا ٹھکانا' پیٹ بھرنے کو کھانا اور تفریح کے لیے ٹی وی فراہم کردیا تھا۔ وہ اس میں خوش اور مطمئن تھا۔ اسے زیادہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنی سی مہربانی پر وہ بابر کا غلام بن گیا تھا۔ اس نے قتل کے الزام میں جیل کاٹی تھی۔ جیل سے نکلتے ہی بابر نے اسے پٹا لیا تھا۔ بابر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھے گا۔ وہ تنومند آدمی تھا لیکن بابر کے پیچھے دُم ہلاتا چلتا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر وہ کسی کو بھی قتل کرسکتا تھا۔ نذیر کو حیرت ہوتی تھی کہ بابر نے کیسے اسے قابو کیا ہے کہ اِسے اپنے اشاروں پر نچا سکتا ہے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس کا اپنا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی پوری طرح بابر کے قابو میں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ طبعاً وہ تشدد پسند نہیں ہے۔ جب بابر نے اس سے کہا تھا کہ اسے یونٹ میں شمولیت کے لیے قتل کرنا ہوگا تو وہ ہنس دیا تھا۔ وہ بابر پر نہیں ہنسا تھا' نہ اس بات پر ہنسا تھا کہ بغیر کسی وجہ کے کسی کو قتل کرنا کتنی عجیب بات ہے۔ بس وہ کسی کو قتل کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مشکور کے لیے وہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ بابر کے حکم پر کسی کو بھی قتل کرسکتا تھا مگر پھر بابر نے اسے اس کی بچی اور پھر بیوی کی موت یاد دلائی' دولت مندوں کی بے حسی کا احساس دلایا۔ یوں وہ بھڑک گیا۔ رہی سہی کسر شراب نے پوری کردی۔ اس نے اپنے کارخانے کے مالک کو قتل کردیا لیکن وہ اب بھی یقین سے کہہ سکتا تھا کہ بابر اور شراب نہ ہوتے تو وہ کبھی قتل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بغیر سہارے کے چلنے والا آدمی نہیں تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور بابر اندر آگیا۔

اس کے پیچھے دونوں لڑکیاں تھیں۔ وہ دونوں یقینی طور پر نشے میں دُھت تھیں۔ "کم آن..... ہمیں جشن منانا ہے۔" بابر نے کہا۔

جشن رات گئے تک جاری رہا۔ بابر نے اس دوران شہناز کے کارنامے کی تفصیل متعدد بار دُہرائی۔ نذیر نے کئی بار سونے کے لیے اٹھنا چاہا مگر بابر نے اسے اٹھنے نہ دیا۔

○☆○

صبح کے چار بجے تھے۔ کمال نے وہ بے خواب رات اسکول کے اسٹیڈیم میں گزاری تھی۔ وہ تنہا وہاں بیٹھا اسٹیڈیم میں ماضی کی یادوں کو متحرک دیکھ رہا تھا۔ پوری زندگی جیسے اس نے ایک بار اور گزار لی تھی۔ اور اب وہ مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شام کو صوفیہ سے ملاقات اس کے نقطۂ نظر سے نتیجہ خیز ثابت نہیں رہی تھی۔ وہ صوفیہ کو قائل نہیں کرسکا تھا۔ جمیل صاحب کی آفر نے اور پیچیدگی پیدا کردی تھی۔ صوفیہ کا اصرار تھا کہ وائس پرنسپل کا عہدہ قبول کرلیا جائے اور مری میں ہی گھر بنایا جائے۔ "دکھوں کی زمین میں سکھ کے بیج بونے سے کیا فائدہ؟" صوفیہ نے دلیل دی تھی۔ وہ اپنے دلائل دُہراتا رہا تھا لیکن بے سود۔ صوفیہ اپنے مؤقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔

کمال جانتا تھا کہ وہ صوفیہ سے محبت کرتا ہے لیکن گاؤں واپس جاکر گھر بنانا اس کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ اس سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ صوفیہ کو کھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ صوفیہ نے یہ بات محسوس کرکے منصوبہ بندی کا شعبہ سنبھال لیا تھا۔ جون میں شادی، پھر ہنی مون اور واپسی پر کمال احمد وائس پرنسپل۔ وہ انکار بھی نہ کرسکا کہ صوفیہ کا دل نہ ٹوٹ جائے اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی منصوبہ بندی کے بعد صوفیہ کا دل ٹوٹنا کتنا اذیت ناک ہوگا۔

رات کی تاریکی ہلکی پڑ گئی۔ آسمان پر ملگجا اُجالا پھیل گیا۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اسے یقین ہوگیا کہ اسکول کھل گیا ہے اور اب گرم کافی مل سکتی ہے۔ پھر وہ گھاس پر چلتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف بڑھا۔ دو گھنٹے وہ اوپر والے فیکلٹی روم میں بیٹھا پرچے جانچتا رہا۔ اس دوران اس نے کافی کی کئی پیالیاں پی ڈالیں اور سگریٹ کا پورا پیکٹ پھونک ڈالا۔

اس روز اس نے اپنی کلاسوں کو ایک اسائن منٹ دے کر مصروف رکھا۔ اس کا بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تینوں پیریڈ ختم ہوئے تو اس نے سکون کی سانس لی اور کافی اور سگریٹ پینے کے لیے چل دیا۔ اس کے لیے وہ دن سسک سسک کر گزر رہا تھا۔

لاؤنج میں مظفر خان اس کے سر پر سوار ہوگیا۔ "جانتے ہو، آگ لگ جانے کی صورت میں یہ جگہ ایک قید خانہ ہے۔" مظفر نے بلا تمہید کہا۔ "دیکھا ہے کہ زینے کتنے تنگ ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آگ لگ جائے تو بچوں کو کیسے نیچے اُتارا جائے گا۔ آگ سے بچاؤ والے زینے بھی ردّی ہیں۔ میرا خیال ہے، ان پر دو آدمی ایک ساتھ کھڑے ہوجائیں تو یہ ڈھے جائیں گے۔"

کمال نے پرچے سے نظریں اُٹھائیں اور بولا۔ "میں نے کبھی غور نہیں کیا اس پر لیکن میرا خیال ہے تم مبالغے سے کام لے رہے ہو۔"

"تمہیں کیا معلوم۔ صبح سے میں بھگت رہا ہوں۔ اچانک انسپکشن والے آگئے۔ مجھ سے انہوں نے کیا کیا کام کروائے۔ اسٹور سے کھیلوں کا تمام سامان نکلوا دیا جبکہ سامان رکھنے کی متبادل جگہ بھی فراہم نہیں کی۔ یہ فکر صرف اس لیے کہ یہاں وزیروں، مشیروں اور بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ کبھی کسی عام اسکول کی تو فکر نہیں کی جاتی۔ اس ملک میں قانون بھی مختلف طبقوں کے لیے مختلف ہے اور مراعات بھی۔ انصاف تو نام کو نہیں....."

کمال پرچے چیک کرتا رہا۔ مظفر کو بھی اندازہ ہوگیا کہ اس وقت وہ سُننے یا بولنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ وہ اسپورٹس کا ایک میگزین کھول کر بیٹھ گیا۔

○☆○

مطلب کے ٹھکانے کی تلاش میں بابر تنہا ہی نکلا تھا۔ ہوٹلوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور ابھی سیزن بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اسے توقع تھی کہ کوئی دشواری نہیں ہوگی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے مخصوص لوکیشن درکار تھی۔ کوئی ہوٹل اس معیار پر پورا نہیں اترا تو وہ مایوس ہونے لگا۔ پھر اسے وہ نو تعمیر شدہ اپارٹمنٹ نظر آگئے۔ پہلی دو عمارتیں مطلوبہ رخ پر نہیں تھیں۔ وہ تیسری اور آخری عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں بات نہ بننے کی صورت میں اس کے لیے مسئلہ کھڑا ہوجاتا۔ وہ دروازے پر کھڑا کچھ دیر سوچتا رہا پھر آفس میں داخل ہوگیا۔ وہاں ایک معمر شخص میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ وہ مقامی آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ بولا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ "فرمایئے..... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"میرا نام بابر سلیم ہے۔ ایک اپارٹمنٹ چاہیے مجھے۔" بابر نے کہا۔

"یہاں بیشتر اپارٹمنٹ لوگوں کی ملکیت ہیں۔" منیجر نے کہا۔ "یہ اسی اسکیم کے تحت بنائے گئے تھے۔ مالک جس وقت چاہیں یہاں آسکتے ہیں..... یا وہ کسی کو بھی چابی دے سکتے ہیں۔ ہاں کچھ اپارٹمنٹ موجود ہیں۔ وہ مالکانہ قبضے کے ساتھ بھی مل سکتے ہیں اور کرائے پر بھی۔"

"پلیز..... مجھے دکھا دیجیے ذرا۔"

منیجر نے ایک رجسٹر کھول کر دیکھا پھر دراز میں سے چابیاں نکالیں اور بولا۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

وہ اسے پہلی منزل پر لے گیا۔ وہاں اس نے بابر کو تین اپارٹمنٹ دکھائے۔ وہ دو کمرے والے اپارٹمنٹ تھے..... اٹیچڈ باتھ کے ساتھ۔ کھڑکیوں سے بہت خوبصورت منظر نظر آتا تھا لیکن وہ بابر کے مطلب کے نہیں تھے مگر وہ منیجر کو کیسے بتاتا کہ اس کی

ضرورت کیا ہے۔ "تین کمروں والے اپارٹمنٹ نہیں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"وہ دوسرے رُخ پر ہیں..... اور تیسری اور چوتھی منزل پر ہیں۔" منیجر نے کہا۔ "لیکن میں نے بتایا نا' وہ لوگوں کی ملکیت ہیں۔"

بابر کا دل خوش ہوگیا۔ اسے عمارت کے دوسرے رخ میں ہی دلچسپی تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ کو انہیں کرائے پر دینے کا اختیار نہیں؟"

"ہے۔ وہ کرایہ ہمارے پاس مالکوں کی امانت ہوتا ہے۔ اس میں ایک خطرہ ہے۔ وہ کسی وقت آگئے تو آپ کو اپارٹمنٹ خالی کرنا ہوگا۔"

"میں یہ رسک لے سکتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

منیجر چند لمحے ہچکچایا پھر بولا۔ "ان کا کرایہ زیادہ ہوگا۔" پھر اس نے وضاحت کی۔ "دیکھیں نا' کرایہ تو مالکوں کا ہوگا۔ ہمارا محنتانہ الگ....."

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ مجھے اپارٹمنٹ دکھادیں۔"

"آپ یہیں رُکیں' میں چابی لے کر آتا ہوں۔"

تھوڑی دیر میں منیجر چابی لے آیا۔ اس نے تیسری منزل پر دوسرے رُخ کا اپارٹمنٹ کھولا۔ "ویسے لوگ عام طور پر مشرق کی سمت والے اپارٹمنٹ پسند کرتے ہیں۔"

"مجھے مغرب والا زیادہ اچھا لگے گا۔"

وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔ بابر نے ہر چیز چیک کی۔ اپارٹمنٹ واقعی اچھا تھا۔ فرنیچر بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ لائٹیں موجود تھیں۔ وہ سرسری انداز میں کھڑکی کے پاس گیا۔ حالانکہ اس کے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کی چیز وہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا اور پوری طرح مطمئن ہوگیا۔

"اس کا کرایہ کتنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"چار ہزار روپے۔"

بابر نے منیجر کو گھور کر دیکھا۔ "چار ہزار....."

"سیزن میں تو دس ہزار ملتا ہے اس کا۔" منیجر نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "دیکھیے فرنشڈ اپارٹمنٹ ہے۔"

"اور اگر ہم صرف ہفتہ دو ہفتے رہیں تو؟"

"کرایہ تو ایک ماہ کا ہی چارج ہوگا۔"

"اور اگر ہمیں وقت سے پہلے مالک کی آمد کی وجہ سے اپارٹمنٹ خالی کرنا پڑا تو؟" بابر نے دکھاوے کی حجت کی۔ اسے تو اپارٹمنٹ بس دو دن کے لیے چاہیے تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ منیجر کسی بھی زاویے سے مشکوک ہو۔

"تو ہم آپ کو متبادل اپارٹمنٹ دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" بابر نے جیب سے بٹوا نکالا اور چار ہزار روپے گن کر منیجر کو دے دیے۔ منیجر نے اسے چابی دے دی۔

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات و احادیث درج ہیں' اُن کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیے۔

بابر دوپہر کو پنڈی واپس پہنچ گیا۔ اس نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ اپارٹمنٹ اسے کتنی دشواری سے ملا ہے۔ اس نے چابی شہناز کو دے دی۔ "میں چاہتا ہوں' کل تم اس اپارٹمنٹ میں پہنچ جاؤ۔" اس نے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے شہناز اور شہلا کو کچن میں دھکیلا۔ مشکور ٹی وی میں مگن تھا۔ وہ نذیر کے ساتھ اگلے دو روز کے پروگرام کی تفصیل طے کرنے بیٹھ گیا۔ "کل ہمیں ساری سیٹنگ کرنا ہوگی۔ جمعرات کی صبح تو بہت مصروف ہوگی۔"

نذیر بہت توجہ سے سنتا رہا۔ وہ بابر کے فیصلوں پر کبھی اعتراض نہیں کرتا تھا' کوئی اعتراض ہوتا بھی تو وہ اندر ہی رہتا۔ مثلاً اس کے خیال میں سنیما والا قتل حماقت تھی۔ اس کے نتیجے میں یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس ان تک پہنچ جاتی لیکن اس نے اپنا منہ بند ہی رکھا۔ ابھی تک تو بابر کی بات درست ثابت ہورہی تھی۔ پولیس کے پاس ایسا کوئی سراغ نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ اس قتل کا تعلق ان سے جوڑتی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے ان لوگوں کو یکجا کرکے اچھا یونٹ بنایا تھا۔ پھر اس نے اور شہروں میں یونٹ بنانے کے لیے بھرپور انداز میں کام کیا تھا۔ اس نے ایسے سزا یافتہ لوگوں کی فہرست بنائی تھی جو سنگین جرائم میں ملوث تھے اور حال ہی میں رہا ہونے والے تھے۔ اس نے ان سے رابطہ کیا تھا اور اب اس کا دعویٰ تھا کہ ہر بڑے شہر میں یونٹ قائم ہوچکا ہے۔ اس یونٹ کی کامیابی کے بعد ان سب کو حرکت میں آنا تھا۔

بابر کا منصوبہ بہت سادہ تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی چوریوں اور ڈکیتیوں کے ذریعے بڑی واردات کے لیے فنانس فراہم کیا تھا۔ نذیر کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ جمعرات کو وہ جو کچھ کرنے والے تھے' وہ بہت بڑا کام تھا اور بابر کے خواب تو اس سے بھی آگے کے تھے۔ اس نے ایک اور گروپ تشکیل دیا ہوا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ انہیں بیک کرتا۔ یہ خالص دہشت گردوں والی ٹیکنیک تھی۔ بابر کا کہنا تھا کہ عنقریب ملک بھر میں اس کے بیسیوں یونٹ کام شروع کردیں گے۔ بتدریج پورا ملک تشدد اور دہشت گردی کی لپیٹ میں آجائے گا اور تمام یونٹ اپنی کارروائیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت کے بل پر طاقت ور ہوتے جائیں گے۔

نذیر کو اس سے غرض نہیں تھی کہ بابر کے خواب کہاں تک

جاتے ہیں۔ وہ تو خطیر رقومات کے تذکرے سے مسحور ہو کر رہ جاتا تھا۔ اب اسے صرف دولت کی ہوس تھی۔ دولت اس کی بچی اور بیوی کو واپس تو نہیں لا سکتی تھی لیکن نذیر اب کبھی اس بے بسی سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا جو بچی کی بیماری کے عرصے میں اس پر طاری رہی تھی۔ پھر اب اس کی زندگی ایک بہت بڑے اور مہیب خلا کی طرح تھی۔ بابر نے اس خلا کو ایڈونچر کے احساس سے بھر دیا تھا۔

بابر خاموش ہوا تو نذیر کا جاگتی آنکھوں کا وہ خواب ٹوٹ گیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ بابر کی بات توجہ سے سُن رہا تھا کوئی سوال کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے پوچھا۔ "ہم دھماکے والے چارج کب بنائیں گے؟"

"ابھی..... اسی وقت۔" بابر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ایک غلطی بھی ہوگئی تو جمعرات کی نوبت نہیں آئے گی۔"

اگلے آدھ گھنٹے میں بابر نے بموں کے مختلف حصے یکجا کیے جو مکان کے مختلف حصوں میں چھپائے گئے تھے۔ پھر اس نے ڈائنامائٹ نکالا۔ نذیر کو اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بس وہ بچپن میں دیا سلائیوں کا مسالہ سوراخ والی چابی میں جمع کر کے کیل کی مدد سے پٹاخے چلاتا رہا تھا۔

بابر نے پہلے اسے تفصیل سے سمجھایا اور ہدایات دیں۔ اس کے بعد اس نے اسے ہاتھ بٹانے کی اجازت دی۔ اس کے باوجود وہ اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کوئی بھی غلطی مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ بابر کو تین بم درکار تھے۔ ہر بم میں ڈائنامائٹ کی پندرہ اسٹک تھیں اور وہ چاہتا تھا کہ اسٹکوں کو ایسے باندھا جائے کہ وہ ڈھیلی نہ ہوں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ٹریگر کیے جانے کے بعد بم پھٹیں گے' اس نے بڑی احتیاط سے اسٹک کے تینوں بنڈلوں سے تین علیحدہ بلاسٹنگ کیپ منسلک کر دیے۔ کیپ لگانے کے بعد اس نے تینوں کے لیڈ وائرز کو رسی کی طرح بٹ دیا۔

"اب میں تمہیں اس کا اصول سمجھاتا ہوں۔" بابر نے نذیر سے کہا۔ "ہمارے لیے ٹائم بم بیکار چیزیں ہیں۔ ہمیں ان بموں پر مکمل کنٹرول حاصل ہونا چاہیے ورنہ یہ ہمارے لیے کسی کام کے نہیں ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ پولیس کو بہت جلد اس بات کا احساس ہو جائے گا۔ چنانچہ اپنی اس مضبوطی کے لیے ہم ان تمام یونٹوں کو ایک بیٹری سے منسلک کریں گے..... اور اس کے بعد ایک ٹرانزسٹر ریڈیو سے یہ کام بہت سادہ ہے۔ میرے پاس مخصوص فریکوئنسی کا ٹی وی ریموٹ کنٹرول یونٹ ہے۔ اس کا سگنل ریڈیو پکڑے گا۔ پھر ریڈیو بیٹری کو ایکٹی ویٹ کر دے گا۔ بیٹری اس الیکٹریکل چارج کو ریلیز کرے گی جو بلاسٹنگ کیپ کو ٹریگر کرے گا لیکن یہ سادہ سا کام اتنا آسان نہیں ہے۔ ابھی ہمیں وائرنگ کرنی ہے اور بیٹری یوں کسی بھی وقت چارج دے سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں آف کرنے والا سوئچ لگانا ہوگا۔" یہ سب کچھ کہتے ہوئے وہ انگلیوں سے میز پر ڈایاگرام بھی بنا رہا تھا۔ "اس لیے ہمیں ویسا ہی وارم اپ سوئچ استعمال کرنا ہوگا جیسا ٹی وی سیٹ میں ہوتا ہے۔ تم نے یقیناً دیکھا ہوگا۔ بٹن دبایا اور ٹی وی آف۔ دوبارہ دبایا تو ٹی وی آن۔ اس سوئچ کو ہم آف پوزیشن میں لگائیں گے۔ ریڈیو سے موصول ہونے والا سگنل اسے ایکٹی ویٹ کرے گا۔" اس دوران بولنے اور ڈایاگرام بنانے کے درمیان وہ وائر بھی سیٹ کر رہا تھا۔ اسے کسی چیز کی مثلاً وائر کٹر' اسکریو ڈرائیور اور سوڈرنگ آئرن کی ضرورت ہوتی تو وہ نذیر سے طلب کرتا۔

"ہاں..... بات سنو۔ ایک بات مجھے یاد دلا دینا۔" بابر نے کہا۔ "جب میں لیڈ کو بیٹری سے جوڑنے لگوں تو مجھے یہ ضرور یاد دلا دینا کہ سوئچ کو ٹیسٹ کر لوں۔ کہیں چارج لیک نہ ہو رہا ہو۔"

"اور اگر کوئی بھولا بھٹکا سگنل اس فریکوئنسی پر آگیا تو؟" نذیر نے اعتراض کیا۔

بابر نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "یہ امکان تو ہمیشہ موجود رہتا ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا جیسے اس جملے کی اہمیت نذیر پر اُجاگر کرنا چاہتا ہو۔ "لیکن میں نے فریکوئنسی بہت احتیاط سے منتخب کی ہے۔' ں کے باوجود موسم کی خرابی کی صورت میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ کیوں' تمہیں خوف آرہا ہے؟"

"ہاں۔ اس پر تو ہمارا کنٹرول نہیں ہے نا۔" نذیر نے کہا۔

"دیکھو' جب تک ریڈیو آف ہے' یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہاں ریڈیو آن کرنے کے بعد ہم قسمت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ انسان جتنی احتیاط کر سکتا ہے' وہ میں نے کی ہے۔ آگے بھگوان جانے...." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے منہ سے کیا نکل گیا ہے۔ اس نے نذیر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ "بات یہ ہے کہ میں بُرے کام میں اللہ کا نام کبھی نہیں لیتا۔" وہ مسکرایا۔ "ایک اچھے مسلمان کی طرح میں بُرائی کافروں کے خدا پر تھوپ دیتا ہوں۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

نذیر مسکرانے لگا۔ "لیکن اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا؟"

"سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ ہمارے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔" بابر نے بے پروائی سے کہا۔ "اہم بات یہ ہے کہ اس کے زور پر ہم اپنی بات منوا سکتے ہیں۔" اس نے ٹریگر ڈیوائس کی وائرنگ مکمل کر لی تھی۔ "اب بس ہمیں لیڈ کو سوئچ سے منسلک کرنا ہے پھر کام مکمل۔ ذرا سوڈرنگ آئرن بڑھانا۔ یہ نازک کام ہے۔" اس نے پہلا بم مکمل کر لیا۔

اس دوران نذیر کی نظر کچن سے نکلتی ہوئی شہناز پر پڑ گئی۔ وہ دونوں بہت کم وقت میں ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ بابر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسے تو اس پر بھی اعتراض نہیں تھا

کہ وہ شہلا کے ساتھ کھیلتا رہا ہے لیکن شہناز' بابر کو اور انداز میں اچھی لگی تھی۔ اسے اس پر ترس بھی آتا تھا۔ بے چاری نے کہاں سے زندگی شروع کی' کیسے دولت والوں کے ہاتھوں برباد ہوئی اور کہاں تک آ پہنچی۔ نذیر نے سوچا تھا کہ پیسہ ہاتھ میں آتے ہی شہناز سے شادی کر کے پُرسکون زندگی گزارے گا.....

اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ "اے بابر..... تمہیں پہلے کچھ اور کرنا تھا!" وہ تقریباً چلا اٹھا۔

بابر کے ہونٹ بھنچ گئے۔ "ہاں..... ذرا مجھے ٹیسٹر دو۔" اس نے ٹیسٹر کی مدد سے دوسرے بم کے تار سوئچ پر رکھے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے اسی طرح تیسرے بم کے سوئچ کو چیک کیا۔ اس بار ٹیسٹر کا دستہ روشن ہوگیا۔ "تیسری چیز ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ تیسرے سوئچ کی دوبارہ وائرنگ کر رہا تھا۔ نذیر کو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ دوبارہ وائرنگ کر کے اس نے سوئچ کو پھر چیک کیا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے لیڈ جوڑ دی۔

نذیر کو یہ احساس بہت دیر میں ہوا کہ کیا ہوا تھا اور جب احساس ہوگیا تو اس نے دم سادھ لیا۔ بابر نے ان سب کو چیتھڑے اُڑانے کے بہت قریب پہنچا دیا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی کہ ان کے منصوبے میں بھی ایسی کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ کوئی ایسی بات جس کے متعلق انہوں نے سوچا بھی نہ ہو۔ سب سے زیادہ وہ اس بات پر پریشان تھا کہ بابر سے غلطی سرزد ہوئی ہے جبکہ وہ پوری طرح بابر پر انحصار کر رہے تھے۔ دوسرے تو اس کی ہدایات پر عمل کرتے مگر بابر کے لیے درست فیصلے کرنا ضروری تھا۔

بابر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "تمہارا رنگ پیلا پڑ گیا ہے نذیر۔"

"ہم بال بال بچے ہیں۔" نذیر نے لرزتی آواز میں کہا۔

بابر کے ہونٹوں کا ایک گوشہ اوپر اُٹھ گیا۔ "یہ تمہاری غلطی تھی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ سوئچ چیک کرنے کے بارے میں مجھے یاد دلا دینا۔ میں جب کسی سے کچھ کہتا ہوں تو توقع رکھتا ہوں کہ تعمیل کی جائے گی۔ میں نے تمہیں ہدایت دینے کے بعد مطمئن ہو کر سوئچ والے معاملے کو اپنے ذہن سے دھکیل دیا تھا۔ مجھے تم پر بھروسا تھا نذیر لیکن تم نے مجھے مایوس کیا۔ اب بتاؤ' میں کس حد تک تم پر اعتماد کرسکتا ہوں؟"

نذیر کے وجود میں غصہ اُبلنے لگا لیکن اس نے خود کو پھٹ پڑنے سے باز رکھا۔ اس نے بابر کی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا۔ "آئی ایم سوری۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔" بابر نے کہا۔ "اب میں تمہیں بے ضرر سا کام سونپ رہا ہوں۔ گنوں کی صفائی کردو۔ گن تو ہینڈل کرسکتے ہو تم؟"

نادر دماغ

ایک پروفیسر صاحب طب کے طلبہ کو کلاس میں مختلف قسم کے دماغ دکھا رہے تھے۔ ایک دماغ اٹھا کر انہوں نے کہا "یہ مصر کے کالے گدھے کا دماغ ہے۔ یہ بہت نایاب ہے۔ یہ نسل دنیا سے مٹ چکی ہے۔"

پھر انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا "اس قسم کے دماغ ساری دنیا میں صرف دو ہی ہیں۔ ایک مصر کے میوزیم میں اور دوسرا میرے پاس۔"

نذیر نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اُٹھا اور عقبی بیڈروم میں چلا گیا۔ کچن کی طرف سے بابر کی آواز آرہی تھی۔ وہ شہلا اور شہناز کو اس واقعے کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ بیس منٹ تک انہیں غلطیوں اور ان کے نتائج پر لیکچر دیتا رہا۔ نذیر نے اس کی آواز پر اپنی سماعت کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز جیسے براہِ راست اس کے دماغ میں گھسی جارہی تھی۔ اس کے اندر غصے کا آتش فشاں اُبلنے لگا۔ ایسا غصہ اسے پہلے کبھی نہیں آیا تھا..... سوائے اس وقت کے جب اس کی بچی مری تھی۔ وہ بیڈ کی پٹی پر بیٹھا پوری جان سے لرزتا رہا لیکن وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے غصہ پینا ہی تھا۔

O☆O

جمیل الرحمٰن نے سیکریٹری مسز جعفری کو اپنے کمرے میں یہ کہہ کر بُلایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کافی پیے۔ اب وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ پائپ کے کش لیے جارہا تھا۔

"مجھے کافی کی دعوت دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسروں کی ٹوہ لینے کی فکر میں ہیں۔" مسز جعفری نے کہا۔

"خیر..... میں اتنا مطلبی بھی نہیں ہوں۔" جمیل الرحمٰن نے کہا۔ "بہرکیف میں کمال اور صوفیہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

مسز جعفری ہنسنے لگیں۔ "دیکھا آپ نے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ بتائیں' آپ ان میں سے کس کا نقطۂ نظر جاننا چاہتے ہیں؟"

"کمال سے تو میں بات کرچکا ہوں۔ صوفیہ کی سناؤ۔"

"صوفیہ بہت پریشان تھی۔" مسز جعفری نے بتایا۔ "اس کا خیال تھا کہ کمال گاؤں کی بات صرف اس سے شادی سے بچنے کے

لیے کر رہا ہے مگر اب صورتِ حال کچھ بدل گئی ہے۔ صوفیہ نے اپنی دانست میں کمال کو وائس پرنسپل کا عہدہ قبول کرنے اور گاؤں سے دستبردار ہونے پر آمادہ کرلیا ہے۔ اس کا پروگرام موسمِ گرما کی چھٹیوں میں شادی کرکے ہنی مون کے لیے یورپ جانے کا ہے....."

"میرے لیے یہ بڑی خوشخبری ہے۔"

"لیکن صوفیہ اتنی خوش ہے کہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ کمال بہت پریشان ہے۔ وہ خوش نظر نہیں آتا حالانکہ اسے خوش ہونا چاہیے۔"

"اپنے کسی خواب سے دستبرداری پر مجبور ہونے والے کا ردِعمل یہی ہوسکتا ہے۔" جمیل صاحب بولے۔

"ممکن ہے۔ لیکن اس کے انداز سے نہیں لگتا کہ وہ دستبردار ہوگیا ہے۔ مجھے تو اس وقت تک اس شادی کا یقین نہیں آئے گا جب تک یہ شادی ہو نہیں جاتی۔" مسز جعفری نے کہا۔ "اور ایک مشورہ میں آپ کو بھی دوں گی۔ اپ ان لوگوں کی اتنی زیادہ فکر نہ کریں۔ نیچرز آتے جاتے رہتے ہیں۔ متبادل مل جاتے ہیں۔ آپ پُرسکون رہنے کی عادت ڈالیں ورنہ بیمار ہوجائیں گے۔"

"شکریہ مسز جعفری۔"

"نہیں۔ آپ واقعی بہت پریشان ہوتے ہیں۔" مسز جعفری نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا.... اب میں چلتی ہوں۔"

○☆○

گھنٹی بجی تو کمال اپنا لنچ باکس خالی کرکے رکھنے کے بعد اپنی کلاس میں چلا آیا۔ اس کی صبح کی کلاسیں بہت اچھی رہی تھیں۔ طلبا تعاون کے موڈ میں تھے۔ شور شرابا بالکل نہیں ہوا تھا۔ خود کمال کا موڈ بھی بہت اچھا تھا۔ لیکچر دینے کے لیے وہ بہت مناسب دن تھا۔

تمام طلبا اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو کمال نے کہا۔ "اب تک ہم جنگ پر جو کہ احتجاج کی انتہائی شکل ہے، کئی ناول پڑھ چکے ہیں۔ اب میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ جنگ کیا ہے؟"

کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ کمال تحمل سے انتظار کرتا رہا بالآخر نازیہ توقیر نے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی۔ تین سال پہلے وہ فربہ اندام بچی تھی مگر اس عرصے میں اس کا مٹاپا چھٹ گیا تھا..... اور اب وہ بچی بھی نہیں تھی۔ بلکہ بہت حسین، نوخیز لڑکی کا روپ دھار گئی تھی۔ وہ ذہین بھی تھی۔ ذہانت ایک ایسا وصف تھا جسے کمال خوبصورتی پر فوقیت دیتا آیا تھا۔

"آپ وضاحت کریں....." وہ بولی۔

"میں نے جان بوجھ کر اس سوال میں ابہام چھوڑا تھا۔" کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس طرح اس سوال کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگیا ہے۔"

"میرے خیال میں بنیادی طور پر جنگ دو یا دو سے زیادہ فریقوں کے آپس میں لڑنے کا نام ہے۔" نازیہ نے جواب دیا۔

"جواب معقول ہے۔ اب کوئی مجھے جنگ کی وجوہات بھی بتائے۔"

علی نے بلند آواز میں کہا۔ "یہ رنگ کی بنیاد پر بھی ہوتی ہے۔ کالے گوروں کے جھگڑے عام ہیں۔"

"اور زیادہ معقول وجوہات بھی ہیں۔" کمال نے کہا۔

"آپ کو میری بات کبھی معقول نہیں لگتی؟" علی نے شکایت کی۔

"یہ بات نہیں۔ امریکا میں رنگ کی بنیاد پر بدترین بلوے ہوئے ہیں لیکن لوگ اور بنیادوں پر بھی تو ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں۔"

"اس کی بنیاد کوئی ایسی چیز بھی ہوسکتی ہے جس کی خواہش دونوں فریقوں کو ہو۔" نازیہ بولی۔

"اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے ذیشان؟"

ذیشان کھڑکی سے باہر کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل متوجہ نہیں تھا۔ گڑبڑا کر بولا۔ "کس بارے میں سر؟"

"ان طلبا کے بارے میں جن کی توجہ پڑھائی پر نہیں ہوتی۔"

"ان کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں ہے سر۔" ذیشان نے جواب دیا۔ اس پر ساری کلاس میں قہقہے لگے۔

خاموشی ہوئی تو کمال نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ، جنگ کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔"

"لالچ بھی ہوسکتا ہے۔" ذیشان نے کہا۔ "مثلاً ملکوں کے درمیان سرحد پر بھی جنگ ہوتی ہے۔ کوئی ملک دوسرے ملک کے علاقے پر قابض ہونا چاہتا ہے۔"

"گڈ۔ یعنی زمین، دولت، وسائل والے علاقے..... یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لیے دو فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوسکتی ہیں۔" کمال نے کہا۔ "اور اختلافات بھی ہوتے ہیں جو تنازعات کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔"

عذرا نے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ بہت شرمیلی لڑکی تھی۔ "یہ بھی تو ہوتا ہے سر کہ کسی ملک کو اپنے توسیع پسند پڑوسی کی تھوپی ہوئی جارحیت کے خلاف اپنا دفاع کرنا پڑے۔"

"یہ بھی درست ہے۔ اکثر مدافعانہ جنگیں بھی لڑی جاتی ہیں۔" کمال نے تبصرہ کیا۔

"نظریاتی اور عقائد کا اختلاف بھی جنگوں کا سبب ہوتا ہے۔" یہ رئیس کی آواز تھی۔

"ہاں، ہوتا ہے۔ اس کے لیے صلیبی جنگوں کی مثال دی جاسکتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ نہیں تھا۔ تمہارا دھیان جنگ بدر اور احد کی طرف بھی نہیں گیا ہوگا۔ اس لیے مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس کے لیے کیا مثال دو گے؟"

"سرمایہ داروں اور کمیونسٹوں کی جنگ کی۔" رئیس نے کہا۔

"اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جنگ دو قوموں کے درمیان ہی ہو۔

جنگ مختلف اور متصادم آئیڈیالوجی رکھنے والے دو گروہوں کے درمیان بھی ہوتی ہے۔ جیسے شمالی اور جنوبی ویت نام....."

"یا جیسے کفر و ایمان کی جنگ۔" کمال نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایمان فتح یاب ہوا ورنہ آج دنیا میں صاحبِ ایمان لوگ موجود نہ ہوتے۔"

"ہم میں سے چند کی خوش قسمتی ہے کہ ویت نام میں بہتر آئیڈیالوجی ....والوں نے جنگ جیتی۔" رئیس نے کمال کی سنی اَن سنی کر کے کہا۔ "اس لیے کہ وہاں سرمایہ داری کو شکست ہوئی۔"

"تم جس معاشرے میں رہتے ہو رئیس' وہاں کمیونزم کی کوئی گنجائش نہیں....."

"میں جانتا ہوں۔ یہاں نام اسلام کا چلتا ہے مگر حکومت سرمایہ داری کی ہے....." رئیس نے کہا۔ "یہاں امریکا کے آشیرواد کے بغیر حکومتیں نہیں چلتیں۔"

"یہ کمیونسٹ معاشرہ ہوتا تو تمہیں اتنا بولنے کی اجازت بھی نہ ہوتی۔" کمال کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ رئیس کا باپ اسی امریکا نواز حکومت کا وزیرِ داخلہ ہے لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ وہ ڈرتا نہیں تھا لیکن اس کے خیال میں اخلاقاً یہ رکیک حملہ ہوتا۔

"آپ تو اب بھی نہیں چاہتے کہ میں بولوں۔"

"نہیں۔ میں تم سے بولنے کا حق نہیں چھینوں گا۔"

"آپ کو اس کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ حق تو ہمارا معاشرہ اور حکومت پہلے ہی چھین چکے ہیں۔ یہ طے کر لیا گیا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ تبادلۂ خیال کی..... اختلاف کرنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ گھر میں ہر بات پر کہا جاتا ہے..... ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹے۔"

"اب گھر کا تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں بہرحال کلاس میں طلبا کو تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے اختلاف کا حق دیتا ہوں لیکن یاد رکھو! ہر معاشرہ اپنے تشخص کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اپنی بقا کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں افراد پر کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔"

"ہاں۔ معاشرہ جھوٹ اور کرپشن کے سارے شخصی آزادی کو غصب کر کے اپنی بقا کا اہتمام کرتا ہے۔" رئیس نے تند لہجے میں کہا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں شخصی آزادی کا حوالہ دینے کا حق حاصل ہے۔" کمال نے نرم لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اس لیے کہ آنجہانی روس کی اور تمام کمیونسٹ ممالک کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ وہاں شخصی آزادی کا تصور ہی نہیں تھا۔"

"میں اپنے معاشرے کی بات کر رہا ہوں۔"

"معاشرہ افراد سے بنتا ہے اور کوئی انسان خامیوں سے مبرا نہیں۔ لہٰذا معاشرہ بھی خرابیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ افراد اپنی اصلاح کر لیں تو معاشرہ خود برائیوں سے پاک ہو جائے گا۔ اب بولو' میں اپنی بات آگے بڑھاؤں؟"

"میں آپ کو روک تو نہیں سکتا۔"

کمال اس بحث کو جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ "بہت سے عظیم مصنفوں نے اپنے جنگ کے تجربات کو ادب میں پیش کیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم ان کے حوالوں سے انسانی رویّوں کی اسٹڈی میں مدد حاصل کرتے ہیں۔"

"لیکن مغرب کے حوالے میں ہی....." رئیس نے پھر مداخلت کی۔

"دکھوں' تکلیفوں اور مصائب پر انسانی ردِ عمل کو مشرق اور مغرب میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ آنسو مغرب میں مشرق سے مختلف نہیں ہوتے اور تمہیں جنگ کا تجربہ نہیں ہے اس لیے تمہیں دوسروں کے حوالوں سے سیکھنا اور سمجھنا ہو گا۔"

"یہ بات آپ میرے اور سب کے لیے نہیں' صرف اپنے لیے کہیں۔"

"تمہیں اپنی رائے قائم کرنے کا حق ہے۔"

"کاش آپ کبھی مجھے اس کے اظہار کا موقع بھی دیں۔"

کمال نے اس بار اسے نظرانداز کر دیا۔ "میں اب جو کچھ کہنے والا ہوں' میرا خیال ہے اس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکے گا۔" اس نے کہا۔ "اپنی ضرورتوں کے تحت صدیوں سے ایک دوسرے سے نبرد آزما... قومیں اب مفاہمت کے ذریعے اپنے اختلافات طے

فلم اور ٹی وی سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے

پُراسرار اداکارہ روحی بانو کی سرگزشت

آوارۂ منزل

نفسیات کے علم سے نفسیاتی عوارض تک
ایک دلچسپ کتھا
فلم' ٹی وی اور اسٹیج پر اداکاری کے دوران ہونے والی
بدحواسیوں اور شادیوں کی روداد

دادا

عظیم ہدایتکار نذرالاسلام کی زندگی کے چند پوشیدہ گوشے

ماہنامہ سرگزشت مارچ ۹۴ کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

کر رہی ہیں۔ وہ ایک مشترکہ مفاد کے تحت ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں۔ وہ مشترکہ مفاد ہے بقا۔ جیو اور جینے دو۔ اس لیے کہ اب جنگ دنیا کو فنا کے غار میں دھکیل سکتی ہے اور مشترکہ مفاد ہے ایک دوسرے سے تجارت اور اپنی اپنی خوش حالی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگ کے خطرات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ امن کے امکانات روشن ہوتے جا رہے ہیں۔"

"لیکن نظریاتی اختلافات پر سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔" رئیس نے کہا۔

"ہر چیز پر سمجھوتا ممکن ہے۔" کمال بولا۔ "اب امریکا اور روس کو ہی دیکھ لو....."

"سب دکھاوا ہے۔ آخر میں دیکھیے گا....."

"یہی رویّہ تو جنگ کی طرف لے جاتا ہے۔"

"اور سمجھوتے معاشرے کو اخلاقی اعتبار سے کمزور کر دیتے ہیں۔"

"تم اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرتے ہو۔"

"یہ بات آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ یہ باتیں نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی ذاتی طور پر تو آپ جنگ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔"

کمال ہچکچایا۔ اسے اس موضوع کی طرف گھسیٹا جا رہا تھا جس پر وہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ چپ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ "میں ایک جنگ لڑ چکا ہوں اور جنگ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔"

"ہاں۔ اے ۔ میں شاید آپ فوج میں کلرکی کر رہے ہوں گے۔"

اب پیچھے ہٹنا کمال کے لیے ناممکن تھا۔ پوری کلاس کا تجسس بھڑک اُٹھا تھا۔ "نہیں۔ میں نے عملی طور پر جنگ میں حصہ لیا تھا۔" اس نے کہا۔

"آپ نے دشمن کے کسی فوجی کو مارا بھی تھا؟" یہ سوال نازیہ نے کیا تھا۔

"میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کس طرح کے فوجی تھے۔" رئیس نے حقارت سے کہا۔

"میں نے موت اور تباہی و بربادی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔" کمال کا لہجہ مدافعانہ ہو گیا۔ "اور جنگ میں لوگ ایک دوسرے کو مارتے ہیں لیکن کسی کاز کے لیے۔ اس میں ذاتیات کا دخل نہیں ہوتا۔ میں وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔"

"آپ لوگوں نے مشرقی پاکستان ہار دیا....." رئیس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"وہ فوج کا نہیں، اقتدار کے بھوکے سیاستداں اور ایک جنرل کا کیا دھرا تھا۔ فوج تو خواہ مخواہ رسوا ہوئی۔" کمال نے تند لہجے میں کہا۔

"تب تو آپ جنگی قیدی بھی رہے ہوں گے؟"

"ہاں۔ لیکن میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا....."

"ظاہر ہے۔ وہ تو آپ کی بزدلی کا ثبوت ہوا نا....."

کمال کا جی چاہا کہ اس پر برس پڑے۔ اسے بے نقط سنا ڈالے۔ وہ حد سے گزر گیا تھا لیکن اس نے جیسے تیسے خود کو قابو میں رکھا۔ "تم لوگ کتابیں کھولو اور پڑھنا شروع کر دو۔ مجھے اور رئیس کو باہر ہال میں جا کر کچھ تبادلۂ خیال کرنا ہے۔"

وہ اور رئیس دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے۔ کمال دروازے سے قریب ہی رہا تاکہ کلاس کی آوازیں بھی سُن سکے۔

"دیکھو رئیس! ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم جانتے ہو کہ مجھے معقولیت سے بحث کرنا اچھا لگتا ہے لیکن نامعقولیت مجھے پسند نہیں۔ تم مجھے بتاؤ، تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

"مجھے بچّوں کی طرح پڑھایا جانا پسند نہیں۔ آپ ہمیں دنیا کی تصویر اپنی آنکھوں سے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری بات نہیں سُنی جاتی۔"

کمال مسکرا دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم نے یہ تاثر لیا لیکن میں تمہیں دنیا کی تصویر دوسرے بڑے لوگوں، بڑے مصنفوں کی آنکھوں سے دکھانے کی کوشش کرتا ہوں اور حوالے بھی دیتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنے نظریات تم پر نہیں تھوپے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ممکن ہے ایسا ہو لیکن غیر ارادی طور پر ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔"

"آج آپ معذرت کریں گے اور کل پھر یہی کریں گے۔"

کمال سناٹے میں آگیا۔ یہ مغرب کے طرزِ تعلیم کی خرابیوں میں سے ایک تھی۔ کوئی عام اسکول ہوتا تو یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو کچھ اساتذہ طلبا سے کہتے تھے، یہاں ایک طالبِ علم اپنے استاد سے کہہ رہا تھا۔ یہاں طلبا کو خود اعتمادی دی جاتی تھی۔ یہ نہیں سوچا جاتا تھا کہ خود اعتمادی اور بدتمیزی کے درمیان حدِّ فاصل بھی مقرر ہونی چاہیے۔ بہرحال اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوا تو تم مجھے یاد دلا دو گے۔ اب ہمارے درمیان جنگ بندی ہو جانی چاہیے تاکہ دوسرے طلبا کی پڑھائی کا نقصان نہ ہو۔"

رئیس کو اپنے ٹیچر کی نرمی کے ہاتھوں شکست کا احساس ہو رہا تھا اور شکست اسے قبول نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ مجھے ناپسند اس لیے کرتے ہیں کہ میں آپ کی یکطرفہ گفتگو میں مداخلت کرتا ہوں۔"

"یہ تمہارا نقطۂ نظر ہے۔ اب تم اپنے بارے میں میری رائے بھی سن لو۔" کمال نے کہا۔ "بنیادی طور پر تم اچھے لڑکے ہو لیکن تم اس کو چھپانے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہو۔ تم بال بڑھاتے ہو، میلے کپڑے پہنتے ہو اور تم ذہین ہو۔ بلکہ شاید تم میری کلاس کے ذہین ترین طلبا میں سے ہو لیکن تم دوسروں پر اپنی اصل شخصیت ظاہر کرنے سے ڈرتے ہو۔ مگر تمہیں دوسروں کی توجہ چاہیے۔ اس کے

لیے تم کپڑوں سے بے پروائی کرتے ہو۔ کلاس میں تند و تیز بحث کرتے ہو۔ رئیس..... ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ انسان ہو۔ دوسروں کو خود کو پسند کرنے کا موقع بھی دو۔"

رئیس کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔ وہ ہکلانے لگا۔ "آپ نے..... میری کوئی بات..... نہیں سُنی۔ سب نیچر ایک..... جیسے ہوتے ہیں۔"

اس سے اور کچھ نہیں کہا گیا۔ وہ تیز قدموں سے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ کمال اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنا فرض پورا کردیا تھا۔ اس نے رئیس کو آئینہ دکھادیا تھا۔ اب وہ حقیقت تسلیم کرے نہ کرے۔ وہ جانے۔

وہ پلٹا اور دروازہ کھول کر کلاس روم میں چلا گیا۔

○☆○

بابر فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں اسلحے کا ڈھیر جمع کیے بیٹھا تھا۔ سب لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ "میں اب تم لوگوں میں اسلحہ تقسیم کروں گا۔" اس نے کہا۔ "تم میں سے ہر ایک کے پاس ایک رائفل اور ایک ہینڈ گن ہوگی۔ انہیں ہر وقت اپنے پاس رکھنا۔ ہر گن لوڈ ہے اور سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے۔ اسے ہٹا ہی رہنے دینا۔ میرے پاس تم لوگوں کے لیے ایمونیشن بیلٹس بھی ہیں۔ میرے اور مشکور کے پاس شاٹ گنیں ہوں گی۔ تم لوگوں کو رائفلوں کے لیے دو فاضل کلپ ملیں گے۔ میں نے اتنی مشق کرادی ہے کہ یقین ہے' کلپ تبدیل کرنے میں تم لوگوں سے غلطی نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ تم میں سے ہر ایک کو تین دستی بم دیے جائیں گے۔" اس نے فرش پر رکھے ہوئے صندوق میں ہاتھ ڈالا اور ایک دستی بم نکالا۔ "یہ تمہاری ایمونیشن بیلٹ سے کلپ ہوں گے۔ ان کا استعمال بھی تمہیں آتا ہے۔ رِنگ کھینچو گے تو بم تیار۔ بس پھر ہینڈل ریلیز کرنا اور انہیں اُچھال دینا ہوگا۔ اس کے لیے تمہارے پاس دس سیکنڈ کی مہلت ہوگی۔ بم پھینک کر خود زمین پر لیٹ جانا۔ کسی کو کچھ پوچھنا ہے؟"

شہلا نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ "ہمیں ان چیزوں کو استعمال کب کرنا ہوگا؟"

"یہ تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ جب کوئی اور چارہ نہ رہے تب یہ کام آئیں گے۔" بابر نے کہا اور اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "اب ہماری روانگی میں ایک گھنٹا ہے۔ یہاں سے ہر سراغ مٹا کر نکلنا ہے۔ یہاں ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑنی جس سے پولیس کو مدد مل سکے۔ جو کچھ جلایا جاسکتا ہے اسے جلا ڈالو۔ کپڑوں سے لیبل ہٹادو۔ کوئی سراغ نہیں چھوڑنا ہے....."

وہ پندرہ منٹ تک بولتا رہا۔ اس کی آواز ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پُرجوش ہوتی گئی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ نذیر نے خود کو ٹٹولا لیکن اس کے اندر کوئی جذبہ نہیں تھا۔ بابر بولے جارہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ یہ محض آغاز ہے۔ اس کے پاس مختلف جیلوں میں موجود سزا کاٹنے والے پچاس مجرموں کے نام ہیں۔ اس پہلی کامیابی کے بعد یہ تمام لوگ مل کر درجنوں یونٹ بنائیں گے۔ ایک سال کے اندر اندر وہ کسی حکومت کی طرح منظم اور مستحکم ہوجائیں گے۔ کراچی سے پشاور تک یونٹوں کا جال بچھ جائے گا۔ یونٹ ایک جگہ کارروائی کرکے دوسری جگہ پہنچ جائیں گے۔ کارروائیوں کا لامتناہی سلسلہ ہوگا اور دولت کا انبار ہوگا۔ ملک کے خزانے میں اتنی دولت نہیں ہوگی جتنی اس تنظیم کے پاس ہوگی۔ ان کی ٹیکنک ہوگی۔ ہٹ اینڈ موو۔ وار کرو اور نو دو گیارہ ہوجاؤ۔ یہ یونٹ بس چار پانچ کارروائیاں کرے گا۔ پھر اس کے اراکین کی حیثیت ملکی کابینہ کی سی ہوگی۔ پھر وہ ملک سے باہر بھی یونٹ بنائیں گے۔ اپنا دائرہ وسیع کریں گے..... اور بالآخر پوری دنیا پر چھا جائیں گے.....

نذیر کو بابر کی آنکھوں میں جانی پہچانی چمک نظر آئی۔ جیسے وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہا ہو مگر اس بار نذیر نے بابر کی گفتگو سے ہپناٹائز ہونے سے انکار کردیا۔ اس نے اس کے لفظوں کو نظرانداز کردیا اور اپنی توجہ اس کے چہرے اور آنکھوں پر مرکوز کردی۔ وہ خاص طور پر اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں چمک تھی لیکن ریاکاری بھی تھی۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا کہ نذیر کو بابر کی سچائی اور خلوص پر شبہ ہوا ہو۔ کبھی کوئی اتفاقی نظر یا لہجے میں آنے والی تبدیلی لفظوں سے کہیں بڑھ کر کچھ بتا دیتی ہے۔ بابر جب کسی کو اذیت سے دوچار کرنے والا ہوتا تھا یا کسی اور کو ایسا کوئی کام تفویض کرتا تھا تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی اور اس وقت وہ غیر محتاط بھی ہوجاتا تھا۔ نذیر جانتا تھا کہ بابر گھٹیا اور بے رحم آدمی ہے..... اور یہی نہیں' وہ اپنے گھٹیا پن اور بے رحمی سے خوشی بھی حاصل کرتا ہے۔

وہ فلیٹ سے سب کچھ صاف کرکے نکلے۔ نذیر نے یونٹ کو اتنا طاقت ور کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے ایمونیشن بیلٹس باندھی ہوئی تھیں اور بیلٹ سے دستی بم یوں لٹک رہے تھے جیسے درخت کی شاخ پر پکے ہوئے پھل۔ بابر اور مشکور کی شاٹ گنیں ان کی گود میں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سب ایک جیسے لباس میں تھے۔ جینز' خاکی شرٹس اور پیراشوٹ جیکٹس۔ سروں پر موزوں کی ٹوپیاں اور بڑے دھوپ کے چشمے بابر کا اختراعی اضافہ تھے۔ نذیر نے حیرت سے دیکھا۔ اب وہ سب بالکل ایک سے لگ رہے تھے۔ کسی کی کوئی شناخت نہیں رہی تھی۔ بس فرق تھا تو صرف قدوقامت اور جسامت کا۔ نذیر کو تحفظ کا بھرپور احساس ہونے لگا۔

وہ سب چرائی ہوئی اسٹیشن ویگن میں تھے۔ کار وہ راولپنڈی میں ہی چھوڑ آئے تھے۔

○☆○

آہٹ محسوس کرکے کمال نے لیکچر دیتے دیتے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دروازے میں ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی جس کا

رخ اس کے پیٹ کی طرف تھا۔ اس کا پہلا ردِ عمل حیرت کا تھا۔ پھر اس نے سوچا، کہیں یہ رئیس سے گزشتہ روز کی گفتگو کا نتیجہ تو نہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ مذاق ہے۔ لیکن اسے کسی نتیجے پر پہنچنے کا موقع نہ مل سکا۔

"مسٹر کمال، اگر آپ اپنی کرسی پر جا بیٹھیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ ہم کچھ عرصے کے لیے آپ کی کلاس روم مستعار لے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے آپ اور آپ کے طلبا کلاس روم میں شامل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب پُرسکون اور خاموش رہیں۔ خاموش بیٹھنے کے سوا آپ کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ ہم آپ سے تہذیب اور تعاون کے متمنی ہیں لیکن آپ کی طرف سے مزاحمت یا کوئی متشددانہ کارروائی ہوئی تو آپ اس کے لیے ہمیں تیار پائیں گے۔ اب آپ تشریف رکھیے۔"

کمال کو وہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ تاہم وہ بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ پوری کلاس پر سکتہ طاری ہے۔ شاٹ گن نے انہیں دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا ہنسنے کو جی چاہا لیکن اس وقت تک اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ سب کچھ مذاق نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ کسی اعتبار سے بھی حقیقت نہیں لگتا تھا۔ اس مداخلت کار کے چہرے پر واحد قابلِ شناخت نقوش اس کے پتلے پتلے ہونٹ تھے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

اسی وقت آگ کے خطرے والا الارم چلانے لگا۔ کمال بری طرح چونکا۔

"آپ سب بیٹھے رہیں۔" شاٹ گن بردار نے کہا۔ "یہ الارم آپ کے لیے نہیں ہے۔"

○☆○

نذیر نے آگ کے خطرے والا الارم کھینچا اور منتظر رہا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا ہے۔ وہ وین کو اسکول کے مشرقی دروازے سے لے کر احاطے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنا تمام سامان اور خوراک کا ذخیرہ نیچے اُتارا۔ پھر مشکور تیسری منزل پر جانے کے لیے زینوں کی طرف چل دیا۔ نذیر نے وین پارک کردی۔ مشکور نے آکر اطلاع دی کہ میدان صاف ہے تو وہ چاروں سامان اُٹھا کر تیسری منزل کے فیکلٹی روم کی طرف چل دیے جو سنسان پڑا تھا۔ فیکلٹی روم پر قبضہ کرتے ہی بابر کوریڈور میں نکلا اور آخری کلاس روم میں داخل ہو گیا۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا تھا۔

بابر کے جانے کے دو منٹ بعد نذیر نے سر باہر نکال کر جائزہ لیا اور پھر قریبی فائر الارم کا لیور کھینچ دیا۔ پھر وہ تماشا دیکھتا رہا۔ کلاسوں سے گھبرائے ہوئے طلبا اور ٹیچر نکلے اور زینوں پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سب بیک وقت باہر نکلنا چاہ رہے تھے۔ اس معاملے میں بھی بابر کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ چند منٹ کے اندر کلاسوں کی روشنیاں بجھ گئیں اور تمام طلبا باہر نکل گئے۔ جیسے ہی وہ منزل خالی ہوئی، نذیر نے باہر نکل کر چیک کیا کہ تمام کلاسیں خالی ہو چکی ہیں یا نہیں۔ پھر واپس آکر اس نے رپورٹ دی۔

"اب ایک ایک بیگ لو اور اسے ہر زینے پر تین سیڑھیاں نیچے رکھ دو۔" نذیر نے ہدایت دی۔ یہ ہدایت اسے بابر سے ملی تھی۔ "بیگ رکھنے کے بعد چیک کرلینا کہ ریڈیو آن ہے یا نہیں۔ ریڈیو آن ہونا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ خود درمیانی زینوں کی طرف چل دیا۔ بم کا بیگ چوتھی سیڑھی پر رکھتے ہوئے اسے قریب ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو ایک نوجوان عورت کو سامنے کھڑا پایا۔ "کیا بات ہے؟ کیا چاہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں کمال کو لینے کے لیے واپس آئی ہوں۔" عورت بولی۔

نذیر ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس نے عورت پر رائفل تان لی۔

"کون کمال؟"

"کمرا نمبر ۲۱ کا ٹیچر۔"

"وہ تو نیچے نہیں آسکتا لیکن میرا خیال ہے تم اوپر آجاؤ۔"

صوفیہ پیچھے ہٹنے لگی۔ "نہیں....."

"سنو۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ میں تم پر گولی نہیں چلانا چاہتا۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو مگر مجھے اس میں ملوث مت کرو۔"

"بہتر یہی ہے کہ اوپر آجاؤ۔ تم نہ چاہتے ہوئے بھی ملوث ہو چکی ہو۔"

"مجھے جانے دو....."

"اب تم اوپر آجاؤ محترمہ۔ ورنہ میرے ہاتھوں ضائع ہو جاؤ گی۔"

صوفیہ پلٹی اور سیڑھیوں پر نیچے کی طرف بھاگی۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزری ہیں۔ وہ خوف سے اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ نذیر نے آکر اسے بازو سے تھاما اور گھسیٹتا ہوا اوپر لے چلا۔ اب صوفیہ میں مزاحمت کی طاقت نہیں تھی۔ اوپر پہنچ کر اس نے شہلا کو پکارا۔ "شہلا، یہاں آؤ۔ اسے کلاس میں لے جاؤ اور دوسروں کے ساتھ جمع کرادو۔"

شہلا فیکلٹی روم سے نکلی۔ اس نے رائفل سے صوفیہ کو کور کرلیا۔ "اسے کیوں دھر لیا ہے تم نے؟" اس نے پوچھا۔

"میری مرضی۔ بس اسے لے جاؤ۔" نذیر نے کہا اور صوفیہ کو شہلا کی طرف دھکیل دیا۔

شہلا صوفیہ کو لے کر آخری کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔ نذیر فیکلٹی روم میں چلا گیا۔ مشکور اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اسے فائرنگ کی آوازوں سے تشویش ہوئی تھی۔

"مشکور..... یہ زنجیر لے جاؤ اور بم کے بیگ کو اس طرف کونے والے زینوں کی ریلنگ سے باندھ دو۔" نذیر نے کہا۔ "ذرا ڈھنگ

سے باندھنا۔ یہ نہ ہو کہ کوئی آئے اور بیگ کھول کر چلتا بنے۔"

○☆○

پرنسپل جمیل الرحمان نے اپنے کمرے میں فائر الارم کی آواز سنی تو وہ چونک کر اُٹھا۔ اس نے سوچا' پھر کسی بچے نے شرارت کر ڈالی ہے۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ کوئی الارم بجا دیتا اور تمام کلاسیں باہر گراؤنڈ میں پہنچ جاتیں۔ اس کے تدارک کی کوئی تدبیر اسے آج تک نہیں سوجھی تھی۔ وہ بیرونی آفس میں آیا تو شیشے کی دیوار سے اسے پندرہ سو طلبا کا ہجوم نظر آیا۔ "میں آل کلیئر کا الارم بجادوں؟" سکریٹری مسز جعفری نے اس سے پوچھا۔

"رہنے دو۔ میں جاکر الارم چیک کروں گا اور اسے آف کردوں گا۔" جمیل الرحمان نے کہا۔

وہ باہر کاریڈور میں نکل آیا اور الارم چیک کیے۔ مخالف سمت سے اسے پی ٹی آئی مظفر خان آتا نظر آیا۔ "طلبا تو سب نکل آئے ہیں۔" مظفر خان نے کہا "تیسری منزل کا الارم ہوگا۔ کیونکہ ستار صاحب نے باہر آتے ہوئے دوسری منزل کے تمام الارم چیک کرلیے تھے۔"

وہ دونوں کونے والے زینوں کی طرف چل دیے۔ "آج دن کا آغاز بہت اچھا ہوا تھا۔" جمیل الرحمان نے کہا۔ "ہر طرف سکون تھا۔ کلاسوں میں حاضری بہت اچھی تھی۔ پارکنگ لاٹ میں چھپ کر سگریٹ پیتا ہوا بھی کوئی نظر نہیں آیا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ سکون قائم رہنے والا نہیں۔" وہ تیسری منزل کی لینڈنگ سے مڑے۔ جمیل الرحمان کے منہ سے نکلا۔ "خدا کی پناہ!" مشکور کی شاٹ گن اس کے چہرے سے بمشکل چند انچ دور تھی۔

"رک جاؤ... اور واپس چلے جاؤ۔" مشکور غرایا۔ "ورنہ تمہارا بھیجا اُڑا دوں گا۔"

"یہ ہو کیا رہا ہے؟" مظفر خان تیزی سے آگے بڑھا۔

"پیچھے ہٹو۔"

جمیل الرحمان کے لیے اتنا کافی تھا۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی سنگین نوعیت کی گڑبڑ ہے اور وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔ بے بس ہیں۔ وہ پیچھے ہٹنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیا چکر ہے لیکن میں پیچھے ہٹنے والا نہیں۔" مظفر خان نے کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر مشکور کی طرف بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو..." جمیل الرحمان نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن مظفر خان نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ صرف تین سیڑھیاں چڑھا تھا کہ کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور وہ نیچے لینڈنگ پر آگرا۔ جمیل الرحمان پہلے ہی پلٹ کر شاٹ گن کی رینج سے دور سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ وہ تیسری منزل سے پلٹا ہی تھا کہ اس کے سر کے اوپر دیوار سے گولیاں ٹکرائیں۔ دیوار سے پلاسٹر اُدھڑا اور اس کے چہرے سے ٹکرایا۔

وہ اپنے آفس میں داخل ہوا تب بھی بھاگ رہا تھا۔ "پولیس کا فون نمبر ملاؤ۔" اس نے ہانپتے ہوئے مسز جعفری سے کہا۔

مسز جعفری نے دہشت بھری نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ "ارے... آپ تو خونا خون ہو رہے ہیں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم نمبر ملاؤ۔" جمیل الرحمان نے دیوار سے ٹیک لگا کر اپنے جسم کے لرزے پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن خوف کی ایک لہر نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ مسز جعفری نے ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔ اس وقت تک بھی وہ خود پر قابو نہیں پاسکا تھا۔

"میں پائن ووڈ کانونٹ اسکول کا پرنسپل بول رہا ہوں۔ جمیل الرحمان۔" اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "یہاں اسکول میں ایمرجنسی صورتِ حال ہے۔ عمارت کی تیسری منزل پر ایک مسلح آدمی موجود ہے۔ وہ ہمارے ایک ٹیچر کو پہلے ہی شوٹ کرچکا ہے۔ جلدی کریں... پلیز... کچھ کریں۔"

○☆○

مشکور کے دوسرے فائر سے پہلے ہی بابر کمرے سے نکل چکا تھا۔ فائر نذیر نے بھی کیا تھا لیکن بابر کو تشویش نہیں ہوئی تھی۔ نذیر سمجھ دار آدمی تھا لیکن مشکور کی شاٹ گن کی گرج نے اسے وحشت میں مبتلا کردیا۔ وہ جانتا تھا کہ مشکور کچھ بھی کرسکتا ہے۔ مشکور کو تو خون بہا کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ زینوں پر پہنچا تو اس کے اندیشے کی تصدیق ہوگئی۔ لینڈنگ پر جو شخص پڑا تھا' اس کے سینے میں ایک چھوٹی کھڑکی جتنا مہیب خلا نظر آرہا تھا۔ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مرچکا ہے۔ "کیا ہوا؟" اس نے مشکور سے پوچھا۔

"یہ مجھ سے ہاتھاپائی کررہا تھا۔ شاٹ گن چھیننا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے شوٹ کردیا۔" مشکور نے وضاحت کی۔

"اور دوسرا فائر؟"

"اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ وہ بچ نکلا۔" مشکور نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

بابر تیزی سے پلٹا اور فیکلٹی روم کی طرف چل دیا۔ فیکلٹی روم پہنچ کر اس نے انٹرکام اُٹھایا اور بزر دیا۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔ "اپنے پرنسپل سے بات کراؤ۔" پھر وہ انتظار کرتا رہا۔ مردانہ آواز سنتے ہی اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں تنبیہہ کررہا ہوں۔ پولیس کو تیسری منزل سے دور ہی رکھنا۔ ورنہ یہ خون میں نہا جائے گی۔ تمہارے دو ٹیچر اور طلبا کی ایک پوری کلاس ہمارے قبضے میں ہے۔ ذرا سی بھی گڑبڑ ہوئی تو ان کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکے گی۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ہم کس قدر منظم ہیں اور ہماری پوزیشن کتنی مضبوط ہے۔"

ریسیور رکھنے کے بعد وہ باہر نکلا۔ شہلا اور نذیر راہداری میں موجود تھے۔ نذیر نے کہا۔ "میرا تو خیال تھا کہ خون خرابہ ذرا بھی

نہیں ہوگا۔"

"ہم یہاں کرکٹ کھیلنے نہیں آئے ہیں۔ صورتِ حال ہمارے اندازے سے مختلف ہوگی تو خون بھی بہے گا۔" بابر نے تند لہجے میں کہا "تم اس لاش کو لے جاکر دوسری منزل پر ڈال دو۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے اپنے پتے میز پر پھیلانے سے پہلے ہی اسکول پولیس والوں سے بھر جائے گا اور ہاں.... ذرا مجھے ریڈیو دو۔"

شہلا ریڈیو لینے چلی گئی۔ بابر اور نذیر ٹہلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ وہ لاش کو گھسیٹتے ہوئے دوسری منزل پر لے گئے۔ لاش اپنے پیچھے ایک خونی پگڈنڈی بناتی گئی۔ وہ واپس آئے تو شہلا ہاتھ میں ریڈیو لیے کھڑی تھی۔ بابر نے اس سے ریڈیو لیا اور بٹن دبایا۔ "ہیلو شہناز.... میری آواز سُن رہی ہو؟"

○☆○

شہناز اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں کھڑی سڑک پار اسکول کے میدان کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ وہاں کی نقل و حرکت سے صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ طلبا اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ٹیچرز ایک ٹولی بنائے کھڑے تھے۔ اسکول کی عمارت سے کوئی نکل کر آیا اور اس نے ٹیچروں سے کچھ کہا اور واپس چلا گیا۔ ایسا کئی بار ہوا۔ شاید ٹیچروں کے لیے ہدایات آرہی تھیں پھر شہناز کو ایسا لگا کہ اس نے فائر کی آواز سُنی ہے۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ بابر کی کال نے اسے بری طرح چونکا دیا "ہاں.... میں سُن رہی ہوں۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"پولیس یہاں پہنچنے والی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ ہم پر دھاوا بول دیں گے۔ مجھے باخبر رکھنا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ' وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"مشکور نے ایک ٹیچر کو ختم کر دیا ہے۔ وہ ہیرو بننے کی کوشش کر رہا تھا۔" بابر نے بتایا۔ "باقی سب خیریت ہے۔"

"شہلا کا کیا حال ہے؟"

"فرسٹ کلاس۔ اب وہ بہادر ثابت ہو رہی ہے۔" بابر نے جواب دیا اور دل ہی دل میں کہا۔ اب اداکاری کی ضرورت جو نہیں رہی۔ "اور سنو شہناز' تم خاص طور پر چھت پر نظر رکھنا۔ ان کے پاس ہم تک پہنچنے کا وہی ایک راستہ ہے۔"

"ٹھیک ہے بابر۔"

رابطہ منقطع کرکے بابر باہر نکلا اور اس نے تینوں زینوں سے بندھے ہوئے چارجز کو اچھی طرح چیک کیا۔ اب وہ گھبرا رہا تھا۔ اگر سو ڈیڑھ سو پولیس والوں نے دھاوا بول دیا تو ڈائنامائٹ کے تین چارجز اور چند گنیں انہیں نہیں روک سکیں گی۔ "شہلا' تم کلاس روم میں چلی جاؤ اور مشکور کو یہاں بھیج دو۔" اس نے کہا۔ وہ مشکور کے آنے تک مضطربانہ انداز میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا پھر وہ مشکور سے بولا۔ "ہم تینوں کو تینوں زینوں پر نظر رکھنی ہے۔ جھکے رہنا اور کھڑکی سے دور رہنا۔ اگر انہوں نے اوپر آنے کی کوشش کی تو میں چارجز اُڑا دوں گا۔ ایسے میں تم بموں سے دور ہی رہنا۔" اس نے مشکور اور نذیر کو غور سے دیکھا۔ "میں درمیانی سیڑھیاں سنبھالوں گا۔ تاکہ ٹیکٹی روم اور فون سے قریب رہوں۔ بس اب جاؤ۔"

○☆○

کمال سناٹے کے سے عالم میں اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ اس کے تمام طلبا بھی خاموش تھے۔ یوں بُت بنے بیٹھے تھے' جیسے ابد کا حصہ بن گئے ہوں۔ کمال اٹھنا.... صوفیہ کے پاس جانا چاہتا تھا' جو کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی لیکن وہ خواہش اور کوشش کے باوجود نہ ہل سکا۔ دروازے کے باہر ایک ہیولا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کمال کو یقین تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ رائفل کی بظاہر کوئی اوقات نہیں تھی۔ وہ انسان کا بنایا ہوا ہتھیار تھی اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی تھی لیکن کمال اس کی ہلاکت خیزی سے آگاہ تھا۔ اس بھری پُری کلاس کے لیے اجنبی ہاتھوں میں اس رائفل کی موجودگی مہلک تھی۔ اسی لیے وقت ٹھہر گیا تھا.... ساکت ہو گیا تھا! کمال کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ چاہے صرف کھڑا ہو جائے' لیکن وہ اس کے بس میں نہیں تھا۔

صوفیہ اچانک پلٹی اور اس کی میز کی طرف آئی۔ اسی لمحے باہر کھڑی عورت بھی اندر چلی آئی۔ صوفیہ نے اس سے کہا۔ "ہمیں بتاؤ تو کہ یہ سب کیا ہے؟"

عورت نے سر اُٹھایا۔ دھوپ کا بڑے فریم کا چشمہ جیسے صوفیہ کو گھورتا رہا پھر وہ بولی۔ "تم لوگ کچھ عرصے یہاں قید رہو گے۔"

"چلو' کچھ نہ بتاؤ۔ ہمیں بات کرنے اور چلنے پھرنے کی اجازت تو دو۔ ہم یہاں غیر معینہ مدت تک یوں پتھر کے بُت بن کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔" صوفیہ نے کہا۔

"تم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر ہاتھ پاؤں کھول سکتے ہو۔" عورت بولی۔ "بات بھی کر سکتے ہو مگر آہستہ آہستہ.... لیکن کسی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میں اسے شوٹ کر دوں گی۔"

کمال بھی سُن رہا تھا۔ عورت کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔ اس نے سوچا' کاش میں اس عورت کی آنکھوں میں دیکھ سکتا۔ یہ جسمانی طور پر تو عورت لگتی ہے لیکن نسوانی نرمی اور جذبوں سے محروم ہے۔ یوں وہ بالکل اندھیرے میں تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا سابقہ کس سے پڑا ہے۔

صوفیہ نے کرسی کھینچی اور کمال کے برابر میں بیٹھ گئی۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ لوگ کیا کر رہے ہیں آخر؟"

کمال کو عجیب سا لگا۔ وہ طلبا کو کلاس میں سرگوشی میں بات کرنے کو منع کرتا تھا لیکن اب خود ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ "میں کیا

بتاؤں۔ بس میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو وہ مسلح شخص دروازے پر کھڑا تھا۔"

"تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کتنے افراد ہیں؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اب تک میں تین مختلف افراد کو دیکھ چکا ہوں۔"

"میں چار کو دیکھ چکی ہوں۔ ایک نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ گولی دو انچ نیچے چلائی گئی ہوتی تو میں اس وقت یہاں موجود نہ ہوتی۔"

"تم کیسے آپھنسیں یہاں؟"

"میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم اپنی کلاس کو لے کر نیچے کیوں نہیں آئے ہو۔"

"کیا باقی سب کلاسیں نیچے پہنچ گئی ہیں؟"

"ہاں۔ پورا اسکول باہر میدان میں جمع ہے۔"

کمال نے پینٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ "پتا نہیں' یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

"پتا نہیں۔ اب تک میں تین فائروں کی آواز سُن چکی ہوں اور جس شخص نے مجھ پر گولی چلائی تھی' میرے خیال میں وہ زینوں کی ریلنگ سے بم باندھ رہا تھا۔" صوفیہ کہتے کہتے رکی پھر بولی۔ "یہ لوگ جو کچھ بھی کر رہے ہیں' اس میں بے حد سنجیدہ ہیں۔ ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جائیں' اتنا ہی بہتر ہے۔"

کمال نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کوئی احمقانہ قدم اُٹھانے سے پہلے ہمیں صورتِ حال کو سمجھنا چاہیے۔"

صوفیہ اور اس کے قریب جھک آئی۔ "ہم کھڑکیوں کے راستے نہیں نکل سکتے؟"

کمال نے کن انکھیوں سے رائفل بردار عورت کو دیکھا۔

"اس رائفل کی موجودگی میں تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

اب کلاس میں آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ لڑکے کھڑے ہونے اور ہاتھ پاؤں کھولنے کی اجازت سے استفادہ کر رہے تھے۔ لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگی تھیں۔ وہ آوازیں ذرا بلند ہوئیں تو رائفل بردار لڑکی مضطرب ہو گئی۔ کمال اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ تاکہ لڑکی کے متشدد ہونے سے پہلے طلبا کو ٹوک سکے لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ دور سے سائرن کی آواز سُنائی دی' جو بڑھتی گئی۔ چند ہی لمحے بعد باہر رکنے والی گاڑیوں کے ٹائر چیخے۔ سائرن خاموش ہو گئے تھے۔ کمال کا اندازہ تھا کہ وہ کم از کم چھ گاڑیاں تھیں۔

گاڑیوں کے رُکنے کے بعد سنگین خاموشی چھا گئی۔ یہ جاننے کے بارے میں کہ چکر کیا ہے؟ کمال کا تجسس اور بڑھ گیا!

○☆○

پرنسپل جمیل الرحمان نے اپنے آفس کے دروازے میں کھڑے ہو کر وہ منظر دیکھا۔ پولیس کی گاڑیاں پارکنگ ایریے میں رُکیں۔ پولیس کے جوان اُچھل کر اُترے اور فوراً ہی انہوں نے گاڑیوں کی اوٹ میں پوزیشن سنبھال لیں۔ جمیل الرحمان کو صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود وہ اچھا خاصا مسخرا پن لگا۔ وہ چند منٹ انتظار کرتا رہا کہ وہ اس کی طرف آئیں گے لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ آسانی سے اپنی پوزیشن چھوڑنے والے نہیں۔ چنانچہ وہ خود قریب ترین پولیس کار کی طرف بڑھ گیا۔

جمیل الرحمان اس طرف سے بھی پریشان تھا۔ یہ ضرور تھا کہ گزشتہ دس سال میں علاقے کی پولیس کو جدید خطوط پر استوار کیا گیا تھا لیکن علاقے میں بس چھوٹے موٹے جرائم ہی ہوتے تھے۔ یا خاندانی دشمنی کی بنیاد پر کوئی قتل ہو جاتا تھا۔ اس کے خیال میں مقامی پولیس ایسی منظم واردات سے نمٹنے کی اہلیت بہرحال نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ اس کا کسی سنگین چیلنج سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جمیل الرحمان خود بھی اس مسخرے پن میں شامل ہو گیا۔ وہ قریبی کار کی اوٹ میں دبکے ہوئے انسپکٹر کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔

"میں انسپکٹر اشفاق ہوں۔" پولیس افسر نے تعارف کرایا۔

"اور میں جمیل الرحمان ہوں... اس اسکول کا پرنسپل۔"

"اب آپ مجھے بتائیں کہ یہاں کی صورت حال کیا ہے؟"

جمیل الرحمان نے تیسری منزل کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں کم از کم دو مسلح افراد موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نے ہمارے پی ٹی آئی کو شوٹ کیا ہے۔ اس نے مجھ پر بھی گولی چلائی تھی۔ اس کے فوراً بعد اس نے تیسری منزل کے فیکلٹی روم سے انٹر کام پر مجھ سے بات کی۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ پولیس کو اسکول کی عمارت سے دور رکھا جائے ورنہ بڑا خون خرابہ ہو گا۔ انہوں نے دو ٹیچرز اور ایک پوری کلاس کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔"

"کون سی کلاس ہے وہ؟"

"تیسری منزل پر کمرا نمبر ۲۱ میں انگریزی کی کلاس ہے۔" جمیل الرحمان نے اشارہ کیا۔

"اور ان لوگوں کے مطالبات کیا ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ انہوں نے بتایا نہیں۔"

انسپکٹر آہ بھر کے رہ گیا۔ "خیر یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا۔ پہلے تو ہمیں دوسرے معاملات کی فکر کرنی ہے۔ یہاں موجود تمام لوگوں کو باہر نکالنا ہے۔ آپ ایسا کریں' تمام لڑکوں کو کرکٹ اسٹیڈیم میں جمع کر لیں پھر انہیں عقبی گیٹ سے نکالا جائے۔"

"بہت بہتر یہ کام ہو جائے گا۔"

"گڈ۔ جو طلبا ہوسٹل میں رہتے ہیں' انہیں فی الحال کسی اور اسکول میں پہنچایا جائے۔ یہ کام جلد از جلد کر لیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ آزادانہ طور پر بلڈنگ میں آ اور جا سکتے ہیں۔ آپ انٹر کام پر ان سے رابطہ کریں اور پوچھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم کریں کہ زخمی ٹیچر کو نکالا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"مجھے اُمید نہیں کہ مظفر خان زندہ ہوگا۔"

"کیوں؟"

"اسے صرف چند فٹ کے فاصلے سے شوٹ کیا گیا ہے اور وہ بھی شاٹ گن سے۔"

انسپکٹر اشفاق کی نظریں جھک گئیں۔ "ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ امکان تو کم ہی ہے پھر بھی ہمیں اُمید رکھنی چاہیے۔"

جمیل الرحمان اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اور اگر وہ تم سے بات کرنا چاہیں تو؟"

"ہمارے ایس پی صاحب آنے ہی والے ہیں۔ اس معاملے کو وہی نمٹائیں گے۔"

"ٹھیک ہے" جمیل الرحمان نے کہا اور بلڈنگ کی طرف چل دیا۔ جاتے ہوئے اس نے نظریں اُٹھا کر تیسری منزل کی طرف دیکھا۔ وہاں اسے ایک سایہ سا نظر آیا۔ وہ اپنے دفتر میں داخل ہوا' جہاں مسز جعفری فون کے پاس بیٹھی اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ "باہر جاؤ اور ٹیچروں سے کہو کہ تمام طلبہ کو کرکٹ اسٹیڈیم میں لے جائیں۔ میں انہیں وقتی طور پر کسی دوسرے اسکول میں شفٹ کرنے کی بات کرتا ہوں۔ اب اس بلڈنگ میں کسی کو نہیں آنا ہے۔ تم بھی واپس نہ آنا۔" پھر اسے خیال آیا کہ اسکول کا اپنا ہاسٹل اسکول کی بلڈنگ سے خاصا دور اور محفوظ ہے۔

"اور آپ؟"

"اسکول کا پرنسپل بھی بحری جہاز کے کیپٹن کی طرح ہوتا ہے۔ اسے بھی جہاز کے ساتھ ڈوبنا ہوتا ہے۔" جمیل الرحمان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

"اس کی ضرورت تو نہیں...." مسز جعفری نے کہا۔

"مجھے یہاں کچھ کام کرنے ہیں پھر میں بھی نکل جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔" پرنسپل نے کہا اور اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر وہ سوچتا رہا۔ اسے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ ایک ایسے اسکول کا پرنسپل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا' جو مغربی طرز پر چلایا جا رہا ہو اور جس میں بڑے اہم لوگوں کے بچے پڑھتے ہوں۔ مسائل ہی مسائل تھے' جن سے نمٹنا پڑتا تھا۔ مسائل کھڑے کرنے والے طلبا سے خوش اسلوبی سے نمٹنا' انتظامی مسائل حل کرنا اور ٹیچرز کا خیال رکھنا۔ یہ عہدہ ویسے ہی پھولوں کی سیج نہیں تھا کہ یہ نئی افتاد.... اسے مظفر خان کا خیال آیا تو پریشانی اور بڑھ گئی۔

اس نے ہاسٹل کی میٹرن سے بات کرنے کے لیے ریسیور اُٹھایا۔

○☆○

بابر کھڑکی سے ہٹا اور فیکلٹی روم کی طرف چل دیا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ دوبارہ پرنسپل سے خود رابطہ کرے یا ان کے رابطہ کرنے کا انتظار کرے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ پرنسپل اور پولیس کے درمیان کیا طے پایا ہے۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے دو طرفہ ریڈیو کا بٹن دبایا۔ "کہو' باہر کیا ہو رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

شہناز کی بے حد صاف اور واضح آواز سنائی دی۔ "طلبا کرکٹ اسٹیڈیم کی طرف جا رہے ہیں۔ پارکنگ ایریے میں چھ پولیس کاریں کھڑی ہیں۔ پانچ پولیس کاریں اسکول کی عمارت کے باہر سڑک پر موجود ہیں۔ ایک منٹ.... ایک اور گاڑی اسکول میں داخل ہو رہی ہے.... پولیس کی ہی گاڑی ہے اور ہاں.... ایک ایمبولینس بھی اسکول میں داخل ہوئی ہے۔"

"پولیس والے کیا کر رہے ہیں؟" بابر نے پوچھا۔

"وہ بس اپنی گاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔"

"صورتِ حال میں کوئی تبدیلی ہو تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔"

ریڈیو آف کر کے بابر نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ چند ہی لمحے ہوئے ہوں گے کہ انٹرکام کا بزر چیخا۔ تین چار بزر کے بعد اس نے ریسیور اُٹھایا۔ "تم یقیناً جمیل الرحمان ہوگے۔" اس نے کہا۔ "ہاں مجھے بتاؤ کہ کیا صورتِ حال ہے؟"

"صورتِ حال تو تم مجھے بتاؤ گے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ظاہر ہے تم خود کو مجھ سے متعارف تو کرانے سے رہے۔"

"اس کے بعد تم پوچھو گے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ ان گھسے پٹے سوالات کے علاوہ بھی کچھ ہے تمہارے پاس؟" بابر نے کہا۔

"بہرحال میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں یہاں سے لاشیں نیچے پھینکنا شروع کر دوں گا۔ لہٰذا ہمارے خلاف کوئی جارحیت نہیں ہونی چاہیے۔"

"ایسا کر کے تم بچ تو نہیں سکو گے۔"

"میں تو موت کا کھیل کھیل رہا ہوں۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں بس تم پولیس کو اس عمارت سے دور ہی رکھو۔"

"اب مجھے گھسا پٹا سوال کرنا ہی پڑے گا۔" دوسری طرف سے پرنسپل نے کہا۔

بابر نے کرسی میں پہلو بدلا۔ اب اسے اس گفتگو میں مزہ آرہا تھا۔ "ہم کون ہیں؟ اس سے تو تمہیں غرض نہیں ہونی چاہیے۔ فی الحال تم ہمیں تیسری منزل کے دہشت گرد کہہ سکتے ہو۔ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب میں تمہیں نہیں دوں گا۔ تم میرا یہ پیغام پولیس والوں تک پہنچا دو کہ وہ اس عمارت کے پاس نہ پھٹکیں۔ میں ٹھیک ۴۵ منٹ بعد اسٹیڈیم کے ساتھ والے جمنازیم میں انٹرکام پر مزید ہدایات دوں گا۔ اگر اس وقت تک یہ میدان صاف نہ ہوا اور پولیس نہ ہٹی تو میں تمہارے ایک اسٹوڈنٹ کو ہلاک کر کے نیچے پھینک دوں گا۔ اس کے بعد اپنی یہ شرط پوری ہونے تک میں ہر پانچ منٹ بعد ایک طالب علم کو موت کے گھاٹ اُتارتا رہوں گا۔"

"اور مظفر خان کے متعلق کیا کہتے ہو؟"
"کون مظفر خان؟"
"وہی جسے تم نے گولی ماردی ہے۔"
"وہ تو ہر چیز سے بے نیاز ہو چکا ہے۔"
"اسے ہم عمارت سے نکال سکتے ہیں؟"
"ایمبولینس کے عملے کو اوپر بھیج دو۔ ان کے علاوہ کوئی نہیں آئے گا۔ اس کی لاش ہم نے دوسری منزل پر پہنچادی ہے۔"
"یعنی اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ زندہ ہو گا؟"
"نہیں اور اگر ہماری بات نہیں مانی گئی تو اور لوگ بھی مریں گے۔" یہ کہہ کر بابر نے ریسیور رکھ دیا اور ہنسنے لگا۔ وہ بہت خوش تھا۔

○☆○

ایس پی جلیس احمد اپنے اکلوتے بیٹے کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ نعمان ان دنوں کچھ زیادہ ہی بدتمیز ہو گیا تھا۔ بلکہ لگتا تھا' وہ اسے چڑانے کے لیے جان بوجھ کر بدتمیزی کرتا ہے۔ ان دنوں وہ ضد کر رہا تھا کہ اس کا ڈرائیونگ لائسنس بنوایا جائے اور اسے موٹر سائیکل لے کر دی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کا بیٹا ہونے کے ناتے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ جبکہ دوسرے لڑکے رشوت دے کر لائسنس بنوا چکے ہیں۔ جلیس نے اسے دوٹوک انداز میں بتادیا تھا کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گا تو اس کے مطالبات پورے کر دیے جائیں گے۔ ورنہ وہ ایسی کوئی توقع نہ رکھے۔

اس صبح جلیس کی بیوی صفیہ نے اسے نعمان کے سلسلے میں کافی سمجھایا تھا۔ "دیکھو' سولہ سال کا لڑکا جوان ہوتا ہے۔ تمہیں اپنا رویہ تبدیل کر لینا چاہیے۔ اس کے مطالبات فطری ہیں۔"
"لیکن وہ غیر ذمے دار ہے۔ ایسے لڑکے کو ڈرائیونگ لائسنس دلانا... موٹر سائیکل دلانا... یہ تو قتل اور خودکشی کا لائسنس دلانا ہے۔"
"اس کے ہم عمر ساتھیوں کے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔"
"ہوتی رہیں۔ میں اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتا۔"
"لیکن اس کے ساتھ نرمی تو برت سکتے ہو۔"
"اس کے بڑھے ہوئے بال' اس کا حلیہ دیکھ کر مجھے غصہ آجاتا ہے۔"
"اس سے محبت کا اظہار کرو' نرمی سے سمجھاؤ تو وہ ہنسی خوشی خود کو تبدیل کر لے گا۔" صفیہ نے کہا۔ "دیکھو نا... ہمارا تو کل سرمایہ وہی ہے۔ تم پولیس میں ہو۔ ڈسپلن کے آدمی ہو۔ سڑکوں پر حادثات دیکھتے رہتے ہو لیکن اس پر ڈسپلن تھوپو نہیں' نہ وہ اتنا بڑا ہے کہ ڈسپلن کی اہمیت سمجھے اور نہ اتنا چھوٹا ہے کہ سڑکوں پر اپنی اور دوسروں کی بقا کا خیال نہ رکھ سکے۔ تمہارا رویہ اسے بگاڑ رہا ہے۔ سرکش بنا رہا ہے۔"

جلیس جانتا تھا کہ اس معاملے میں صفیہ سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ وہ مانتا تھا کہ صفیہ اس سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ "ٹھیک ہے صفیہ۔ آج شام وہ آئے گا تو میں اس سے نرمی سے بات کروں گا۔"
"یقین کرو۔ وہ بُرا لڑکا نہیں۔ اس کی اسکول کی کارکردگی بھی اتنی خراب نہیں۔ بس وہ تمہاری توجہ اور محبت چاہتا ہے۔"
"تم جانتی ہو' میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں..." جلیس نے شکایتی لہجے میں کہا۔
"مگر اسے تو نہیں معلوم' اپنی محبت ظاہر بھی کیا کرو۔ اسے وقت بھی دیا کرو۔"
"اچھا بیوی۔ اب ایسا ہی کروں گا۔" اس نے کہا اور دفتر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

دفتر میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ وہ مختلف تھانوں سے آئی ہوئی رپورٹیں دیکھتا رہا۔ ساڑھے بارہ بجے اس نے کھانا کھایا۔ ڈیڑھ بجے وہ کال موصول ہوئی۔ وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ خود نکلا۔ باہر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ "ہمیں مری چلنا ہے۔" اس نے ڈرائیور سے کہا "اور تیز ترین رفتار سے۔" پھر اس نے ریڈیو پر متعلقہ تھانے سے رابطہ کر کے کمک طلب کر لی۔
یہ خیال تو اسے راستے میں آیا کہ نعمان بھی اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔

○☆○

بابر کلاس روم میں داخل ہوا تو اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف تھا۔ کلاس میں نقل و حرکت بہت زیادہ تھی لیکن اس کے کلاس میں داخل ہوتے ہی خاموشی چھا گئی۔ طلبا اس کی ایک ایک حرکت کو شک آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جواباً انہیں گھورنے لگا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کی نظریں جھک گئیں اور وہ پہلو بدلنے لگے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ ٹیچرز کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں اس میز پر بیٹھوں گا۔" اس نے کہا "تم لوگ طلبا کے پاس چلے جاؤ۔" اس نے شاٹ گن لہرا کر اشارہ کیا۔
دونوں ٹیچر کھڑکی کے پاس پڑی دو خالی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ بابر میز کے عقب میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا دیں۔ شاٹ گن اس نے دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ لی۔
"میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ ٹیچر ہونا کیسا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ "اب پتا چل رہا ہے۔ یہ تو بڑی عیاشی کی زندگی ہے۔ کمال' تم اس طرح پڑھاتے ہو۔"
کمال نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ دیکھنے کے لیے عقاب کی چونچ جیسی ناک اور پتلے پتلے ہونٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔
"نہیں مجھے پڑھانے کے لیے گن کی ضرورت نہیں پڑتی۔" اس

نے جواب دیا۔

"اور لیڈی ٹیچر تم؟ تم بھی ایسی ہی کوئی عقل مندی کی بات کہنا چاہو گی؟" بابر صوفیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں لیکن تم سُننا پسند نہیں کرو گے۔" صوفیہ نے کہا۔

"اوہ... بہت تیز و طرّار ہو؟"

"یہ بتاؤ تم ہمیں یہاں کب تک قید رکھو گے؟"

بابر نے صوفیہ کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"صوفیہ۔"

"صوفیہ، مجھے خوشی ہے کہ ہمیں تم کو شوٹ نہیں کرنا پڑا۔ تمہارے وجود سے تو یہاں رنگینی ہے۔ نذیر رنگینیوں کا عاشق ہے۔ اگرچہ تم اس کے ٹائپ کی نہیں ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ بالآخر وہ تمہیں پسند کرنے لگے گا... یہ سوچ کر کہ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ کہو کیا خیال ہے تمہارا؟"

کمرے کی خاموشی اور سنگین ہو گئی پھر اس خاموشی کو کمال نے توڑا۔ "مجھے یقین ہے کہ صوفیہ اسے پسند نہیں کرے گی اور اگر نذیر اس شخص کا نام ہے، جو تم لوگوں میں سب سے اچھا اور معقول لگتا ہے، تو وہ خود بھی اس صورتِ حال سے بچے گا۔ تم کیوں اسے مشکل میں ڈال رہے ہو۔"

بابر مسکرایا۔ "تم یقیناً اچھے ٹیچر ہو گے۔ زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔" اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔ "لیکن یہ نہ بھولنا کہ ہمارے پاس الفاظ نہیں، گنیں ہیں۔"

جواباً کمال بھی مسکرایا۔ "سوال یہ تھا کہ تم ہمیں کب تک یہاں قید رکھو گے؟"

"ضرورت سے زیادہ ایک منٹ بھی نہیں۔"

"میں ایک اور آسان سوال کروں۔ ان بچوں کو پانی پینے اور باتھ روم وغیرہ جانے کی اجازت کب ملے گی؟"

بابر نے شاٹ گن اپنے پیروں کے پاس سے اُٹھائی اور میز کے کنارے پر رکھ لی۔ "ایک گھنٹے بعد... ذرا گرد بیٹھ جائے۔ پھر انہیں پوٹی کا وقفہ ضرور دیا جائے گا۔ ہے کوئی ایسا، جو اتنی دیر انتظار نہ کر سکے۔" اس نے شاٹ گن گھمائی اور اس کا رخ کمال کی طرف کر دیا پھر وہ بولا۔ "یہ بڑی بور کلاس ہے مسٹر کمال۔ یہ لوگ تو سوالوں کے جواب بھی نہیں دیتے۔ ہاں... میں تمہیں بتا دوں میں نے اس بلڈنگ میں کافی وقت گزارا ہے... رات کے وقت، جب یہاں کوئی موجود نہیں ہوتا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ یہ کمال رشید کیسا آدمی ہو گا۔ دراز قد، خوش رو اور دیکھنے میں اپنی عمر سے کم اور یہ صوفیہ خاتون بھی خاصی خوش شکل ہیں۔ مجھے یقین ہے تم دونوں کے درمیان ضرور کوئی چکر چل رہا ہے۔" وہ طلبا کی طرف مڑا۔ "کیوں بھئی، تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ مجھے یقین ہے، ان کے درمیان غیر اخلاقی تعلق ہے اور تم لوگوں کو پتا ہی نہیں۔ دیکھو، صوفیہ بیگم کا چہرہ کیسا سرخ ہو رہا ہے۔ اس بدلتی رنگت نے پول کھول دیا نا؟ کیوں کمال، یہ صوفیہ کیسی ہے... خوش ذائقہ، کھٹی میٹھی ہے تو دھان پان سی مگر یہ دبلی پتلی عورتیں ہوتی بڑی زبردست ہیں۔"

کمال نے بہت برداشت کیا مگر بالآخر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر بابر کی طرف بڑھا۔ بابر نے شاٹ گن اُٹھا کر گھمائی اور ٹریگر دبا دیا۔ چھوٹے سے کمرے کو اس دھماکے نے ہلا کر رکھ دیا۔ کچھ لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لڑکے ڈیسکوں کے نیچے جھک گئے۔ کچھ کی کتابیں اور دوسری چیزیں گر گئیں۔ صوفیہ اپنی کرسی پر یوں بیٹھی تھی، جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ بابر نے بڑے سکون سے خالی کارتوس باہر نکال کر ایک طرف اُچھالا اور گن کا رخ پھر کمال کی طرف کر دیا۔

کمال نے گن کو نظر انداز کر دیا۔ وہ اس میز کے سامنے پہنچ کر رکا جس کے پیچھے بابر بیٹھا تھا۔ "تم اپنا یہ ڈراما جس طرح چاہو، چلاؤ لیکن مجھے اُمید ہے کہ تم تہذیب، شرافت اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑو گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں اس کھیل کے ضابطے بتا دوں مسٹر کمال رشید۔" بابر نے سرد لہجے میں کہا "میری ہر بات تمہیں برداشت کرنا ہو گی۔ اگلی بار ایسی جسارت کی تو دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔ لگتا ہے، فی الوقت میں تمہیں ڈراؤنا نہیں لگ رہا ہوں مگر آخر میں تم مجھ سے خوف کھاؤ گے۔" وہ اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ شاٹ گن کا رخ اب بھی کمال ہی کی طرف تھا۔ "میں کچھ دیر کے لیے تمہیں اکیلا چھوڑ رہا ہوں۔ تاکہ صورتِ حال پر غور کر لو لیکن یاد رہے کہ طلبا کو فرار کرنے کی اسکیم بنانا مناسب نہیں ہو گی۔ ہم تمہیں کبھی اتنی دیر اکیلا نہیں چھوڑیں گے کہ اس پر عمل کر سکو۔ اگر تم میں سے چند ایک نکل بھی گئے تو اس کی سزا باقی لوگ بھگتیں گے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ کر دیکھے بغیر دروازے سے نکل گیا۔ راہداری میں اسے نذیر مل گیا۔ وہ دونوں ساتھ ہی فیکلٹی روم کی طرف گئے۔ "میں ایک بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں نذیر۔" بابر بڑبڑایا۔

"کیا؟"

"میں آخر میں اس ذلیل آدمی کو ضرور قتل کروں گا مگر پہلے میں اسے حقیر کیڑے کی طرح رینگنے پر مجبور کروں گا پھر اس کی موت کے ایک ایک لمحے سے لطف اُٹھاؤں گا۔ میرے سامنے تن کر کھڑے ہونے کی جرأت کرنے والے کی جاں بخشی نہیں ہو سکتی۔"

O☆O

کلاس روم میں صوفیہ سرگوشی میں غرائی۔ "کمینہ کہیں کا۔" اور کمال حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی تنہائی میں بھی صوفیہ کو بدکلامی کرتے نہیں سُنا تھا۔ کجا یہ کہ بھری کلاس کے سامنے۔ طلبا نروس انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ شاک کی

حالت میں خاموش بیٹھے تھے۔ دو لڑکیاں چپکے چپکے رو رہی تھیں۔ ایک لڑکے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ کمال کا اب تک خیال تھا کہ وہ لوگ خود کو بہت اچھی طرح سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ صوفیہ کی طرف بڑھا اور نرمی سے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔ "پُرسکون رہو۔" اس نے تلقین کی۔ "ہمیں ان بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" صوفیہ بولی "ہمیں کسی نہ کسی طرح انہیں یہاں سے نکالنا ہے۔"

"میں اس کی دھمکیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔"

"تو کیا کرنا چاہیے؟" صوفیہ اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"طلبا کو ڈیسکوں سے اٹھا کر ایک کونے میں جمع کرنا ہے۔ یوں وہ ایک دوسرے سے قریب رہ کر ایک دوسرے کا زیادہ بہتر طور پر خیال رکھ سکیں گے۔ میرا خیال ہے... میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن وہ لڑکیوں کو تولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ سامانِ ترغیب نمایاں رہے۔"

وہ دونوں اٹھے۔ انہوں نے طلبا کے پاس جا کر انہیں تسلی دی۔ انہیں سمجھایا کہ وہ ان ہم جماعتوں کی ڈھارس بندھائیں، جو بہت پریشان ہیں اور ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھے ہیں۔ کمال بڑے تحمل اور نرمی سے طلبا کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ لوگ اکٹھے ہو کر سکون سے بیٹھ گئے تو کمال اور صوفیہ کلاس روم کے اگلے حصے میں چلے گئے۔

صوفیہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "اب کیا کریں؟"

کمال برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ شادی کا پروگرام طے کیا جائے۔"

○☆○

ایس پی جلیس احمد اسٹیڈیم کی چھت پر پیٹ کے بل لیٹا دوربین کی مدد سے اسکول کی عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ تیسری منزل کی کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ بادلوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک کمرا اس سے مستثنیٰ تھا۔ کونے کے اس کلاس روم کی ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس سے اندر کے منظر کی ایک دھندلی سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ جلیس نے اپنی گھڑی دیکھی اور چھت سے اُترنے لگا۔ اسٹیڈیم کے اسکور بورڈ والے چھوٹے سے کیبن کو اس نے براڈ کاسٹنگ بوتھ بنا لیا تھا۔ اس بوتھ میں پرنسپل جمیل الرحمان اس کا منتظر تھا۔ "کہو... کیا رہا؟" پرنسپل نے اس سے پوچھا۔

"ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ غالباً گولی سے، لیکن میں اندر نہیں دیکھ سکا۔ روشنی ہونے کے بعد یہ ممکن ہو سکے گا۔"

"کوئی پروگرام بھی بنایا تم نے؟"

جلیس نے پھر گھڑی میں وقت دیکھا۔ "تیسری منزل پر پہنچنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔" وہ بولا۔ "بہرحال اندھیرا ہونے کے بعد میرے آدمی جمنازیم کے راستے عمارت کے عقبی حصے میں پہنچیں گے۔ مجرموں کے لیے انہیں دیکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ میرے کچھ آدمی جمنازیم کی چھت پر رہیں گے لیکن ہم کچھ بھی کریں، کیسی ہی احتیاط کریں، مسلح تصادم ناگزیر ہے۔ ایک بات سُنیں۔ چھت میں کھلنے والا ٹریپ ڈور بھی یقیناً ہوگا۔ وہ کہاں کھلتا ہے؟"

"اسٹور روم میں اور اسٹور روم بھی اسی راہداری میں ہے۔"

"مجھے اس منزل کا نقشہ بنا دیں۔"

"راہداری ہے، جو لمبائی کے رخ پر پوری عمارت میں موجود ہے۔ سامنے کے حصے میں دس اور عقبی حصے میں چھ کلاس روم ہیں۔ درمیانی زینوں کے بائیں طرف فیکلٹی روم ہے اور داہنی طرف اسٹور روم ہے۔ فیکلٹی روم اور اسٹور روم، دونوں کے ساتھ تین تین کلاس روم ہیں پھر ریسٹ روم ہیں اور آخر میں کونے والے زینے ہیں۔"

"ہمارے لیے دو ہی زینے بچتے ہیں۔" جلیس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اس طرف والے زینے کا دفاع تو وہ بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ آگ سے بچاؤ والے دونوں زینے بھی بیکار ہیں۔ ایک بہت دور ہے اور دوسرا ان کی نظروں کے سامنے۔ ہمیں کلاس روم سے قریب ترین زینہ استعمال کرنا ہوگا۔ ہمیں بہت تیزی سے اس کلاس روم میں داخل ہونا ہوگا۔ اگر ہم اپنے کچھ آدمی اسٹور روم میں پہنچا دیں تو شاید انہیں حیران کرنے اور راہداری صاف کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"تم پرجوش تو نہیں لگتے۔" پرنسپل نے کہا۔

"ہوں بھی نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں کی تعداد کتنی ہے اور پھر میں کچھ بھی کر لوں، یہ معاملہ بہرحال وقت طلب ہے اور اس دوران وہ کچھ طلبا کو موت کے گھاٹ اُتار سکتے ہیں۔"

وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے خاموش بیٹھے رہے۔ جلیس عمارت کے لے آؤٹ اور اس میں گھسنے کے طریقوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے آدمیوں کو مختلف جگہوں پر رکھ کر دیکھ رہا تھا، جیسے بساط پر مہرے رکھے جاتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب آپریشن کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ ایک جوان آگ سے بچاؤ والے دور کے زینے پر جائے اور راہداری میں گیس کے بم اُچھالے۔ اسی لمحے بلٹ پروف پہنے ہوئے تین جوان اسٹور روم سے نکل کر زینوں پر جھپٹیں گے۔ امکان یہی تھا کہ بغیر کسی فائر کے وہ دہشت گردوں پر قابو پا لیں گے۔ وہ اپنے ساتھ جو جمعیت لایا تھا، انہیں دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے کمانڈو تربیت دی گئی تھی۔ وہ اس قسم کی کارروائی کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔

بہرحال ایسا ہو یا نہ ہو، اس کی خواہش یہی تھی کہ پورا آپریشن صاف ستھرے انداز میں خون بہے بغیر ہو جائے۔ اسے اپنے بیٹے

نعمان کی بھی فکر تھی لیکن اس نے اس کے خیال کو ذہن کے عقبی حصے میں دھکیل دیا تھا۔ پرنسپل دفتر سے نکلتے ہوئے اپنے ساتھ بدنصیب کلاس میں موجود طلبا و طالبات کی فہرست لایا تھا۔ اس فہرست میں نعمان کا نام دیکھ کر خدشہ حقیقت میں بدل گیا تھا۔

انٹر کام کے بزر نے ان دونوں کو چونکا دیا' جلیس نے ریسیور اُٹھایا "یس؟"

"اوہ.... نئی آواز" دوسری طرف سے کہا گیا "تم کون ہو بھئی؟"

"میں ایس پی جلیس احمد بول رہا ہوں۔"

"یہ تو ہماری عزت افزائی ہے کہ ایس پی صاحب بنفس نفیس یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں تمہیں اپنا نام تو نہیں بتا سکتا لیکن خیر... میں جانتا ہوں کہ تم اس کال کے منتظر ہو گے... اس خیال سے کہ ہم سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں تم ہمارے خلاف آپریشن کا مؤثر منصوبہ بنا سکو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں مایوس کر رہا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہاری کوئی کارروائی کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو؟" جلیس نے سرد لہجے میں کہا۔

"مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہارے عزائم خطرناک نہیں پھر بھی احتیاطاً میں چند باتیں بتا دوں۔ تینوں زینوں پر ڈائنا مائٹ کے بم بندھے ہوئے ہیں۔ الیکٹرونک ٹریگر والے۔ تم لوگوں نے اوپر آنے کی کوشش کی تو تم پر جہنم کے دروازے کھل جائیں گے۔ چھت کا راستہ البتہ کھلا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اسٹور روم میں ٹریپ ڈور کھلتا ہے لیکن اول تو تم ہمارے علم میں آئے بغیر وہاں پہنچ ہی نہیں سکو گے' پہنچ بھی گئے تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ہم نے نہ صرف ٹریپ ڈور کو اندر سے بند کر دیا ہے بلکہ ڈائنا مائٹ بھی لگا دیا ہے۔"

"بہت خوب" جلیس نے کہا۔ اس کے دماغ نے خودکارانہ انداز میں متبادل منصوبے پر کام شروع کر دیا تھا۔

"اب تفصیلات سُن لو۔ تمہیں کل شام تک پانچ کروڑ روپے کا بندوبست کر کے ہم تک پہنچانا ہے۔ سو روپے سے بڑا کوئی نوٹ نہیں ہونا چاہئے۔ کسی نوٹ پر نشان نہ ہو اور نوٹ سیریل کے نہ ہوں۔ فی الحال یہی ایک کام ہے تمہارے لئے اور ڈیڈ لائن ہے کل شام چھ بجے۔ اس کے بعد موت کا کھیل شروع ہو جائے گا۔"

"بس؟ یعنی تمہیں صرف دولت کی ضرورت ہے؟"

"تمہیں شاید مایوسی ہوئی۔ حالانکہ یہاں سب کچھ دولت سے ہی ہوتا ہے۔ سیاست بھی دولت کے بغیر نہیں چلتی۔ اپنے سیاست دانوں سے.... سیاسی جماعتوں سے پوچھو کہ وہ منشیات فروشوں سے کیوں تعلقات رکھتے ہیں۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ میرے منصوبے اور بھی ہیں لیکن میں ان پر تم سے تبادلۂ خیال نہیں کروں گا۔"

"اور رقم تمہیں مل جائے گی تو پھر کیا ہو گا؟"

"اس موضوع پر کل بات کریں گے۔ ویسے مجھے تمہارا رویّہ پسند آیا۔ تم نے یہ نہیں کہا کہ کل تک اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے کیا جا سکتا ہے۔ بس تم رقم کا بندوبست کرو۔"

"رقم تمہیں مل جائے گی" جلیس نے کہا اور دل میں سوچا "کرنسی کی شکل میں نہیں بلکہ موت کے روپ میں۔"

"گڈ۔ پھر کل صبح بات ہو گی۔ اس دوران تم اسکول کی عمارت سے دور رہنا" اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

جلیس ریسیور رکھنے کے بعد جمیل الرحمان کی طرف مڑا "انہوں نے آخری جزئیات تک مکمل منصوبہ بنایا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے' اس عمارت سے پوری طرح واقف ہے۔ ایک بات بتائیں' آپ نے حال ہی میں کسی کو ملازمت سے تو نہیں نکالا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی دن میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر اسکول کا جائزہ لے سکے؟"

"کوئی بڑا ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اور دوسرے منتظمین ہر آدھے گھنٹے بعد پورے اسکول کا راؤنڈ کرتے ہیں۔"

"یہ عمارت کبھی خالی تو نہیں رہتی؟"

"صفائی کرنے والا عملہ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ ہاں' جمعے کو ان کی چھٹی ہوتی ہے۔ جمعرات کی رات وہ جاتے ہیں اور ہفتے کی صبح ڈیوٹی پر آتے ہیں۔"

"یعنی کوئی شخص جمعرات اور جمعے کی راتیں اسکول میں گزارے تو اسکول کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتا ہے۔"

"مائی گاڈ! پھر تو وہ میرے دفتر میں بھی گھس سکتا ہے۔ دفتر میں عمارت کے مکمل نقشے۔ اسٹاف کی تفصیل اور کلاسوں کا شیڈول سبھی کچھ موجود ہے۔ ایک فوٹو اسٹیٹ مشین بھی ہے۔"

جلیس نے جمیل کی طرف سگریٹ بڑھائی' سگریٹ سُلگانے میں مدد دی اور خود بھی سگریٹ سُلگا لی "ان کی تیاری خواہ کتنی ہی مکمل ہو' مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں بس انہیں پکڑنا چاہتا ہوں... عمارت میں گھس کر... اس سے پہلے کہ وہ تاوان کو یا کسی یرغمالی کو ہاتھ بھی لگا سکیں۔ میرے ذہن میں کئی آئیڈیے ہیں لیکن پہلے مجھے پانچ کروڑ کی فکر کرنی ہے۔ اس کے لئے مجھے اسلام آباد میں وزارتِ داخلہ سے رابطہ کرنا ہے۔"

جمیل الرحمان نے اس کی بات نہیں سُنی۔ وہ اس دہشت گرد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو راتوں کو سنسان اسکول میں آزادانہ دندناتا رہا تھا۔ اس نے تصور میں اسے اپنے دفتر میں' اپنی کرسی پر بیٹھ کر اپنے کاغذات اور ریکارڈز کا مطالعہ کرتے دیکھا۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔

○☆○

بابر فیکلٹی روم میں پُرسکون بیٹھا تھا۔ اس نے ٹرے میں سے

اپنے لئے ایک سینڈوچ اُٹھایا اور تھرماس سے پیالی میں کافی انڈیلی۔ وہ مطمئن تھا کہ آپریشن اس کی توقع کے مطابق آگے بڑھ رہا ہے۔ کوئی غیر معمولی اور غیر متوقع رکاوٹ اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔ صورتِ حال پوری طرح اس کے قابو میں تھی۔ بس وہ ایک طرف سے فکر مند تھا۔ کمال رشید کی طرف سے۔ جمیل الرحمان کے دفتر میں موجود فائل میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا' جس سے اندازہ ہوتا کہ کمال رشید اس کے لئے مسئلہ بنے گا۔ اس کی شخصیت میں جارحیت کی کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی۔ وہ فزیکل کوچ بھی نہیں تھا۔ نہ وہ ٹیچرز ایسوسی ایشن کا ممبر تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت اہل ٹیچر تھا۔ اس لئے اس نے بڑی احتیاط سے کمال رشید کی کلاس کو منتخب کیا تھا۔ اس نے کسی خاتون ٹیچر کو یوں منتخب نہیں کیا کہ یوں ڈسپلن کے مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ ٹیچر ایسا ہو' جو اپنی کلاس پر قابو پانا جانتا ہو۔

مگر اب اس کا خیال مختلف تھا!

شہلا آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے بھی ٹرے سے ایک سینڈوچ اُٹھالیا "یہ کام تو ہماری توقع سے بھی آسان ثابت ہوا ہے۔" وہ بولی۔

"جب تک یہ معلوم ہوتا رہے کہ باہر کیا ہو رہا ہے' کام آسان ہی ہوتا ہے" بابر نے کہا۔

"ان بچوں کا کیا کرو گے۔ اب وہ بے چینی سے پہلو بدل رہے ہیں۔"

"انہیں ایک ایک کر کے باتھ روم جانے دو۔"

"ہم میں سے کسی کا ساتھ جانا ضروری ہے؟"

"نہیں۔ بس مشکور کو کونے والے زینوں پر کھڑا کر دو اور تم درمیانی زینوں پر کھڑی رہو۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

○☆○

شہناز اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں کھڑی اسکول میں ہونے والی سرگرمیاں دیکھ رہی تھی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود صاف ظاہر تھا کہ صورتِ حال پوری طرح بابر کے قابو میں ہے۔ تمام طلبا کو پچھلے گیٹ سے رخصت کر دیا گیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں پارکنگ سے ہٹالی گئی تھیں۔ آخر میں ایمبولنس والے رخصت ہوئے تھے' وہ اسٹریچر پر کسی کو ڈال کر باہر لائے تھے اور اسے ایمبولنس میں ڈال دیا گیا تھا۔ شہناز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لاش ہے' جس سفید چادر سے اس کا منہ ڈھانپا گیا تھا' وہ درمیان سے سرخ ہو رہی تھی اور اسٹریچر لانے والوں کے انداز میں عجلت بھی نہیں تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اسکول کے پرنسپل کو عمارت سے نکل کر اسٹیڈیم کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے انداز اور حرکات سے شکست خوردگی ظاہر ہو رہی تھی۔

شہناز سوچتی رہی۔ بابر ان سب سے برتر ہے۔ وہ ڈوریاں ہلاتا ہے اور دوسرے اس کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک اعتبار سے اسے ان لوگوں پر ترس آرہا تھا۔ یہ تو ان لوگوں کی بے بسی کا محض آغاز تھا۔ ان کا بابر سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ان کی زندگی اور موت کے سوئچ بابر کے اختیار میں تھے۔ ان لوگوں کو بابر کا ہم پلّہ ہونے کے لیے بابر کی سطح تک آنا تھا اور اتنے کم وقت میں وہ اتنا زیادہ گر نہیں سکتے تھے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا جو ان کی شخصیت کا حصہ بن جائے گا..... ہمیشہ کے لیے جیسے اس کے لیے ویڈیو والے توقیر کی کمینگی ایک ڈراؤنا خواب تھی جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ ہر ضائع ہونے والی زندگی وہ ہوگی جسے وہ کسی بھی طرح نہیں بچا سکتے لیکن وہ ان کی ذمے داری ہوگی۔ یہی تو فرق ہے نیکی اور بدی میں۔ نیکی کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے..... اور نیکی کے کئی مطالبے ہوتے ہیں جبکہ بدی کتنی آسان ہے۔ ارادہ کیا اور کرلی۔ اس لیے کہ بدی کو انسانی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہوتی..... جیسے ویڈیو والا توقیر! اس نے زور سے سر جھٹکا۔ آج نجانے کیوں اسے اپنی تباہی کا وہ سیاہ باب رہ رہ کر یاد آرہا تھا' جس کا مرکزی کردار توقیر تھا۔

اسٹیڈیم والے دروازے سے گاڑیاں مسلسل آ اور جا رہی تھیں۔ وہ سحر زدہ سی اس نقل و حرکت کو دیکھتی رہی۔ بلٹ پروف پہنے اور ہیلمٹ لگائے پولیس والے آتے اور گنیں لے کر مستعد کھڑے ہو جاتے جیسے ایکشن کے لیے تیار ہوں مگر کچھ ہی دیر بعد وہ اسٹیڈیم کے کسی اسٹینڈ میں بے فکری سے سگریٹ پیتے نظر آتے۔ ایک دوسرے سے مذاق کر رہے ہوتے جو کچھ بھی تھا' شہناز ان سے بہت دور اور بے حد محفوظ تھی۔ یہ احساس بے حد طمانیت خیز تھا پھر رپورٹرز اور ٹی وی والے کیمرے لیے آپہنچے۔ وہ اسٹیڈیم میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے..... ایک باوردی پولیس مین سے دوسرے تک..... سنسنی خیز معلومات کے حصول کے لیے۔ ان کے ایک پولیس والے سے دوسرے تک بھٹکنے سے ثابت ہوتا تھا کہ ان کی تسلی نہیں ہو پا رہی ہے پھر وہ اسٹیڈیم کے سرے پر پہنچتے اور کارنر سے جھانک کر دیکھتے جیسے عمارت کی دیواروں پر لکھی ہوئی کوئی خبر پڑھنا چاہ رہے ہوں۔ وہ کمرا نمبر ۲۱ کی طرف اشارہ کرتے اور اپنے کیمرے بندوقوں کی طرح اس پر تانتے لیکن وہاں تصویر کھینچنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ کہیں کوئی مسلح آدمی نظر نہیں آرہا تھا' نہ کوئی فائر کیا گیا تھا۔ نہ ہی کھڑکی سے کوئی جھانکتا ہوا کوئی طالب علم خود کو اور اپنے ہم جماعتوں کو بچانے کی اپیل کر رہا تھا۔ وہاں سبھی کو کسی نہ کسی چیز کی تلاش تھی۔ بابر کو اپنے خواب کی تعبیر کی تلاش تھی۔ اخبار اور ٹی وی والے سنسنی خیز خبر کی تلاش میں تھے اور نذیر..... وہ دولت کی تلاش میں تھا۔ تاکہ اپنے اور اُس کے لیے ایک پُر آسائش گھر بنا سکے۔ شہناز جانتی تھی کہ نذیر کے شہلا سے بھی تعلقات ہیں لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ رقابت محسوس کرنے کا حق تو وہ اسی دن گنوا چکی تھی جس دن اسے لوٹا گیا تھا۔ اس کے لیے بس یہ یقین ہی کافی تھا کہ نذیر شادی صرف اس سے ہی کرے

گا۔ اس نے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور دو طرفہ ریڈیو اُٹھا کر بابر کو کال کیا۔

چند لمحوں کے بعد ریڈیو پر بابر کی آواز اُبھری۔ "کیا بات ہے؟ کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے کیا؟"

"نہیں' اسٹیڈیم کی چھت پر نشانچی موجود ہیں۔ میں نے سوچا' تمہیں بتا دوں۔"

"اس کی تو مجھے توقع تھی۔ عمارت کی طرف دیکھو۔ وہاں تو پولیس والے نہیں ہیں؟"

"نہیں۔ کم از کم اس زاویے سے تو نظر نہیں آرہے۔ سڑک سنسان پڑی ہے۔ میرا خیال ہے پولیس نے ناکا بندی کردی ہے۔" شہناز نے کہا پھر اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ "سُنو بابر..... اگر وہ یہاں آئیں..... عمارت خالی کرانے کے لیے تو میں کیا کروں؟"

"دستک کا جواب نہ دینا اور کھڑکی سے دور رہنا تاکہ دیکھی نہ جاسکو۔"

"ٹھیک ہے بابر۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اب تم کچھ دیر کے لیے سو جاؤ۔ ریڈیو کھلا چھوڑ دینا تاکہ ضرورت پڑنے پر میں تمہیں جگا سکوں۔ آج رات آزمائش کی رات ہوگی۔ تمہیں آج رات بھر جاگنا اور نائٹ اسکوپ سے اس پورے علاقے کو ٹٹولنا' چیک کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے بابر۔"

"اور کوئی بات؟"

"نذیر موجود ہے؟"

"ابھی کمرے میں آیا ہے۔ اس سے بات کراتا ہوں۔"

اگلے ہی لمحے ریڈیو پر نذیر کی آواز اُبھری "کیا بات ہے؟"

"بس تم سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ تنہائی سے پریشان ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ جلد ہی دور ہو جائے گی تنہائی" نذیر نے کہا اور ریڈیو آف کردیا۔

اس گفتگو کے بعد بابر نے نذیر سے کہا کہ وہ جا کر تمام کھڑکیوں کے پردے برابر کردے "میں نہیں چاہتا کہ اسٹیڈیم کی چھت پر موجود نشانچیوں کو ہمیں چلتے پھرتے دیکھ کر' کھلی کھڑکیوں کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کوئی ترغیب پریشان کرے" اس نے کہا۔

نذیر کو بے وقوف ہونے کا احساس ہونے لگا۔ تمام کام اسی سے لیے جا رہے تھے۔ بابر خود حکم دینے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہا تھا لیکن اس کام کے پیچھے جو بابر کی منطق تھی' وہ نذیر کی سمجھ میں آنے والی تھی۔ بابر کا ان نشانچیوں کے سامنے ایکسپوز ہونا مناسب نہیں تھا۔ اگر بابر ان کا نشانہ بن گیا تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کیا ہوگا؟ خواب تو بکھر جائے گا اور وہ لوگ بس اپنی بقا کی جدوجہد کرتے نظر آئیں گے اور صورت حال پوری طرح ان کے خلاف ہوگی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ نذیر کلاس روم میں میں گھسے اور ایک ایک کرکے طلبا کو قتل کرنا شروع کردے۔ نہ ہی وہ مشکور کو ایسا کوئی حکم دے سکتا تھا۔ اس میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا اور حوصلہ نہ ہو تو دولت مل بھی جائے تو کس کام کی۔ وہ تو دولت چھوڑ کر بس اپنے بچ نکلنے کی فکر کرتا۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی کہ بابر کی بقا ان سب کے لیے کتنی ضروری ہے' نذیر خاموشی سے نکلا اور اس نے ہر کمرے میں جا کر کھڑکیوں کے پردے برابر کردیے۔ اس کام سے نمٹ کر اس نے کلاس روم کا رخ کیا۔ وہ یرغمالیوں کو تنہا چھوڑ کر بابر کی طرح مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔ اپنے اندر کہیں گہرائی میں وہ جانتا تھا کہ ہر شخص کے اندر بھڑک جانے کی' متشدد ہو جانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ کیسا ہی شخص ہو' کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو' اسے تشدد کی طرف دھکیلا جاسکتا ہے۔ یہ بات بابر بھی جانتا تھا اور وہ اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا تھا مگر اس کے لیے وہ انسانی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ خود تشدد کرتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ حد سے زیادہ تشدد' نشانہ بننے والے کو اپنے درست اور دوسرے کے غلط ہونے کا شدت سے احساس دلاتا..... اور اس کے اندر تشدد کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو تشدد کے جواب میں تشدد کی خواہش رکھتے ہیں جو آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کے قائل ہوتے ہیں اور ایسے لوگ تشدد ہنسی خوشی سہ لیتے ہیں..... اُف بھی نہیں کرتے' انہیں یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اگر زندہ رہے تو وہ ہر ظلم کا بدلہ لیں گے۔ ان لوگوں کی نفسیات ایک ایسے اخلاقی ضابطے کے تحت کام کرتی ہے' جسے بابر سمجھنے سے قاصر تھا۔

نذیر اپنی سوچوں پر خود ہی حیران رہ گیا۔ وہ حق و انصاف کے حق میں دلائل دے رہا تھا اور دوسری طرف جرم کی دلدل میں خود کو دھنساتا چلا جا رہا تھا لیکن اس کے لیے یہ مسئلہ آئیڈیلز کا نہیں تھا..... بلکہ بنیادی ضرورت کا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ غربت دنیا کی سب سے بڑی سزا ہے۔ وہ صحیح راستے پر چل کر مادی خوشحالی حاصل کرنے کا موازنہ غلط راستے پر چل کر دولت کمانے سے کرتا تھا۔ اس کے بعد راستے کا انتخاب ہرگز کوئی مسئلہ نہیں رہتا تھا۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ کلاس روم میں داخل ہوا۔

صوفیہ نے جو طلبا اور طالبات کے درمیان فرش پر بیٹھی تھی' چھوٹتے ہی پوچھا "ہمیں کچھ کھانے کو بھی ملے گا' ہم بھوکے ہیں۔"

نذیر کو نجانے کیوں صوفیہ سے چڑ محسوس ہوتی تھی' اس کا ردِعمل فوری تھا "مجھے نہیں معلوم۔ میری بلا سے' بھوکے مرجاؤ تم لوگ۔"

"ہمیں کھانا چاہیے۔" صوفیہ نے برہمی سے کہا۔

نذیر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ جوان تھی لیکن اس کے نقوش اور انداز سے سختی جھلکتی تھی۔ وہ ایسی عورت تھی جو اس پر کبھی التفات نہیں کرسکتی تھی۔ نذیر کو اس بات کی پروا بھی نہیں

تھی لیکن اس کی ناپسندیدگی نذیر کو بے انصافی کا احساس دلاتی تھی اور عمر بھر اس کے ساتھ یہی بے انصافی ہوتی رہی تھی۔ "میں تو تم لوگوں کے کھانے کے لیے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کروں گا۔"

اس بار کمال نے مداخلت کی "اسٹور روم میں کینڈی اور پاپ کورن موجود ہیں۔ ہم اس سے ہی کام چلالیں گے۔"

نذیر نے بے رحمی سے قہقہہ لگایا "اپنے ہی ذرائع استعمال کرو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے..."

وہ بہت گھٹیا بات تھی۔ اگرچہ کلاس کے بیشتر طلبا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کمال کو غصہ تو بہت آیا تاہم اس نے تحمل سے کہا "لگتا ہے، تم یہ تجربہ کرچکے ہو لیکن یہ کام ہمارے بس کا نہیں۔"

نذیر میز پر چڑھ کر بیٹھ گیا "کیوں نہیں۔ جبکہ مجھ جیسے کروڑوں غریبوں کی کسی کی پروا نہیں ہوتی۔"

"بات سُنو۔ یہ بچے پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں ہیں۔ ان کی پریشانیوں میں اضافہ نہ کرو۔"

نذیر کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہ شعوری طور پر اس تمتماہٹ پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔ کمال فرش سے اُٹھا اور ایک ڈیسک پر ٹِک گیا "ایسا کرو۔ اپنے باس سے پوچھ آؤ۔"

نذیر سفاکی سے ہنسنے لگا "یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے اور میرا جواب انکار میں ہے۔ اسے ایک طرح کا سبق سمجھ لو ماسٹر۔ دیکھو، عیش و عشرت کی زندگی نے تمہیں کس حال کو پہنچادیا ہے۔ تم ایک وقت بھوکے نہیں رہ سکتے۔ جبکہ لاکھوں انسان ایسے ہیں، جنہیں ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔ تمہیں ڈٹ کر کھانا کھاتے وقت کبھی ان لوگوں کا خیال بھی آتا ہے؟"

"میں سمجھ گیا۔ تم کہانیوں والے سلطانہ ڈاکو ہو۔ امیروں سے دولت چھین کر غریبوں میں بانٹو گے۔ بہت اچھا آئیڈیا ہے" کمال نے کہا "اور متوسط طبقہ بھوکا مرتا رہے گا، بہت خوب۔"

نذیر اُچھل کر میز سے اُترا اور جارحانہ انداز میں کمال کی طرف بڑھا۔ اس کی انگلی کمال کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور وہ عملاً چیخ رہا تھا "اس لیے کہ تم جیسے لوگ ہم لوگوں کو دیانت داری سے نہیں جینے دیتے..."

رئیس کی آواز نے مداخلت کی "ان پر غصہ نہ کرو مسٹر۔ یہ تو قابلِ رحم حد تک سیدھے سادے آدمی ہیں۔"

نذیر رک گیا اور اس نے دلچسپی سے بڑے بالوں والے لڑکے کو دیکھا "کیا مطلب؟"

"یہ بے چارے تو سسٹم کا ایک حصہ ہیں۔"

"اچھا؟ یعنی یہی تعلیم دی جارہی ہے تمہیں؟" نذیر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بالکل۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے، یہی سُن رہا ہوں۔ اچھے بنو، جیسا میں کہتا ہوں، ویسا کرو۔ سیدھے راستے پر چلو۔ کامیاب انسان بنو گے" رئیس نے نقل اُتارتے ہوئے کہا۔

نذیر میز کی طرف واپس چلا گیا "تم اس کی بات پر عمل کرو۔ تم کامیاب انسان بن سکتے ہو۔"

"رئیس، تم اس معاملے میں مت پڑو" کمال نے تہدیدی لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے ماسٹر۔ بچوں کا بولنا اچھا نہیں لگا تمہیں؟ یا سچ سُننا برا لگتا ہے" نذیر نے طنز کیا۔

کمال نے ڈیسک پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا "نہیں..... لیکن میں انہیں نظریاتی طور پر برباد ہونے دینا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے طلبا خود کو کچلی ہوئی اکثریت تصور کرکے تمہاری طرح خود ترسی میں مبتلا ہوں..... اور رئیس کی بات اور ہے، اس کے لیے یہ باتیں کرنا محض فیشن ہے..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ یہ بتانا بہت مخدوش بلکہ تباہ کن تھا کہ رئیس نہ صرف پچاس لاکھ کے بنگلے میں رہتا ہے بلکہ اس کا باپ وزیرِ داخلہ ہے..... وفاقی وزیر...

لیکن رئیس پر تو کمال کا اختیار نہیں تھا۔ "میرے والد مرکزی حکومت میں وزیرِ داخلہ ہیں لیکن میں ان سے بھی اختلافات رکھتا ہوں۔" رئیس نے فخریہ لہجے میں کہا "یہ فیشن کی بات نہیں۔"

"رئیس۔ غیر ضروری باتیں مت کرو۔" کمال نے کہنا چاہا۔

"یہ تو بڑے کام کی بات معلوم ہوئی ہے" نذیر نے اس کی بات کاٹ دی "اور تم بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہو۔ میں ابھی تمہارے طلبا کو عملی مظاہرہ کرکے دکھاتا ہوں کہ قوت کے استعمال سے سسٹم کو کیسے سیدھا کیا جاسکتا ہے۔ یہاں آؤ کمال صاحب!" اس نے رائفل لہرا کر اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

کمال ڈیسک سے اُتر کر اس کی طرف بڑھا "کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرے سامنے گھٹنوں کے بل جھکو۔"

کمال سوچ میں پڑگیا۔ وہ علامتی فرمائش تھی... سسٹم کو اپنے قدموں میں جھکانے کی اور کمال جانتا تھا کہ سسٹم میں خرابیاں سہی لیکن پھر بھی وہ سسٹم نہ ہونے سے بہتر ہے۔ خرابیاں تو دور کی جاسکتی ہیں لیکن سسٹم کا نہ ہونا طوائف الملوکی اور بالآخر ملک اور معاشرے کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ اس نے تمام امکانات کو تولا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے تو ہر صورت میں نقصان پہنچنا ہے۔ جھکے گا تو کمزور ثابت ہوگا۔ نہیں جھکے گا تو ذلت اور توہین کا ہدف بنے گا۔ اس نے بڑے تحمل سے کہا "نہیں.... یہ ممکن نہیں۔"

"سُن رہے ہو وزیر زادے۔ کیا نام ہے تمہارا... ہاں رئیس" نذیر نے کہا اور رائفل کی نال کمال کے سینے پر رکھ دی "جھکو۔" وہ غرایا۔

"نہیں۔"

"نہیں جھکو گے تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا" نذیر نے دھمکی دی۔ اسے اپنی گدی کے اندر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہورہی تھیں۔

"نہیں۔"

"وزیر زادے رئیس' اب اپنے استاد کا حشر بھی دیکھنا۔ اب تمہیں پتا چل جائے گا کہ کتابی باتیں اور ہوتی ہیں اور عملی باتیں اور" نذیر نے رئیس سے کہا پھر وہ کمال کی طرف مڑا "سنو ماسٹر' بہتری اسی میں ہے کہ جھک جاؤ۔"

"نہیں" کمال کے لہجے میں اب بھی تحمل تھا۔

نذیر کا دل چاہ رہا تھا کہ ٹریگر دبا دے۔ زندگی میں پہلی بار اس کے اندر شعوری طور پر کسی کو قتل کرنے کی خواہش ابھری تھی۔ خاص طور پر اس شخص کو قتل کرنے کی خواہش۔ یہ شخص اس کے لیے نفرت انگیز تھا۔ وہ متوسط طبقے کا خوش حال آدمی تھا۔ دوسروں کا احساس نہ کرنے والا۔ اس کے اندر ہر وہ خصوصیت تھی' جس سے نذیر کو نفرت تھی۔ نذیر آگے کی طرف جھکا اور اس نے رائفل کی نال کمال کے سینے پر رکھ کر اسے پوری قوت سے دھکیلا۔ اس ایک لمحے میں جب دونوں کے جسم غیر متوازن تھے۔ کمال نے ہاتھ بڑھا کر رائفل کی نال پکڑلی اور اسے کھینچا۔ نذیر نے رائفل چھڑانے کے لیے جھٹکا دیا۔ اس چکر میں ٹریگر دب گیا' گولی چلی' کمال گھوما اور ایک جھٹکے سے ایک ڈیسک پر جا کر گرا۔ فائر کی آواز نے پوری کلاس میں سکتہ طاری کردیا۔

خود نذیر کا بھی یہی حال تھا۔ دیوانگی کی سُرخ لہریں اس کے وجود میں مچل رہی تھیں لیکن دھماکے نے اسے ہوش میں رہنے پر مجبور کردیا۔ وہ نیچے گرے ہوئے کمال کا جسم گولیوں سے چھلنی کردینا چاہتا تھا لیکن کوئی چیز اسے روک رہی تھی۔ وہ قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بس اس شخص کو ایذا پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ اسے انتہا درجے کی اذیت سے دوچار کرنا چاہتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مشکور کو آوازیں دیے جا رہا تھا۔ اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ سب اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔

بابر نے منہ سے کچھ نہیں کہا بس اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ مشکور اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"مشکور اسے اُٹھاؤ" نذیر نے کہا۔

مشکور نے مستفسرانہ نگاہوں سے بابر کو دیکھا۔ بابر نے سر کو تائیدی جنبش دی۔ مشکور آگے بڑھا اور اس نے بڑی آسانی سے کمال کو فرش سے اُٹھا دیا۔ کمال کی قمیص بائیں کندھے کے پاس سے سیاہ ہو رہی تھی اور جس جگہ بازو کندھے سے ملتا ہے' وہاں چھوٹا سا ایک خلا تھا' جس سے اُدھڑے ہوئے عضلات نظر آرہے تھے اور خون بہہ رہا تھا۔

"اسے جھکاؤ۔" نذیر غرایا۔

کمال لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا۔ اس نے سہارے کے لیے مشکور کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ اسے گرنے سے بچانے کے لیے مشکور نے اسے پکڑا ہوا تھا۔

"مشکور... اسے مارو' اذیت دو۔"

"تم یہ کام پہلے ہی کرچکے ہو۔ اب یا اسے ختم کرو' یا اس کا پیچھا چھوڑو۔"

بابر کی نگاہوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ وہ سحرزدہ سا کمال کو دیکھ رہا تھا۔ "اسے مارو" وہ بڑبڑایا۔

"ٹھیک ہے' تم کہتے ہو تو یہی سہی" مشکور نے کہا' پھر اس نے قمیص کا کالر تھام کر کمال کو اوپر اُٹھایا اور پوری قوت سے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ اس کے نتیجے میں کمال کا پورا بوجھ اس پر آپڑا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ کمال نے ہاتھ پاؤں چلائے۔ مشکور کے منہ پر جھپٹا مارا.... اور اب وہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔

"گھٹنوں کے بل جھک جا..." نذیر گالی دیتے ہوئے چلّایا۔

"خدا کے لیے کمال... جھک جاؤ" صوفیہ کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

"نہیں۔"

بابر تیزی سے کمال اور مشکور کے درمیان آگیا "جھک جاؤ۔ ورنہ میں مشکور سے کہوں گا کہ تمہیں ختم کردے" وہ ردِعمل کے لیے کمال کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔"

بابر پیچھے ہٹتے ہوئے اس شخص کو دیکھ رہا تھا' جو مشکور کے بازوؤں میں بے جان سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے اندازے کی کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے۔ بہرحال اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس شخص کو توڑنے کے لیے اس کے پاس بہت وقت تھا۔ وقت کی کوئی کمی نہیں تھی "تم اتنی مزاحمت کیوں کررہے ہو؟"

"سسٹم افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا یہ خیال غلط ہے کہ اسے جھکایا جاسکتا ہے" کمال نے ڈوبتی اُبھرتی آواز میں جواب دیا۔

"مجھے حیرت ہے تم پر۔ تم ذہین ہو' پڑھے لکھے ہو' جانتے ہو کہ تشدد ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے کسی بھی سسٹم کو' کسی بھی معاشرے کو اور کسی بھی فرد کو با آسانی تباہ کیا جاسکتا ہے۔" بابر نے کہا پھر وہ مشکور کی طرف مڑا "اسے اور مارو مشکور۔"

مشکور' کمال کو قمیص سے تھام کر گھسیٹتا ہوا دیوار کی طرف لے گیا۔ اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کرکے اس نے پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے چہرے پر اور دو گھونسے اس کے پیٹ میں مارے۔ کمال دُہرا ہوگیا۔ مشکور نے گھٹنا اس کے سینے پر مارا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کام کیسے کرے۔ اسے کمال کو سنبھالنا اور کھڑا کرنا بھی تھا اور اسے مارنا بھی تھا۔ اس نے کمال کو چھوڑ دیا' جو نیچے فرش پر ڈھیر ہوگیا "اور ماروں؟" اس نے بابر سے پوچھا۔

بابر نے سوالیہ نظروں سے نذیر کو دیکھا "یہ تو جھکنے کو تیار نہیں ہے اور پٹواؤں؟"

نذیر، کمال کی طرف بڑھا۔ کمال کو سانس لینے کے لیے بھی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ اپنی کراہوں پر بھی اس کا اختیار نہیں تھا۔ نذیر کو اب خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ ماسٹر سے کیا چاہتا تھا۔ وہ اسے سسکتے، گڑگڑاتے، زندگی کی بھیک مانگتے دیکھنا چاہتا تھا۔ یا اسے اپنی توہین، اپنی ذلتوں اور اپنے دکھوں اور پریشانیوں میں شریک کرنا چاہتا تھا؟ اس کی خواہش جو بھی رہی ہو، بہرحال پوری نہیں ہوئی تھی۔ ماسٹر کو گولی بھی لگی تھی اور اس کی مرمت بھی ہوئی تھی۔ وہ موت سے صرف ایک ثانیے کے فاصلے پر تھا لیکن زندگی اب بھی اس کے لیے اپنے برحق ہونے کے احساس سے زیادہ قیمتی نہیں تھی۔ اس پر تشدد ہوا تھا لیکن وہ اپنے درست اور برحق ہونے کے تصور میں مست و سرشار اور یوں محفوظ و مامون تھا۔

نذیر نے اسے ٹھوکر ماری اور کہا "نہیں.... یہ کافی بھگت چکا ہے" اس لمحے اسے اپنا آپ بہت بُرا لگ رہا تھا۔

بابر کمال کے نزدیک گیا اور اس پر جھکتے ہوئے بولا "تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔"

کمال اذیت سے بے حال تھا لیکن اس بات کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ اس نے اپنی زندگی نامعقول سوالوں کے آخری حد تک معقول جواب دینے کے لیے وقف کردی تھی۔ اس احمقانہ مگر سفاک صورتِ حال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور جواب اسے درکار تھا۔ اس نے دانت بھینچ کر پوچھا "تم یہ سب کیوں کررہے ہو؟"

بابر کے چہرے کے عضلات نرم پڑ گئے "میں ایک فن کی مشق کررہا ہوں۔"

"بچّوں کو دہشت زدہ کرنے کے؟"

"یہ تو اس فن کی بس ایک شاخ ہے" یہ کہتے ہوئے بابر کے دانت نمایاں ہوگئے "تم نہیں سمجھ سکتے۔ جیسے پڑھانا تمہاری جاب ہے، یہ دہشت گردی میری جاب ہے اور میں اتنا طاقت ور ہوں کہ جو چاہوں حاصل کرلوں۔ میں دہشت زدہ بھی کرسکتا ہوں اور قتل بھی کرسکتا ہوں۔ میں اپنی ہر مرضی پوری کرسکتا ہوں۔ مجھے کوئی خوف نہیں اس لیے کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ تمہاری اذیت میری مسرت ہے۔ یہی میرا کام ہے۔ میں تمہیں استعمال کرسکتا ہوں اور بعد میں تمہیں بیکار چیز سمجھ کر پھینک بھی سکتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی چیز کی، کسی انسان کی کوئی وقعت نہیں۔"

بابر نے یہ بات بہت نرم لہجے میں کہی تھی لیکن لفظ ایسے تھے کہ کمال کی تکلیف میں اضافہ ہوگیا "لیکن کس لیے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ یہ گفتگو بس اس کے اور بابر کے درمیان تھی۔

"اس لیے کہ میری زندگی کا یہی مقصد ہے۔ مجھے اس سے خوشی ملتی ہے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے میں کسی کو بھی کچل سکتا.... روند سکتا ہوں۔"

کمال اس گفتگو سے دستبردار ہونا چاہتا تھا۔ اذیت سے بچنے کے لیے اس اندھیرے میں چھپ جانا چاہتا تھا، جو اس کی آنکھوں میں چھا رہا تھا لیکن یہ شخص اسے حیران کیے دے رہا تھا۔ انسان ایسے بھی ہوسکتے ہیں؟ "یعنی تم شیطنیت کا روپ ہو۔ تمہارے عزائم بھی شیطانی ہیں۔"

"نہیں، میں ایک محبِ وطن آدمی ہوں" بابر نے معنی خیز لہجے میں کہا، پھر اس نے تیزی سے موضوع بدلا "یہ جنہیں تم بچے کہتے ہو.." اس نے کلاس کی طرف اشارہ کیا "اب یہ ہمیشہ دہشت زدہ رہیں گے۔ اس لیے کہ ہر سنسان سڑک پر، ہر تاریک گوشے میں انہیں زندگی بھر میرا سایہ نظر آتا رہے گا۔ میرے مرجانے کے بعد بھی میری یاد ان کے ذہنوں میں زندہ رہے گی۔"

کمال نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک لمحے خاموش لیٹا رہا۔

"کیوں؟ اس کا کوئی جواب ہے تمہارے پاس؟" بابر نے اسے چھیڑا۔

کمال نے آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا "تم خود کو ضرورت سے بہت زیادہ اہمیت دیتے ہو۔"

بابر نے بڑھ کر اس کے کھلے زخم پر جوتا رکھ کر دباؤ ڈالا۔ کمال تکلیف سے بلبلا اُٹھا۔ "اور تم بکواس بہت زیادہ کرتے ہو" وہ غرایا پھر وہ شہلا کی طرف مڑا "فیکلٹی روم میں فرسٹ ایڈ باکس رکھا ہے۔ وہ لے آؤ، لیڈی ٹیچر ہمارے ہیرو کی مرہم پٹی کردے گی۔ بدقسمتی سے ابھی ہمیں اس کی ضرورت ہے" وہ کونے میں بیٹھے ہوئے طلبا کی طرف گیا اور نازیہ کے سامنے جارکا "یہ ہماری صلاحیتوں اور طاقت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ ہمیں ایسا کوئی موقع نہ دو" اس نے اِدھر اُدھر دہشت زدہ چہروں کو دیکھا۔ وہ ستائیس نوعمر لڑکے لڑکیوں کے معدوں میں ہونے والی اینٹھن کا تصور کرسکتا تھا۔ اس نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا پھر اس کی نظریں نازیہ کے معصوم اور حسین چہرے پر آرکیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر مشکور کو اپنے ساتھ لے کر کمرے سے نکل گیا۔

صوفیہ نے شہلا سے فرسٹ ایڈ باکس جھپٹا اور کمال کی طرف لپکی۔ کمال نے اسے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کی حالت ایسی تھی کہ اس پر قابو پانا صوفیہ کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس نے اس کے کندھے کے زخم کا جائزہ لیا۔ گولی جوڑ کے قریب موٹے مسلز کو پھاڑتی ہوئی گزری تھی۔ اسے احساس ہوگیا کہ وہ زخم صاف کرنے اور خون روکنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ وہ پانچ انچ لمبا بدصورت زخم تھا، جس سے اُدھڑا ہوا گوشت جھانک رہا تھا۔ اس نے بہت غور کیا لیکن اس نتیجے پر پہنچی کہ اس زخم کو بند کرنا ممکن نہیں۔ اس نے افسردگی سے سوچا کہ اگر کمال کو فوری طور پر بھی کسی ماہرترین سرجن کی خدمات حاصل ہوجائیں (جو کہ خارج از امکان تھا) تو بھی شاید اس کا یہ ہاتھ کبھی پہلے کی طرح کام نہیں کرسکے گا۔ اس نے زخم کی صفائی کی اور پٹی کو اینٹی بایوٹک دوا میں

بھگو کر زخم پر رکھنے کے بعد اسے خوب کس کر باندھ دیا۔ بینڈیج نے فوراً ہی خون جذب کرنا شروع کر دیا۔ یعنی پٹی بار بار بدلنا ضروری تھا پھر ایک طالب علم کی مدد سے اس نے کمال کو زبردستی اسپرین کی دو ٹکیاں دیں۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نڈھال سی ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اس کے رخسار پر پڑے نیل کو اپنی انگلیوں سے بڑی نرمی سے سہلاتی رہی۔ وہ اب بھی ہوش میں تھا لیکن اپنی نگاہوں کو فوکس کرنے کے لیے اسے سخت کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔

"پُرسکون رہنے کی کوشش کرو" صوفیہ نے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے' میں بہت تکلیف میں ہوں" کمال کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"پھر بھی' ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دو۔ خون رکنا بہت ضروری ہے۔"

کمال نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس لمحے رئیس آیا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا "سر.... مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ لوگ اتنا کچھ کر گزریں گے" وہ بولا۔

"جاؤ.... چلے جاؤ یہاں سے" کمال نے تند لہجے میں سرگوشی کی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

○☆○

بے ہوشی کے اندھیرے میں وہ پھر چھوٹا سا لڑکا بن گیا۔ وہ چھوٹے سے اصطبل میں سیاہ بچھیرے کی باگیں تھامے کھڑا تھا۔ وہ کتنی وسیع و عریض دنیا تھی۔ چالیس ایکڑ زمین.... زرعی' نہری۔ وہ ہر صبح ساڑھے چار بجے بیدار ہوتا تھا۔ اپنے بچھیرے کو چارا دیتا' اس پر سواری کرتا' اس وقت اس کی عمر سات آٹھ سال تھی۔ اتنی طاقت' اتنی توانائی کہاں سے آتی تھی کہ وہ ساڑھے چار بجے اُٹھتا۔ اسکول سے واپس آنے کے بعد دن بھر بھوسے کے ڈھیر پر اُچھلتا' کودتا اور کھیلتا رہتا۔ خواب کی اس کیفیت میں بھی وہ بھوسے کی خوشبو میں گھلی ملی گوبر کی بو محسوس کر رہا تھا۔ وہ کتنی محفوظ دنیا تھی۔ بیس بھینسیں اور سو سے زائد مرغیاں تھیں ان کے پاس اور گھر کے مکھن کی سی نرمی اور ذائقہ پھر کہیں نہیں ملا تھا۔ وہ دن.... وہ خوب صورت صبحیں کیا ہوئیں.... کہاں گئیں؟ اور بابا؟ وہ تنومند' سخت جان اور جفاکش بابا' جنہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے وہ بڑے بڑے کھردرے ہاتھ۔

قید سے رہائی کے بعد وہ واپس آیا تو اپنے سکڑے سمٹے بابا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ ان کے بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ بہت مختصر' بہت کمزور لگ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی قید کے دکھ نے بابا کو اندر سے چاٹ لیا ہے۔ وہ اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر چپکے چپکے روتا رہا تھا۔ اس لیے کہ پتھر کا مضبوط آدمی ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ اس کے وجود میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور پھر دو سال بعد سب کچھ جل گیا تھا۔ پورے گاؤں کو معلوم تھا کہ وہ کن لوگوں کی حرکت ہے لیکن قانون کو نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ اس نے پولیس کو بتایا تھا لیکن مجرموں کے سیاسی ہاتھ بہت لمبے تھے۔ پولیس ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ لہٰذا تجاہل عارفانہ سے کام لیتی رہی اور وہ خود.... وہ انتقام لینے کی طاقت اور ہمت رکھتا تھا لیکن وہ خود فوجی تھا۔ وہ صرف غیر ملکی دشمنوں کے خلاف ہتھیار اُٹھا سکتا تھا۔ اسے یہی تربیت دی گئی تھی۔ سو وہ انتقام سے دست بردار ہو گیا۔

○☆○

اس کے پیٹ سے متلی کا احساس ایک تند لہر کی صورت اُٹھا اور اس کے حلق تک چلا آیا۔ اس احساس نے اسے بے ہوشی کی اندھیری عافیت گاہ سے اُٹھا دیا۔ وہ اتنی جگہ سے دکھ رہا تھا کہ کسی ایک مقام اذیت کی بھی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا۔ گہرائی میں دھڑکتا پھڑکتا درد اس کی گردن سے پھیلتا پھیلتا' اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں تک آ پہنچا تھا۔ اس نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن عضلات کا ہلکا سا کھنچاؤ بھی متلی کے احساس کو بہت زیادہ بڑھا دیتا تھا۔ وہ کروٹ بدلنا.... اُٹھنا چاہتا تھا لیکن یہ ناممکن تھا۔ وہ ٹھنڈے فرش پر آنکھیں بند کئے لیٹا اپنی پیشانی پر پسینہ پھوٹتے محسوس کرتا رہا۔ پسینہ بہہ کر اس کی کنپٹی پر آ رہا تھا۔ کان کے نیچے سے گزر کر گردن پر ٹپک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ خون کی کمی کو وہ محسوس کر رہا تھا۔ ٹھنڈک کا احساس اس کی جلد کے پار اُتر کر جسم میں پھیل رہا تھا۔ اسے اپنا جسم تیرتا اور جھولتا محسوس ہو رہا تھا.... اور وہ جسم کی ان حرکات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کافی دیر کے بعد اسے آنکھیں کھولنے کی ہمت ہو سکی۔ آنکھیں کھلیں تو اسے متحرک دھندلاہٹ کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ نظریں فوکس کرنے کی کوشش میں متلی کا احساس پھر اُبھر آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا پھر صوفیہ کا چہرہ اس پر جھک آیا "کیسا محسوس کر رہے ہو؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"بہت خراب۔"

"تمہاری حالت اچھی نہیں لگتی۔ کندھے کا کیا حال ہے؟"

"بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ اندھیرا کیوں ہے؟"

"تم بہت دیر بے ہوش رہے ہو۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"میرا خیال ہے' رات کے بارہ بج چکے ہیں۔"

"کوئی خاص بات؟"

"نہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً ہمیں چیک کرنے کے لیے آتے رہے ہیں۔ وہ جسے وہ بابر کے نام سے پکارتے ہیں' دو بار آ چکا ہے۔ وہ نازیہ کو جن نظروں سے دیکھتا ہے' مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔"

"اب وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے' باری باری نیند لے رہے ہیں۔"

کمال نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اس پر بے پناہ تھکن غالب آرہی تھی... اور دل کی طرح مسلسل دھڑکتے درد کی طرف سے اپنے ذہن کو بند کرلینا چاہتا تھا۔ بہت کوشش کرکے اس نے آنکھیں کھولیں۔ "بچوں کا کیا حال ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تم نے انہیں بُری طرح ڈرادیا۔ میں دو گھنٹے کی کوشش کے بعد انہیں دوبارہ پُرسکون کرسکی ہوں۔ اس وقت میرے خیال میں ان میں سے بیشتر سو رہے ہیں۔"

"میں تو انہیں صبر و تحمل پر لیکچر بھی نہیں دے سکتا۔"

"تم نے احمقانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے تھے؟"

"میں خود بھی نہیں سمجھا۔ شاید عزتِ نفس کی بات تھی۔ حالانکہ بھارت کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں وہ لُٹ چکی تھی۔"

"پتا ہے، تم مر بھی سکتے تھے۔"

کمال سوچ رہا تھا۔ واقعی ان لوگوں نے اس سے کوئی بڑا مطالبہ تو نہیں کیا تھا۔ تو اسے وہ اتنا بڑا کیوں لگا تھا۔ کیا اس لیے کہ وہ صوفیہ کے اور اپنے اسٹوڈنٹس کے سامنے ذلیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیا وجہ تھی۔ گھٹنوں کے بل جھکنا اتنی بڑی بات تو نہیں تھی کہ اس کے لیے آدمی مرنا گوارہ کرلے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حوصلہ اور بدمزگی کا وہ شدید احساس کہاں سے ابھرا تھا، جس نے اسے نذیر کی رائفل پر ہاتھ ڈالنے پر اکسایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کررہا ہے۔ وہ اس سے رائفل چھین کر اس صورتِ حال کو ختم کردینا چاہتا تھا، جس نے اسے مضطرب کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے جنگی قیدیوں کے کیمپ کی ناخوش گوار یادیں اُبھر آئی تھیں اور اسے اپنا آپ بُرا لگنے لگا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ رائفل چھیننے کے بعد وہ کیا کرتا۔ نذیر کو ختم کردیتا۔ کیا وہ اتنی آسانی سے اپنے نظریات، اپنی تربیت بھول سکتا ہے۔ اس نے تو ذاتی انتقام کی شدید خواہش کو ان نظریات اور تربیت پر قربان کردیا تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ میدانِ جنگ کے سوا وہ کبھی انسانی زندگی کو موت کے گھاٹ نہیں اُتارے گا مگر اور کوئی صورت بھی تو نہیں تھی۔

"میرا خیال ہے، اب ہمیں منصوبہ بندی شروع کردینی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ صورتِ حال ہمارے ہاتھوں سے بالکل ہی نکل جائے" اس نے صوفیہ سے کہا۔

"مگر ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

"ہمیں ان بچوں کو باہر نکالنا ہے" کمال نے کہا اور اندھیرے میں جانے پہچانے کمرے کو نظروں سے ٹٹولا۔ ہر منزل پر کونے والے کلاس روم میں دو ایسی دیواریں تھیں، جن میں کھڑکیاں تھیں۔ عام کمروں میں ایسی ایک ہی دیوار تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کمال کو اچانک احساس ہوا کہ یہ کلاس روم کس حد تک اس کی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ اس کمرے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ سرخ ٹائلوں والے فرش میں کہاں کہاں رخنے ہیں، وہ جانتا تھا۔ چھت پر موجود ہر داغ دھبے سے وہ واقف تھا۔ اس کی پوری زندگی اپنی تمام اہمیتوں سمیت اس کمرے سے وابستہ ہوگئی تھی۔ یہاں سے اسے خوشیاں زیادہ اور مایوسیاں کم ملی تھیں۔ اسے ان طلبا کی تعداد بھی یاد نہیں تھی، جنہیں اب تک وہ پڑھا چکا تھا۔ وہ یہ حساب نہیں لگا سکتا تھا کہ ان طلبا اور طالبات نے اس کی زندگی پر کیسے نقوش چھوڑے ہیں۔ یا اس نے ان کی زندگی پر کیسے نقوش چھوڑے ہوں گے۔ اس کے لیے وہ کلاس روم ایک شاندار تجربہ تھا لیکن آدمی ہوتا ہی ناشکرا ہے۔ شاید وہ جنت میں بھی خوش نہ رہ سکے۔ اس کلاس روم نے اسے اتنا کچھ دیا تھا لیکن وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا بوجھ سمجھتا تھا۔ اس نے طلبا کو نہ صرف اچھی طرح پڑھایا تھا بلکہ خود بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس کی بالغ نظری میں اضافہ ہوا تھا۔ اس کا انسانوں کو سمجھنے کا علم آگے بڑھا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہورہا تھا کہ اسے اس کمرے سے محبت ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کی خوش گوار یادیں خون آلود ہوں اور وہ بھی اس کے شاگردوں کے خون سے۔ وہ انہیں جلد از جلد اس کمرے سے نکال دینا چاہتا تھا، جو کسی بھی وقت مقتل بن سکتا تھا۔

"میرے خیال میں سب سے پہلے نازیہ، رئیس اور نعمان کو باہر نکالنا ہوگا" اس نے کہا "نازیہ کو اور طرح کا خطرہ ہے۔ وہ بابر اسے خراب نظروں سے دیکھتا ہے۔ رئیس کے متعلق اسے معلوم ہوچکا ہے کہ وہ وزیر کا بیٹا ہے۔ وہ اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتا ہے اور نعمان کے متعلق اگر اسے معلوم ہوگیا کہ وہ ایس پی کا بیٹا ہے تو اور مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔"

"مگر کیسے؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"اگر عقبی کھڑکیوں سے دو لڑکوں کو کسی طرح آگ سے بچاؤ والے چکردار زینوں پر اُتار دیا جائے تو وہ دوسروں کی مدد کرسکیں گے۔"

اسی وقت فرش پر سمٹ کر سوتے ہوئے بچوں کے درمیان ایک سایہ متحرک ہوا اور ان کی طرف بڑھا۔ وہ خاموش ہوگئے۔ وہ نازیہ تھی۔ اسے کمال دور سے بھی پہچان سکتا تھا۔

"کیا بات ہے نازیہ!" اس نے پوچھا۔

"سر... آپ تو ٹھیک ہیں نا؟"

کمال نے مسکرانے کی کوشش کی "میں ٹھیک ہوں۔ تم واپس جاؤ اور سونے کی کوشش کرو۔"

"سر... مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ذرا باہر کا حال بھی دیکھتی آنا۔"

نازیہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اچانک صوفیہ نے کہا "اس کا اکیلے باہر جانا مناسب تو نہیں۔"

کمال جانتا تھا کہ وہ اٹھ کر نازیہ کے ساتھ جانے کے قابل نہیں ہے۔ صوفیہ کو ساتھ بھیجنا بھی مناسب نہیں تھا "کوئی حرج نہیں" اس نے کہا۔ اس لمحے اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ اس

نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اُٹھ کر بچّوں کو باہر نکالنے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ سردی بھی خاصی ہو رہی تھی اور وہ فرش پر پڑے تھے لیکن اس لمحے وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا ذہن ڈوبتا جارہا تھا اور اس کیفیت سے لڑنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ صوفیہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن اس کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جارہی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ نیند سے نہیں لڑسکے گا۔

"ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا" وہ بڑبڑایا مگر اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی آواز صوفیہ تک پہنچی ہوگی۔

اس کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اندر گہرا سناٹا تھا مگر وہ سناٹا بھی یوں چیخ رہا تھا کہ اس کی سماعت معطل ہوگئی تھی۔ جیسے دور ہوا غراتی ہوئی چل رہی ہو۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ سُن نہیں پارہا تھا۔ بس بھنبھناہٹ سی کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا گیا۔ جاگتے رہنے کی جدوجہد دم توڑتی گئی۔ وہ بھول گیا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ کررہا تھا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ شعور میں کوئی اہم بات تھی، جسے وہ گرفت میں نہیں لے پایا تھا۔

ذرا دیر بعد صوفیہ نے اسے نرمی سے ہلایا "کمال... کمال، سُنو۔ نازیہ کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی ہے اور وہ واپس نہیں آئی۔ مجھے تو اب پریشانی ہو رہی ہے۔"

"کتنی دیر ہوگئی؟" کمال نے بہت کوشش کرکے پوچھا۔ بولنا بھی اس کے لیے بہت بھاری کام ہوگیا تھا۔

"آدھا گھنٹا ہوگیا ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟ میں تمہیں جگانا بھی نہیں چاہتی تھی۔"

کمال نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم میں ہر طرف اذیت کی لہریں دوڑ گئیں۔ جیسے تیسے وہ اٹھ بیٹھا مگر اس کی پیشانی پسینے میں تر ہوگئی تھی۔ متلی کے احساس سے لڑتے ہوئے وہ دیوار کا سہارا لے کر اپنے قدموں پر اٹھا۔ ذرا قدم جمے تو وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ "میں آگے نہیں جاسکوں گا" اس نے صوفیہ سے کہا "تم جاکر دیکھو۔ میں یہاں کھڑا ہوں۔"

صوفیہ نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور راہداری میں نکلی۔ راہداری کے اس سرے پر اسے مشکور بیٹھا نظر آیا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صوفیہ نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا تو اس نے اثبات میں سرہلادیا۔ کمال دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ صوفیہ باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ کمال کو توقع تھی کہ وہ چند لمحوں میں واپس آجائے گی۔ دیر لگی تو اسے تشویش ہونے لگی۔ لمحے گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ طبیعت رہ رہ کر بگڑ رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہیں فرش پر لیٹ جاتا۔ پسینے نے اب اس کی قمیص کا کالر بھگو دیا تھا۔

جبین اس وقت جب اس کی برداشت جواب دے رہی تھی اور وہ فرش پر لیٹنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلا اور صوفیہ نازیہ کو سہارا دے کر باہر لائی۔ کمال کا دل ڈوبنے لگا۔ یقیناً کوئی گڑبڑ تھی۔ اس لیے کہ نازیہ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ صوفیہ، نازیہ کو کمرے میں لائی اور اسے ڈیسک سے ٹکا کر بٹھادیا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" کمال نے کمزور آواز میں پوچھا۔

صوفیہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "اس درندے نے درندگی کی حد کردی" اس نے بمشکل کہا۔

کمال کے اندھیروں میں گھرے ذہن کو بات سمجھنے میں خاصی دیر لگی اور جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو اس کے وجود میں دھماکے ہونے لگے۔ وہ پلٹ کر اندھا دھند دروازے کی طرف بڑھا۔ پہلے وہ ایک اور پھر دوسری ڈیسک سے ٹکرایا۔ اس نے سامنے والی دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ پسینہ اب اس کے چہرے سے پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ پسینے نے اس کی آنکھوں کو کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ دیوار کا سہارا لے کر آگے بڑھتے ہوئے اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم کا پورا بوجھ دروازے پر جاپڑا۔ اس کا کندھا دروازے کے شیشے سے ٹکرایا۔ شیشہ ٹوٹا اور اس کا کندھا خالی حصے میں دھنسنے لگا۔ اذیت کی ایک تند موج اُٹھی۔ اس کے ہونٹوں سے چیخ نکلی اور وہ فرش پر گرتا چلا گیا۔

لاؤنج میں بابر نے بھی وہ آواز سنی لیکن اس نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کس عمل کا ردِّ عمل ظاہر ہو رہا ہے وہ صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر شہلا کو دیکھا "اگر یہ ٹیچر راہداری میں قدم بھی رکھے تو اسے شوٹ کردینا۔"

پھر وہ بڑے تحمل سے شہلا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ اسے امید تھی کہ فائر کی آواز نہیں سنائی دے گی۔ یہ ٹیچر کمال رشید اس کے لیے ذاتی نوعیت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ ایسے کسی شخص کو برداشت نہیں کرسکتا تھا، جو وسائل سے محروم ہونے کے باوجود حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرے۔ وہ اس شخص کو موت کے علاوہ ہر طرح کی اذیت دینا چاہتا تھا... کم از کم فی الوقت۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ کام کیسے کرے گا؟ کچھ بھی ہو، اسے اس ٹیچر کو اس کے آئیڈیلز کی دنیا سے کھینچ کر باہر لانا تھا۔ اس کے لیے حربوں کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ جاکر صوفیہ کو شوٹ کرے لیکن ایسا نہ کرنے کی معقول وجوہ موجود تھیں۔ بعد میں... بوقتِ ضرورت خوف وہراس پھیلانے کے لیے اسے استعمال کیا جاسکتا تھا اور پھر یہ امکان بھی موجود تھا کہ ممکن ہے، کمال کے لیے وہ اتنی اہمیت ہی نہ رکھتی ہو۔ بابر... بلکہ اشوک یعنی بابر اس بات کا قائل تھا کہ کوئی عمل بے سود نہیں ہونا چاہیے۔ ہر عمل کے مطلوبہ نتائج حاصل ہونے چاہئیں۔ قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بشرطیکہ اس سے شدید خوف اور دہشت زدگی کا ردِّ عمل حاصل کیا جائے۔

وہ ٹیچر کمال رشید کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ انٹلیکچوئل آدمی تھا۔ قتل سے بس اس کی طبیعت بگڑ سکتی تھی لیکن کیا قتل کمال کے اس حفاظتی حصار کو توڑ سکتا تھا جو اس کے اور سنگین حقیقتوں کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا تھا۔ نہیں.... شاید نہیں۔ اس کی حقیقی دنیا عمل کی نہیں، لفظوں کی تھی جو کلاس روم کی اس محدود دنیا میں اس کے ہونٹوں سے بہتے تھے۔ اس جانی پہچانی دنیا میں ڈیڑھ سو چہرے ہر روز اسے اس محدود حقیقت کی یقین دہانی کرانے آتے اور جاتے رہتے تھے۔ وہ اس کے سامعین تھے، جن سے وہ اپنے آئیڈیلزم کے لیے تحفظ کشید کرتا تھا۔ وہ اسے کبھی چیلنج نہیں کرتے تھے اور چیلنج کا نہ ہونا ہی اس کی خود اعتمادی کا ضامن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سب ٹیچر ایسے ہی ہوتے ہیں اور ایسے کسی آدمی پر کیسے اٹیک کیا جا سکتا ہے؟ نہیں.... اس کے لیے ان چہروں پر اٹیک کیا جاتا ہے، جو اسے خود اعتمادی فراہم کرتے ہیں۔

شہلا واپس آگئی تھی۔ اس نے کہا "وہ ٹیچر فرش پر گر پڑا تھا۔"

"گر پڑا تھا! گر کیسے؟"

"میں ان سے زیادہ تفصیل نہیں اگلوا سکی۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔"

"وہ زخمی ہوا ہے؟"

"میرا خیال ہے، شیشے سے کٹ لگے ہیں لیکن زیادہ زخمی نہیں ہوا۔ وہ گولی کے زخم والے کندھے کے بل گرا تھا۔ بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"اور وہ لڑکی کلاس روم میں موجود تھی؟"

"خوب صورت والی؟"

"تم جانتی ہو، میں کس لڑکی کو پوچھ رہا ہوں۔"

"وہ فرش پر بیٹھی ہے۔"

اشوک نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔ اسے اس لڑکی نازیہ کی آخری جھلک یاد تھی۔ وہ ریسٹ روم کے فرش پر پڑی رو رہی تھی۔ اگر اسے کمال کو سزا نہ دینا ہوتی تب بھی وہ اس لڑکی کو ہرگز نہ چھوڑتا۔ معصومیت ہر رنگ، ہر روپ میں اسے چیلنج محسوس ہوتی.... پامال کرنے پر اکساتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو اس کے خوب صورت بالوں کو ایک ایک کر کے کھینچتا اور توڑ ڈالتا۔

وہ اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ جما کر اسے گھسیٹتا ہوا ریسٹ روم میں لے گیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں رہی۔ اب وہ ایک بے وقعت اور قابلِ نفرت چیز تھی اس کے لیے۔ اس کا گڑگڑانا، اس کی وہ کھلی دہشت۔ اس کا رونا اور اس کی سسکیاں.... بس اس کے لیے یہی کچھ دل بستگی کا سامان تھا اور یہ خیال کہ اس نے صرف پندرہ منٹ میں اس کی معصوم روح پر ایک ایسا گھاؤ لگا دیا تھا، جو زندگی بھر بھی مندمل نہیں ہو سکتا تھا، وہ مطمئن تھا۔

اس نے بلا کو بیچ والے زینوں کی طرف بھیج دیا کہ وہ نذیر کو چھٹی دے دے پھر اس نے اپنے لیے پیالی میں کافی انڈیلی اور صوفے کی پشت گاہ سے ٹکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کمال کو اور کس طرح سزا دی جا سکتی ہے۔ جسمانی طور پر تو وہ اسے توڑ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ذہنی طور پر بھی کمال اب کسی قابل نہیں رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ پوری طرح ٹوٹ چکے گا تو کمال کا کیا بچے گا؟ محض ڈھانچا! اسے یقین تھا کہ آخر میں کمال اندر سے خالی ہو گا.... بالکل خالی.... کھوکھلا! ایک انسان کو کچلنا کوئی مشکل کام تو نہیں۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو نذیر قریب ہی کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ "کیا مسئلہ ہے نذیر!" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"چہرے سے تو کچھ اور لگ رہا ہے۔"

نذیر نظریں چرانے لگا "میں سوچ رہا تھا، جب تم اس طرح آنکھیں بند کرتے ہو تو کیا سوچ رہے ہوتے ہو۔"

"بہت خوش گوار ہوتی ہیں میری سوچیں۔ کیا چہرے پر ان کا عکس نظر نہیں آتا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو کیا نظر آتا ہے؟"

"میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"کیا تمہیں اس سے خوف آتا ہے؟"

"اگر میں تمہیں جانتا نہ ہوتا تو یقیناً خوف زدہ ہو جاتا۔"

"گڈ۔ اب میں ذرا کلاس روم میں جا رہا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو گے۔"

کلاس روم کی طرف بڑھتے ہوئے اشوک کو اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ راہداری میں، دروازے کے سامنے اس کے جوتوں سے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے ٹکرائے۔ اس نے دروازہ کھولا اور سوئچ دبا کر روشنی کر دی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ طلبا کا جائزہ لیا۔ ان میں سے کچھ نیند بھری نظروں سے اسے تک رہے تھے۔ بالآخر اس کی نظریں کلاس روم کے سامنے والے حصے میں بیٹھی ہوئی صوفیہ پر پڑیں۔ اس نے نازیہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹا ہوا تھا۔

نازیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے۔ اسے دیکھ اور پہچان کر اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

وہ مسکرایا "میں تو بس اپنے دوست کمال رشید کا حال دیکھنے آیا ہوں۔ سنا ہے، یہ گر گیا تھا۔ ٹھیک تو ہے نا؟"

صوفیہ کے بے تاثر چہرے کی نقاب سے نفرت جھلکنے لگی "خدا کے لیے ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ جو کچھ تم اب تک کر چکے ہو، کیا وہ کافی

نہیں ہے؟"

"یہ سوال تو میں اس بودے ٹیچر سے کرنے آیا تھا کہ مزاج کچھ ٹھکانے آئے یا نہیں" وہ کمال کی طرف بڑھا' جو فرش پر ساکت پڑا تھا۔ اس کا سر البتہ آہستہ آہستہ اِدھر سے اُدھر ہل رہا تھا شاید وہ ہوش میں آرہا تھا۔

بابر نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اس کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ کمال کی آنکھیں کھل گئیں۔ چند لمحوں میں بابر کو یقین ہو گیا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے "کہو مسٹر کمال' کچھ تسلی ہوئی یا نہیں؟" اس نے نہایت بے رحمی سے پوچھا "یہ صوفیہ تو کہتی ہے کہ بہت ہو گیا ہے لیکن میرے خیال میں تمہارے لیے صرف اتنا کافی نہیں" وہ جھک کر کمال کی آنکھوں میں دیکھتا رہا جو پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کمال کے چہرے کے تاثر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ناکام رہا۔ کمال کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے لیکن چہرہ بے تاثر تھا۔ اس کی آنکھوں میں اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری اسٹوڈنٹ مجھے پسند آئی۔ لطف آگیا" اس نے ایک اور وار کیا "تم خود بھی کبھی آزما دیکھو!" اسے توقع تھی کہ اب وہ پلکیں جھپکیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کے اندر تند غصہ اُبلنے لگا۔ یہ اس کی توہین تھی کہ اس کی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر صوفیہ کی طرف بڑھا۔ اس نے اس کا بازو تھام لیا۔ صوفیہ نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

"اپنے گندے ہاتھ ہٹاؤ۔" صوفیہ چلائی "مت چھوؤ مجھے۔"

بابر نے اُلٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ رسید کیا۔ اس نے جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کر کے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے چرچر کی آواز کے ساتھ صوفیہ کی قمیص سامنے سے پھٹتی چلی گئی۔ بابر اب ہانپ رہا تھا "سوچتا ہوں' اگلی بار اسے اپنی قربت سے نوازوں" اس نے کمال سے کہا "ویسے اس میں رکھا کچھ بھی نہیں ہے لیکن تم مائنڈ تو نہیں کرو گے مسٹر کمال۔ نہیں کرو گے نا مائنڈ!"

وہ بے تاثر نگاہیں اب بھی اسے گھور رہی تھیں۔ اب بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔

بابر کا اب غصے سے بُرا حال تھا۔ صوفیہ اس کی ٹانگوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ اس نے اس کے بال مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ بے بسی سے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ "اس کو میں بعد کے لیے بچا رکھوں تو بہتر ہے" اس نے کمال سے کہا "ایسی گئی گزری بھی نہیں ہے۔ تم نے کبھی اسے اس انداز میں دیکھا ہے؟" اس نے صوفیہ کے بال تھام کر پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ یوں اس کی برہنگی اور عیاں ہو گئی۔ بابر نے مکروہ قہقہہ لگایا اور صوفیہ کو پرے دھکیلتے ہوئے دوبارہ کمال کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا گھٹنا کمال کے چہرے پر مارا۔ کمال کا چہرہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ وہ دیوار کی طرف لڑھک گیا۔ بابر اب جیسے مطمئن تھا۔ وہ نیچے گری ہوئی صوفیہ کو پھلانگ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر جانے سے پہلے اس نے لائٹ آف کر دی اور پلٹ کر چلایا "شب بخیر۔ ہیو اے نائس نائٹ۔"

باہر ہال میں نذیر اس کا منتظر تھا۔ نذیر لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا "میں نے تمہیں وہیں ٹھہرنے کو کہا تھا" بابر نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم نے مجھے نروس کر دیا تھا۔"

وہ کمرے میں داخل ہوئے اور صوفے پر بیٹھ گئے "نروس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تم بہت زیادہ دباؤ ڈال رہے ہو ان پر" نذیر نے کہا۔

"آغاز تم نے کیا تھا۔ انجام کی طرف میں لے جا رہا ہوں۔"

"اسے میں نہیں جھکا سکا۔ وہ بہت ضدی ہے۔ اور سنو۔۔۔ اب وہ بہت زیادہ نہیں جھیل سکتا اور وہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ ہمارے لیے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس سے پہلے ہی وہ مر چکا ہو گا۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔"

بابر صوفے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ اب گفتگو کی گنجائش نہیں۔ نذیر کرسی میں بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اسے اب یہ شخص بُرا لگنے لگا تھا۔ وہ سرد مزاج پروفیشنل ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا' وہ صرف آپریشن کی کامیاب تکمیل کے لیے نہیں تھا۔ اس کے لیے اپنی انا بہت اہم تھی۔ لگتا تھا' اس کے اندر غلاظت اور بے پناہ نفرت بھری ہوئی ہے اور اس غلاظت اور نفرت سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ ورنہ ان یرغمالیوں سے اس کا کوئی ذاتی تعلق تو نہیں تھا لیکن وہ انہیں جان بوجھ کر اذیت پہنچا رہا تھا۔ یہ پروفیشنلزم نہیں ہے۔ اس نے تلخی سے سوچا۔

نذیر کو یقین تھا کہ اس کا خیال درست ہے۔ کسی بھی شخص کو ایک حد تک ہی دھکیلا جا سکتا ہے۔ پاؤں کے نیچے دب کر تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ کمال تو ایک مضبوط اور جری انسان ثابت ہوا تھا۔ خود اس کی برداشت کی بھی کوئی حد تو تھی۔ وہ بے رحمی کے مظاہرے ایک حد تک ہی دیکھ سکتا تھا۔ ماسٹر کمال انسان تھا' کوئی چوہا نہیں تھا۔ بابر اس کے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیل رہا تھا۔ اور نذیر چوہے کے کھائے جانے کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کو ایک اور خیال آیا۔ بابر کے بلی ہونے میں تو کوئی شک نہیں تھا لیکن کیا ماسٹر کمال واقعی چوہا تھا؟ اس کے گولی لگی تھی۔ اسے بارا بھی بہت گیا تھا لیکن وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا تھا۔ وہ اپنے مؤقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ ممکن ہے' وہ کوئی وقتی ردِ عمل رہا ہو۔ کچھ بھی

ہو' نذیر کے لیے وہ خطرے کی گھنٹی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کبھی بابر اور کمال میں تصادم ہو تو وہ اس میں ملوث ہو۔

نذیر نے پاؤں پھیلا لیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے پاس سونے کے لیے چار گھنٹے کی مہلت تھی۔ اسے یہ سب کچھ سوچنے میں کیوں ضائع کیا جائے۔

○☆○

کمال نے اپنی نظریں دیوار پر جمائیں اور پلکیں جھپکائیں۔ ناک سے جاری ہونے والا خون رک چکا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا لیٹا تھا۔ سانس وہ منہ سے لے رہا تھا۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ اسے مزید کتنا نقصان پہنچا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس کی ناک ٹوٹ گئی ہے۔ البتہ منہ اور دانت سلامت تھے۔ لاتیں اس نے زیادہ تر اپنے سینے پر کھائی تھیں۔ وہ اسی وقت بابر کے پیچھے جاتا لیکن تکسیر پھوٹنے کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تکلیف نے اسے مہلت ہی نہیں دی تھی اور جب مہلت دی تو اسے معلوم تھا کہ بابر دور جاچکا ہے۔

وہ گھسٹتا ہوا صوفیہ کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اس کا جسم سسکیوں سے لرز رہا تھا۔ اس نے چادر میں پھٹی ہوئی قمیص کو چھپالیا تھا۔ اس نے نرمی سے اس کے سر کو سہلایا۔ اس نے سر اٹھایا تو اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی بائیں آنکھ سوج گئی تھی اور ہونٹوں کے بائیں گوشے پر خون کی پتلی سی لکیر نظر آرہی تھی۔

"میری ناک اور تمہاری آنکھ۔ کیا خوب صورت جوڑی ہے" کمال نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

"شکریہ۔"

"کیوں نہ ہم دونوں کھڑے ہونے کا تجربہ کریں۔ دیکھیں تو..... کیا ہوتا ہے؟"

صوفیہ ہی پہلے اٹھی پھر اس نے اسے سہارا دے کر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ کمال کو اب متلی کا احساس نہیں ہورہا تھا لیکن وہ بہت کمزوری محسوس کررہا تھا وہ بمشکل ایک منٹ کھڑا رہا پھر بیٹھنے پر مجبور ہوگیا "ایک وقت تھا کہ مجھ پر بڑی سے بڑی تکلیف کا اثر نہیں ہوتا تھا" اس نے کمزور آواز میں کہا "لگتا ہے' بوڑھا ہورہا ہوں میں۔"

صوفیہ نے گیلے کپڑے سے اس کا چہرہ صاف کیا پھر کمال نے اسی طرح صوفیہ کا چہرہ صاف کیا۔ اب اس کے بازو کی پٹی بھی بدلی جانی تھی۔ زخم کی صفائی بہت تکلیف دہ مرحلہ تھی۔ وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتا رہا لیکن پھر وہ پرسکون ہوگیا۔ درد اب پہلے جیسا نہیں تھا یا پھر وہ اس کا عادی ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے بائیں بازو پر نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ یہ ہاتھ بیکار ہوچکا ہے۔ پہلے تو وہ اسے ہلا سکتا تھا لیکن اب وہ بے جان انداز میں لٹک رہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اسے نہ ہلا سکا۔ صوفیہ دوسری پٹی کرنے میں مصروف تھی۔

کمال نے نیم تاریک کمرے کی طرف رخ کرکے پکارا "رئیس!"

اگلے ہی لمحے ایک سایہ اس کی طرف چلا آیا "جی سر۔ آپ ٹھیک تو ہیں سر!" رئیس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"وقت کے ساتھ بہتر ہوتا جاؤں گا انشاء اللہ" کمال نے کہا "مجھے افسوس ہے..."

"نہیں سر۔ افسوس تو مجھے ہے۔ اپنی ہر بات پر... ہر کوتاہی پر میں شرمندہ ہوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچے گی۔"

کمال اسے منفی سوچ اور دہشت گردی کے متعلق اچھی طرح سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ اچھا موقع تھا۔ رئیس پہلی بار بات سننے کے موڈ میں تھا لیکن کمال نے اس لمحے کو گزر جانے دیا۔ اتنا بڑا عملی تجربہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لڑکا اب خود بھی بہت کچھ سمجھ سکتا تھا۔ اسے بہت مہنگا سبق ملا تھا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے" اس نے کہا "تمہارے ساتھیوں کا کیا حال ہے؟"

"وہ بہت ڈرے ہوئے ہیں سر۔ جب سے وہ شخص بابر یہاں سے گیا ہے' کسی کے منہ سے آواز بھی نہیں نکلی ہے۔ اس وقت سے کوئی سویا بھی نہیں ہے۔ سب بیٹھے ہوئے فرش کو گھور رہے ہیں۔ سر... وہ تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی ڈر رہے ہیں۔"

کمال نے سوچا' انسان کی درندگی کا نظارہ ایسا ہی خوف ناک ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کا حوصلہ قابلِ ستائش تھا۔ "تم شاک سمجھتے ہو رئیس؟" اس نے پوچھا۔ رئیس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہارے خیال میں ان میں سے کچھ شاک کی حالت میں ہیں؟"

"میرے خیال میں کسی کا بھی ایسا حال نہیں ہے سر۔"

"ایسا کرو' تم جاکر دوبارہ جائزہ لو۔ ہر ایک کو اچھی طرح دیکھنا۔ بات کرکے بھی چیک کرنا۔ یہ کام بڑی خاموشی سے کرنا ہے۔ چیک کرکے میرے پاس واپس آنا۔"

رئیس نے سر کو تھپکی جنبش دی اور طلبا کی طرف چلا گیا۔

صوفیہ یہ گفتگو خاموشی سے سنتی رہی تھی۔ وہ بدستور پٹی کرنے میں مصروف تھی۔ رئیس کے جانے کے بعد اس نے پوچھا "ہمیں اور انتظار نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ بابر کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ مجھے توڑنے کی کوشش میں ہے" کمال نے کہا "وہ یہاں آتا رہے گا... بار بار آئے گا۔ وہ ہر وہ حرکت کرے گا' جس سے اس کے خیال میں مجھے تکلیف پہنچ سکے۔ صرف میری بات ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں اسے ہینڈل کرسکتا تھا لیکن وہ میری کمزوری سے واقف ہے۔ تم... اور میرے یہ طلبا میری کمزوری ہیں۔ تم لوگوں کے ذریعے وہ مسلسل

مجھ پر کاری وار کر سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ جلد از جلد نکل جاؤ۔ اس سے پہلے کہ میری مدافعت ختم ہو' تم لوگوں کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"اور وہ واپس آیا اور میدان صاف ہوا تو تمہیں ختم کردے گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ آخر میں وہ کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ پیدائشی اذیت رساں اور دہشت گرد معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے فوری طور پر کچھ کرنا ضروری ہوگیا ہے۔"

"تم نے رئیس ہی کو کیوں منتخب کیا؟"

"اس لیے کہ میں جانتا ہوں' وہ سب سے زیادہ حوصلے والا ہے۔ بدتمیز بچوں میں بہت سی خوبیاں چھپی ہوتی ہیں۔"

اسی وقت اندھیرے میں سے رئیس نمودار ہوگیا "سر... وہ سب بُری طرح دہلے ہوئے ہیں لیکن شاک کی حالت میں نازیہ کے سوا کوئی نہیں ہے" اس نے بتایا۔

"گڈ۔ اب غور سے سنو۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی ہے" کمال نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ یہ کام سادگی سے کیا جائے۔ پچھلی کھڑکی سے آگ سے بچاؤ والے زینے پر کودا جاسکتا ہے۔ وہاں سے نیچے پارکنگ میں اُترا جاسکتا ہے۔ وہاں خود کو سائے میں چھپائے رکھیں اور پھر طوفانی رفتار سے اسٹیڈیم کی طرف بھاگیں۔ دو تین لڑکے زینے پر پہنچ جائیں تو وہ دوسروں کی مدد کرسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ کام ہر ایک کے بس کا نہیں..."

رئیس نے اس کی بات کاٹ دی "سر... پردوں کو پھاڑ کر رسی کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے اور اسی رسی کو کھڑکی سے باندھا جاسکتا ہے۔ اکبر کے پاس چاقو موجود ہے۔"

"بہت اچھا آئیڈیا ہے" کمال نے ستائشی لہجے میں کہا "مگر پہلا کام سب کو سمجھانا ہے کہ ہم کیا کرنے والے ہیں... اچھا' کچھ پوچھنا ہے تمہیں؟"

"نہیں سر۔"

"تو ٹھیک ہے' جاکر سب کو سمجھادو۔"

چند لمحے بعد کمرا سرگوشیوں اور پہلو بدلنے کی آوازوں سے بھر گیا۔ اندھیرے میں متحرک ہیولے دکھائی دینے لگے پھر پردوں کو کاٹ کر ڈوریاں بنائی جانے لگیں۔ اچھی خاصی آوازیں ہونے لگیں حالانکہ صرف رئیس بول رہا تھا۔ وہ ہر بار ایک ہی بات دُہرا رہا تھا لیکن لفظ سنائی نہیں دے رہے تھے۔ کمال کو کمرے کے ماحول میں کشیدگی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ صورتِ حال کے متعلق سُن کر طلبا کے جسم کمانوں کی طرح کھنچ گئے تھے۔ پہلی بار ان کے لیے اُمید کی کوئی کرن پھوٹی تھی۔ خود کمال کو اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے اس کے جسم میں توانائی کا کوئی پوشیدہ چشمہ پھوٹ نکلا ہو۔

پھر ایک کھڑکی بڑے پُرشور انداز میں کھلی۔ کمال نے بڑی مشکل سے خود کو اُچھلنے سے روکا۔ وہ خوف زدہ ہوگیا۔ اتنی بلند اور واضح آواز! ساتھ ہی کاریڈور میں قریب آتے قدموں کی آواز اُبھری۔ "ہش... آواز نہیں" اس نے سرگوشی میں تنبیہہ کی۔

نذیر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوئچ دبا کر روشنی کردی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر تھا۔ جیسے وہ کمرے میں کسی غیر

معیاری نفسیاتی و علمی کتابیں

ان کتابوں کا مطالعہ آپ کی شخصیت کے نکھارنے' آپ کو صحت مند رکھنے اور کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔

ٹیلی پیتھی، مستقبل بینی	۲۰/-	دست شناسی کے نئے رُخ	۲۰/-
ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات	۲۰/-	تحریر اور شخصیت	۱۵/-
ہپناٹزم	۱۵/-	مسائل اور حل	۲۰/-
ہپناٹزم کے عملی طریقے	۲۰/-	باخبری	۱۰/-
ہپناٹزم کی جدید تحقیقات	۲۰/-	چھ حیرت انگیز علوم	۱۵/-
ذاتی ہپناٹزم	۱۵/-	احساس کمتری	۱۵/-
خوابوں کے اسرار	۱۵/-	سگریٹ نوشی چھوڑیے	۱۵/-
عورتوں کی نفسیات	۳۰/-	کامیابی	۱۵/-
مقناطیسیت	۲۰/-	کراٹے	۳۰/-
ازدواجی نفسیات	۳۰/-	مٹاپا اور اس کا سدِباب	۲۰/-
خوف و شرم اور اس کا سدِباب	۳۰/-	امتحان میں کامیابی	۱۵/-
فکر کی کمزوری اور اس کا سدِباب	۱۵/-		

اندرونِ ملک ڈاک خرچ ایک یا دو کتابوں کا ۱۰/- روپے۔
۳ یا ۴ کتابوں کا ۱۲ روپے ہوگا۔ رقم صرف منی آرڈر کے ذریعے بھیجیں

بیرونِ ملک اخراجات

بیرونِ ملک ڈاک خرچ: مشرقِ وسطیٰ ۲۵ روپے فی کتاب' یورپ و مشرقِ بعید ۴۰ روپے فی کتاب' آسٹریلیا و امریکا ۶۰ روپے فی کتاب۔
رقم پیشگی بذریعہ ڈرافٹ ارسال فرمائیں۔ کسی قسم کی نقد رقم لفافے میں نہ رکھیں۔ ڈرافٹ اس نام پر بنوائیں۔

MAKTABA NAFSIAT A/C 688 H. B. L
MANSFIELD STR. BR. KARACHI

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی ۱

معمولی تبدیلی کی توقع کر رہا ہو۔ اس نے اسٹوڈنٹس کو غور سے دیکھا۔ ان میں سے بیشتر سو رہے تھے۔ کچھ نے روشنی سے بچنے کے لیے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ دو لڑکے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے چند ھیائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں کوئی گڑبڑ تھی ضرور لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے گنتی کی... لیکن طلبا پورے تھے۔ کمال رشید فرش پر لیٹا سو رہا تھا۔ خوب صورت لڑکی... نازیہ کو ٹیچر صوفیہ اپنی بانہوں میں لئے بیٹھی تھی۔ نذیر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا کہ شاید پتا چل جائے کہ اسے سنائی دینے والی آواز کیسی تھی... کس چیز کی تھی لیکن وہ معما حل نہیں ہوا۔

کمال سانس روکے فرش پر لیٹا رہا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کمرے میں در آئی تھی۔ ماحول تیزی سے سرد ہو رہا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کسی بھی لمحے نذیر کو بھی یہ تبدیلی محسوس ہو جائے گی اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ نجات کی کوشش آغاز سے پہلے ہی ختم...

وہ انتظار کرتا رہا پھر کلک کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے ردِعمل پر قابو پایا پھر اسے احساس ہوا کہ وہ سوئچ آف کیے جانے کی آواز تھی۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا تھا اور نذیر باہر جا رہا تھا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھا۔ تیز دھڑکنوں کو معمول پر آنے میں کچھ دیر لگی پھر اسے آہٹ سنائی دی اس نے سر گھما کر دیکھا رئیس اس کے پاس کھڑا تھا۔

"اب ہم جائیں سر؟" رئیس نے پوچھا۔

کمال چند لمحے سماعت پر زور دیتا رہا لیکن کمرے کے باہر کوئی آہٹ نہیں تھی مگر فوراً ہی اسے ایک نامانوس سی آواز سنائی دی' جو اس نے پہلے نہیں سنی تھی۔ وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا' بالآخر اس نے کہا "رئیس... ذرا ٹھہرو۔ چھت پر کوئی موجود ہے۔"

○☆○

ایس پی جلیس اسکور بورڈ والے کیبن میں بیٹھا اسکول کی عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا' جو اندھیرے میں ایک بہت بڑے ہیولے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ کاش وہ کسی طرح ان کھڑکیوں کے پیچھے جھانک سکتا۔ اسے اپنے باہر کے چالیس آدمیوں کی نقل و حرکت کا پوری طرح علم تھا لیکن اس کے جو مٹھی بھر جوان اسکول کی عمارت کی چھت پر تھے' ان سے وہ بے خبر تھا۔

شاید اس حقیقت نے کہ اس کا بیٹا بھی یرغمالیوں میں شامل ہے' اسے ایک ایسا ایکشن لینے پر مجبور کر دیا تھا' جس کے ماحصل سے وہ مطمئن نہیں تھا یا شاید اس کے پیچھے اس کی انصاف پسندی کارفرما تھی۔ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا اس کا فرض تھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی رہی ہو' وہ ایسے احکامات دے چکا تھا' جن کے نتیجے میں اب کچھ نہ کچھ ہونا تھا۔ ہاں... اس کے آدمی تربیت یافتہ اور ڈسپلن کے تحت کام کرنے والے تھے۔ ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور وہ نشانے کے بھی سچے تھے۔ اس کے باوجود کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ مجرموں کے ردِعمل کے بارے میں درست اندازہ کبھی نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ اس توقع پر یہ ایکشن لے رہا تھا کہ موت کو سامنے دیکھ کر مجرموں کے اعصاب جواب دے جائیں گے اور وہ ہتھیار ڈال دیں گے۔

اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر عمارت کے عقبی حصے پر نظر ڈالی۔ اب سے چند منٹ بعد اس کے جوان پوزیشن سنبھال لیں گے اور پھر اس کا کیریئر داؤ پر لگ جائے گا۔ کامیابی اسے شہرت اور ترقی دلواتی اور ناکامی... اس کے بارے میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس صورت میں اس کا سب کچھ چھن سکتا تھا۔

اس نے سگریٹ سلگائی اور پھر عمارت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس کال کا منتظر تھا' جو اسے بتاتی کہ اس کے جوان ایکشن کے لیے تیار ہیں۔ منصوبہ سیدھا سادہ تھا۔ جمنازیم کے عقب سے بارہ افراد کو عمارت کی چھت پر پہنچنا تھا۔ جمنازیم کی چھت سے اسکول پر پہنچنے کا ذریعہ رسی تھی۔ اسکول کی چھت پر پہنچنے کے بعد خطرے کی حدود شروع ہوتی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر منصوبے کو ذہن میں دُہرایا۔ کہیں بہت زیادہ خطرہ مول تو نہیں لیا جا رہا ہے۔ رسی کی مدد سے ان لوگوں کو تیسری منزل کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر اندر داخل ہونا تھا اور اس وقت عمارت کے گرد گھیرا ڈالنے والے جوانوں کو اندرونی زینوں اور آگ سے بچاؤ والے زینے پر جھپٹنا تھا۔ اس منصوبے میں دو مثبت عناصر تھے۔ حیرت اور عددی برتری۔ اس کے جوانوں کو بلٹ پروف جیکٹس اور گیس ماسک میسر تھے۔ ٹائمنگ درست رہی تو اس کے چالیس جوان تیسری منزل پر مجرموں سے ٹکرائیں گے۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا تو مجرموں کو مزاحمت کا موقع نہیں ملے گا اور اگر انہوں نے مزاحمت کی تو وہ مارے جائیں گے۔ اس نے اپنے جوانوں کو ضرورت کے تحت فائر کرنے کی کھلی آزادی دی تھی۔

اس نے وزارتِ داخلہ سے اور اپنے آئی جی سے رابطہ کیا تھا۔ آئی جی نے اس پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ جبکہ وزارتِ داخلہ نے بتایا تھا کہ فوری طور پر وزیرِ داخلہ سے رابطہ کیا جائے گا اور وزیرِ اعظم کو بھی مطلع کر دیا جائے گا' انہوں نے یقین دلایا تھا کہ زرِ تاوان کا بندوبست کر دیا جائے گا لیکن بہتر یہی ہے کہ دہشت گردی کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے جائیں۔ انہوں نے اس سے پوچھا تھا کہ اسے کسی وفاقی ایجنسی کی مدد کی ضرورت ہو تو بتائے؟ "جناب! یہ مسئلہ صرف عددی برتری سے حل ہونے والا نہیں۔ مختلف ایجنسیوں کے ہجوم میں کام بگڑ بھی سکتا ہے" اس نے جواب دیا تھا۔

اسی وقت اسکول کا پرنسپل جمیل الرحمان بوتھ میں چلا آیا "اور کتنی دیر ہے؟" اس نے پوچھا۔

جلیس نے گھڑی پر نظر ڈالی "ابھی دس منٹ باقی ہیں۔"

"میری دعا ہے کہ تمہارا منصوبہ کامیاب رہے۔"

"ناکامی کی صورت میں میری تباہی یقینی ہے۔"

"تمہارا اس میں کیا قصور ہوگا؟"

"بڑا عہدہ بڑی ذمے داری بھی لاتا ہے اور یہ تو غیر معمولی صورتِ حال ہے" جلیس نے آہ بھر کے کہا "اور منصوبے میں گڑبڑ خارج از امکان نہیں۔ ٹائمنگ میں معمولی سا فرق بھی پڑا تو تیس سیکنڈ میں بھی وہ لوگ خاصی تعداد میں بچوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی "اور وہ زینوں کو بھی اڑا سکتے ہیں" سب سے زیادہ فکر در حقیقت اسے اس بات کی تھی۔ اگر اس کے نیچے والے جوان اوپر نہیں پہنچ پائے تو مجرموں کے لیے اوپر والوں سے نمٹنا بہت آسان ہوگا۔ یہ کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا لیکن وہ اور کرتا بھی کیا۔ وہ ابھی ایکشن نہ لیتا تو کیس کسی اور ایجنسی کے ہاتھوں میں چلا جاتا۔ امکان یہی تھا کہ فوج کا ایس ایس گروپ کسی بھی وقت اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اور یہ صوبائی حکومت کی... اور محکمۂ پولیس کی بھی توہین ہوتی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ پولیس سے بہتر انداز میں اس معاملے کو نمٹا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود پیشہ ورانہ رقابت اپنی جگہ تھی۔ کام تو وہ بہرحال اس کا ہی تھا۔ کوئی اور انجام دیتا تو اس کے محکمے کی نااہلی سامنے آتی۔ ویسے بھی جرم اس کے علاقے میں ہوا تھا۔ مجرم اس کا شکار تھے۔

جمیل الرحمان نے سگریٹ کا کش لیا۔ اندھیرے میں سگریٹ کا سرا بہت روشن نظر آرہا تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں پہلے نہیں سمجھ سکا" اس نے کہا "میں نے سوچا بھی نہیں کہ نعمان جلیس تمہارا بیٹا ہے۔ کیسا اتفاق ہے کہ وہ بھی یرغمالیوں میں شامل ہے۔"

جلیس نے سگریٹ سے سگریٹ جلائی "ایک زمانے میں میں نے سگریٹ نوشی ترک کردی تھی" اس نے سگریٹ کے ٹوٹے کو فرش پر پھینک کر جوتے سے مسلا پھر بولا "مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اس پریشانی میں یہ تعلق سمجھ سکیں گے لیکن میرے اکلوتے بیٹے کا اس اسکول میں پڑھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں اور اتفاق سے وہ آج انگلش کی کلاس میں تھا۔"

"کاش... اس نے تمہارے متعلق ڈینگیں مارنے کی حماقت نہ کی ہو" جمیل الرحمان نے کہا "اس سے مجرموں کو اپنی قوت بڑھنے کا احساس ہوگا۔"

اندھیرے میں جمیل الرحمان کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس بات نے ایس پی جلیس کو ہلا ڈالا ہے "مجھے سچ بتایئے گا۔ میرا بیٹا کیسا لڑکا ہے؟" جلیس نے پوچھا۔

جمیل الرحمان کے لیے وہ استفسار حیران کن تھا "دیکھو... میں تمام طلبا کو تو نہیں جانتا لیکن تمہارے بیٹے کو تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ وہ اچھا طالب علم ہے۔ اسپورٹس اور دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا ہے، اسکول کی سیاست میں بھی اس کا دخل ہے۔ نہ تو وہ ہمارا بہترین اسٹوڈنٹ ہے، نہ بہترین کھلاڑی لیکن مجموعی طور پر وہ اپنی کلاس کے ٹاپ اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتا ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر جلیس نے کہا "میں ایسا نہیں سمجھتا تھا..."

"میں تمہیں ایک ہی اہم بات بتا سکتا ہوں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ اسکول میں کیسا ہے۔ گھر میں لڑکوں کا رویہ عام طور پر

تھانے میں

پچھلے دنوں ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کے ہاں سے ڈاکو کلاشنکوف دکھا کر اس کا بہت سا سامان لے اُڑے۔ جب اکاؤنٹنٹ تھانے میں رپٹ لکھانے پہنچا تو تھانے دار اور اس میں اس طرح کی بات چیت ہوئی۔

تھانے دار "کہیے کیسے تشریف لائے، اکاؤنٹنٹ صاحب؟"

اکاؤنٹنٹ "جناب میرے گھر میں ڈاکوؤں نے داخل ہوکر سارا جمع جتھا اُڑا لیا ہے۔"

تھانے دار "اللہ آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ہم پولیس کی جمعیت کے ساتھ آپ کے لئے دعا کریں گے۔"

اکاؤنٹنٹ "میں رپٹ لکھوانے حاضر ہوا تھا۔"

تھانے دار "جب اخباروں میں خبر آچکی ہے تو رپٹ سے کوئی فائدہ نہیں۔ ڈاکو نیک دل ہوئے تو ممکن ہے لُوٹا ہوا مال واپس کرجائیں۔ تھانے میں رپٹ لکھوانا اور اخبار میں خبر چھپوانا ایک ہی بات ہے۔"

اکاؤنٹنٹ "تو کیا آپ کچھ نہیں کرسکتے؟"

تھانے دار "کیوں نہیں۔ کہا نا ہم دعا کریں گے... ہاں اگر کسی پر شُبہ ہو تو ان کے نام بتادیں۔ ہم ان کی پرچیاں ڈال کر اور لوٹا گھما کر بتادیں گے کہ ان میں سے کس نے آپ کے گھر ڈاکا ڈالا ہے۔"

(اقتباس نصراللہ خان سے)

باغیانہ ہی ہوتا ہے۔ مستقبل اچھے طالب علم کا ہی ہوتا ہے۔"

جلیس اب خاموش ہو کر وہ بات سوچ رہا تھا' جو ابتدا ہی سے اسے رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ کیا وہ اپنے بیٹے کو بحفاظت نکال کر لانے کے لیے اتنی انسانی جانوں کو داؤ پر لگا رہا ہے؟ ہر بار وہ اس سوچ کے بعد یہی دعا کرتا تھا کہ کاش ایسا نہ ہو۔ یہ تو ضمیر کے لیے مستقل خلش بنتی جا رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے تھے" جمیل الرحمان نے اسے چونکا دیا "اس صورت حال میں دماغ ٹھیک طرح سے کام ہی نہیں کرتا۔"

"کیا مطلب؟"

"اس یرغمالی کلاس میں ایک بہت اہم لڑکا موجود ہے۔ جانتے ہو' وہ وفاقی وزیر داخلہ کا بیٹا ہے.... رئیس نام ہے اس کا۔"

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جلیس اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا "یہ آپ مجھے اب بتا رہے...." وہ جملہ پورا نہیں کر سکا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "ہیلو... ایس پی جلیس اسپیکنگ" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں ہوم سیکریٹری بول رہا ہوں" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میری منسٹر صاحب سے بات ہوئی ہے۔ وہ دورہ مختصر کر کے فوراً واپس آ رہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کا بیٹا رئیس ظفر بھی اس اسکول میں پڑھتا ہے۔ تم فوری طور پر مجھے کنفرم کر کے بتاؤ کہ...."

"سر... ابھی چند سیکنڈ پہلے مجھے معلوم ہوا ہے کہ منسٹر صاحب کا بیٹا بھی یرغمالی کلاس میں موجود ہے" جلیس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"تو پھر غور سے سنو۔ تمہیں کوئی ایکشن نہیں لینا ہے۔"

"لیکن سر! میں آرڈر دے چکا ہوں۔ اب کسی بھی لمحے آپریشن شروع ہو سکتا ہے" جلیس کی پیشانی پسینے میں تر ہو گئی تھی۔

"فوراً روک دو ایکشن۔ تم سمجھ نہیں رہے ہو۔"

"لیکن جناب! وزیر اعظم نے...."

"ہاں۔ وزیر اعظم نے کہا تھا کہ دہشت گردی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے لیکن وہ پرانی بات ہے۔ اب صورت حال بدل چکی ہے۔ وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ انسانی جانوں کو خطرے میں نہیں ڈالا جائے۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ نتائج کے ذمے دار تم ہو گے۔"

"سر.... میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ ذرا ہولڈ کریں۔ میں کوشش کرتا ہوں لیکن مشکل ہے سر۔ سر حال...."

"میں لائن ہولڈ کر رہا ہوں۔ تم معلوم کرو...."

اسی وقت جمیل الرحمان نے کہا "ارے.... انہوں نے اسکول کی لائٹس آف کر دی ہیں۔"

جلیس نے سر گھما کے دیکھا۔ تیسری منزل اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ وہ میز کی طرف بڑھا' جہاں واکی ٹاکی رکھا تھا "جلیس اسپیکنگ۔ رپورٹ دو۔ کیا صورت حال ہے؟"

کیبن الیکٹرونیکل ٹرٹراہٹ سے بھر گیا پھر واکی ٹاکی پر ایک سرگوشی ابھری "جمشید بول رہا ہوں سر۔ میرے آدمی ابھی گھاس میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہمیں حرکت میں آنے میں پانچ منٹ لگیں گے۔ جمنازیم کی چھت سے اسکول کی چھت تک رسی تان دی گئی ہے۔ اس وقت ہمارا پانچواں آدمی اسکول کی چھت پر پہنچنے والا ہے۔ چار پہنچ چکے ہیں۔ پانچ منٹ لگیں گے سر۔"

"کیا تم لوگوں کو دیکھ لیا گیا ہے؟"

"میرا خیال ہے' نہیں۔"

"تو پھر لائٹ کیوں آف ہو گئی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم سر۔ کوئی نظر تو نہیں آ رہا۔"

"اپنے آدمیوں کو واپس بلا لو۔ آپریشن ملتوی سمجھو" جلیس نے کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر دوسری طرف سے کہا گیا "اب یہ ممکن نہیں ہے جناب۔"

"کیوں.... مسئلہ کیا ہے؟"

"واکی ٹاکی جمنازیم کی چھت پر ہے۔ دوسری طرف سے ہمارا رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔"

"تم انہیں سگنل نہیں دے سکتے؟"

"وہ پہلے ہی اسکول کے اس طرف پوزیشن لے چکے ہیں۔ میں نے انہیں ٹھیک دو بج کر دس منٹ پر آپریشن شروع کرنے کو کہا تھا۔ اب میں انہیں کسی طرح نہیں روک سکتا۔"

اسی وقت میدان کے اس طرف سے روشنی کے گولے اچھلنے لگے۔ ان کی آواز کسی بلند آہنگ سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

جلیس تیزی سے فون کی طرف جھپٹا "سوری سر۔ کارروائی شروع ہو چکی ہے۔"

"اب میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہارا انجام کیا ہو گا؟" دوسری طرف سے ہوم سیکریٹری نے خشک لہجے میں کہا "دعا کرو کہ تمہاری کارروائی کامیاب نہ ہو' تب بھی طلبا کے لیے مہلک ثابت نہ ہو...."

جلیس کو خوب اندازہ تھا کہ یہاں طلبا کا مطلب وزیر داخلہ کا بیٹا رئیس ظفر ہے۔ اس کا محفوظ رہنا ضروری تھا اور اس کے لیے اب وہ صرف دعا ہی کر سکتا تھا... اپنے بیٹے کی فکر بھول کر۔

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا" ہوم سیکریٹری نے کہا اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

جلیس ریسیور رکھ کر اسکول کی طرف دیکھنے لگا' جو روشنی کے شیلوں میں دھوپ میں نہایا ہوا لگ رہا تھا۔

لہو کے تاجروں کی یہ سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے۔ دوسری اور آخری قسط کا مطالعہ آئندہ ماہ کیجیے۔

کیرول بے حد مضطرب اور پریشان تھی۔

"آخر یہ ہوا کس طرح؟" اس نے زیرِ لب اپنے آپ سے پوچھا "میں قتل جیسے معاملے میں کیوں اُلجھ گئی؟ کاش میں اس عمارت میں منتقل ہی نہ ہوئی ہوتی۔"

کیرول اس سے پہلے ایک دوسری بلڈنگ میں اپنے پرانے اپارٹمنٹ میں بڑے آرام اور سکون سے رہ رہی تھی۔ وہاں کی ہر چیز ٹھیک تھی لیکن پھر مالک نے وہ اپارٹمنٹ بیچ دیا اور کیرول کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ موجودہ بلڈنگ میں آئے ہوئے اسے دو سال گزر گئے تھے اور ان دو برسوں میں اس نے یہاں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی چیز خراب دیکھی تھی۔

لفٹ آئے دن خراب ہوتی رہتی تھی لیکن کیرول کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گراؤنڈ فلور پر رہتی تھی اس لیے کم از کم لفٹ کا خراب ہونا اس کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنتا تھا' عمارت کے نگراں کا کوڑا جمع کرنے کا نظام بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اس میں اکثر و بیشتر سستی کرتا تھا۔ فٹ پاتھ سے برف بھی وہ صحیح طریقے سے نہیں ہٹاتا تھا۔ برف باری کے دنوں میں عمارت میں آنے جانے میں دشواری ہوتی تھی۔

اپارٹمنٹ کے اندر بھی یہ حال تھا کہ کھڑکیاں اور دروازے گرمیوں میں آسانی سے نہ کھلتے تھے اور نہ ہی آسانی سے بند ہوتے تھے۔ عمارت کو گرم رکھنے کا نظام بھی صحیح کام نہیں کرتا تھا۔ باہر کی ایک سیڑھی بھی ٹوٹی ہوئی تھی.... اور اب انٹرکام بھی خراب ہو گیا تھا!

"آخر اور کون کون سی چیز خراب ہوگی؟" اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے خود سے پوچھا۔ چھت میں بھی پلستر چٹخنے کا ایک نیا نشان نمودار ہو رہا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ انٹرکام کا خراب ہونا سب سے زیادہ پریشان کن ثابت ہوا تھا۔ انٹرکام کئی ماہ سے خراب تھا۔ اس میں سے شاں شاں اور گھوں گھوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں اور سوئچ آف ہونے پر بھی یہی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آن ہو۔

کیرول کو پہلی بار انٹرکام کی خرابی کا پتا اس وقت چلا تھا جب اس نے اچانک ہی اس پر ایک مردانہ آواز سُنی تھی "اوپر آجاؤ۔" وہ خوف سے اُچھل پڑی تھی کیونکہ اس کے اپارٹمنٹ میں تو

ایک خرابی کے سبب جنم لینے والی سبق آموز کہانی

چھوٹی چھوٹی باتیں جنھیں ہم اکثر نظرانداز کر دیتے ہیں، کبھی کبھی بڑی توجہ طلب ہوتی ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی ایک چھوٹی سی بات کو نظرانداز کر بیٹھی تھی اور اپنے بے کاری میں اختیار کیے ہوئے مشغلے کے سبب ایک دردِ سر مول لے بیٹھی تھی۔ ایک قاتل اُس کے قریب ہی موجود تھا۔

خرابی

نجمہ مودی

کوئی مرد موجود نہیں تھا تو پھر یہ کس کی آواز تھی؟ ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ آواز دراصل دروازے کے قریب دیوار میں نصب شدہ انٹرکام سے آئی تھی۔ ہر اپارٹمنٹ میں انٹرکام صرف اس لیے لگا ہوا تھا کہ اس کے ذریعے عمارت کے صدر دروازے سے رابطہ رہ سکے اور اگر کسی کا کوئی ملاقاتی آئے تو اسے اندر آنے کی اجازت دی جاسکے۔

کیرول کو پتا چلا کہ دوسرے اپارٹمنٹس میں رہنے والے جب گیٹ پر موجود کسی شخص سے بات کرتے تھے تو ان کی آوازیں اس کے انٹرکام پر سُنائی دیتی تھیں پھر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر وہ اپنے انٹرکام پر "سُننے" کا بٹن دباتی تھی تو خاص طور پر اسے عین اپنے اوپر والے اپارٹمنٹ میں ہونے والی ہر گفتگو' ہر آواز سنائی دیتی تھی۔

اسی خرابی نے اسے قتل کے معاملے میں اُلجھا دیا تھا!

"کاش میں نے عمارت کے نگران کو انٹرکام خراب ہونے کی اطلاع دے دی ہوتی" اپنے آپ سے کیرول کی گفتگو جاری تھی۔ اس نے نگران کو یہ اطلاع نہیں دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ انٹرکام ٹھیک کرنے کے لیے کافی توڑ پھوڑ ہوگی۔ دیواروں کا پلستر توڑ کر اس کی وائرنگ دیکھی جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مرمت کا کام کرنے والا کوئی مرد دیر تک اس کے اپارٹمنٹ میں رہے اور توڑ پھوڑ کرتا رہے۔ اسے درحقیقت انٹرکام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ تو گراؤنڈ فلور پر تھی۔ اس سے اگر کوئی ملنے آتا تو وہ دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھ سکتی تھی کہ آنے والا کون تھا۔

سچی بات یہ تھی کہ انٹرکام کی یہ خرابی اس کے لیے دلچسپی کا باعث بھی تھی۔ وہ ایک غیر شادی شدہ' تنہا عورت تھی۔ اس کی مصروفیات بہت کم تھیں۔ فرصت کے اوقات میں کبھی کبھی اسے اپنی توجہ بٹانے اور ذہن کو بہلانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں اگر انٹرکام پر کچھ آوازیں سنائی دیتی تھیں تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر اپنا وقت قدرے دلچسپ انداز میں گزار سکتی تھی۔

اسے یاد تھا کہ پہلے پہل اسے یہ حرکت کچھ معیوب سی لگی تھی۔ دوسروں کی لاعلمی میں ان کی باتیں سُننا۔ اگر وہ اس کے جاننے والے' دوست یا شناسا ہوتے تو شاید یہ حرکت اتنی معیوب محسوس نہ ہوتی۔

ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ پھر بڑبڑائی "اگر وہ میرے شناسا ہوتے تو میں اس مصیبت میں بھی نہ پھنستی۔"

کیرول نے اپارٹمنٹس کے نمبروں کے حساب سے' لابی میں لگے ہوئے لیٹر بکسوں کا جائزہ لیا تھا۔ اس کے عین اوپر والے اپارٹمنٹ کے لیٹر بکس پر پچھلے چھ ماہ سے جے بی کارٹر کے نام کا کارڈ چسپاں نظر آرہا تھا۔ کیرول نے بارہا جے بی کارٹر کو دیکھا تھا۔ وہ اپارٹمنٹ میں تنہا ہی رہتا تھا لیکن ایک عورت اس کی دوست تھی جو اکثر اس سے ملنے آتی تھی۔

اس کے اپارٹمنٹ کے دروازے میں ننھا سا' چور محدب عدسہ بھی لگا ہوا تھا جس کے ذریعے وہ دروازہ کھولنے سے پہلے باہر کھڑے ملاقاتی کا چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ اس شیشے کے ذریعے چہرہ اصل سے بڑا نظر آتا تھا اور باہر کھڑے شخص کو پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ اسے دیکھا جارہا تھا۔

کیرول اس شیشے کے ذریعے جے بی کارٹر کو بارہا دیکھ چکی تھی۔ بلکہ جب اسے انٹرکام پر دلچسپ آوازیں سُننے کو نہیں ملتی تھیں تو وہ اس ننھے سے عدسے کے ذریعے باہر لابی میں جھانکتی رہتی تھی اور عمارت میں آنے جانے والوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ یہ مشغلہ بھی اسے کافی دلچسپ محسوس ہوتا تھا کہ وہ لوگوں کی لاعلمی میں انہیں دیکھتی رہتی تھی۔

اس عدسے کے ذریعے وہ گویا عمارت میں رہنے والے ہر شخص کو جان گئی تھی جبکہ اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اسی عدسے سے اس نے پہلی بار ایک شخص کو جے بی کارٹر والا لیٹر بکس کھولتے دیکھا تھا تو اسے پتا چلا تھا کہ وہ کارٹر تھا۔ اس کے بعد سے اسے انٹرکام پر کارٹر کی آواز سُننا زیادہ معیوب محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کارٹر اس کے لئے گویا اجنبی نہیں رہا تھا۔ وہ ذرا گٹھے ہوئے جسم کا تقریباً چالیس سالہ شخص تھا۔ اس کے بال سنہرے تھے۔

"کاش آج شام میں نے انٹرکام کی طرف توجہ نہ دی ہوتی" کیرول سوچ رہی تھی "کاش آج میں نے اس پر آوازیں سُننے کی کوشش نہ کی ہوتی۔"

لیکن کیرول سُنے بغیر رہ نہیں سکی تھی۔ انٹرکام پر پہلے تو گھوں گھوں کی آواز اُبھری تھی۔ اس نے غیر ارادی سے انداز میں "سُننے" کا بٹن دبا دیا تھا۔ تب شاں شاں کی آواز سُنائی دی جیسے لاؤڈ اسپیکر پر کسی کے بولنے سے پہلے آتی ہے۔ وہ انٹرکام کے سامنے کرسی سنبھال کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک مرد اور ایک عورت کی باتیں کرنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ وہ اونچی اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ غالباً بحث کر رہے تھے' بیچ میں کبھی کبھی آواز غائب بھی ہو جاتی تھی۔

مرد' مارتھا سے نمٹنے کی کوئی بات کر رہا تھا پھر وہ برہمی سے بولا "میں کہتا ہوں ہمیں اس ہفتے مارتھا کو قتل کر دینا چاہیے۔"

کیرول نے گھبرا کر سر پیچھے ہٹا لیا "قتل...؟" اس نے حیرت سے سوچا۔ "کسی عورت کو قتل کرنے کی بات ہو رہی ہے؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے سُننے والے بٹن سے انگلی ہٹالی تھی لیکن ذرا سنبھلنے کے بعد اس نے دوبارہ اس پر انگلی رکھی۔

مرد کہہ رہا تھا "... ہم نے بہت انتظار کرلیا۔ اسے قتل کرنے کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ ہمارا یہ کام کوئی اور تو آکر کرے گا نہیں۔ ہمیں خود ہی کرنا ہوگا۔ اب ہم مزید کتنا انتظار کریں گے؟ ہمارے لیے اس میں کوئی خطرہ نہیں۔ ہمیں بھلا کوئی کیسے پکڑ سکتا ہے؟"

پھر آوازیں دھیمی ہوتے ہوئے معدوم ہو گئیں' باتیں کرنے

والے غالباً انٹرکام سے دور چلے گئے تھے۔

کیرول نے دیوار سے ٹیک لگالیا۔ اس کے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا تھا۔ "کیا مجھے یہ بات کسی کو بتانی چاہیے؟ پولیس کو اطلاع دینی چاہیے؟" وہ سوچ رہی تھی۔

"شاید یہ سب محض مذاق ہو۔" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا "شاید وہ اداکار وغیرہ ہوں اور اپنے مکالموں کی ریہرسل کررہے ہوں۔ اس طرح کے سو چکر ہوسکتے ہیں۔ کون میری بات کا یقین کرے گا؟ قتل....؟" وہ اپنے سفیدی مائل بالوں کی ایک لٹ کو مروڑے جارہی تھی۔

اگلے ایک گھنٹے تک وہ انٹرکام پر مزید گفتگو سُننے کی کوشش کرتی رہی۔ کبھی کبھی کوئی لفظ اسے سُنائی دے جاتا تھا لیکن بات سمجھ میں نہ آئی۔ ایک گھنٹے بعد مکمل خاموشی چھاگئی۔

رات تک وہ کوئی فیصلہ نہ کرپائی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس رات اسے نیند بھی سکون کی نہ آئی۔

دوسری صبح کافی پیتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ ابھی اسے انتظار کرنا چاہیے اور مزید گفتگو سُننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ گفتگو سُننے کے لیے بٹن دبا کر رکھنا پڑتا تھا۔ اس نے بٹن پر ٹیپ چپکادی تاکہ وہ مستقل دبا رہے لیکن ٹیپ رہ نہ سکی۔ اس کے بعد کیرول کو سودا سلف لینے مارکیٹ جانا تھا۔

چار دن اسی طرح تذبذب اور کشمکش میں گزر گئے۔ کیرول کچھ بھی نہ کرسکی اور اس موضوع پر مزید گفتگو بھی نہ سُن سکی۔ چوتھے روز اخبار کے صفحۂ اوّل پر قتل کی ایک خبر نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ اس ہفتے میں قتل کی دوسری واردات تھی۔ مقتولہ آسودہ حال طبقے کی عورت تھی اور قریب ہی کسی مضافاتی علاقے میں رہتی تھی۔ پولیس کو کشمکش، نقب زنی یا تالا توڑ کر گھر میں داخل ہونے کی کوئی علامت یا شہادت نظر نہیں آئی تھی۔

دوسرا پیراگراف پڑھتے ہوئے کیرول کی سانس گویا سینے میں اٹک گئی۔ مقتولہ کا نام مارتھا تھا۔ پولیس اس کے شوہر کو تلاش کررہی تھی جو پچھلے سات ماہ سے غائب تھا۔ اس کی دُھندلی سی ایک تصویر بھی چھپی تھی۔ وہ کارٹر سے کچھ مختلف لگ رہا تھا۔ بالوں کا رنگ بھی مختلف لگ رہا تھا لیکن بالوں کا رنگ تو تبدیل بھی ہوجاتا تھا۔ وہ کارٹر بھی ہوسکتا تھا۔ کیرول کو یقین نہ سہی لیکن شبہ ضرور تھا۔ اس نے کارٹر کو قریب سے دیکھا بھی تو نہیں تھا اور اخبار میں چھپنے والی تصویر بھی زیادہ واضح نہیں تھی۔

وہ جب دل ہی دل میں اپنے آپ سے بحث کررہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے تو اسی دوران اس نے اوپر زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سُنی۔ اس کا مطلب تھا کارٹر گھر میں موجود تھا۔ وہ جلدی سے انٹرکام کے قریب پہنچی اور بٹن دبا کر سُننے لگی۔ انٹرکام پر باتوں کی نہیں، صرف کسی کے چلنے پھرنے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

بالآخر کیرول نے فیصلہ کرلیا کہ وہ پولیس کو فون کرے گی۔ وہ انہیں بتائے گی کہ غالباً وہ مارتھا کے قتل کے بارے میں کچھ جانتی ہے، اگر وہ اس سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہیں تو اس کے گھر آسکتے ہیں۔

وہ ٹیلی فون اُٹھا کر انٹرکام کے قریب ہی لے گئی تاکہ فون پر بات کرنے کے دوران بھی اگر انٹرکام پر کوئی کام کی آواز اُبھرے تو سُن سکے۔ پولیس سے رابطہ قائم ہونے کے بعد وہ انٹرکام کے بٹن کو بھی دبائے بیٹھی تھی لیکن فی الحال اس پر کوئی آواز نہیں اُبھر رہی تھی۔

اس سے بات کرنے والا پولیس کا ایک سراغ رساں تھا۔ اس نے اپنا نام برنارڈ بتایا تھا۔ کیرول نے ہکلاتے ہوئے اسے اپنا نام اور پتا بتایا پھر بولی "میں مارتھا نامی اس عورت کے قتل کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں جس کی خبر آج اخبار میں چھپی ہے۔ میں نے اتفاق سے اپنے انٹرکام پر کچھ آوازیں سُنی تھیں.... میرا خیال ہے میں آپ کو اس عورت کے شوہر کے بارے میں کچھ بتاسکتی ہوں۔"

"کیا آپ پولیس اسٹیشن آسکتی ہیں؟" سراغ رساں برنارڈ نے پوچھا۔

"نہیں.... یہ میرے لیے مشکل ہوگا...." وہ ہکلائی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انٹرکام کے پاس سے ہٹے اور کوئی کام کی بات سُننے سے محروم رہ جائے۔ سراغ رساں برنارڈ نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس کے پاس اپنا کوئی آدمی بھیج رہا تھا۔

اس نے فون بند کردیا۔

چند منٹ بعد بھی وہ انٹرکام کا بٹن دبائے بیٹھی تھی جب اچانک کال بیل بجی۔ وہ ایک لمحے کے لیے تو خوفزدہ سی ہوگئی۔ سنبھلنے کے لیے اس نے دیوار سے ٹیک لگالیا پھر قدرے طمانیت سے سوچا "پولیس نے یقیناً میری بات کو اہمیت دی ہے جو اتنی جلدی کسی کو بھیج دیا۔"

"کون؟" اس نے انٹرکام پر پوچھا۔

"پولیس۔" باہر سے آواز آئی۔

تب اس نے عدسے وغیرہ سے دیکھے بغیر نہایت اطمینان سے دروازہ یکدم کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے اس کا منہ حیرت سے کُھل گیا۔ اس کی ٹانگوں سے جان سی نکل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بے ہوش ہورہی تھی۔ دیوار سے رگڑ کھاتی ہوئی وہ واقعی فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

اندر آنے والا کارٹر تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ حواس مفلوج ہونے سے پہلے کیرول نے اسے کہتے سُنا "میرے انٹرکام پر بھی اسی طرح آوازیں سُنائی دیتی ہیں جس طرح تمہارے انٹرکام پر۔ مجھے یہ بات آج ہی معلوم ہوئی ہے!"

THE INTERCOM
KATHRYN TORGENSEN

ٹریون باتھ روم میں آئینے کے سامنے کھڑا شیو بنا رہا تھا۔ آئینے میں اسے اپنی بیوی فیلائس کا عکس نظر آرہا تھا جو کمرے میں سنگھار میز کے آئینے پر جھکی کانوں میں بُندے پہن رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ٹریون کو یہ نظارہ بھلا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ فیلائس کے استخوانی کندھے تھے جو ٹریون کو آئینے میں حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ فیلائس نے ڈائٹنگ کر کر کے اپنے آپ کو بدنمائی کی حد تک دُبلا کر لیا تھا۔ خوش شکل وہ پہلے بھی نہیں تھی۔

ٹریون نے منہ دھو کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس کا معاملہ ذرا اُلٹا تھا۔ وہ اب بھی وجیہہ تھا مگر موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ ایک بار پھر اس نے دل ہی دل میں ورزش اور ڈائٹنگ کا ارادہ کیا جو وہ اس سے پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا مگر عمل کی نوبت نہیں آئی تھی۔

مغرب سے تازہ تر، دو شرکائے حیات کا متوازی سفر

وہ دونوں اپنے اپنے شریکِ حیات کا کام تمام کرنے کا معاہدہ کر بیٹھے تھے۔ اس طرح دونوں کو نہ صرف آزادانہ طور پر کھل کھیلنے کا موقع ملتا بلکہ مقتولین کی دولت بھی اُن کے ہاتھ لگتی۔ مغرب کی روایتی بے وفائی پر ایک مختلف انجام کی کہانی۔ ایک ہی زاویے کے دو مختلف پہلو۔

معاہدہ

نسیم جاوید سیّد

وہ باتھ روم سے نکلا تو اس کا موڈ کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔

وہ باتھ روم سے کمرے میں آتے ہوئے بہ آوازِ بلند بولا۔ "آخر ہمیں اس ڈنر پر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا' نیوہال کو ہمیں ڈنر پر مدعو کرنے کا خیال کیونکر آگیا؟ ہم نے تو اس شخص سے سماجی تعلقات استوار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ تم خود ہی کچھ خیال کرو..... وہ شخص محض ایک اکاؤنٹنٹ ہے۔"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ محض ایک اکاؤنٹنٹ ہی نہیں' مالی مشیر بھی ہے۔" فیلائس بولی۔ فیلائس کے تمام حسابات اور انکم ٹیکس کے گوشوارے وغیرہ نیوہال ہی مُرتب کرتا تھا۔ فیلائس ایک دولت مند عورت تھی۔ ٹریون کو صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ اس کی بیوی کے مالی معاملات میں نیوہال کا اور کس حد تک دخل تھا۔

فیلائس بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں اب نیوہال کے ہاں ڈنر پر جانے سے مزید انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اس سے پہلے وہ تین مرتبہ ہمیں مدعو کرچکا ہے اور میں انکار کرچکی ہوں۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "تمہیں وہاں زیادہ بوریت نہیں ہوگی۔ میں نے سنا ہے' اس کی بیوی خوبصورت ہے۔"

فیلائس اس قسم کے طنز کے تیر چلا کر لطف اندوز ہوتی تھی۔ وہ شوہر کی بے وفائی کے اندیشے کو اکثر سامنے لاتی رہتی تھی۔ اس طرح درحقیقت وہ شوہر کی بے وفائی کے امکان کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُسے پہلے ہی خبردار کردیتی تھی کہ اس امکان پر اس کی نظر ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا یہ نسخہ اکثر و بیشتر کامیاب رہا تھا۔

ٹریون نے نیوہال کے گھر جانے کے لیے فیلائس کی ہدایت کے مطابق درمیانے درجے کی گاڑی نکالی حالانکہ ان کے گیرج میں رولز رائس اور ایک دوسری بیش قیمت گاڑی بھی کھڑی تھی لیکن فیلائس اپنے اور نیوہال کے رہن سہن کے درمیان طبقاتی فرق زیادہ نمایاں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نیوہال کے گھر پہنچ کر ٹریون کو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کچھ ایسے غریبانہ حال میں نہیں رہ رہا تھا۔ اس کا مکان دو منزلہ تھا' خاصا کشادہ تھا اور باعزت علاقے میں واقع تھا۔ نیوہال یقیناً اونچے متوسط طبقے کا فرد تھا۔

نیوہال نے دروازے پر ہی ان کا استقبال کیا۔ وہ واقعی ان کی آمد پر شکرگزار نظر آرہا تھا۔ ٹریون نے اس سے پہلے کبھی بغور اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ اس کے نزدیک محض "کوئی فربہ اندام شخص" تھا جو مہینے میں ایک بار بریف کیس اٹھائے ان کے گھر آتا تھا اور کافی دیر کے لیے فیلائس کے ساتھ اس کی اسٹڈی میں بند ہوکر بیٹھ جاتا تھا۔

آج پہلی بار ٹریون نے ذرا توجہ سے اس کی طرف دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ ایک جسیم شخص تھا۔ وہ فربہ اندام نہیں بلکہ ورزشی جسم کا مالک تھا اور یہ دیکھ کر ٹریون کو دل ہی دل میں ہلکی سی خوشی محسوس ہوئی کہ اس کے سر پر گنج نمودار ہوچکا تھا جبکہ ٹریون کا سر ابھی گھنے بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے ملنے جلنے والوں سے اپنا موازنہ کرنا ٹریون کا خفیہ مشغلہ تھا۔

چند لمحے بعد وہ نیوہال کی نشست گاہ میں پہنچے جہاں نیوہال کی بیوی ڈیریا ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ ڈرائنگ روم کی آرائش کسی پیشہ ور ڈیکوریٹر کی رہینِ منت معلوم ہوتی تھی۔ ڈیریا نیوہال ایک ادائے خاص سے ان کی طرف بڑھی۔ کسی زمانے میں وہ ماڈل رہی تھی۔ اس کی چال ڈھال میں اب بھی اس دور کے کافی اثرات باقی تھے۔ وہ تقریباً اپنے شوہر ہی کی ہم عمر یعنی چالیس سے ذرا اوپر تھی لیکن اس کے سنہرے بالوں میں سفیدی کی جھلک نہیں تھی۔ وہ خوش شکل اور پُرکشش تھی۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھی لیکن خدوخال کی دلکشی اس لباس میں بھی نمایاں تھی۔ ٹریون سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر فیلائس بھی دل ہی دل میں اس سے اپنے موازنے کا کھیل کھیل رہی تھی تو یقیناً اس کھیل میں اسے اپنی ہار کا احساس ہو رہا ہوگا۔

ابتدا میں رسمی گفتگو ہوتی رہی جو کچھ زیادہ ہی رسمی تھی تاہم نیوہال نے ان کے گلاس خالی نہیں ہونے دیے۔ ڈیریا نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا البتہ جب اسے معلوم ہوا کہ ٹریون ایک آرٹ گیلری چلا رہا تھا تو وہ ذرا دلچسپی سے بولی۔ "مجھے پینٹنگز سے عشق ہے لیکن میں ان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ میں مصوری کی باریکیوں سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں۔"

"مصوری کی باریکیوں کا تو خود ٹریون کو کچھ زیادہ علم نہیں۔" فیلائس ملامت سے بولی۔ "شاید اسی لیے یہ آرٹ گیلری عمدگی سے چلا رہا ہے۔"

ٹریون خوش دلی سے مسکرا دیا۔ دل ہی دل میں وہ شکرگزار تھا کہ فیلائس نے صرف اسی خفیف سے طنز پر اکتفا کیا تھا ورنہ وہ اس سے زیادہ چبھتی ہوئی کوئی بات بھی کہہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے میزبانوں کو یہ بھی بتا سکتی تھی کہ آرٹ گیلری درحقیقت اس نے خود خرید کر ایک کرسمس پر اپنے شوہر کو تحفے کے طور پر پیش کی تھی تاکہ دیگر مردوں کی طرح اس کے لیے بھی کام پر جانے اور صبح سے شام کرنے کا کوئی ٹھکانا بن سکے۔

کھانے کی میز پر نیوہال نے صرف ایک مرتبہ ٹریون کو گفتگو میں شریک کرنے کی کوشش کی جب اس نے پوچھا کہ کیا اسے کیمپنگ سے کوئی دلچسپی ہے؟ ٹریون کا جواب نفی میں تھا۔ تب نیوہال بتانے لگا کہ وہ خود کیمپنگ اور ایڈونچر کا دلدادہ ہے لیکن اس کی بیوی کو جنگلوں میں خیمے لگانے اور جانوروں کی طرح طرح کی آوازیں سننے سے نفرت ہے۔ ٹریون نے بتایا کہ وہ بھی "شہری جانوروں" کی آوازیں سننا پسند کرتا ہے' جنگلی جانوروں کی نہیں۔

فیلائس بولی۔ "آؤٹ ڈور سرگرمیوں میں ہم دونوں کو صرف گھڑسواری پسند ہے۔ ہماری پہلی ملاقات بھی گھڑسواری کے دوران ہی ہوئی تھی۔"

کچھ دیر اور اسی طرح کی گفتگو جاری رہی پھر نیوہال نے فیلائس کا محبوب ترین موضوع چھیڑ دیا۔ یعنی اس کے مالی معاملات۔ وہ بولا۔ "مجھے معلوم ہے' آپ عمدہ سرمایہ کاری کے نئے نئے مواقع تلاش کرتی رہتی ہیں۔ میں چند ایسی ہی چیزوں کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں....."

اس لمحے ٹریون کی توجہ گفتگو سے ہٹ گئی۔ کسی زمانے میں ان کے خاندان میں بھی کچھ دولت تھی لیکن انہوں نے اناڑیوں اور احمقوں کی طرح سرمایہ کاری کرکے اسے برباد کرلیا تھا۔ اب ٹریون کا تمام ٹھاٹ باٹ فیلائس کے سر پر تھا۔

نیوہال اور فیلائس سر جوڑ کر کاروباری گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ ملازمہ میز صاف کرنے لگی۔ ڈیریا' ٹریون کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "آیئے..... میں آپ کو لان دکھاؤں....."

وہ اٹھ کر باہر آگئے۔ ٹریون کو احساس تھا کہ عقب سے فیلائس اسے دیکھ رہی ہوگی حالانکہ اس نے ذرا بھی گردن نہیں موڑی تھی لیکن ٹریون کو معلوم تھا' بہت سی چیزیں وہ گردن موڑے بغیر بھی دیکھ لیتی تھی۔ نیوہال تو گویا ان کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ وہ فیلائس کو میونسپل بانڈز کے بارے میں بتا رہا تھا۔

باہر آکر ڈیریا گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "اس قسم کی باتوں سے میرا دم گھٹتا ہے۔"

"میرا بھی۔" ٹریون نے کہا۔

"میں تمہاری آرٹ گیلری دیکھنے آؤں گی۔" ڈیریا بولی۔ ٹریون نے اسے اپنا کارڈ دے دیا۔

رات گئے ٹریون اور فیلائس گھر واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں فیلائس بولی۔ "اگر تم اس عورت سے معاشقہ لڑانے کی سوچ رہے ہو تو اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔ اس کا شوہر کرائے میں بلیک بیلٹ ہے۔" ساتھ ہی فیلائس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بظاہر یہ بات مذاق میں کررہی تھی۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ پیر کو ڈیریا' ٹریون کی آرٹ گیلری دیکھنے آن پہنچی۔ اس نے دیواروں پر آویزاں پینٹنگز کا نہایت سنجیدگی سے معائنہ کیا پھر بولی۔ "اگر پچھلے کمرے میں بھی کوئی لائق توجہ چیز موجود ہے تو وہ بھی دکھا دو۔"

ٹریون اسے پچھلے کمرے میں لے آیا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اس لیے اندھیرا رہتا تھا۔ ٹریون نے لائٹ آن کی لیکن ڈیریا نے بجھا دی اور اس کے گلے میں بانہیں حمائل کردیں۔

وہ سرگوشی میں بولی۔ "میں نے جونہی تمہیں اور تمہاری بیوی کو دیکھا' مجھے اندازہ ہوگیا کہ تم سے میری دوستی ہوسکتی ہے لیکن اگر میرا خیال غلط ہے تو مجھے ابھی سے بتا دو۔ میں اب کوئی ایسی نوجوان نہیں رہی۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔"

"تمہاری صاف گوئی مجھے پسند آئی۔" ٹریون دیانتداری سے بولا۔

★ ✱ ★

ڈیریا کو ملاقاتوں کے لیے وقت نکالنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی کیونکہ اس کا شوہر اپنے کلائنٹس کی بہتر سے بہتر خدمت کے لیے دن رات مصروف رہتا تھا۔ ڈیریا کو کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ ٹریون نے جب محسوس کیا کہ ان کی آشنائی ابھی قائم رہے گی تو اسے اپنے معمولات میں کچھ تبدیلی کرنا پڑی۔

اس نے اپنی پارٹ ٹائم اسسٹنٹ بلین کی تنخواہ بڑھا کر اس کے اوقات کار میں اضافہ کردیا اور گیلری کا زیادہ کام اس پر ڈال دیا۔ اس نے خود گیلری کے اوپر ہی واقع ایک کمرے کا فلیٹ کرائے پر لے لیا اور زیادہ وقت وہاں گزارنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس ایک کمرے کے فلیٹ میں اس سے زیادہ خوش رہتا ہے جتنا فیلائس کے اٹھارہ کمروں کے مکان میں رہتا تھا۔

وہ بہت خوش تھا لیکن یہ خوشی اسے مضطرب بھی کررہی تھی۔ وہ زیادہ خوشی کا عادی نہیں تھا۔ اس کے تجربے کے مطابق زندگی شکستہ خوابوں اور تشنۂ تکمیل تمناؤں کا تسلسل تھی۔ اسے زندگی کے کسی بھی مرحلے پر مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ بچہ تھا تو اس کے خاندان میں دولت تھی۔ اس کے لڑکپن تک محض سفید پوشی رہ گئی۔ اب تک اسے کوئی ایسا کام نظر نہیں آیا تھا جس میں اس کا دل لگتا۔ تقریباً چونتیس کی عمر میں اس نے اپنی دانست میں اپنا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے ایک دولت مند عورت سے شادی کرلی تھی۔ مستقبل کا تو کچھ پتا نہیں تھا' فی الوقت تو وہ گویا اس عورت کا قیدی تھا۔

اسے پتا چلا کہ ڈیریا کے بھی اپنی زندگی کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات تھے بلکہ اس نے تو بوجھل لہجے میں ایک بار کہا تھا۔ "میری زندگی تو تم سے بھی بدتر ہے کیونکہ میں ایک عورت ہوں' تم مرد ہو۔ تم پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنی محرومیوں کی تلافی کرسکتے ہو۔ اب مجھے ان گھسے پٹے الفاظ سے تسلی دینے کی کوشش نہ کرنا کہ عورت ہونے کے زیادہ فائدے ہیں۔ چالیس کی عمر کے بعد ہماری سوسائٹی میں عورت ہونے کے فائدے ختم ہوجاتے ہیں۔ میں کبھی خوبصورت تھی۔ اگر وہ خوبصورتی بھی میرا ساتھ دیتی رہتی تو کوئی بات نہیں تھی مگر افسوس کہ نوجوانی کے ساتھ ساتھ گویا خوبصورتی بھی رخصت ہوگئی۔"

ٹریون نے موقع کی مناسبت سے اس کے حسن کی تعریف سے اس کی دلجوئی کی کوشش کی لیکن اسے اس وقت اس غیم دلانہ تعریف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ افسردگی سے بولی۔ "جلد یا بدیر یہ رفاقت بھی ختم ہوجائے گی۔ تمہیں اپنی بیوی کے بارے میں سوچ سوچ کر گھبراہٹ اور وحشت ہونے لگے گی یا میرے شوہر کو احساس ہوجائے گا کہ میں شہر کے کچھ زیادہ ہی چکر لگانے لگی ہوں۔ ہم ملنے سے کترانے لگیں گے۔ یونہی دھیرے دھیرے بڑھاپا آجائے گا..... بس..... یہ ہے زندگی کی کل کہانی۔"

ٹریون کو اس کی حقیقت پسندی پر جھرجھری سی آگئی۔

ایک روز ٹریون نے طلاق کا موضوع چھیڑا لیکن ڈیریا نے یہ

کہہ کر کندھے اُچکا کر بات ختم کردی۔ "مالی معاملات میں میرا شوہر بڑا شاطر ہے۔ وہ مجھے اس طرح چھوڑے گا کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوگی۔"

ٹریون نے فیلائس کے بارے میں سوچا تو وہ بھی کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ ان کے درمیان معاہدہ تھا کہ کوئی بھی طلاق لے گا تو اسے دوسرے کی جائیداد سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ ٹریون کے پاس اپنا تو کچھ تھا ہی نہیں۔

ایک ویک اینڈ پر نیوہال کہیں کیمپنگ کے لیے چلا گیا اور فیلائس اپنے اسکول کے زمانے کی دوستوں کے کسی سلسلۂ تقریبات میں شرکت کے لیے چلی گئی۔ ان کی عدم موجودگی میں ٹریون اور ڈیریا نے تقریباً دو دن اکٹھے گزارے۔ اتوار کی رات انہوں نے اتنی شیمپئن پی کہ حواس کچھ دھندلانے لگے۔

ڈیریا گلاس کے اوپر سے اُلو کی طرح گول گول آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تم سے ایک معاہدہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"بہت خوب!" ٹریون بولا۔ "مجھے معاہدے بہت پسند ہیں۔ سودے بازی مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"میں جس معاہدے کی بات کررہی ہوں اسے سن کر تمہاری گھگھی بندھ جائے گی۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ زندگی میں کچھ تو سنسنی آئے۔" ٹریون بولا۔

"تو پھر سنو۔ تم اپنی بیوی کا بندوبست کرو' میں اپنے شوہر کا بندوبست کرتی ہوں۔"

ٹریون قدرے لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ "تمہارا مطلب ہے..... ان سے چھٹکارا حاصل کرلیں؟"

ڈیریا مخمور سے انداز میں کھلکھلائی۔ "میرا خیال ہے ہم واقعی یہ کام کرسکتے ہیں..... کم از کم میں تو کرسکتی ہوں..... بلکہ ایک بار تو میں تقریباً کرہی گزری تھی۔ میں نے اس کی کھوپڑی پر بالوں کا بُرش دے مارا تھا۔ اگر میرے ہاتھ میں بالوں کے بُرش کی جگہ ہتھوڑا ہوتا تو اس کی کھوپڑی ٹوٹ چکی ہوتی..... میں مذاق نہیں کررہی ہوں....."

"میں چشم تصور سے تمہیں جیل میں دیکھ رہا ہوں....." ٹریون بھی مخمور سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "موٹی موٹی باوردی عورتیں تمہیں دھکیلتی ہوئی بجلی کی کرسی کی طرف لے جارہی ہیں..... تمہارا سر مونڈا جاچکا ہے....." وہ اس کے سنہرے بالوں کی لٹوں سے کھیلنے لگا۔

ڈیریا سنجیدگی سے بولی۔ "مجھے تو معلوم ہے' میں اپنے حصے کا کام کیسے کروں گی۔ میں ہیئر بُرش سے زیادہ بھاری اور ٹھوس چیز سے اس کی کھوپڑی پر وار کروں گی پھر اس کی لاش جنگل میں پھینک آؤں گی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ایک مرتبہ نیوہال دو دن کے لیے گم ہوگیا تھا۔ وہ کیمپنگ کے لیے جنگل میں گیا تھا اور جس دن کا کہہ کر گیا تھا اس دن واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے پولیس کی مدد حاصل کی تو پتا چلا کہ موصوف راستہ بھول گئے تھے....." اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اتنا لحیم شحیم بوائے اسکاؤٹ راستہ بھول گیا.....!"

"اوہ..." ٹریون احمقانہ سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"چلو خیر..... چھوڑو۔" ڈیریا خود ہی بولی۔ "مجھے معلوم ہے' اس قسم کے منصوبے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ انجام کار ہم جیل میں ہوں گے اور مجرموں کے انٹرویوز کا جو پروگرام ٹی وی پر پیش کیا جاتا ہے' اس میں ہمارا بھی انٹرویو نشر ہورہا ہوگا۔"

"ہاں..... حالات جیسے ہیں انہیں ویسے ہی رہنے دو۔" ٹریون بولا۔

"نہیں۔ یہ تو نہیں ہوسکتا۔" ڈیریا فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔ "حالات جیسے ہیں انہیں ویسے ہی نہیں چھوڑا جاسکتا....."

اس کے بعد ایک ہفتے تک اسے ڈیریا کے بارے میں کچھ پتا نہ چلا۔ وہ خود آئی' نہ اس کا کوئی پیغام آیا۔ ٹریون کو وحشت ہونے لگی' وسوسے ستانے لگے۔ اس نے نیوہال کے گھر فون کیا اور ڈیریا کے بجائے پہلے نیوہال ہی کو پوچھا۔ ان کی موٹی ہسپانوی ملازمہ بول رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ مسٹر نیوہال اپنے آفس میں تھے۔ تب اس نے اس طرح سرسری سے انداز میں "مسز نیوہال" کے بارے میں پوچھا گویا شوہر کے نہ ملنے پر بیوی سے ہی کوئی بات پوچھنے کا ارادہ کررہا ہو لیکن ملازمہ نے بتایا کہ وہ بھی گھر پر نہیں ہے۔ تب ٹریون کو وسوسے کچھ زیادہ ہی ستانے لگے۔

وہ گاڑی میں بیٹھ کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے گاڑی گھر سے کافی دور ہی روک لی۔ وہاں سے وہ گھر پر نظر رکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں گاڑی میں بیٹھا رہا۔ آخر کار اس کا انتظار رنگ لایا۔ ڈیریا ایک اسٹیشن ویگن میں گھر آپہنچی اور اس کا پچھلا دروازہ کھول کر کچھ گملے اتارنے لگی جو غالباً وہ کسی نرسری سے لائی تھی۔

ٹریون نہایت آہستگی سے گاڑی چلاتا ہوا اس کے قریب سے گزرا اور کھڑکی سے سر نکال کر نیچی آواز میں بولا۔ "کیا آئندہ تم سے ملاقات نہیں ہوگی؟"

ڈیریا نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔

دوسرے دن ٹریون کی آرٹ گیلری میں فون کی گھنٹی بجی۔ بلین نے فون سنا اور ریسیور ٹریون کی طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف ڈیریا تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ "گزشتہ شب اس نے مجھے تھپڑ مارا..... کاش تم سنتے' وہ مجھے کن کن القابات سے نواز رہا تھا..... میرا خیال ہے' اسے ہمارے بارے میں شبہ ہوگیا ہے۔"

"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" ٹریون نے تشویش سے پوچھا۔

"وہی جو ہم نے سوچا تھا۔" ڈیریا نے سرگوشی کی۔ "اگر میں وہ کام کرلیتی ہوں تو کیا تم بھی کرو گے؟ مجھے ابھی اور اسی وقت جواب دو۔"

بلین اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ غنیمت رہا کہ اسی وقت

ایک گاہک آگیا اور بلین اس سے بات کرنے چلی گئی۔ ٹریون نے ایک لمحے کے لیے دانت مضبوطی سے بھینچے پھر نیچی آواز میں بولا۔ "میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھ میں اتنی ہمت ہے یا نہیں..... لیکن اگر تم ایسا کرتی ہو..... میرا مطلب ہے' کیا تم واقعی ایسا کر سکتی ہو.....؟"

"سیدھی طرح بات کرو۔ کیا میں سمجھوں کہ ہمارے درمیان معاہدہ طے پا گیا؟" ڈیریا نے جاننا چاہا۔

اسی دوران بلین' گاہک کو اس کے پاس لے آئی۔ وہ واقعی تصویر خریدنا چاہتا تھا۔ ٹریون نے فون بند کر دیا۔

اس رات کھانے کی میز پر ٹریون نے محسوس کیا کہ فیلائس کچھ پریشان سی تھی۔ ٹریون کے استفسار پر اس نے بتایا۔ "کل مجھے نیوہال کی مدد کی ضرورت ہے اور وہ آ نہیں سکے گا۔ کمبخت انکم ٹیکس والوں کا نوٹس آیا ہوا ہے کہ کچھ سرمایہ کاریوں پر ٹیکس کے بقایا جات موجود ہیں....." اس نے کمپیوٹر پر ٹائپ شدہ ایک لمبا چوڑا سرکاری سا خط اس کے سامنے پٹخ دیا لیکن ٹریون کو اس کے سر پیر کی سمجھ نہیں آئی۔

"نیوہال کل کیوں نہیں آسکتا؟" ٹریون نے دریافت کیا۔

"وہ دو ہفتے کے لیے کیمپنگ پر روانہ ہو رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سردیاں شروع ہونے سے پہلے اس کا کیمپنگ پر جانے کا یہ آخری موقع ہے۔ میں اتنی پریشان ہوں کہ میرا چیخیں مارنے کو جی چاہ رہا ہے۔ میں انکم ٹیکس والوں کے یہ دھمکی آمیز خطوط برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے اس قسم کے خطوط سے نفرت ہے۔"

"سبھی کو ہے۔" ٹریون نے سر ہلایا۔

"میں نیوہال کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتی۔ میں صبح جا کر وکرمین سے ملوں گی۔" فیلائس بولی۔ وکرمین اس کے وکیل کا نام تھا۔ "تم کل گیلری سے چھٹی کر سکتے ہو؟ اصل میں کل صوفوں کا کپڑا تبدیل کرنے والوں کو آنا ہے۔ میں نے ان سے وقت لے رکھا ہے لیکن مجھے اب وکیل کے پاس جانا ہے۔ اگر تم گھر رہ جاؤ تو تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ انہیں وہ صوفے اور کاؤچ دکھا دینا جن کا کپڑا تبدیل کرنا ہے۔ ذرا دیر ان کے سر پر کھڑے رہو گے تو کام اچھا ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے اتنا تو تم کر ہی سکتے ہو؟"

"ٹھیک ہے۔ میں گھر رہ جاؤں گا۔" ٹریون ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

دوسرے دن ٹریون گھر پر رہا اور دوپہر سے پہلے اس نے تین ٹیلی فون ریسیو کیے۔ پہلا فیلائس کی ماں کا تھا جس نے منمناتے ہوئے شکوہ کیا کہ اس کی بیٹی اس سے ہفتہ وار ملاقات کے لیے کیوں نہیں آئی تھی۔ دوسرا صوفے مرمت کرنے والوں کا تھا جنہوں نے معذرت کے ساتھ مطلع کیا تھا کہ وہ صوفوں کا کپڑا تبدیل کرنے نہیں آسکیں گے۔ تیسرا ڈیریا کا تھا۔

"میں نے گیلری فون کیا تھا....." وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ "شکر ہے تم گھر پر موجود ہو۔ تمہیں ذرا میری طرف آنا پڑے گا۔"

"کیا ابھی؟" ٹریون نے پوچھا۔

"تو اور کیا اگلے ہفتے؟" ڈیریا خفگی سے بولی۔

"کیا تمہارا شوہر کیمپنگ کے لیے روانہ ہو گیا؟"

"ہاں۔ وہ اپنے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔" ڈیریا نے جواب دیا۔

ٹریون گاڑی میں اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ ان کے گھروں کے درمیان تقریباً دس میل کا فاصلہ تھا۔ ٹریون نے جان بوجھ کر گاڑی کی رفتار کم رکھی۔ نہ جانے کیوں وہ کچھ خوف سا محسوس کر رہا تھا۔

وہ ڈیریا کے ہاں پہنچا تو وہ دروازے پر ہی منتظر ملی۔ گھر پر وہ یقیناً اکیلی ہی تھی۔ وہ بغلوں میں ہاتھ دیے کھڑی تھی۔ دھوپ اس کے بالوں اور چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی رنگت بالکل سفید لگ رہی تھی اور اس وقت وہ انسان کے بجائے کوئی روح معلوم ہو رہی تھی۔

"میرے ساتھ گیرج میں آؤ۔" وہ سرگوشی میں بولی اور آگے آگے چل دی۔

وہ گھر کے عقب میں واقع گیرج تک پہنچے۔ ڈیریا نے ایک جھٹکے سے دروازہ اوپر اٹھایا۔ اسٹیشن ویگن گیرج میں کھڑی تھی۔ ڈیریا نے اسے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔

ٹریون نے دروازہ کھولا۔ اندر کینوس کے ٹینٹ میں کوئی لمبی چوڑی سی چیز لپٹی پڑی تھی۔ ٹریون کو اسے چھوئے اور کینوس ہٹائے بغیر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چیز تھی۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ ڈیریا نے بدمزگی کے سے عالم میں آگے بڑھ کر کینوس کا کچھ حصہ ہٹایا۔ ٹریون کو نیوہال کا زندگی سے محروم چہرہ نظر آیا۔ کینوس کے نیچے سے ..... دروازے کی طرف خون بھی نہایت آہستگی سے بہتا نظر آرہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دروازہ کھلا رہا تو چند منٹ بعد خون گاڑی سے ٹپکنے لگے گا اور ٹریون کے جوتوں پر گرے گا۔ ٹریون نے ہڑبڑا کر پیچھے ہٹتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

ڈیریا نے گاڑی کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر دیا اور اسے اپنی طرف گھماتے ہوئے بولی۔ "اب یہ بچوں کی طرح منہ بسورنا چھوڑو..... اگر تم سے خون نہیں دیکھا جاتا تو تم اپنے حصے کے کام میں زہر استعمال کر لینا۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیرت سے بولا۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے' میرا مطلب کیا ہے؟" ڈیریا برہمی سے بولی اور سڑکوں کا ایک نقشہ نکال کر نہایت توجہ سے دیکھنے لگی۔

★ ✱ ★

اس شام فیلائس باہر سے واپس آئی تو اس کا موڈ اچھا نہیں تھا۔ وکرمین ٹیکس اور مالیات کے معاملے میں اس کی زیادہ مدد اور رہنمائی نہیں کر سکا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ انکم ٹیکس والوں کو کچھ دن لٹکائے رکھے گا لیکن نیوہال سے اس کی ملاقات بہرحال ضروری

تھی اور وہ موصوف شاید ٹارزن بننے جنگلوں میں نکلے ہوئے تھے۔ دو ہفتوں تک ان کی واپسی کی امید نہیں تھی۔

ٹریون نے جب فیلائس کو بتایا کہ اس کی ماں فون پر شکوہ کر رہی تھی اور صوفے مرمت کرنے والے آئے ہی نہیں تھے تو فیلائس تقریباً رو دی۔

وہ اپنا منک کوٹ بے رحمی سے الماری میں ٹھونستے ہوئے بولی۔ "ہر کام ایک مصیبت کیوں بنتا جا رہا ہے؟"

"ان پریشانیوں سے بچنے کے لیے تمہیں معمولات کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔" ٹریون نے مشورہ دیا۔ "تمہیں کسی تفریحی سفر یا اس طرح کے کسی اور پروگرام کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"تمہیں معلوم ہے، سمندری سفر سے تو میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔" فیلائس بولی۔ "البتہ بہت عرصے سے ہم گھڑسواری کے لیے پروگرام پر نہیں گئے۔ کیا خیال ہے..... گھڑسواری کے لیے چلیں؟"

"ضرور..... ضرور....." ٹریون بولا۔ ایک بار پھر اس کا ذہن ان گھنے جنگلوں کے تصور میں الجھ گیا جن میں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔

ٹریون چار دن تک گھڑسواری کے پروگرام کے انتظامات نہیں کر سکا اور ان چار دنوں کے دوران اس کا ذہن سُن سا رہا۔ فیلائس اس دوران پہلے اپنی ماں کے شکوے دور کرنے گئی پھر اس نے صوفے مرمت کرنے والوں کی خبر لی۔ وہ آکر صوفے اٹھا کر لے گئے۔ اس دوران ڈیریا سے ٹریون کا کوئی رابطہ نہیں ہو سکا اور اس کے شوہر کا بھی کوئی پتا نہیں چل سکا۔ وہ جنگل میں کسی ایسی جگہ تھا جہاں اس سے رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سادہ الفاظ میں بھی حقیقت یہی تھی لیکن ٹریون کی نظر میں اس کا حقیقی مفہوم کچھ اور تھا۔

بالآخر وہ دن آگیا جب وہ گھڑسواری کے لیے روانہ ہوئے۔ پہلے وہ گاڑی میں میڈولین فارمز تک پہنچے جہاں گھوڑے پالے اور سدھائے جاتے تھے۔ وہاں سے انہوں نے گھوڑے لیے اور جنگلوں کے سفر پر روانہ ہوئے۔ فیلائس بچپن سے گھڑسواری کر رہی تھی لیکن وہ گھڑسواری میں بھی اپنی متانت برقرار رکھتی تھی۔ ٹریون واجبی سا گھڑسوار تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک مسکین سا گھوڑا منتخب کیا تھا جبکہ فیلائس نے اپنے لیے کوئیک سلور نامی جو گھوڑا منتخب کیا تھا اس کی شہرت ایک تیز رفتار اور قدرے تُند مزاج گھوڑے کی تھی۔ اس کی زین اور رکاب بھی ذرا مختلف ساخت کی تھی۔ اس پر سوار ہوتے وقت فیلائس پھسل کر گر پڑی تھی لیکن خوش قسمتی سے اسے چوٹ نہیں آئی تھی۔

"اصل میں ہم کئی سال بعد گھڑسواری کے لیے نکلے ہیں....." ٹریون نے فارم پر کام کرنے والے نگران کو بتایا۔ "کچھ عادت سی نہیں رہی۔"

"تو پھر اس پگڈنڈی پر ذرا ہوشیار رہیے گا جس پر آپ روانہ ہو رہے ہیں۔" نگران نے مشورہ دیا۔ "پچھلے ہفتے یہاں بہت بارشیں ہوئی ہیں۔ پگڈنڈی کے آس پاس بہت سی نئی نالیاں سی بن گئی ہیں۔"

"ہم محتاط رہیں گے۔" ٹریون نے ممنونیت سے کہا۔ اس کے حق میں یہ بہت اچھا ہوا تھا کہ فیلائس، نگران کے سامنے ہی گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے گر پڑی تھی اور نگران نے راستے کی خرابیوں کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔

وہ آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ خاصے گھنے جنگل میں جا پہنچے۔ فیلائس نے گھوڑے کی رفتار خاصی تیز کر لی تھی۔ ٹریون بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اس کے برابر پہنچا اور تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے گھوڑے کی زین کے بارے میں مطمئن نہیں ہوں..... ذرا ٹھہرو..... میں اس کی بندشیں ٹھیک کر دوں۔"

دونوں نے گھوڑے روکے اور ٹریون، فیلائس کے گھوڑے کے نیچے جھک کر زین کی بندشیں "ٹھیک" کرنے لگا۔ فیلائس بہت متاثر ہوئی۔

"کیسا عجیب لگ رہا ہے کہ تمہیں بھی میرے بارے میں تشویش ہو رہی ہے۔" وہ بولی۔

"تمہیں کیا معلوم کہ مجھے تمہارا کتنا خیال رہتا ہے۔" ٹریون ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس بار فیلائس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو وہ یک دم ہی بے قابو سا ہو کر دوڑا۔ فیلائس ٹانگوں کی گرفت سے کچھ دیر اس پر جمی رہی لیکن اس دوران گھوڑے کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ آخر کار زین اس کے نیچے سے پھسل گئی۔ وہ ایک زوردار چیخ کے ساتھ دور جا کر گری۔ اس کا سر ایک گرے ہوئے درخت کے تنے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

ٹریون اس کے قریب پہنچا تو وہ تکلیف سے چیخ رہی تھی لیکن ہاتھ پیروں کی حرکت بتا رہی تھی کہ اس کی کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔ خون صرف اس کی پیشانی پر نظر آ رہا تھا۔ ٹریون نے گھوڑے سے اُتر کر جلدی سے اس کی پیشانی پر رومال رکھا لیکن اس کا حقیقی مقصد خون روکنے سے زیادہ اس کی آنکھیں ڈھانپنا تھا۔

اسے تسلی دیتے ہوئے ٹریون نے خود کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر قریب پڑی ہوئی تقریباً دو فٹ لمبی ایک بھاری سی ٹوٹی ہوئی شاخ اٹھائی اور پوری قوت سے فیلائس کی کھوپڑی پر وار کیا۔ فیلائس کی کھوپڑی کچلنے کے لئے ایک ہی وار کافی رہا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ فیلائس مر چکی تھی تب اس نے شاخ اس کی کھوپڑی کے نیچے اس طرح پھنسا دی اور فیلائس کی گردن اس طرح موڑ دی جیسے وہ نہ جانے کتنی قوت سے اس شاخ پر ہی آکر گری تھی۔

پھر وہ ایک عجیب وحشت کے سے عالم میں واپس روانہ ہو گیا۔

★ ✱ ★

فیلائس کی افسوس ناک "حادثاتی" موت کو دو ہفتے گزر چکے تھے لیکن نیوہال کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔ فیلائس کے وکیل وکرمین نے نہایت تکلیف اور پریشانی کے عالم میں اکاؤنٹنگ کی ایک فرم کی مدد سے فیلائس کی جائیداد اور اثاثوں کا حساب کتاب اور ضروری گوشوارے تیار کرائے تھے۔

یہ کام بڑا مشکل ثابت ہوا تھا کیونکہ ایک عرصے سے فیلائس کے تمام حسابات اکیلا نیوہال سنبھالتا چلا آرہا تھا۔ وہی اس کے تمام مالی معاملات کا مختار تھا اور ان کی تفصیلات میں وہ کسی کو شریک نہیں کرتا تھا۔ وکرمین کو ساری صورت حال کی ایک جامع رپورٹ تیار کرنے میں کئی دن لگ گئے۔ آخر کار یہ کام ختم ہوا تو اس نے "غمزدہ" شوہر سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔

ٹریون، وکیل کے دفتر پہنچا تو مضمحل اور بیمار نظر آرہا تھا۔ بیوی کی موت کے بعد سے حقیقتاً اس کا کھانا پینا حرام ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے جن کی وجہ سے اس کی سوگواری اور مستند نظر آرہی تھی۔

"کیا ان معاملات پر اتنی جلدی بات کرنا ضروری ہے؟" وہ اذیت زدہ لہجے میں بولا۔ "مجھے فیلائس کی وصیت سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"میں نے تمہیں یہاں وصیت کے سلسلے میں نہیں بلایا۔" وکیل بولا۔ "سچی بات یہ ہے کہ وصیت کی تو اب کوئی خاص اہمیت بھی نہیں رہی۔"

ٹریون نے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں اور ناک صاف کی۔ اس وقت تمام حرکات و سکنات کی اہمیت تھی۔ وہ مغموم سے لہجے میں بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ شادی کے معاہدے کی موجودگی میں وصیت....."

وکرمین اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "معاہدے سے وصیت نامے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اس سے پڑ رہا ہے....."

اس نے پن سے جڑے ہوئے دو بڑے بڑے کاغذ ٹریون کی طرف بڑھائے۔ پہلے کاغذ پر آڈٹ کی کسی فرم کی طرف سے کوئی رپورٹ درج تھی۔ دوسرا کاغذ اعداد و شمار سے بھرا ہوا تھا۔ وہ غالباً فیلائس کے اثاثوں کی تفصیل تھی لیکن ٹریون کی سمجھ میں نہ آیا کہ بیشتر اعداد و شمار کے ساتھ نفی کا نشان کیوں لگا ہوا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ کاغذوں کو الٹنے پلٹنے کے بعد بولا۔

"سادہ زبان میں مختصر سی بات یہ ہے کہ فیلائس نے درحقیقت اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا۔ اس کی جائیداد بھی اس کے قرضے اتارنے کے سلسلے میں بک جائے گی۔" وکرمین بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے مسٹر وکرمین؟ یہ تو سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔" ٹریون بولا۔

"احمقانہ قسم کی سرمایہ کاری واقعی سمجھ میں نہ آنے والی ہوتی ہے۔ ایک طویل عرصے سے فیلائس کو نہ جانے کون سا مالی مشیر ملا ہوا تھا جس کے مشوروں سے وہ اپنا سرمایہ دھڑا دھڑ بیکار اور کھوکھلے قسم کے منصوبوں میں لگاتی رہی، نہ جانے کن کن بوگس کمپنیوں کے شیئرز خریدتی رہی۔ معلوم نہیں کون اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ شاید کسی نے گھما پھرا کر..... اِدھر اُدھر چکر دے کر درحقیقت اس کے سرمائے کا بہاؤ اپنی طرف کیا ہوا تھا....."

ٹریون کو کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ کس طرح وکیل کے دفتر سے نکلا اور کس طرح ٹیکسی پکڑ کر ریلوے اسٹیشن تک پہنچا۔ اس کا ذہن گویا آسمان اور زمین کے درمیان کہیں معلق تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ صحیح اسٹیشن پر اتر گیا۔ اسٹیشن کی پارکنگ لاٹ سے اس نے اپنی گاڑی نکالی اور اس میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں غیر ارادی سے انداز میں اس نے گاڑی ڈیریا کے گھر کی طرف موڑ لی۔

ان کی پُرسکون گلی میں پہنچ کر ٹریون نے دیکھا، ڈیریا کی اسٹیشن ویگن اس کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈیریا اندر سے سوٹ کیس اور دیگر سامان لا کر اسٹیشن ویگن میں بھر رہی تھی جبکہ اس میں پہلے ہی بہت سامان بھرا ہوا تھا۔

اس وقت ٹریون کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے نیوہال کو بھی گھر سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ بھی دو بیگ اٹھائے آرہا تھا۔ وہ بالکل صحت مند اور بھلا چنگا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر پر کہیں خراش تک نظر نہیں آرہی تھی۔

"میرا خیال ہے، یہ بیگ میں پچھلی سیٹ پر رکھ دوں۔" وہ خوشگوار لہجے میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

"اب تو پچھلی سیٹ پر بھی جگہ نہیں ہے۔" ڈیریا بھی خوشگوار لہجے میں بولی۔ ٹریون نہایت خاموشی سے گاڑی سے اتر کر ان کے قریب پہنچا۔ وہ صرف ایک لمحے کے لیے اسے دیکھ کر ساکت ہوئے پھر ڈیریا خوش دلی سے بولی۔ "ہیلو ٹریون! اچھا ہوا تم ہمیں رخصت کرنے آپہنچے۔"

"ہم لوگ جنوب کی طرف سفر پر روانہ ہو رہے ہیں....." نیوہال نے اسے مطلع کیا۔ "میکسیکو..... ساؤتھ امریکا وغیرہ جائیں گے..... عین ممکن ہے، ہوائی بھی چلے جائیں۔ کوئی بھی ایسی جگہ جہاں سردی نہ ہو۔"

ٹریون خاموش کھڑا تھا۔ اسے گاڑی کے پچھلے حصے میں دروازے کے قریب اب بھی کہیں کہیں سرخ ذرّات سے نظر آرہے تھے لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس نے نیوہال کی "لاش" کے نیچے سے جو خون بہتے دیکھا تھا وہ یقیناً سرخ پینٹ تھا۔

ڈیریا نے مزید وضاحت کی۔ "دراصل ہم لوگ اس لیے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں کہ اس مرتبہ موسمی پیش گوئی کے مطابق یہاں شدید سردی پڑے گی....."

..... لیکن ٹریون تو سردیوں کی آمد سے پہلے ہی اپنے اندر ایک برف زار پھیلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

THE DEAL
HENRY SLESAR

ہمارے اپنے گلی کوچوں میں ہونے والا تماشائے آہن و سنگ
ہمارے آپ کے گرد بکھرے ہوئے کرداروں کی داستانِ ہزار رنگ

زندگی کٹھن بھی ہے اور آسان بھی۔ پُر پیچ بھی ہے اور سادہ بھی۔ اس میں رنگ وفا بھی ہے اور زہرِ جفا بھی۔ کہیں لوگ غیروں کو اپنا نمود دے کر زندہ رکھتے ہیں تو کہیں اپنوں کا خون چوستے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتے۔ یہ پل پل رنگ بدلتی زندگی کے ایسے ہی اونچے نیچے راستوں اور رنگین و سنگین لمحوں کی داستان ہے، ایک سادہ و معصوم نوجوان کا فسانۂ حیات ہے جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور آنکھوں میں مستقبل کے حسین مگر دھندلے خواب تھے۔ اُسے شاہراہِ حیات پر طویل سفر درپیش تھا لیکن گردشِ ایام اور شورشِ حالات نے اُس کے راستے ہی بدل دیے، نت نئی منزلیں اُس کے سامنے آ گئیں۔

باذوق قارئین کی پسند۔ ایک ہنگامہ خیز سلسلہ

کرکش

محمود احمد مودی

شکر گڑھ کے ایک غریب خاندان میں میری پیدائش ہوئی۔ پیدائش کے کچھ عرصے بعد ہی میری والدہ وفات پا گئیں۔ والد نے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مجھے اسکول میں داخل کروادیا۔ ابھی میں نے ایف اے ہی کیا تھا کہ میرے والد دو چوہدریوں کے ایک تنازعے میں اپنے آقا پر قربان ہو گئے۔ مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عرصۂ حیات تنگ ہونے پر میں نے ایک جھلی پیر مشل شاہ کا سہارا ڈھونڈلیا۔ بھانڈا پھوٹ جانے پر مشل شاہ نے مجھے اپنے ایک ٹھیکے دار دوست کے پاس بھیج دیا جہاں لالی نامی ایک لڑکی مجھ سے ٹکرائی اور میں اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوگیا۔ اسی دوران میں نے اشرف خان نامی ایک اسمگلر کے ساتھ مل کر اسمگلنگ کا مال اِدھر اُدھر کرنا شروع کردیا۔ ہمارا دھندا کامیابی سے جاری تھا کہ ایک روز میں خرکاروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے مجھ پر بہت تشدد کیا۔ ایک روز موقع پاکر میں ایک نوعمر لڑکے راشد کے ہمراہ کیمپ سے بھاگ نکلا۔ میں نے راشد کو اس کے گھر چھوڑا اور اشرف خان کے پاس پہنچ گیا۔ ہم نے دوبارہ اپنے دھندے کا آغاز کردیا۔ ایک کامیاب مہم سے لوٹنے کے بعد ہم گھر میں آرام کررہے تھے کہ ہمارے حریف استاد لبھو کی مخبری پر ایکسائز والوں نے چھاپا مارا۔ افراتفری کے عالم میں فرار ہوتے ہوئے اشرف خان گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا۔ میں نے لاہور پہنچ کر اشرف خان کے کزن قاسم خان کے ساتھ کام شروع کردیا جو زیادہ بڑا اسمگلر تھا۔ فرصت ملنے پر ایک روز میں راشد کے گھر جا پہنچا جہاں میری ملاقات اس کی بہن راحیلہ سے ہوئی جو محبت میں بدل گئی۔ قاسم خان منشیات کی ایک بڑی کھیپ امریکا اسمگل کرتے ہوئے گرفتار ہوگیا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں گروہ سے الگ ہوگیا اور اپنا کام شروع کردیا۔ اس دوران راحیلہ نے اچانک ہی شادی کرلی۔ یہ میری زندگی کی بدترین شکست تھی۔ میرا کام کامیابی سے چل نکلا تھا۔ اپنی بلیک منی کو وہائٹ کرنے کے لیے میں نے کراچی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل بنانے کے ساتھ ساتھ ایک فلم کمپنی بھی خریدلی۔ فلم میکنگ کے دوران مجھے خانہ بدوشی کے عرصے میں ٹھیکے دار کے ہاں ٹکرانے والی لڑکی لالی ملی جو آج کی مشہور فلم اسٹار ستارہ تھی۔ ایک موقعے پر ایک ایکسٹرا لڑکی ہنی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کی۔ ایک روز استاد لبھو کو سامنے دیکھ کر میرے وجود میں دبی ہوئی نفرت کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی اور میں نے ایک سخت، خونریز معرکے کے بعد استاد لبھو کو گردن توڑ کر ہلاک کردیا۔ اس کے بعد میں نے ایک جعلی فلمی مصنف نصیر نواز کو اس کی دوسروں کے ساتھ زیادتیوں اور ظلم پر اس خوب صورتی سے پھانسی پر لٹکایا کہ اس کی موت خودکشی معلوم ہو۔ کراچی میں ایک اسمگلر سیٹھ عالم شیر کے آدمیوں نے میری ایک لانچ کو گرنیڈ مار کر تباہ کردیا۔ اس کے جواب میں اچھی خاصی مرمت کے بعد عالم شیر نے ایک بھاری رقم زرِ تلافی کی مد میں دینا منظور کرلی۔ ایک روز مجھ پر گھات لگا کر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ حملہ آوروں میں سے تین میرے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے جبکہ چوتھا میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ زندگی کے انہی ہنگامہ خیز روز و شب میں کراچی میں میرے فائیو اسٹار ہوٹل کے افتتاح کا خوب صورت لمحہ بھی آگیا۔ میں کراچی پہنچا تو میری ملاقات اچانک ہی راشد سے ہوگئی۔ اس کے ممی، ڈیڈی فوت ہوچکے تھے اور راحیلہ کو طلاق ہوگئی تھی۔ میں نے راشد اور راحیلہ کو لاہور شفٹ ہونے پر آمادہ کرلیا۔ میں واپس لاہور پہنچا تو کوئی ریڈ ڈاٹ نامی پُراسرار تنظیم میرے پیچھے پڑ گئی اور عجیب و غریب واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ریڈ ڈاٹ کے ایک بندر نما انسان اے نن نے مجھے زچ کرکے رکھ دیا۔ انہوں نے ہنی کو اغوا کرالیا اور اس کی والدہ کو قتل کردیا۔ میں ہنی کو ان کی تحویل سے آزاد کرانے پہنچا تو ریڈ ڈاٹ کے تین آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اس کے چند روز بعد ایک انتہائی ہولناک سازش میرے علم میں آئی جس کے تحت ملک کے وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب کو میرے کراچی کے ہوٹل میں قتل کردیا جاتا مگر میں نے اس سازش کو اتنی کامیابی سے ناکام بنایا کہ حفیظ صاحب بھی حیران رہ گئے۔ میں نے اپنے دو دشمنوں ملک اسلم اور ملک قیصر کو نہایت عمدگی سے ٹھکانے لگادیا۔ اس کے بعد میں نے ملک ریاض کی بھی اچھی طرح خبر لی جو ملک اسلم اور ملک قیصر کی دولت و جائداد کا وارث تھا اور مجھ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کے پروردہ ایک مشہور اور بڑے ڈاکو نورو ماچھی کی میں نے خوب جی بھر کے ٹھکائی کرنے کے بعد چھت سے نیچے پھینک دیا جبکہ دیگر ڈاکوؤں کو میرے جاں نثاروں نے ختم کردیا۔ عالم شیر بھی گولی لگنے سے زخمی ہوا جو میری دشمنی میں ملک ریاض سے گٹھ جوڑ کیے بیٹھا تھا۔ ایک روز نورو ماچھی کا بھائی، دینو ماچھی اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لئے شیشے کا دروازہ توڑ کر اندر آگیا مگر میرے گارڈ نے سیون ایم ایم کا برسٹ مار کر اسے ہلاک کردیا اور اس کے دو ساتھیوں کو میرے اہم جاں نثار ٹونی نے گولی ماردی جبکہ ایک فرار ہوگیا۔ ملک ریاض اور عالم شیر اچھا خاصا سبق ملنے کے باوجود مسلسل میرے راستے کا پتھر بنے ہوئے تھے لہٰذا میں نے انہیں بھی اپنے راستے سے ہٹادیا۔ ایک روز رات کے وقت ایک شخص اچانک میری گاڑی کے سامنے آگیا۔ وہ میرے بچپن کا دوست ریاض عرف راجو تھا۔ میں اس طرح اچانک اس کے ملنے پر حیران تھا کہ دوسری حیرت مجھ پر اس وقت ٹوٹی جب میں اس کے گھر پہنچ کر اس کی بیوی سے ملا۔ وہ میرے بچپن کی پہلی محبت شمیم تھی۔ ایک روز میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک جدید اور سائنٹیفک عمارت میں پایا جو ریڈ ڈاٹ کی ملکیت تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک دراز قد اور پُراسرار سے شخص نے مجھ سے ملاقات کی۔ اس شخص کا کوئی چہرہ نہیں تھا بلکہ اس کے نہایت چوڑے کندھوں کے درمیان سر کی جگہ ایک بہت بڑا انڈا رکھا ہوا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ ریڈ ڈاٹ والے مجھے پاکستان کا سربراہِ مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے دو ماہ کے لئے سوچنے کی مہلت دی گئی اور بے ہوش کرکے واپس میرے بیڈ روم میں پہنچادیا گیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس سلسلے میں حفیظ صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کیا لیکن پہلے چند پریشانیوں سے جان چھڑالینا بہتر سمجھا۔ پہلے میں نے مختار رفیق نامی ایک بدمعاش کو جو ریاض اور شمیم کو تنگ کررہا تھا اور دوسری بہت سے بُرائیوں کا ذمّے دار تھا، اس کے کچھ گرگوں سمیت جہنم رسید کیا، پھر حفیظ صاحب کو ریڈ ڈاٹ کی پیشکش کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ یہ بات سُن کر سناٹے میں آگئے۔ رات گئے میں گھر میں پہنچا تو وہاں ہر چیز جل کر راکھ ہوچکی تھی۔ یہ کام ریڈ ڈاٹ والوں کا تھا۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں نے ان کی ہدایات کے برعکس حکومت کی خفیہ ایجنسیوں سے ملاقات کی ہے۔ اب ریڈ ڈاٹ والے پوری طرح مجھے نیست و نابود کردینے پر تُل گئے تھے۔ انہوں نے ستارہ کو شوٹنگ کے دوران زہر دے کر ہلاک کردیا۔ پھر شمیم کے بیٹے عمار کو جو درحقیقت میرا بیٹا تھا، اغوا کرلیا مگر میں نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے عمار کو بڑی جدوجہد کے بعد رہا کروالیا۔ اس کے بعد انہوں نے راحیلہ کے گھر حملہ کرکے ہر چیز تباہ و برباد کردی۔ راشد بھی گولی لگنے سے جاں بحق ہوگیا۔ ان سانحات سے ابھی میں سنبھلا بھی نہیں تھا کہ مجھے ریڈ ڈاٹ والوں نے دوبارہ اغوا کرلیا۔ اس مرتبہ انہوں نے یہ پیش کش کی کہ اگر میں وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب کو ان کے راستے سے ہٹادوں تو وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔ اس وقت تو میں نے مصلحتاً اس کام کی ہامی بھرلی مگر بعد میں تمام تر خطرات کے باوجود حفیظ صاحب کو اس منصوبے سے آگاہ کردیا۔ حفیظ صاحب نے فوراً سیکیورٹی والوں کو طلب کرلیا مگر تمام حفاظتی تدبیریں دھری رہ گئیں۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے اس قدر شدید حملہ کیا ... کہ کوٹھی ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ حفیظ صاحب کے تمام گارڈ ہلاک ہوگئے اور خود حفیظ صاحب بے ہوش پڑے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ریڈ ڈاٹ کا ایک نیا شعبدہ میرے سامنے آیا جب میں نے دو آدمیوں کو فضا میں پرواز کرکے تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ انہوں نے مجھے اور راحیلہ کو پکڑنے یا ہلاک کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ اب ریڈ ڈاٹ کیونکہ ہر قدم اور ہر سطح پر مجھے ختم کردینے پر تُل گئی تھی لہٰذا میں نے کچھ عرصے کے لئے منظر سے ہٹنے کا فیصلہ کرلیا اور بھیس بدل کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا لیکن میری تمام تر چالاکی اس وقت دھری رہ گئی جب میں نے ریڈ ڈاٹ کی فضائی مخلوق کو بدستور اپنے تعاقب میں سرگرداں پایا۔ غور کرنے پر ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے میری قیمتی گھڑی میں کوئی ڈیوائس چھپادیا تھا جس کے ذریعے وہ ہر جگہ مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ جان چھڑانے کے لئے میں نے وہ گھڑی ایک ٹرک ڈرائیور کو دے دی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ایک فضائی

شیطان نے کوئی سفید اور چمکتی ہوئی چیز ٹرک پر پھینکی اور ٹرک کے ساتھ ڈرائیور شیر خان کے بھی پرخچے اُڑ گئے۔ فضائی شیطان اپنی دانست میں مجھے ہلاک کر کے واپس جا چکا تھا مگر میں خدا کے فضل سے صحیح سلامت تھا۔ اس جگہ سے بہت دور نکل آنے کے بعد میں بس کے ذریعے پہلے ملتان پہنچا اور وہاں سے کراچی ایکسپریس کے ذریعے سکھر پہنچ گیا۔ یہاں ایک اُچکے نے لفٹ کے بہانے مجھے لوٹنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ چھینا جھپٹی میں میرا تھیلا دریا میں گر گیا جس میں پندرہ لاکھ روپے تھے۔ میں نے غصے اور جھنجلاہٹ میں اس اُچکے کو بھی اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ سکھر سے کندھ کوٹ کی طرف سفر کرتے ہوئے مجھے چند خونخوار اور وحشی افراد نے کسی ایسے شخص کے شبہ میں پکڑ لیا جس نے ان کے سردار نواب سرور کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر پہاڑی علاقے میں موجود ایک قلعہ نما حویلی میں پہنچ گئے۔ ہمیں اس جگہ پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ نواب سرور کی بھانجی 'نواب زادی نگینہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کا شوہر شدید زخمی حالت میں اس کے ساتھ تھا۔ ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا تھا۔ تقریباً ڈھائی کروڑ روپے کا سونا بھی نواب زادی کے ساتھ تھا جس کے چکر میں ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد نواب زادی کا شوہر نواب زادہ حشام زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ ڈاکو بھی نواب زادی کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور اندھا دھند فائرنگ کر کے ڈیرے کے بیشتر لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ میں ایک قیدی کی مدد سے وہاں سے بھاگ نکلا۔ دو ڈاکوؤں کو بھی میں نے ہلاک کر دیا۔ ایک طویل سفر کے بعد میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلنے پر میں خود کو ایک غریب مگر مہمان نواز دیہاتی کے گھر میں پایا۔ ایک رات میں اس کے ہاں رہا اور صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں اسی گاؤں میں ایک چھپر ہوٹل کے مالک دینو کے پاس راج مزدوری کا کام کر رہا تھا کہ میں نے دو آدمیوں کو بھتے کے سلسلے میں دینو کے ساتھ اُلجھتے دیکھا۔ پھر جب انہوں نے اسے مارنا شروع کیا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے ان دونوں کی خوب ٹھکائی کی اور انہیں وہاں سے بھگا دیا مگر کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں اپنے کچھ اور ساتھیوں اور سردار' دلبر خان کے ساتھ دینو کے ہوٹل پر پہنچ گئے۔ پہلے تو انہوں نے دینو کی خوب ٹھکائی کی' پھر اس کے ہوٹل کو آگ لگا دی۔ ایک آدمی کو بھی انہوں نے قتل کر دیا۔ پہلے تو میں نے اس ہنگامے میں کوئی مداخلت نہیں کی مگر پھر ایک موقعے پر دلبر خان کو اپنے قابو میں کر کے سب کو بے بس کر دیا لیکن جلد ہی دلبر خان کے ایک لمبے چوڑے' جن نما آدمی ہوشو خان نے دلبر کو میری گرفت سے آزاد کرا لیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ سب مل کر مجھے گھیرنے کی کوشش کریں گے لیکن دلبر خان نے اپنے آدمیوں کو کسی بھی کارروائی سے روک دیا اور دینو کو میری رہائش کے سلسلے میں ہدایات دے کر چلا گیا۔ دلبر خان اپنے جن نما آدمی ہوشو خان سے میرا مقابلہ کرانا چاہتا تھا۔ تب تک کے لئے اس نے مجھے دینو کے گھر میں نظر بند کر دیا۔ آخر کار مقابلے کا دن بھی آ ہی گیا۔ دلبر خان نے مجھے بتایا تھا کہ یہ حقیقت سے قریب تر ایک نورا کشتی ہو گی لیکن مقابلہ شروع ہونے کے بعد جب ہوشو خان نے سفاکی کی حد تک جارحانہ انداز میں مجھ پر جان لیوا' خونی حملے شروع کیے تب دلبر خان کا پورا منصوبہ میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ کھیل ہی کھیل میں ہوشو خان کے ہاتھوں مجھے مروا دینا چاہتا تھا لیکن دلبر خان کے ارادے اور ہوشو کی نیت کو بھانپتے ہی میرے اندر سویا ہوا درندہ بیدار ہو گیا۔ ایک سخت' خونی مقابلے کے دوران میں نے ہوشو خان کو اٹھا کر پھینکا تو اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دلبر خان کے کئی کلاشنکوف بردار میری طرف بڑھے لیکن اس سے قبل کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچاتے' گاؤں کے لوگوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے کر پیچھے ہٹا دیا۔ اسی اثنا میں مولی رنگ میں گھس آئی اور اپنے پیٹ پر چھری رکھ کر مجھے دھمکی دی کہ میں فوراً وہاں سے بھاگ جاؤں ورنہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لے گی۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس کی دھمکی نے مجھے وہاں سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں دلبر خان کی جیپ میں وہاں سے نکل آیا۔ راستے میں جیپ کا انجن بند ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ایک اور پریشانی نازل ہو گئی۔ وہ گھڑ سوار جو یقیناً میرے تعاقب میں تھے' وہاں پہنچ گئے۔ میں نے موقع پا کر انہیں بے ہوش کر دیا اور ایک گھوڑے پر وہاں سے آگے روانہ ہو گیا۔ ایک جگہ گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا تو اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ میں ایک گھنے جنگل میں گھس گیا اور پیدل ہی اپنا سفر جاری رکھا۔ جنگل سے باہر ایک سڑک سے مجھے بس مل گئی مگر راستے میں دو پولیس والوں نے مجھے بس سے اتار لیا اور تھانے لے جا کر بند کر دیا لیکن جلد ہی مجھے موقع مل گیا اور میں تھانے سے نکل بھاگا۔ ایک بڑھیا نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی لیکن جب میں سو رہا تھا تو اس بڑھیا نے اپنے بیٹے کا قاتل سمجھتے ہوئے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میں اس کے گھر سے نکل آیا۔ اسی گاؤں کا ایک دوسرا نیک انسان مجھے اپنے گھر لے گیا۔ ابھی میں نے وہاں سکون کے چند لمحے ہی گزارے تھے کہ دلبر خان کے آدمیوں نے اس گھر کو گھیر لیا۔ میں نے دلبر خان کے چار آدمیوں کو ہلاک کر دیا اور ایک آدمی کی موٹر سائیکل چھین کر اس گاؤں سے نکل بھاگا۔ انہوں نے تعاقب کر کے مجھے پکڑنے کی کوشش کی لیکن کافی دیر کی جدوجہد کے بعد بالآخر میں انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہو گیا۔ موٹر سائیکل کا پٹرول ختم ہو گیا تو میں نے پیدل ہی اپنا سفر جاری رکھا۔ پھر ایک چھپر ہوٹل کے باہر کھڑے ٹرک کے پچھلے حصے میں چھپ گیا جہاں فروٹ کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں۔ کافی دیر تک سفر بخیر و عافیت جاری رہا مگر پھر اچانک ہی ٹرک کی رفتار کم ہوئی اور وہ کچے میں اُتر کر رک گیا۔ میں نے احتیاط سے جھانک کر دیکھا' ٹرک کے قریب ہی ایک سیاہ رنگ کی مرسیڈیز کھڑی تھی۔ ٹرک اور مرسیڈیز والوں کی گفتگو سُن کر پتا چلا کہ ٹرک میں فروٹ کی پیٹیوں کے درمیان اسلحہ چھپا ہوا تھا جو شاید کہیں اسمگل کیا جا رہا تھا۔ وہ لوگ اس اسلحے کو اب دوسرے ٹرک میں منتقل کرنا چاہتے تھے کیونکہ آگے رینجرز نے راستہ بند کر رکھا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اسلحہ دوسرے ٹرک میں منتقل کرتے اور میں ان کی نظروں میں آتا' میں نے ٹرک سے چھلانگ لگا دی۔ تمام تر احتیاط کے باوجود ایک پتھر میرے پیر کے نیچے آ کر لڑھکا تو وہ لوگ ہوشیار ہو گئے اور اسلحہ اور ٹارچیں لے کر مجھے تلاش کرنے لگے۔ میں تیزی سے سامنے موجود جنگل میں گھس کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ جب وہ لوگ میری تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے تو درخت سے نیچے اُترنے کی کوشش میں ایک شاخ ٹوٹ جانے کی وجہ سے میں نیچے گر پڑا اور میرے پاؤں میں موچ آ گئی لیکن زیادہ خطرناک بات یہ ہوئی کہ جو شاخ ٹوٹی تھی' اس پر شہد کی مکھیوں کا چھتا تھا۔ اس سے قبل کہ مکھیاں مجھ پر حملہ آور ہوتیں' میں پاؤں کی موچ کو بھول کر تیزی سے دوڑا اور ایک نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اس جدوجہد کے باوجود گردن پر دو تین جگہ وہ ڈنک مار چکی تھیں۔ کافی دیر بعد میں پانی سے باہر نکلا اور ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ میرے پاؤں کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور وہ سُوج گیا تھا۔ گردن بھی سُوج کر کپا ہو گئی تھی۔ مجھے بخار ہو گیا تھا اور بھوک بھی شدت کی لگ رہی تھی مگر میں اس ویرانے میں ایک درخت کے نیچے بے یار و مددگار پڑا تھا اور ہلنے سے بھی قاصر تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں وہیں پڑے پڑے بے بسی کی عبرت ناک موت مر جاؤں گا مگر اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی اور اس ویرانے میں ایک اجنبی گھڑ سوار کو مجھ تک پہنچا دیا جو مجھے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اس نے میرے پاؤں کی موچ ٹھیک کی' مجھے درد کش دوائیں دیں اور ہر طرح میرے آرام کا خیال رکھا۔ اس علاقے میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ میں نے اس کے متعلق کئی مرتبہ کچھ جاننے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ ایک روز وہ مجھے اپنے گھر چھوڑ کر دوسرے گاؤں چلا گیا لیکن رات کے پچھلے پہر اس حالت میں واپس آیا کہ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ گھر سے گیا تو شلوار قمیص میں تھا مگر اب اس کے جسم پر کچھ اس طرح کا لباس تھا کہ وہ پرانی ٹیکسیکن اور ویسٹرن فلموں کا ڈاکو معلوم ہوتا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ اور پریشان بھی تھا۔ میرے اصرار پر آخر کار اس نے اپنی حقیقت بتا ہی دی۔ وہ ایک ڈاکو تھا۔ اس کے اس انکشاف پر میں حیرت سے گنگ ہو کر رہ گیا۔ اس کا اصل نام روحیل خان تھا۔ وہ دوسروں کی اپنے ساتھ زیادتیوں کے ردِعمل کے طور پر اس راستے پر چل پڑا تھا اور اب مجھ سے یہ چاہتا تھا کہ میں اس کا بھیس بدل کر اس کے

گھوڑے پر اس کے گھر سے نکلوں تاکہ وہ پولیس افسر جو اس کا تعاقب کر رہا تھا' میرے پیچھے لگ جائے اور اس کی جان بچ جائے۔ اس نے کیونکہ میری جان بچائی تھی لہٰذا میں نے بھی اس کی یہ بات مان لی لیکن اس شرط پر کہ آئندہ وہ ڈاکے نہیں ڈالے گا اور اس نے وعدہ کرلیا۔ میں اس کے گھر سے نکلا تو وہ فرض شناس پولیس افسر واقعی میرے پیچھے لگ گیا۔ میں نے اسے چکر دینے کی بہت کوشش کی لیکن ایک جگہ اس نے اپنے ایک ماتحت کانسٹیبل کے ساتھ مجھے گھیر ہی لیا۔ کانسٹیبل نے مجھے گولی مارنے کے لیے اپنی رائفل سیدھی کی لیکن اس سے پہلے میں نے اسے گولی ماردی اور وہاں سے نکل بھاگا۔ روحیل خان نے کہا تھا کہ اگر مجھے مدد کی ضرورت پڑے یا کوئی پریشانی درپیش ہو تو میں جانو کے اڈے پر پہنچ کر اس کا حوالہ دوں گا تو جانو ہر طرح سے میری مدد کرے گا۔ مجھ سے کیونکہ ایک پولیس والے کا خون ہوگیا تھا' اس لیے میں نے جانو کی مدد لینے کا فیصلہ کیا اور کافی جتن کے بعد بالآخر اس کے پاس پہنچ گیا۔ تعارف وغیرہ کے بعد جانو نے بتایا کہ روحیل خان ان کا خاص آدمی اور کروڑپتی شخص تھا۔ جانو کا خیال تھا کہ روحیل ان کے ساتھ غداری کر رہا تھا۔ ڈاکے کی جس واردات میں روحیل زخمی ہوا تھا' اس میں بہت بڑی رقم ان کے ہاتھ لگی تھی مگر وہ سب روحیل نے غائب کردی تھی۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد جانو نے مجھ سے لوٹ کے اس مال کا مطالبہ کردیا۔ میں نے ایسے کسی مال کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی تو جانو کے آدمی ایک ساتھ مجھ پر پل پڑے مگر میں کسی کے قابو میں نہیں آیا اور سب کو دھنک کر رکھ دیا۔ آخر کار جانو کو یقین آ ہی گیا کہ مجھے لوٹی گئی رقم اور مال کے متعلق واقعی کچھ معلوم نہیں ہے۔ تب اس کے آدمیوں نے اس کے حکم پر مجھے ایک ویرانے میں لے جاکر چھوڑ دیا۔ میں کسی آبادی کی تلاش میں ہرے بھرے کھیتوں میں جانکلا جہاں ایک انتہائی حسین و جمیل عورت اور کچھ مرد کھڑے تھے۔ عورت کا نام زرتاج تھا اور وہ اس علاقے زرتاج نگر کی خاصی بڑی زمیندارنی تھی۔ وہ کافی پڑھی لکھی' انتہائی ذہین اور بہت خوبصورت خاتون تھی۔ تعارف وغیرہ کے بعد اس نے مجھے اپنے گھوڑوں کے فارم پر ملازمت کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کرلیا۔ زرتاج نے ایک معقول قسم کا مکان بھی رہائش کے لیے مجھے فراہم کردیا۔ ایک روز جانو اور اس کا دستِ راست نمیسو خان خلافِ توقع زرتاج کے پاس پہنچ گئے اور اسے میرا حلیہ بتا کر میری بابت دریافت کیا مگر زرتاج نے لاعلمی کا اظہار کرکے مجھے بچالیا۔ جانو کے جانے کے بعد زرتاج اپنے ملازموں کے ہمراہ شکار پر چلی گئی جبکہ میں نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کے بعد ایک منصوبے کے تحت جانو کے دستِ راست نمیسو خان سے ملاقات کی اور کافی دیر کی خوشامد اور چرب زبانی کے بعد اسے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ مجھے بھی اپنے گروہ میں شامل کرلے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر گھنے جنگلات میں موجود ایک کھنڈر نما حویلی میں پہنچ گیا۔ یہ حویلی بس باہر ہی سے کھنڈر تھی' اندر سے بہت شاندار اور ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز سے آراستہ تھی۔ اندر اسلحے اور دولت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہاں دولت مند زمینداروں کے لیے عیش و عشرت کے تمام لوازمات بھی موجود تھے۔ میں نے کچھ وقت اس اڈے پر گزارا اور بہت سی حیرت انگیز چیزیں دیکھیں پھر میں نمیسو خان کے ہمراہ واپس آگیا۔ راستے میں اس نے بہت سی کار آمد باتوں کے علاوہ یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ لوگ زرتاج کو لوٹنے کا پروگرام بنا چکے ہیں بلکہ اس نے اس واردات کے لیے میرا بھی تقرر کردیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ پر اعتماد کرچکا ہے مگر ایک جگہ رک کر اس نے یہ انکشاف کیا کہ وہ مجھ سے یعنی افضل خان سے واقف ہے۔ اب وہ مجھے قتل کرنے کے ارادے سے اس ویرانے میں لایا تھا مگر قدرت نے مجھے محفوظ رکھا اور وہ خود میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اس کی لاش کو ایک گڑھے میں ڈال کر میں واپس زرتاج کی حویلی میں پہنچ کر سوگیا۔ دوسرے روز ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اس بینک کے سامنے پہنچ گیا جہاں زرتاج کو نقصان پہنچانے کے لیے جانو کے لوگوں کو ڈاکا ڈالنا تھا۔ میرا ارادہ اس واردات کو روکنے کا تھا۔ اچانک میں نے ایک شخص کو بینک سے نکلتے دیکھا اور مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ وہ انسپکٹر رحیم گل تھا۔

قسط نمبر: 45

انسپکٹر رحیم گل سادہ لباس میں تھا لیکن میں اسے ہزاروں کے مجمعے میں پہچان سکتا تھا اور شاید یہی معاملہ دوسری طرف بھی تھا' اس لیے میں نے فوراً دیوار کی طرف منہ کرلیا۔ رحیم گل نے اس طرف دیکھا ہی نہیں تھا جدھر میں کھڑا تھا۔ میری جب اس پر نظر پڑی اس وقت اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

دوبارہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنا میں نے بہتر نہ سمجھا۔ اتنا ہی غنیمت تھا کہ اس کی مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ اب یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی کہ میں خود اسے اپنی طرف دیکھنے کی دعوت دیتا۔ یہ ایک عجیب ہی موقع تھا۔ میں اس سے الجھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ فضا میں پہلے ہی ایک خطرے کی آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم گل کے معاملے میں میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے ہرگز ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا مگر دیانت دار آفیسر تھا۔ دیانت دار اور دلیر آفیسر ہمارے معاشرے میں پہلے ہی تقریباً نایاب تھے۔ اس سے اچانک سامنا ہونے پر حیرت کے باعث ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔

آخر وہ یہاں نظر ہی کیوں آیا تھا؟ کیا اسے یہاں میری موجودگی کا شبہ ہوا تھا یا اسے یہاں میری آمد کا کوئی امکان نظر آیا تھا؟ کیا وہ میرا سراغ لگاتا ہوا یہاں تک آن پہنچا تھا یا پھر اسے ڈاکے کی مخبری ہوچکی تھی؟ مگر یہ تو اس کا علاقہ ہی نہیں تھا۔ وہ کیوں اتنی دردسری مول لیتا؟ پولیس والے تو اپنے علاقے کی وارداتوں کے سلسلے میں ہی کوئی زحمت کرلیں تو غنیمت ہوتا ہے۔ دوسرے اس وقت رحیم گل' ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی بھی اعتبار سے تیار نظر نہیں آتا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور عجیب سا خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میں نے اس کی بے پناہ دیانت داری' دلیری اور کبھی نہ جھکنے' کبھی نہ بکنے کی جو باتیں سنی تھیں وہ محض قصے کہانیاں تھیں' پروپیگنڈہ تھا؟ درحقیقت کہیں ڈکیتی کے اس منصوبے سے ہی تو اس کا کوئی تعلق نہیں تھا؟

سوالات' شبہات اور امکانات کن کھجوروں کی طرح میرے ذہن سے چمٹے جارہے تھے اور کسی بھی بات کا کوئی تسلی بخش جواب میرے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ نہایت اطمینان سے چائے والے کو ادائیگی کی اور بے حد آہستگی سے گردن گھما کر بینک کی طرف دیکھا۔ رحیم گل جاچکا تھا۔ وہ بازار میں بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی اور اپنے گھٹیا سے

ویران ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں صرف تین افراد موجود تھے۔ بینچ پر ایک نوجوان جوڑا تھا۔ لڑکی سرگوشیوں میں باتیں کررہی تھی اور لڑکا کان لگا کر سُن رہا تھا۔ ان کے علاوہ کچرا چُننے والی ایک بوڑھی اور مفلوک الحال عورت ایک کونے میں سُکڑی سمٹی لیٹی تھی۔ اس کے پاس چھوٹے موٹے کاٹھ کباڑ کے علاوہ چیتھڑوں سے بھرا ہوا ایک بہت بڑا تھیلا بھی نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی متاعِ گراں کو سمیٹے لیٹی تھی اور کبھی کبھار کن انکھیوں سے بینچ پر بیٹھے جوڑے کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ لڑکی نے صرف ایک بار گہری نظروں سے بُڑھیا کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے ساتھی سے سر جوڑ کر سرگوشیوں میں مصروف ہوگئی۔

اچانک ایک خوش لباس شخص ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ ادھیڑ عمر، کمزور اور مختصرالوجود تھا لیکن مجموعی طور پر کافی حد تک پُروقار اور جاذبِ نظر شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے اچٹتی سی نظر سے ویٹنگ روم اور اس میں موجود تین افراد کا جائزہ لیا پھر ایک نشست سنبھال لی۔

چھوٹا سادہ ویٹنگ روم اچھی حالت میں نہیں تھا۔ باہر سرد اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس کے اثرات اندر بھی محسوس ہورہے تھے۔ خوش پوش، ادھیڑ عمر شخص نے اپنے اوور کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اسے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ کمرے میں پہلے سے موجود تینوں افراد میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی

پے در پے تین قتل اور ہر لاش کا سر غائب۔ قاتل نے یہ کام بڑی صفائی سے انجام دیا تھا۔ تینوں لاشیں ریلوے لائن کے آس پاس پائی گئی تھیں اور وہ تینوں بھی ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ایک ان کے درمیان یقیناً قاتل تھا۔

ایک سراغ رساں کی بروقت کارروائی کا ماجرا

بروقت

پاکیزہ خان

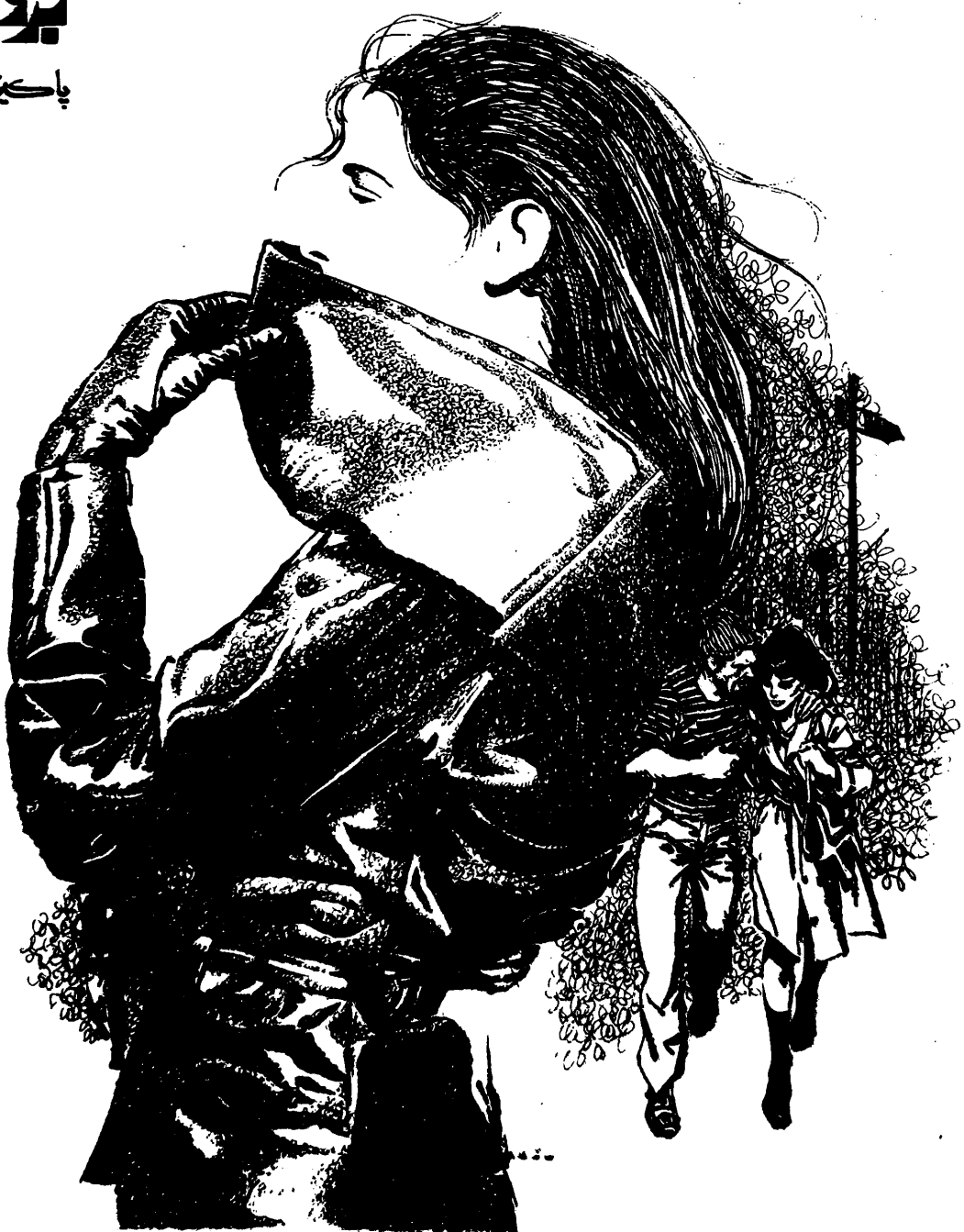

لیکن جب وہ بیٹھ چکا تو کچرا چننے والی بڑھیا نے اپنے پھٹے ہوئے دستانے درست کرتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ نووارد کو اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں بڑھیا اس سے بھیک نہ مانگنے لگے۔ اس نے جلدی سے بغل میں دبایا ہوا اخبار نکالا اور اپنے سامنے پھیلا لیا۔ اسے امید تھی کہ وہ اخبار کے عقب میں پناہ لے لے گا تو کوئی اسے تنگ نہیں کرے گا۔

اخبار کھولے جانے کی خفیف سی کھڑکھڑاہٹ سن کر بینچ پر بیٹھی لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر اخبار کے صفحۂ اول پر پڑی۔ کچرا چننے والی بڑھیا کی نظر نے بھی اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ اخبار کے پہلے صفحے پر شہ سرخی دور سے نظر آ رہی تھی۔

'تیسری سربریدہ لاش پائی گئی'

یہ خبر پڑھ کر ادھیڑ عمر شخص کا دل پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ نہ جانے وہ کون جنونی تھا جس نے گزشتہ دو ماہ میں تین افراد کے سر قلم کر دیے تھے۔ ان میں ایک مرد اور دو عورتیں تھیں۔ تینوں کے سر غائب تھے اور بعد میں بھی کہیں نہیں ملے تھے۔ ان کی لاشیں یکے بعد دیگرے لانگ آئی لینڈ ریلوے لائن کے آس پاس تین مختلف حصوں میں پائی گئی تھیں۔ خبر سے پتا چلتا تھا کہ تینوں ہی مقتول نیویارک سٹی جانے کے لیے رات گئے اسی قسم کے کسی چھوٹے اسٹیشن سے روانہ ہوئے تھے یا اس ارادے سے گھر سے نکلے تھے جیسے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں اس وقت وہ چاروں افراد موجود تھے۔

چند لمحے بعد ادھیڑ عمر شخص نے اخبار تہہ کر کے اپنے پاس بینچ پر رکھ لیا اور لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور اس کی نظر ابھی تک اخبار پر جمی ہوئی تھی۔ اس کا نوجوان ساتھی ایک ٹک ادھیڑ عمر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تبھی ادھیڑ عمر نے دیکھا کہ نوجوان جوڑے کے قریب ایک کولر رکھا ہوا تھا۔ وہ بڑے منہ کا ویسا ہی ایک بڑا سا کولر تھا جیسا عموماً لوگ پکنک وغیرہ پر ساتھ لے کر جاتے تھے۔ رات کے اس سہ پہر' اس سردی میں شہر کی طرف جانے والی ٹرین کے مسافروں کے پاس ایسے کولر کی موجودگی عجیب سی لگ رہی تھی۔

"تم لوگ شاید کسی پارٹی میں جا رہے ہو؟" اس نے مسکراتے ہوئے خوش خلقی سے نوجوان کو مخاطب کیا جو اب بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ ادھیڑ عمر نے خوشگوار لہجے میں مزید کہا۔ "مارچ میں بھی ٹھنڈی بیئر کا بندوبست کر کے جا رہے ہو؟ بہت خوب! اس کا اپنا ایک الگ ہی لطف ہے۔" اس نے یوں جھرجھری سی لی جیسے اس شغل سے لطف اندوز ہونا اس کے بس کی بات نہ ہو۔

نوجوان نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے تاثرات کچھ اسی قسم کے تھے جیسے اس نے ادھیڑ عمر کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ البتہ لڑکی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ ذرا آگے کو جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولی۔ "کاش آپ کا اندازہ درست ہوتا۔ یہ کولر درحقیقت میری ماں نے کھانے کی چیزوں سے بھر کر میرے ساتھ کر دیا ہے۔ میں شہر میں ماڈلنگ کرتی ہوں۔ میری ماں بے چاری کا خیال ہے کہ میں وہاں بھوکی مرتی ہوں گی۔ چنانچہ میں جب بھی گھر آتی ہوں' وہ واپسی پر کھانے کی چیزوں کا ایک انبار میرے ساتھ کر دیتی ہیں۔"

ادھیڑ عمر شخص مسکرا دیا۔ اب اس نے محسوس کیا کہ لڑکی کے خدوخال دلکش اور آنکھیں خوبصورت تھیں۔ وہ ماڈلنگ کے لیے موزوں نظر آتی تھی۔ اس کے ہمراہ نظر آنے والا نوجوان غالباً شہر میں اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص ایک اسٹاک بروکر تھا۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے اس نے سوچا' شاید اس لڑکی کو کبھی اس جیسے پختہ عمر اور دھیمے شخص سے بھی ایک آدھ شام کی دوستی کا اتفاق ہوا ہو.... اور شاید آئندہ بھی وہ کبھی ایسے امکان پر غور کر سکے۔

"میں ذرا یہ اخبار دیکھ سکتی ہوں؟" لڑکی بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے' میری ماں نے یہ خبر نہیں پڑھی ہوگی ورنہ وہ مجھے رخصت کرنے کے لیے ضرور میرے باپ کو یہاں میرے ساتھ بھیجتی اور اسے سختی سے ہدایت کرتی کہ ٹرین آنے تک وہ یہاں میرے ساتھ موجود رہے۔"

ادھیڑ عمر شخص مسکرا دیا۔ لڑکی کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی ماں کو علم نہیں تھا' اس کے ساتھ ایک نوجوان موجود تھا۔ شاید وہ لڑکی کے ساتھ اس کے گھر نہیں گیا تھا۔

اس نے جھک کر اخبار لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کے ساتھی کا جائزہ لیا۔ وہ مضبوط' ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اُڑے اُڑے سے رنگ کی جینز اور پرانی جیکٹ میں تھا۔ پیروں میں ویسے جوتے تھے جیسے عموماً محنت کا کام کرنے والوں کے پیروں میں ہوتے ہیں۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ جبکہ لڑکی صاف ستھری اور نفیس نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس اور جوتے عمدہ اور مہنگے دکھائی دے رہے تھے۔ رہن سہن اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے لڑکا' لڑکی کا ہم پلہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ان کے درمیان طبقاتی فرق نمایاں تھا۔

لڑکی نے خبر پڑھی اور منتظرانہ سے انداز میں اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ادھیڑ عمر شخص کے قریب آ بیٹھی۔ وہ اخبار واپس کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ پولیس کو ابھی تک اس سلسلے میں کوئی سراغ نہیں ملا۔ تینوں بدنصیب مقتول ٹرین پر سفر کر رہے تھے....."

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے ایک لمحے کے توقف سے بولی۔ "کیا خیال ہے.... سادہ لباس میں کوئی پولیس آفیسر اس اسٹیشن پر تعینات تو ہوگا؟"

"ہاں.... ہونا تو چاہیے۔" وہ بولا۔ وہ لڑکی سے اختلافِ رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی سابق بیوی کو اس سے

سب سے بڑی شکایت یہی رہی تھی کہ وہ ہر بات کی مخالفت کرتا تھا اور یہ اس کی فطرت بن چکی تھی۔

لڑکی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "تینوں لاشیں ریلوے لائن کے آس پاس پائی گئی تھیں۔ ان حالات میں ایسے ویران ریلوے اسٹیشنوں پر کم از کم ایک پولیس آفیسر تو ضرور تعینات ہونا چاہیے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"بالکل۔" ادھیڑ عمر نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید میں سر ہلایا پھر اخلاقاً اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے راجر کہتے ہیں۔"

"میں لوئیسا ہوں۔" لڑکی بے دھیانی سے بولی۔ اس کا ذہن گویا کہیں اور تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "اب مجھے پریشانی ہو رہی ہے..... یہ اخبار اب تک میری ممی اور ڈیڈی نے نہ پڑھ لیا ہو۔ ان کا تو گھبراہٹ سے بُرا حال ہو جائے گا۔ میرے والد دل کے مریض ہیں اسی لیے وہ مجھے چھوڑنے یہاں نہیں آئے تھے..... باہر ایک فون بوتھ موجود ہے..... میرا خیال ہے، میں اپنے گھر فون کرلوں..... نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے....."

اس نے کچرا چُننے والی بُڑھیا کی طرف ایک نظر دیکھا پھر راجر کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ "جب یہ بُڑھیا اندر آئی تو میں نے اپنا پرس کولر میں چھپا دیا تھا..... تم ذرا کولر کا خیال رکھنا۔ میں فون کرنے باہر جا رہی ہوں..... اور ہاں..... ذرا دروازے سے جھانک کر مجھے بھی دیکھتے رہنا۔"

راجر نے اثبات میں سر ہلایا اور لوئیسا کو باہر جاتے دیکھنے لگا۔ باہر جانے کے ایک لمحے بعد ہی لوئیسا نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور راجر کو مخاطب کیا۔ "میں تو بھول ہی گئی..... میرے پاس ریزگاری نہیں ہے۔ تمہارے پاس ایک سکہ ہوگا؟ ویسے..... میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے..... میں تو سوچ رہی ہوں، گھر ہی چلی جاؤں۔"

راجر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ریزگاری نکالی اور اسے دینے کے لیے اٹھ کر دروازے پر پہنچا۔ راجر سے ریزگاری لیتے وقت اسی کی آڑ میں ہوتے ہوئے لوئیسا سرگوشی میں بولی۔ "یہ نوجوان جو میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا..... میں اسے جانتی نہیں ہوں۔ یہ بھی اسی وقت یہاں پہنچا تھا جب میں پہنچی تھی۔ اس نے کولر اندر لانے میں بھی میری مدد کی تھی لیکن اب اس کی موجودگی سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

لڑکی نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور بظاہر مسکراتے ہوئے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ وہ اپنی جگہ پر واپس آنے کے لیے مُڑا۔ اسے احساس تھا کہ کچرا چُننے والی بُڑھیا اس دوران انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب وہ اٹھ بیٹھی تھی اور اپنے چیتھڑوں کے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ راجر کو اس تھیلے میں ایک موٹے سے ڈنڈے کی جھلک نظر آئی لیکن اس نے یہی ظاہر کیا

حسن بیمثال
بیوٹی کریم
اُبٹن
جو بھی دیکھے کہے! حسن بیمثال مجھے

اس میں شامل قدرتی جڑی بوٹیوں اور خالص ہلدی، چندن، تلدیل کا تیل اور دُوسرے کئی اجزاء کو ملا کر تیار کی گئی ہے۔
یہ قطعی کیمیائی اجزاء سے پاک ہے۔ اس کے استعمال سے خشک جسم مزید خوبصورت اور نرم ملائم ہو جاتا ہے اور چند دن کے استعمال سے واضح فرق محسوس ہوتا ہے

اُبٹن بیوٹی کریم استعمال کرنے سے پہلے جسم کے اُن حصوں کو صاف پانی سے دھو کر خشک کرلیں جہاں آپ نے یہ کریم لگانی ہے۔ اب ان تمام جگہوں پر اُبٹن بیوٹی کریم نہایت آہستگی کے ساتھ اُنگلیوں کی مدد سے نیچے سے اُوپر کی جانب لگائیں۔ مخصوص حالات میں رات اور دن میں دو بار استعمال کریں۔ اور ۲۰ روز میں واضح فرق دیکھ لیں۔ اُبٹن بیوٹی کریم کا روزانہ استعمال آپ کے جسم کو نرم و نازک اور چہرے کو حسین تر بنا دے گا۔
اس کا روزانہ استعمال نسوانی حُسن کو برقرار رکھتا ہے اور آپ کم عمر نظر آنے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نسوانی حُسن کے اُبھاروں کی نشوونما کیلئے دُنیا کی لاجواب کریم ہے۔ ڈھیلے ڈھالے ٹشوز کو صحت مند اور جاذبِ نظر بنانے کیلئے روزانہ رات کو استعمال کریں۔

جیسے اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔

راجر ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے وہ دروازے کے شیشے سے باہر لڑکی پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ نوجوان اب اس کی طرف حقارت اور ناپسندیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ راجر کے دل کی دھڑکن قدرے تیز ہوگئی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر نوجوان نے اٹھ کر لڑکی کے پیچھے جانے اور کوئی غلط حرکت کرنے کا ارادہ کرلیا تو کیا وہ اسے روک سکے گا؟ کیا وہ لڑکی کو اس کی دست درازی وغیرہ سے بچانے کے لیے کچھ کرسکے گا؟ جسمانی طور پر وہ اس نوجوان کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔

اچانک سنہرے بالوں والا وہ نوجوان اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت لڑکی فون بوتھ سے نکل کر ویٹنگ روم کی طرف واپس آرہی تھی۔ نوجوان تیزی سے دروازہ کھول کر اس کی طرف بڑھا۔ نہ جانے اس کا ارادہ کیا تھا لیکن لڑکی اسے قریب آتے دیکھ کر یک دم فون بوتھ کی طرف واپس دوڑ پڑی۔ اس نے بوتھ میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا اور دونوں ہاتھ اندر سے دروازے پر جما لیے۔ بوتھ کی روشنی میں راجر دور سے اس کا خوفزدہ چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ مدد طلب نظروں سے ویٹنگ روم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ راجر کے جسم سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ کچرا چُننے والی بُڑھیا ایک کونے میں ساکت بیٹھی ایک ٹک دروازے کے شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔

راجر نے اس کی توجہ باہر کی طرف مبذول دیکھ کر موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ وہ دبے قدموں چیتھڑوں کے تھیلے کے قریب پہنچا اور اس نے جلدی سے تھیلے میں سے موٹا سا وہ ڈنڈا نکال لیا جس کی جھلک اس نے ایک لمحے پہلے دیکھی تھی۔ ہاتھ پیچھے لے جاتے ہوئے اس نے ڈنڈا اپنے عقب میں چھپا لیا اور تیزی سے باہر کو لپکا۔

نوجوان نے فوراً ہی اسے دیکھ لیا اور خطرناک انداز میں غرایا۔ "جوش میں آرہے ہو بڑے میاں؟ گڑبڑ کرنے کا ارادہ ہے یا خاموشی سے تماشا دیکھو گے؟"

راجر خاموش رہا۔ نوجوان نے یہی تاثر لیا کہ اس میں کچھ کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ وہ دوبارہ بوتھ کی طرف متوجہ ہوگیا اور دھکا دے کر دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ لڑکی نے دونوں ہاتھ دروازے پر رکھ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ اسی دوران راجر نے عقب سے نوجوان کے سر پر ڈنڈا رسید کیا۔ نوجوان کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

راجر نے خوفزدہ سے انداز میں ڈنڈا فرش پر پھینک دیا اور خودکلامی کے سے انداز میں بولا۔ "اوہ خدایا..... کہیں یہ مر ہی نہ گیا ہو۔"

لڑکی بوتھ سے نکل آئی اور مضبوطی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ "میں اتنی خوفزدہ ہوگئی تھی..... کیا یہ مرگیا ہے؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"نہیں..... خدا کا شکر ہے' ڈنڈا زیادہ زور سے نہیں پڑا۔" راجر' نوجوان کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

لڑکی خوف سے کانپتے ہوئے بولی۔ "ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل لینا چاہیے اور پولیس کو بلانا چاہیے۔"

"تم پولیس کو فون کرو' میں یہیں کھڑے ہوکر اس پر نظر رکھتا ہوں۔ کہیں یہ جلدی ہوش میں نہ آجائے۔" راجر نے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں سے پولیس کو فون نہیں ہوسکتا....." لڑکی تقریباً رو دی۔ "یہ فون خراب ہے۔ ڈائل ٹون ہی نہیں آرہی۔ اسی لیے میں گھر بھی فون نہیں کرسکی۔ ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔"

راجر نے مُڑ کر ویٹنگ روم کی طرف دیکھا۔ دروازے کے شیشے کے عقب سے' کچرا چُننے والی بُڑھیا ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ راجر کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اسی دوران فرش پر پڑے نوجوان کے حلق سے کراہنے کی سی آواز نکلی۔ وہ ہوش میں آرہا تھا۔

"تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟" راجر نے تیزی سے پوچھا۔

"قریب ہی ہے..... لائنوں کے پار....." وہ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ "لیکن پہلے ہمیں ویٹنگ روم سے کولر اٹھانا ہوگا..... وہ میری ممی کا ہے..... اور اس میں میرا پرس بھی ہے....." پھر اس نے خوفزدہ انداز میں نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہوش میں آرہا ہے۔"

راجر نے نیچے دیکھا۔ نوجوان کروٹ لے کر سیدھا ہوچکا تھا۔ اس دوران اس کی جیکٹ کھل گئی تھی۔ اس کی بیلٹ میں ایک نیام دار خنجر اڑسا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"اس کے پاس خنجر بھی ہے....." راجر خوفزدہ لہجے میں بول اٹھا۔ پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "تم اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑو' میں کولر اٹھا کر تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ جلدی کرو۔"

لڑکی نے گہری سانس لی اور دوڑ پڑی۔ راجر نے اسے پلیٹ فارم عبور کرکے لائنوں کی طرف جاتے دیکھا۔ تب وہ خود ویٹنگ روم کی طرف لپکا۔ اندر پہنچ کر اس نے کولر اٹھایا اور واپس دروازے پر پہنچ کر پلٹ کے کچرا چُننے والی بُڑھیا کی طرف دیکھا۔ ڈراؤنی فلموں کے کسی منظر کی طرح وہ گویا اس کی نظروں کے سامنے اپنا قالب بدل رہی تھی۔ اس کی کمر کا خم غائب ہوگیا تھا۔ وہ بالکل سیدھی کھڑی تھی اور دراز قد نظر آرہی تھی۔ اب اس کی آنکھیں بھی پہلے جیسی دھندلی' تھکن زدہ اور چُندھی چُندھی نہیں رہی تھیں۔ اب وہ نیلی' شفاف اور مستعد آنکھیں تھیں۔ تب اسے احساس ہوا کہ حقیقت کیا تھی۔ جس سے انہیں خوفزدہ ہونا چاہیے تھا' اس کی طرف تو ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

وہ کولر اٹھائے تیزی سے ریل کی پٹڑیوں کی طرف دوڑا جہاں لڑکی بے تابی سے اس کا انتظار کررہی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کا تعاقب شروع ہوچکا ہے۔

"خدا کا شکر ہے، تم خیریت سے آگئے....." لڑکی نے راجر کو دیکھ کر قدرے اطمینان کی سانس لی۔ "مجھے تو ہول پڑ رہا تھا۔"

"رکو مت..... بھاگ لو....." راجر بولا۔

وہ بھاگتے ہوئے اس کے ساتھ قدم ملا کر بولی۔ "لاؤ..... ایک طرف سے کولر میں پکڑ لوں....."

راجر نے اسے منع کرنا چاہا لیکن اس وقت تک لڑکی ایک طرف سے کولر کا ہینڈل پکڑ چکی تھی۔ اسی دوران کولر کا ڈھکنا اتر کر گر پڑا۔ راجر کو ایک لمحے کے لیے رکنا پڑا۔ لڑکی کولر پر جھکی۔ جونہی وہ سیدھی ہوئی، ایک فائر کی آواز گونجی اور وہ گر پڑی۔

راجر نے پلٹ کر دیکھا اور اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ چاندنی میں اسے پٹڑیوں کے درمیان، کچرا چُننے والی بڑھیا کھڑی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ راجر کی طرف تھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں مسٹر!" بڑھیا، صاف مردانہ آواز میں بولی۔ "بھاگنے کی کوشش بھی مت کرنا..... ذرا جھک کر لڑکی کا جائزہ لو۔"

راجر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور جھک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ یقیناً مرچکی تھی۔ اس کی قمیص کا اگلا حصہ خون میں تر ہوچکا تھا۔ راجر کا جی مالش کرنے لگا۔ اچانک اسے جھٹکا سا لگا۔ مُردہ لڑکی کے ہاتھ میں اسے قصابوں کے بھاری چاپر جیسا ایک تیغہ نظر آیا تھا۔ وہ مبہوت سا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"یہ سب کیا ہے.....!" بالآخر وہ بڑبڑایا۔

کچرا چُننے والی بڑھیا قریب آتے ہوئے بولی۔ "تمہارا سر قلم ہونے سے بال بال بچا ہے۔ اگر میں بروقت فائر نہ کرتا تو یہ لڑکی تمہاری گردن اُڑا دیتی۔ اس نے جھک کر کولر سے درحقیقت یہی تیغہ نکالا تھا۔ یہ تمہاری گردن اڑانے کی فکر میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اسے پتا نہیں چلا، میں تم دونوں کے تعاقب میں آرہا تھا....."

پھر راجر کے سامنے کچرا چُننے والی بڑھیا نے اپنا قالب مزید تبدیل کرنا شروع کردیا۔ اس نے گندے، سفید بالوں والی وگ اور میلے چیتھڑے اتار پھینکے۔ اندر سے جرسی اور جینز والا ایک مرد نکل آیا۔ وہ راجر کو اپنا پولیس بیج دکھاتے ہوئے بولا۔ "میں کاؤنٹی کی اسپیشل ٹاسک فورس کا سراغرساں برد سکی ہوں۔ ہماری فورس کا ایک ایک آدمی اس ریلوے لائن کے ہر چھوٹے اسٹیشن پر کسی نہ کسی روپ میں تعینات تھا اور اس سفاک قاتل کے اگلے حملے کا انتظار کررہا تھا۔ میرا ایک ساتھی فون بوتھ کے قریب چھپا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ہیڈکوارٹر فون کررہا ہے۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا.....!" راجر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔

"وہ تمہیں اپنے ماں باپ اور گھربار وغیرہ کا جو قصہ سُنا رہی تھی، وہ یقیناً فرضی ہوگا۔" سراغرساں بولا۔ "اسٹیشن وہ اکیلی آئی تھی۔ وہ آوارہ گرد اور لفنگا سا نوجوان اس کے چند منٹ بعد پہنچا تھا۔ لڑکی نے خود ہی ہنس ہنس کر اور ادائیں دکھا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ تمہارے آنے سے پہلے وہ بڑی اپنائیت سے اس کے ساتھ سر جوڑ کر سرگوشیاں کررہی تھی اور نہ جانے کیا کیا جھانسے دے رہی تھی۔ اسی لیے تو وہ بعد میں اس کے پیچھے گیا تھا لیکن لڑکی نے غالباً تمہاری آمد کے بعد یہ محسوس کیا تھا کہ تم اس کے لیے زیادہ بہتر اور آسان شکار ہو۔ اسے یقین تھا کہ تم اسے لفنگے سے بچانے کے لیے ضرور آؤ گے۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ لفنگا نوجوان اور میں..... یعنی کچرا چُننے والی بڑھیا تو بعد میں پولیس وغیرہ کو آتے دیکھ کر کھسک جائیں گے۔ یوں پولیس کو واردات کے بارے میں ایک بار پھر کوئی عینی شاہد نہیں ملے گا۔"

"آخر یہ ایسا کیوں کرتی تھی؟" راجر جھرجھری لے کر بولا۔

"اخبارات میں یہ بات نہیں چھپی کہ یہ اپنے مقتولوں کو لوٹتی بھی تھی۔ ان کا کوئی لاکٹ..... چین..... گھڑی..... انگوٹھی..... بٹوا..... کریڈٹ کارڈز..... غرضیکہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا تھا، اس کا صفایا کردیتی تھی۔ یہ چیزیں یقیناً تمہارے پاس بھی ہوں گی۔" سراغرساں بولا۔

"لیکن یہ ان کے سر کیوں غائب کردیتی تھی؟" راجر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ جب مقتول کا سر بھی غائب ہوتا تھا تو اس کی شناخت میں بہت دشواری پیش آتی تھی، دیر بھی لگ جاتی تھی لیکن میرے خیال میں اس کی بگڑی ہوئی نفسیات کے لیے اس میں کوئی اضافی سنسنی بھی پوشیدہ تھی۔ سر غائب کرکے اس کے جنون کو کچھ اور تسکین ملتی ہوگی۔"

"تمہارے خیال میں وہ سر کہاں گئے؟" راجر نے پوچھا۔

سراغرساں نے جھک کر کھلے کولر کا معائنہ کیا اور سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسے آوارہ گرد نوجوان سے سرگوشیاں کرتے سُنا تھا کہ وہ اسے اپنے مٹی اور پلاسٹر آف پیرس سے بنائے ہوئے مجسمے دکھائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اسے یہ کام آتا ہوگا۔ کولر میں پانی کی بوتل اور پلاسٹر آف پیرس کا ڈبا موجود ہے۔ قتل کے بعد جب تک گردن سے خون ٹپکنا بند ہوتا ہوگا تب تک یہ پانی ملا کر پلاسٹر آف پیرس تیار کرلیتی ہوگی اور کھوپڑی پر اس کی تہہ چڑھا لیتی ہوگی۔ پلاسٹر آف پیرس بہت جلدی سوکھ جاتا ہے۔ اس حالت میں یہ اس کھوپڑی کو کولر ہی میں رکھ کر لے جاتی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ جہاں کہیں بھی اس کا گھر یا ٹھکانا ہوگا، وہاں پلاسٹر آف پیرس میں چھپی وہ کھوپڑیاں مل جائیں گی۔ لڑکی کی لمبی لمبی مخروطی انگلیاں یہ بتاتی ہیں کہ یہ اچھی مجسمہ ساز بھی ہوگی.....!"

HEAD HUNTER
JAN CAROL SABIN

یہ داستان روسی عزائم اور مکار روسیوں کے پس منظر میں تحریر کی گئی ہے۔
افغانستان کے ظاہر شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر روسی حکمرانوں نے جب اس اسلامی ملک میں کمیونسٹ اسٹیٹ کے قیام کی راہ ہموار کر دی تو ملک کے راسخ العقیدہ مسلمان اس لادینی طوفان کے مقابل سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ افغان مجاہدین چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر اس روسی لشکرِ عظیم کے لیے عذاب ثابت ہوئے جو ساری دُنیا میں ایک بڑی قوت کے طور پر مشہور تھا۔ ایسی ہی ایک ٹولی میں ایک نوجوان عقاب کے نام سے مشہور ہو گیا۔ وادیٔ پغمان کی چٹانیں اس کا مسکن تھیں لیکن اُس کے بارے میں کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کب اور کہاں نمودار ہو گا۔ روسیوں کا کوئی ٹھکانا اُس کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا۔ جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا، اُس کے لیے یہی لہو گرم رکھنے کا بہانہ تھا۔

آہن و آتش کے طوفان سے نبرد آزما ایک سرفروش کی داستانِ شجاعت

طاغوتی قوتوں کے مقابل جذبۂ ایمانی سے سرشار مجاہدین کے صبر و استقامت کی حکایت

Scanned By: MAAUL MUSTAFA 0333-4585215

پروازِ عقاب

اقبال کاظمی

وادیٔ پغمان اور کابل کے حکمرانوں میں زمانۂ قدیم سے گہرے روابط قائم تھے۔ کابل کے سردار محمد یوسف خان کے بارے میں آدم درانی نے اکثر سنا تھا جس نے پغمان کے جنگجو قبائل کی مدد سے یحییٰ خیل خاندان کو تباہ ہونے سے بچایا تھا اور اس کے بعد ہی جدید افغانستان کی بنیاد پڑی تھی۔

جغرافیائی لحاظ سے بھی افغانستان کو بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی۔ یہ خطّہ مشرق اور مغرب کے درمیان رابطے کا کام دے رہا تھا۔ اسلام سے افغانستان کا گہرا اور مضبوط بندھن قائم تھا۔ وادیٔ پغمان کے خان حضورؐ کی اولاد میں سے تھے۔ حضورؐ کی چادرِ مبارک قندھار کی ایک خانقاہ میں محفوظ تھی اور یہ افغانستان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ جب افغانستان کا پہلا بادشاہ تخت نشین ہوا تو صابر شاہ نامی ایک سیّد زادے نے اسے اپنے ہاتھوں سے تاج پہنایا تھا۔

آدم درانی اپنے اسلاف کی داستانیں بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ ہر خاندان کے بڑے بوڑھے بھی ان باتوں کا خاص خیال رکھتے تھے کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کو اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں اور ان کی تاریخ سے آگاہ رکھیں۔

اور اب تاریخ شاید اپنے آپ کو ایک بار پھر دہرا رہی تھی۔ قندھار کے شمال مغرب میں چند میل کے فاصلے پر موسیٰ قلعہ نے تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا اور اب اسی موسیٰ قلعہ سے چند میل کے فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں آدم درانی کا کارواں پڑاؤ ڈال رہا تھا۔ دوسری طرف سے کاجا کائی بھی چند میل کے فاصلے پر تھا جہاں نور کا باپ سردار اکبر شرنی بھی موجود تھا۔

جس جگہ پڑاؤ ڈالا گیا تھا وہاں درختوں کی بہتات تھی اور پانی کی بھی کمی نہیں تھی۔ مویشیوں کے لیے بھی سبزہ بکثرت تھا۔ کوچی اپنے مویشیوں کو منڈی میں فروخت کرنے سے پہلے انہیں کھلا پلا کر تگڑا کر لینا چاہتے تھے تاکہ اچھے دام مل سکیں۔ آدم درانی نے ایک یہ بات بھی نوٹ کی تھی کہ کوچی اپنے بچوں اور عورتوں کو کبھی شہروں اور بستیوں میں لے کر نہیں جاتے تھے۔ جہاں پر بھی پڑاؤ ہوتا انہیں چند آدمیوں کی حفاظت میں کیمپ ہی میں چھوڑ دیا جاتا۔

آدم درانی سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے قندھار جا کر معلومات جمع کی جائیں اور اس کے بعد سردار اکبر شرنی کی رہائی کا منصوبہ بنایا جائے جو شاید قندھار سے ساٹھ میل کے فاصلے پر کاجا کائی ڈیم پر قید تھا یا اسے کڑی نگرانی میں رکھا گیا تھا۔

○☆○

پختون نشستان (صوبہ قندھار)

وسط شہر

آدم درانی، نور شرنی، کریمہ اور دس آدمیوں کو لے کر کوچی قبائلیوں کے بھیس میں قندھار شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ کوچی قبیلے کے بھی چند لوگ تھے تاکہ کسی قسم کی گڑبڑ کا امکان

SOVIET UNION
Herat
Kabul
Khyber Pass
AFGHANISTAN
Kandahar

نہ رہے۔

ان کا یہ مختصر سا قافلہ ہرات سے آنے والی ہائی وے کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر چلتا رہا۔ راستے میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا نہ ہی کسی نے روکا اور نہ ہی کچھ پوچھا۔ وہ اطمینان سے چلتے ہوئے بالآخر شہر میں داخل ہو گئے۔

کوچی تو اپنے مویشی وغیرہ لے کر منڈی کی طرف چلے گئے جبکہ آدم درانی، نور شریفی، قاسم اور کریمہ دوسری طرف چلے گئے۔ ان کے باقی ساتھی بھی معلومات جمع کرنے کے لیے دو دو کی ٹولیوں میں شہر کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ پچھلے دو تین برسوں کے دوران شدید لڑائیوں نے افغانستان کے اس دوسرے بڑے شہر کی بلند و بالا اور خوب صورت عمارتوں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ جو عمارتیں ابھی تک اپنی بنیادوں پر کھڑی تھیں ان میں بھی راکٹوں کے بڑے بڑے شگاف نظر آ رہے تھے۔ بعض عمارتیں تو ایسی تھیں جو کسی بھی لمحہ زمین بوس ہو سکتی تھیں۔ شہر کے پارک اور کھیلوں کے میدان بے گھر اور بے آسرا لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر عورتیں اور بچے ایسے تھے جو معذور ہو چکے تھے۔

دن کے وقت کوئی روسی یا افغان کمیونسٹ شہر کے ان علاقوں میں آنے کی جرأت نہ کرتا۔ البتہ کبھی کبھار پیٹرولنگ کرنے والی کوئی گاڑی نظر آ جاتی جو ایک علاقے میں داخل ہو کر تیز رفتاری سے چلتی ہوئی دوسری طرف سے نکل جاتی۔ مسلح روسی فوجیوں کو بھی کسی جگہ رُکنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بہرحال، یہ کہنا مشکل تھا کہ شہر کا کون سا علاقہ روسیوں کے قبضے میں تھا اور کون سا نہیں۔

آدم درانی اپنے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ لالہ زار کیفے کے باہر فٹ پاتھ پر بچھی ہوئی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک موٹر سائیکل سوار دستہ تیزی سے سڑک پر سے گزر گیا۔ ہر موٹر سائیکل کی سائیڈ کار پر ہلکی مشین گنیں لگی ہوئی تھیں۔ آدم درانی نے سوالیہ نگاہوں سے کیفے کے مالک کی طرف دیکھا۔ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"یہ شورادی، کمیونسٹ ہیں۔ ان کا جنرل قندھار شہر دیکھنا چاہتا ہے لیکن اکیلا کہیں جانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔"

فوجیوں سے بھری ہوئی چند اور گاڑیاں وہاں سے گزریں۔ یہ فوجی گاڑیوں میں دو قطاروں میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے رخ اندر کی طرف تھے اور وہ ایسی پوزیشن میں تھے کہ حملے کی صورت میں نہ تو فوری طور پر اپنے ہتھیار اٹھا سکتے تھے اور نہ ہی فائرنگ کی صحیح پوزیشن میں تھے۔

"یہ لوگ اس طرح کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟" آدم درانی نے کیفے کے مالک سے پوچھا۔

"یہ ایک طرح کا زبانی معاہدہ ہے۔ ان کے اس طرح بیٹھنے کا مطلب ہے کہ وہ لوگ لڑنے کے لیے نہیں، شہر کے معائنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ فائرنگ میں پہل نہیں کریں گے اور ظاہر ہے کہ جب وہ لوگ بس کے پُرامن مسافروں کی طرح ٹرکوں میں بیٹھے رہیں گے تو ہم بھی ان پر حملہ نہیں کریں گے۔" کیفے کا مالک مسکرایا۔ "لیکن جب لڑائی شروع ہوگی تو ہم ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

○☆○

جنوب مغربی افغانستان کسی زمانے میں ایشیا کا باغ کہلاتا تھا۔ قدرت نے بڑی فراخدلی سے اس خطّے کو حسن کی دولت سے نوازا تھا۔ تاحدِّ نگاہ پھیلے ہوئے مرغزار، پھلوں سے لدے ہوئے باغات، لہلہاتی ہوئی فصلیں اور خوش رنگ و حسین پھولوں کی خوشبو سے مہکتی ہوئی فضا لیکن پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ چنگیز خان بغداد کی طرح اس حسین خطّے پر بھی قہرِ الٰہی بن کر نازل ہوا۔ اس نے آب پاشی کا سارا نظام تباہ کر دیا۔ یہ سرسبز و شاداب خطّہ بتدریج ویرانے میں تبدیل ہوتا چلا گیا اور پھر پانچ صدیوں تک یہ ویرانہ ہی رہا۔ اس کے بعد کہیں شمال مشرقی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں سے بہنے والے تین دریاؤں ارغنداب، ترناک اور دریائے ارغستان کا رخ تبدیل کیا گیا تاکہ اس ویرانے کو دوبارہ آباد کیا جا سکے۔

آدم درانی تین صحراؤں کے سنگم پر واقع چھوٹی سی پہاڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ویرانے کبھی سرسبز و شاداب ہوا کرتے تھے لیکن اب یہاں ریت اُڑتی تھی۔ آدم درانی دوربین آنکھوں سے لگائے کاجاکائی ڈیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سردار اکبر شریفی یہیں کہیں قید تھا۔

آدم درانی کے ساتھیوں نے کاجاکائی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے نخلستان میں کیمپ لگا رکھا تھا۔ اونچے اور گنجان درختوں کی وجہ سے انہیں خاصا تحفظ مل گیا تھا۔ ان کے جنوب میں ایران کی طرف جانے والی ہائی وے تھی جبکہ مخالف سمت میں یہی ہائی وے وادی ہلمند کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی جنوب مشرق میں تقریباً ڈیڑھ سو میل دور پاکستان کی طرف چلی گئی تھی۔

جنوب مشرق میں دریا کے بالائی رخ پر دوسرا ڈیم تھا۔ اس ڈیم کو ارغنداب کا نام اسی دریا کی نسبت سے دیا گیا تھا۔ جنوب میں تقریباً بیس میل کے فاصلے پر تاریخی شہر قندھار تھا۔ کچھ ہی عرصہ پہلے قندھار کے شہریوں نے روسیوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا تھا۔ قندھار پر روسیوں کا یہ سب سے بڑا حملہ تھا جس میں سوویت فوج کے ۴۰ویں ڈویژن کے ساتھ ۲۴۰ گن شپ ہیلی کاپٹر اور لاتعداد MIG.25 میزائل بردار طیاروں نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔

آدم درانی دوربین کو بائیں سے دائیں آہستہ آہستہ حرکت دیتا ہوا ڈیم کا معائنہ کر رہا تھا۔ ہوائی اور زمینی حملے سے بچاؤ کے لیے روسیوں نے بہترین دفاعی انتظامات کر رکھے تھے۔ موبائل 20

ایس اینٹی ائر کرافٹ گنیں کسی بھی ہوائی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھیں۔ زمین سے فضا میں مار کرنے والے راکٹوں کی بیٹریوں کے قریب مسلح محافظ ٹہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان بیٹریوں کا عملہ یقیناً لکڑی کے ان ہٹس میں تیار بیٹھا تھا جو مین بلڈنگ کے قریب واقع تھے۔ ڈیم کی طرف جانے والے راستے پر بھی تقریباً دو درجن ٹینک تیار کھڑے تھے۔

ڈیم کے اردگرد کا علاقہ بھی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر مشتمل تھا۔ ان پہاڑیوں میں ایسے پگڈنڈی نما چھوٹے چھوٹے راستے موجود تھے جن کے ذریعے ڈیم تک پہنچا جا سکتا تھا۔

کاجا کائی ڈیم اور ان راستوں کا جائزہ لینے کے بعد آدم درانی نے نور کے والد اکبر شریفی کو پیغام بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔

○☆○

"آپ نے بہت بڑی غلطی کی ہے یور ایکسی لینسی۔" عقاب نے کہا۔ "میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس غلطی کا ازالہ کس طرح کرسکتے ہیں۔"

اکبر کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ افغان کابینہ میں وزیر اور سفیر بھی رہ چکا تھا۔ اقوام متحدہ میں بھی اس نے افغانستان کی نمائندگی کی تھی۔ وہ جس ملک میں بھی جاتا' اسے گارڈ آف آنرز پیش کیا جاتا۔ آدم درانی عمر میں اس سے تیس سال چھوٹا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ آدم درانی کو اس نے گود میں بھی کھلایا تھا۔

"کیا ہم یہاں محفوظ ہیں؟ میرا مطلب ہے' ہم تو کھلی جگہ پر ہیں اور سامنے کیفے میں وہ محافظ بھی بیٹھا ہوا ہے۔" اکبر شریفی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ سڑک سے ذرا ہٹ کر درخت کے نیچے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"میں نے آپ کو پیغام بھیجا تھا کہ آپ روزانہ ایک مقررہ وقت پر ٹہلنے کے بہانے اس طرف آجایا کریں۔ محافظ کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا۔ پہلے ایک ہفتے تک تو وہ آپ کے ساتھ اس ٹیلے تک آتا رہا پھر اس کی دلچسپی کسی حد تک کم ہوگئی۔ وہ کمیونسٹ ہے' اس نے جب دیکھا کہ یہاں آکر آپ نماز پڑھنے لگتے ہیں تو وہ ساتھ آنے کے بجائے اس کیفے میں بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس کیفے میں ایک خوب صورت لڑکی کی بھی ڈیوٹی لگا رکھی ہے۔ وہ لڑکی اگرچہ کچن میں ہی رہتی ہے لیکن وہیں کھڑے کھڑے اس محافظ کو باتوں میں لگائے رکھتی ہے۔ آپ کے ساتھ محافظ کا لگے رہنا اور لڑکی سے اس کی باتوں سے ہی ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ آپ روسیوں سے ملے نہیں بلکہ ان کے قیدی ہیں۔" آدم درانی چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کے علاوہ میں نے کچھ لوگوں کو راستے کی نگرانی پر بھی لگا رکھا ہے۔ اگر اس محافظ نے کسی وقت اس طرف آنے کی کوشش کی تو اس پر تین سمتوں سے فائرنگ ہوگی۔"

اکبر شریفی چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اس محافظ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے پاس وہ جدید ترین رائفل ہے جس کی گولی انسانی جسم میں داخل ہوکر اس کے ٹشوز کو کاٹتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی ہے اور اس گولی کا زخم آپریشن سے بھی ٹھیک نہیں ہوسکتا اور اگر گولی ہڈی پر لگ جائے تو فوراً ہی موت واقع ہوسکتی ہے۔"

"اور میرے دو ایسے آدمی نگرانی پر کھڑے ہیں جو اس محافظ کے رائفل اٹھانے سے پہلے ہی اس کی کھوپڑی میں سوراخ کرسکتے ہیں۔" درانی ٹیلے پر جھاڑی میں جھک گیا۔ "حفاظتی انتظامات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا لیکن ہم نے بہرحال آپ کو وہاں سے نکالنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ میں آپ کو چند ضروری باتیں بتا دینا چاہتا ہوں۔ نور بالکل ٹھیک ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہے اور یہاں سے زیادہ دور نہیں۔"

اکبر شریفی کے پورے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر لگتا تھا جیسے بے ہوش ہونے کی تیاری کررہا ہو۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"جیسے بھی سہی' سونا آپ کے ہاتھوں سے نکل کر روسیوں کے قبضے میں پہنچ چکا ہے۔ دریائے آمو کی بندرگاہ پر کارروائی کرکے اس سونے کا ایک حصہ تو ہم اپنے قبضے میں لے چکے ہیں اور باقی سب سونا لینے کے لیے آئے ہیں۔" آدم درانی نے کہا۔

"باقی سونا؟" اکبر شریفی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "لیکن وہ تو سارا سونا اپنے قبضے میں لے چکے ہیں۔ وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے غار تک پہنچ گئے تھے اور پھر انہوں نے سونے پر قبضہ کرلیا۔ تم مجھے نور کے بارے میں بتاؤ' وہ کیسی ہے؟ کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم یہاں سے نکلیں گے تو اسے آپ سے ملا دیا جائے گا۔ یہ بتایئے کہ وہ سونا کہاں لے گئے تھے؟" آدم درانی نے پوچھا۔

"ائرپورٹ۔" اکبر شریفی نے جواب دیا۔ "میں نے سنا ہے کہ وہ سونا کیپٹن سی مونسٹر پر لادا جارہا ہے۔"

"کس پر لادا جارہا ہے؟"

"بحری عفریت کہہ لو۔ یہ بہت بڑے بڑے ہوور کرافٹ ہیں جو فضا میں پرواز کرنے کے علاوہ سمندر کی سطح پر بھی تیر سکتے ہیں۔ روسیوں نے یہ ہوور کرافٹ کیپٹن کی بندرگاہ پر ہی بنائے تھے۔ یہ جدید ترین ہوور کرافٹ اتنے بڑے ہیں کہ ان میں ایک ہزار آدمیوں کی گنجائش ہے اور کئی ہزار ٹن سامان بھی لادا جاسکتا ہے۔ یہ سمندر یا خشکی پر ایک ہزار کلو میٹر کا فاصلہ طے کرسکتے ہیں۔ بارودی سرنگیں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اتنی کم بلندی پر پرواز کرتے ہیں کہ ریڈار میں نہیں آتے۔ انہیں جدید ترین ہتھیار کی

حیثیت حاصل ہے۔ اس علاقے میں روسی افسروں کو اکثر یہ کہتے سُنا گیا ہے کہ وہ اگلی جنگ انہی کی مدد سے جیتیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ سونا انہی کے ذریعے روس لے جایا جا رہا ہے۔"

"آپ کو جب یہ خزانہ ملا تھا تو آپ نے مجاہدین کی کسی تنظیم سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا تاکہ اسے یہاں سے نکال کر لے جانے کی کوشش کی جاتی؟" آدم درانی نے کہا۔

"میں تو یہاں پھنسا ہوا ہوں میرے بھائی۔ میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ مزاحمتی تحریکیں کہاں ہیں اور ان سے رابطہ کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے ایک آدمی سمیر کو پشاور بھیج دیا تھا۔ ان دنوں نری بیا کا شہزادہ جمال پشاور کے دورے پر آنے والا تھا۔ میں نری بیا کے حکمران زید کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے شہزادہ جمال کو پیغام بھیجا تھا کہ مجاہدین کی کسی تنظیم کو تلاش کر کے انہیں بتا دیا جائے کہ رقم کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ میرے پاس مزید کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے تو فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا تھا اور میری سمجھ میں جو آیا وہ میں نے کیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" آدم درانی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے سمیر کو پشاور بھیجا تھا لیکن اس کی طرف سے مجھے ابھی تک کوئی پیغام نہیں ملا لیکن اسی دوران روسی میرا تعاقب کرتے ہوئے خزانے تک پہنچ گئے اور انہوں نے سارا سونا اپنے قبضے میں لے لیا۔" اکبر شریفی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"اور مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے تمہیں گھومنے پھرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ تمہیں گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟" آدم درانی نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شاید اس لیے کہ انہیں میری فنی مہارتوں کی ضرورت ہے۔" اکبر شریفی نے جواب دیا۔

اسی لمحے درخت کی ایک شاخ زور زور سے ہلنے لگی۔ "میرا ایک آدمی درخت کی شاخ سے بندھی ہوئی رسّی کھینچ رہا ہے۔ شاید تمہارا محافظ کیفے سے اٹھ کر اسی طرف آ رہا ہے۔ جائیے' اسے راستے میں ہی ملیں۔ کچھ دیر بعد میں بھی یہاں سے نکل جاؤں گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' ہم آپ کو یہاں سے ضرور نکال لے جائیں گے۔"

○☆○

نخلستان
وسط ستمبر

نخلستان میں گوریلوں کی جنگی کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ جیسا کہ سردار اکبر' آدم درانی کو پہلے ہی بتا چکا تھا کہ سونا قندھار ائرپورٹ پر پہنچا دیا گیا تھا اور ظاہر ہے وہاں سے ماسکو بھیجا جائے گا۔ اس وقت اس جنگی کونسل کے سامنے اہم ترین مسائل یہ تھے کہ سونے کی منتقلی کو روکا جائے' اس پر قبضہ کیا جائے اور سردار اکبر کو ان کے شکنجے سے رہائی دلائی جائے۔ قندھار سے کوچی قبائلیوں نے اطلاع دی تھی کہ روسی اور افغان ۱۵ویں انفنٹری ڈویژن بہت جلد شہر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ قندھار میں مزاحمتی تحریک نے عقاب کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ قندھار آئیں تو انہیں خوش آمدید کہا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے روسیوں کے ہوائی حملے کے خطرے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"ہم محض سو آدمیوں کے ساتھ شہریوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہماری یہ سو کی تعداد بھی اس وقت پوری ہوتی ہے جب کوچی قبائلی پاکستان جانے کا فیصلہ ترک کر کے ہمارا ساتھ دیں۔" قاسم نے کہا۔ "میری تجویز تو یہ ہے کہ پہلے سونے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد سردار اکبر شریفی کو رہائی دلائی جائے۔"

"کیا دونوں کارروائیاں بیک وقت نہیں ہو سکتیں؟" نور نے پوچھا۔

"پہلے تو ہمیں اپنے اسکاؤٹس کی طرف سے اس اطلاع کا انتظار کرنا چاہیے کہ ہوور کرافٹس کی حفاظت کے لیے کتنے آدمی تعینات کیے گئے ہیں۔" آدم درانی نے کہا۔

"میں اس پر کام کرتا رہا ہوں۔" قاسم نے کہتے ہوئے ایک کاغذ جیب سے نکال لیا جس پر پینسل سے کچھ اعداد و شمار لکھے ہوئے تھے۔ "کیا آپ لوگوں نے یہ سوچا ہے کہ اگر سونا اتنی ہی مقدار میں ہے جس کا ہم نے تخمینہ لگایا ہے تو اس کا وزن کتنا ہو گا؟ ہم اس پر قبضہ کیسے کریں گے؟ اسے کہاں رکھا جائے گا اور کسی ٹرانسپورٹ کے بغیر اسے پاکستان کیسے منتقل کیا جائے گا؟"

"میں بھی ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔" کیڈٹ عارف نے کھڑے ہو کر کہا۔

"ہاں کہو۔" آدم درانی بولا۔

"ہمیں مزید آدمیوں' اسلحے' ٹرانسپورٹ اور غالباً مزید معلومات کی ضرورت ہے۔ قندھار پر شاید کسی بھی لمحے حملہ ہو سکتا ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہم قندھار کے دفاع میں یہاں کے لوگوں کی مدد کریں اور اگر کامیاب ہو گئے تو ہم قندھاریوں سے سونے کے مسئلے پر مدد لے سکتے ہیں۔" کیڈٹ عارف نے کہا۔

"تجویز تو بہت اچھی ہے۔" اعظم بے بولا۔ "لیکن بعض امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہو سکتا ہے اس دوران ہوور کرافٹس سونا لے کر روانہ ہو جائیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ اگر قندھاریوں کو سونے کی بھنک مل گئی تو وہ ہمارے لیے مزید مسئلے پیدا کر سکتے ہیں۔ سونا ایسی چیز ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کے ایمان متزلزل ہو جاتے ہیں۔"

وہ سب لوگ کیڈٹ عارف کی طرف دیکھنے لگے۔

"ٹھیک ہے کیپٹن صاحب! لیکن سب سے پہلے تو ہم اپنے

آدمیوں کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہوور کرافٹ کب تک روانہ ہونے والے ہیں۔ ہمارے یہی آدمی دشمن کی صحیح پوزیشن اور قوت کا اندازہ بھی لگائیں گے۔"

"بس برخوردار۔" اعظم بے نے کہا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم پیٹرولنگ کے بارے میں جانتے ہو لیکن سیکیورٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اور پھر قندھاریوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہماری مدد کرنے کے بجائے ہم سے سونا چھین لیں گے۔"

"ہمیں اس قسم کے خطرات تو مول لینے ہی پڑیں گے سر۔" کیڈٹ عارف نے کہا۔

آدم درانی چند لمحے سوچتا رہا پھر اس تجویز پر دوسروں کی رائے لی گئی اور بالآخر ووٹنگ کے بعد کیڈٹ عارف کی تجویز مان لی گئی۔

○☆○

ائرپورٹ تقریباً بیس میل کے فاصلے پر تھا اور کیپٹن اپنے آدمیوں کے ساتھ نخلستان میں جھاڑیوں کی پناہ گاہ میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کسی سواری کے بغیر یہ فاصلہ کیسے طے کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس ریگستان میں کسی معجزے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اچانک ان کا ایک آدمی دوڑتا ہوا جھاڑیوں میں داخل ہوا۔

"ہوشیار کمانڈر سر!" وہ چیخا۔ "اس طرف گرد اڑتی ہوئی نظر آرہی ہے۔"

گرد و غبار کا وہ بادل غالباً گاڑیوں کی وجہ سے اُٹھ رہا تھا جو اسی طرف آرہی تھیں۔

"ہوشیار!" آدم درانی ہاتھ اٹھا کر چیخا۔ "میرا یہ حکم سب کو پہنچا دو کہ ان گاڑیوں کو نخلستان میں داخل ہونے دیا جائے۔ اگر گاڑیاں کم ..... ہوں تو پہلے ٹرک پر حملہ نہ کیا جائے اور اگر زیادہ گاڑیاں ہوں تو درمیان میں حملہ کرکے انہیں دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔"

وہ شخص رائفل سنبھالے ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

"یہ روسی ٹرک ہیں۔" زلیکوف نے کہا۔ وہ ابھی ابھی رینگتا ہوا جھاڑیوں میں داخل ہوا تھا۔

"کتنی گاڑیاں ہیں زلیکوف؟" آدم درانی نے پوچھا۔

"پانچ۔ ہو سکتا ہے چھ ہوں۔" زلیکوف نے جواب دیا۔

پانچ چھ ٹرکوں کا مطلب تھا کم سے کم دو سو آدمی۔ وہ انہیں چاروں طرف سے گھیر سکتے تھے۔ اعظم درانی رینگتا ہوا اعظم بے کے قریب آگیا۔

"وہ گرفتک کی طرف سے سیدھے ہماری طرف آرہے ہیں اعظم بے۔" درانی نے سرگوشی کی۔

اعظم بے مسکرا دیا۔ وہ اپنی کلاشنکوف AK-74 میں نیا میگزین فٹ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ دریائے ہلمند کی طرف سے آرہے ہیں اور یہ تمہارا دریائے ہخمان ہے آدم جان۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دریا تمہاری ضرور مدد کرے گا۔" وہ جانتا تھا کہ کاجا کائی ڈیم میں گرنے والا دریائے ہلمند' ہخمان کی ساڑھے بارہ ہزار فٹ بلند برفانی چوٹیوں سے جنم لے کر سیستان کے راستے تقریباً 625 میل کا فاصلہ طے کرکے یہاں تک پہنچتا ہے۔

ٹرکوں کے انجنوں کی آواز اب واضح ہوگئی تھی۔ ہوا بالکل ساکت تھی اور گھاس کی ایک پتی تک ہلتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ چھ ٹرک تھے جو غالباً طویل سفر کے باعث گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نخلستان میں داخل ہو کر پانی کے اس چشمے کے سامنے رک گئے جس کے قریب ہی جھاڑیوں میں آدم درانی' اعظم بے' زلیکوف اور قاسم چھپے ہوئے تھے۔

پہلا ٹرک تو جھاڑیوں کے اس قدر قریب رکا تھا کہ آدم درانی اس کے انجن کے تیل کی بُو تک سونگھ سکتا تھا۔ وہ گہری نظروں سے ٹرک کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے ریڈی ایٹر پر سرخ رنگ میں مثلث پر سرخ دائرہ اور اس پر گیہوں کا خوشہ بنا ہوا تھا۔ یہ افغان ڈیموکریٹک آرمی کا مخصوص نشان تھا۔ ایک نوجوان فوجی چھلانگ لگا کر ٹرک سے اُتر آیا۔ اس کے کندھوں پر لگے ہوئے نشانات اسے لیفٹیننٹ ظاہر کررہے تھے۔ وہ مکمل جنگی کٹ میں تھا۔ سر پر فولادی ہیلمٹ بھی موجود تھا اور حیرت کی ایک بات یہ تھی کہ اس نے گلے میں سبز رنگ کا رومال لپیٹ رکھا تھا۔

آدم درانی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا۔ انہوں نے جھاڑیوں سے نکل کر اچانک ہی ٹرک سے اترنے والے فوجی کو گھیرے میں لے لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا گوریلے اسے گھسیٹتے ہوئے جھاڑیوں میں لے آئے۔ ایک نے اس کا منہ دبا رکھا تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک اس کے نرخرے کو چھو رہی تھی۔

فوجی نے بڑی مشکل سے اپنے منہ سے ہاتھ ہٹایا اور صرف اتنا کہہ سکا۔ "مجاہد۔ فریڈم فائیٹر....." اس نے اپنے آپ کو ان کی گرفت سے آزاد کرایا' کپڑوں سے گرد جھاڑی اور اٹھ کر اٹین شن کھڑا ہوگیا اور سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔

"پندرھویں انفنٹری ڈویژن' افغان آرمی کا سینئر لیفٹیننٹ طورا' چھ روسی یو رال ٹرکوں' ایک سو اسی جوانوں جن میں پچیس سارجنٹ اور باقی سپاہی ہیں' کے ساتھ کمانڈر کی خدمت میں حاضر ہے۔ میرے تمام جوان بہترین حالت میں اور دشمن کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہیں۔"

کیپٹن اعظم بے کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ واقعی معجزہ ہوا تھا۔ غیب سے ان کے لیے امداد پہنچ گئی تھی۔

"ویل ڈن مائی بوائے۔" کیپٹن اعظم بے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں جنرل یا کمانڈر نہیں' کیپٹن یوسف اعظم بے ہوں۔ یہ ہمارا کمانڈر ہے۔ کاراکش آف ہخمان۔"

طورا نے ایک بار پھر سیلوٹ کیا۔ "یہ سبز رومال جنگ میں

ہماری شناخت کا نشان ہے لیکن ہم اب بھی افغان فوجی ہیں۔"

"شکریہ لیفٹیننٹ!" آدم درانی نے کہا۔ "ان ٹرکوں کو ادھر اُدھر چھپا دو۔ کیا تمہیں یہاں ہماری موجودگی کا علم تھا؟ روسی تمہارا تعاقب تو نہیں کر رہے؟"

طورا نے سینئر سارجنٹ کو ٹرکوں کے بارے میں حکم دیا۔ وہ سیلوٹ کر کے تیزی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

"میرا سُسر نیک نام خان قندھار میں مزاحمتی تحریک کا سربراہ ہے۔ اس نے راشن لانے والے ہمارے ایک ٹرک ڈرائیور کے ذریعے مجھے پیغام بھیجا تھا۔ 'ہم قندھار پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔' نہیں جناب! روسیوں کو کم از کم آٹھ گھنٹوں سے پہلے ہماری گمشدگی کا پتا نہیں چلے گا۔" طورا نے کہا۔

"ہمارے پاس آدمیوں کی کمی ہے طورا خان" آدم درانی نے کہا۔ "روسی اگرچہ ہمیشہ پوری قوت سے حملہ آور ہوتے ہیں لیکن تم لوگوں کے آنے سے ہمارا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا ہے۔"

اپنی فوج سے منحرف ہو کر آنے والے یہ افغان فوجی ہر قسم کے اسلحے سے لیس تھے۔ ان کے پاس تین نئے سوویت آٹومیٹک AGS-17 گرنیڈ لانچر تھے' یہ تباہ کن ہتھیار بیشتر محاذوں پر مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جا چکا تھا۔ خاصی تعداد میں کندھے پر رکھ کر فائر کرنے والے راکٹ لانچر' راکٹ' آٹومیٹک رائفلیں اور بڑی مقدار میں ایمونیشن موجود تھا۔

اعظم بے کو اپنے آدمیوں کے لیے ٹرک مل گئے تھے۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ "طورا خان! تمہارے لیے تحریری احکامات کیا ہیں؟"

"روسی' دری اور پشتو زبان میں لکھے ہوئے احکامات میرے پاس موجود ہیں سر۔ ان تحریری احکامات کے تحت ہم قندھار کے ارد گرد ستر میل کے علاقے میں پیٹرولنگ کر سکتے ہیں" طورا خان نے کہا۔

"کیا تم کسی کو شبے کا موقع دیے بغیر ائرپورٹ پر جا سکتے ہو جہاں ہوورکرافٹس کھڑے ہیں؟"

"کیوں نہیں جناب۔ ہم پہلے بھی کئی مرتبہ اس طرف جا چکے ہیں۔" طورا خان نے جواب دیا۔

"طورا!" کیپٹن اعظم اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ تمہارے رینک کا آدمی اتنے آدمیوں کو کمانڈ کر رہا ہے؟"

"اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں جناب" طورا خان نے جواب دیا۔ "ہمارے بیشتر فوجی منحرف ہو کر مجاہدین سے جا ملے ہیں۔ ہماری فوج ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے اور ہماری رجمنٹ کا تو شاید اب صرف نام ہی رہ گیا ہے۔"

"تم پہلے منحرف کیوں نہیں ہو گئے؟"

"ہمارے رشتے داروں کو حاجی خیل کیمپ میں یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔ نیک نام خان پہلے ان لوگوں کو کیمپ سے نکال کر محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتا تھا۔"

"وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"ان میں سے بیشتر حاجی خیل کیمپ پر حملے کے دوران جاں بحق ہو گئے۔ کچھ پاکستان میں بنگی در مہاجر کیمپ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن روسی ہوائی جہازوں نے اس کیمپ پر زبردست بمباری کی تھی اور مجھے کچھ پتا نہیں ہے کہ کیمپ پر اس بمباری کے بعد ان میں سے کوئی زندہ بچا بھی ہے یا نہیں۔"

"تمہارے کوئی قریبی رشتے دار؟" کیپٹن اعظم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ان میں ماں' میری بیوی اور دو بہنیں بھی شامل تھیں" لیفٹیننٹ طورا نے جواب دیا۔ آخر میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

○☆○

لیفٹیننٹ اعظم بے' لیفٹیننٹ طورا کے ایک سارجنٹ کی وردی میں ملبوس اپنی پارٹی کی قیادت کر رہا تھا۔ دو ٹرکوں پر تیس آدمی سوار تھے اور یہ آدمی کسی بھی قسم کی ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ اعظم بے کے پاس لیفٹیننٹ طورا کے پیٹرولنگ آرڈرز موجود تھے۔ سڑکوں پر اگرچہ سوویت ۳۷۵ویں موٹرائزڈ رائفل ڈویژن نے بیریر لگا رکھے تھے لیکن پیٹرولنگ کے ان آرڈرز کی موجودگی میں انہیں قندھار کی طرف جانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

وہ لوگ چار گھنٹے بعد واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ ہوورکرافٹس بیس پر ڈیوٹی دینے والا ایک مکینک بھی تھا۔ وہ مکینک گویا پہلے ہی فوج سے بھاگنے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس کے سینے میں قیمتی معلومات کا ذخیرہ بھی موجود تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق کیسپئن کے روسی ساحل پر واقع کراسنو واڈک نامی بیس سے آنے والے ان دیو ہیکل ہوورکرافٹس کی تعداد تیس تھی اور انہیں ائرپورٹ کے ایک خاص حصے میں رکھا گیا تھا۔ مکینک کی معلومات کے مطابق ہوورکرافٹس پر لکڑی کی پیٹیوں میں مشینوں کے پُرزے لدے ہوئے تھے اور یہ بہت جلد یہاں سے پرواز کرنے والے تھے۔ ان کی منزل تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ یہ ہوورکرافٹ' طیارے اور بحری جہاز کی ملی جلی شکلوں کے تھے اور فضا کے علاوہ پانی کی سطح یا زمین پر بھی چھ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑ سکتے تھے۔ روسی ان کی کارکردگی سے مطمئن تھے اور اس بات پر خوش تھے کہ وہ انہیں دنیا میں کہیں بھی استعمال کر سکتے تھے۔

مکینک کے مطابق ان روسی ہوورکرافٹس کا راز مغرب والوں پر کسی حد تک فاش ہو گیا تھا۔ اس نے برطانوی ریفرنس بک' 'جینز سرفیس ہوورکرافٹس' کے ایک صفحے کی فوٹو کاپی بھی دکھائی جس پر اس روسی ہوورکرافٹس سے ملتے جلتے ایک جہاز کی تصویر بھی تھی لیکن مغرب والوں کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ روسی بہت

بڑی تعداد میں عفریت نما یہ ہوور کرافٹ تیار کر چکے ہیں۔

آدم درانی سوچ رہا تھا کہ ان ہوور کرافٹس پر کس طرح حملہ کر کے سونے پر قبضہ کیا جائے۔ اس دوران سردار اکبر شریفی جھکتا ہوا جھاڑیوں میں داخل ہوا۔

"آپ!" آدم درانی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔ "میں آپ کو وہاں سے نکالنے کے لیے مختلف منصوبوں پر سوچ رہا تھا لیکن آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

اکبر شریفی نے مسکراتے ہوئے زلیکوف کی طرف اشارہ کیا جو اسے جھاڑیوں میں مزید آگے دھکیل رہا تھا۔ "اپنے اس روسی دوست سے پوچھو۔"

زلیکوف نے اپنے گم بوٹ کے غلیپ سے خنجر نکالا اور اس کی نوک سے دانت کریدنے لگا۔ "کوئی زیادہ سنسنی خیزیات نہیں ہے۔ میں نے لیفٹیننٹ طورا سے ایک ٹرک مستعار لیا' پانچ افغان اس پر لادے اور مُلّا عظیمی کو رہنمائی کے لیے ساتھ لے لیا اور اس کے بعد کچھ مشکل پیش نہیں آئی۔"

"ہم اپنے آدمیوں کو تحفے نہیں دیتے زلیکوف" آدم درانی نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب ہم جب بھی آرڈر آف ریڈ بینر والے کسی روسی فوجی کو گرفتار کریں گے تو اس کا آرڈر آف ریڈ بینر تمہیں پیش کر دیا جائے گا۔" وہ زلیکوف کے اس کارنامے پر بے حد خوش تھا۔ زلیکوف کو شاید خود بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اس نے کتنا بڑا کام کر دکھایا ہے۔

"کیا زلیکوف نے تمہیں بتایا ہے کہ نور کہاں ہے؟" آدم درانی نے سوالیہ نگاہوں سے اکبر کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟" اکبر شریفی نے پوچھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے اور یہیں ہے۔ زلیکوف! انہیں نور جان کے پاس لے جاؤ" درانی نے کہا۔ اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اکبر شریفی' زلیکوف کو دھکیلتا ہوا جھاڑیوں سے نکل رہا تھا۔ آدم درانی ایک بار پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے نقشوں کی طرف متوجہ ہو گیا' وہ سوچ رہا تھا کہ اگر روسی شمال کی طرف سے قندھار پر حملہ کریں تو وہ اس وقت کہاں جمع ہو رہے ہوں گے۔

○☆○

ٹارگیٹ۔ قندھار ائرپورٹ

۵ ستمبر۔ دوپہر

سوویت ہائی کمان کو اس بات کا غصہ تھا کہ روسی فوج کو بار بار قندھار کے نہتے شہریوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر بھاگنا پڑ رہا تھا اور اب تو قندھار کے گردونواح میں کاراکش اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی کی اطلاعات بھی مل رہی تھیں۔ بہرحال روسی ہائی کمان نے شہر کو ان بدمعاشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے فیصلہ کن حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

ہالزن طویل عرصے سے کونسل آف منسٹرز کی سربراہی کا

دوھری حفاظت
دوھرا نکھار

خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ عہدہ حاصل کرنے کے بعد اسے اتنی قوت حاصل ہو جاتی کہ کسی کے لیے اس کے سامنے سر اٹھانا مشکل ہو جاتا لیکن کونسل آف منسٹرز کی سربراہی حاصل کرنے کے لیے ایک اہم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری تھا' اور وہ منصوبہ تھا آپریشن آتش کش۔ وہ خزانے کی منتقلی کے اس منصوبے کو ہر صورت میں کامیاب بنانا چاہتا تھا لیکن شطرنج کے ایک ماہر کھلاڑی کی طرح اس نے اپنے سامنے دو بڑی رکاوٹوں کو بھی محسوس کر لیا تھا۔

وہ اہم اطلاع ہالزن کو اپنے پشاور کے سب سے قابلِ اعتماد ایجنٹ نورحان سے ملی تھی۔ نورحان واقعی بہت ذہین ایجنٹ ثابت ہوا تھا۔ وہ مختصر سے عرصے میں پشاور سے چترال' نورستان اور جنوب مغرب میں سیکڑوں میل دور کوئٹہ تک اپنے ایجنٹوں کا جال پھیلا چکا تھا۔ اگر آدم درانی کو نورحان کی بھیجی ہوئی اس رپورٹ کا پتا چل جاتا تو یقیناً وہ خود بھی سر تھام کر بیٹھ جاتا۔ نورحان کی یہ رپورٹ اس وقت ماسکو میں ہالزن کی میز پر پڑی ہوئی تھی۔

"موضوع۔ خطرناک انقلابی رہنما۔ جنگی نام کاراکش۔ اصل نام۔ نامعلوم۔ پیغام۔ کاراکش کی قیادت میں وادیٔ پنجشیر میں وفادار افغان فوج اور روسی دستوں کو بار بار شکست دینے والا اور دریائے آمو کی بندرگاہ پر گن بوٹ جیسوں کو تباہ کرنے والا گوریلوں کا یہ خطرناک دستہ اب قندھار کے نواح میں دیکھا گیا ہے۔ قندھار کے قریب کاراکش کی موجودگی منتقلی کے منتظر خزانے کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

ہالزن نے اس پیغام کو کئی مرتبہ پڑھا اور پھر مزید وقت ضائع کیے بغیر اس کے آخری جملے پر سرخ پینسل سے نشان لگا کر اسے وزارتِ دفاع کے توسط سے سوویت افغان کمانڈر کو بھیج دیا۔

میز پر ایک دوسرا پیغام بھی رکھا ہوا تھا اور یہ پیغام آدم درانی اور پائندہ گل' دونوں کے لیے حیران کن ثابت ہو سکتا تھا۔

"موضوع۔ انگلینڈ سے آنے والے اسلحے کے اسمگلر پینڈر گڈ کی فوج۔ پیغام۔ کاراکش کی گوریلا تنظیم کو بڑی مقدار میں گولہ بارود فراہم کرنے والے اس شخص کی فوج جس میں زیادہ تر کرائے کے پٹھان گوریلے شامل ہیں' شمال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان علاقوں پر انتظامی گرفت نہ ہونے کی وجہ سے مزید اطلاعات کا حصول دشوار ہے۔ پیغام ختم ہوا۔"

ہالزن کے خیال میں یہ رپورٹ پہلی رپورٹ سے زیادہ اہم نہیں تھی اور فوج کو اس کے تعاقب میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر چند لمحے کمرے میں ٹہلتا رہا پھر دروازہ کھول کر کانفرنس روم میں آگیا۔ یہ کمرا ہر لحاظ سے محفوظ تھا اور یہاں ہونے والی کوئی بات کسی دوسری جگہ نہیں سنی جا سکتی تھی۔

پانچ آدمی سبز کپڑے کی ٹاپ والی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ہالزن کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہالزن نے ہاتھ سے اشارہ کیا' وہ دوبارہ اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ہالزن نے میز پر رکھی ہوئی منرل واٹر کی بوتل اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور باری باری ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کامریڈز! وار پارٹی اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہمارے منصوبوں کے لیے مستقل خطرہ بنی ہوئی ہے۔ ہوورکرافٹس کی مقررہ مدت سے پانچ سال پہلے تیاری بھی ہمارے لیے ایک بہت بڑا دھچکا ثابت ہوئی ہے۔ پارٹی بھی وار آفس کے اس کارنامے سے متاثر نظر آتی ہے لیکن اس سے پہلے کہ کوئی جنرل یا مارشل سوویت اقتدار پر قابض ہو جائے' ہمیں کوئی ایسا قدم اٹھانا ہوگا جس سے ان کا راستہ روکا جا سکے اور اب کامریڈ سمنوف! پچھلی میٹنگ ہم نے کہاں ختم کی تھی؟"

میز کے دوسری طرف ایک پست قامت آدمی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کامریڈ چیف ڈائریکٹر!" وہ کہنے لگا۔ "پچھلی میٹنگ میں ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان ہوورکرافٹس میں کوئی ایسی خامی تلاش کی جائے جسے بنیاد بنا کر وار پارٹی کے خلاف محاذ کھولا جا سکے اور مزید یہ کہ مغرب کا مقابلہ کرنے کے لیے سرمائے کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے۔"

"اور بدقسمتی سے ہم ابھی تک ان دونوں مقاصد میں ناکام رہے ہیں" ہالزن نے ایک ہاتھ کا گھونسا دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہا۔ "اور آج میں نے تم لوگوں کو یہ بتانے کے لیے یہاں بلایا ہے کہ میں نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے۔"

اس لمحے ایسا لگا جیسے سب نے گہرا سانس لیا ہو۔

"کچھ عرصے پہلے افغانستان میں ایک بہت بڑا خزانہ دریافت ہوا تھا اور خوش قسمتی سے وہ خزانہ ہمارے ہاتھ لگ گیا" ہالزن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کامریڈ چیف ڈائریکٹر" ایک آدمی نے کہا۔ "لیکن وہ خزانہ تو ہم سے چھن گیا تھا۔ عقاب اور اس کے ساتھیوں نے وہ گن بوٹ ہی اڑا دی تھی جس پر خزانہ لدا ہوا تھا۔"

"دھیرج کامریڈ کاگانووک!" ہالزن ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہ درست ہے کہ ایگل کے گروہ نے وہ گن بوٹ تباہ کر دی تھی لیکن اس بوٹ پر خزانے کا ایک بہت معمولی سا حصہ تھا جس سے ہماری کوئی چھوٹی ضرورت ہی پوری ہو سکتی تھی۔ جبکہ ہمیں اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے کروڑوں ڈالر کی ضرورت ہے۔

"جس افغان انجینئر نے وہ خزانہ دریافت کیا تھا اس نے اس کی مالیت کا تخمینہ غلط لگایا تھا۔ اس نے یہ خزانہ عربوں کو فروخت کرنے کی پیشکش کی تھی بلکہ پیشکش کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا تھا۔ میں اس خزانے کو ہر قیمت پر سوویت یونین لانا چاہتا تھا۔ میرے ایجنٹ نے اس افغان انجینئر کے منصوبے کا پتا چلا لیا اور ہم نے دخل اندازی شروع کر دی۔"

وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب ہمارے سامنے بہت معمولی سی رکاوٹیں رہ گئی تھیں۔ برطانیہ نے عربوں یا دیگر ذرائع سے میرے اس منصوبے کا پتا چلا لیا تھا کہ میں جعلی سکّے تیار کر کے عربوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ جعلسازیوں میں آج تک ہمارا کوئی ثانی پیدا نہیں ہو سکا۔ ہم قیمتی دھاتوں میں ملاوٹ کی اس قدر مہارت رکھتے ہیں کہ پیچیدہ ترین مراحل سے گزرنے کے بعد ہی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن ہمارے پاس ایڈوانس ٹیکنالوجی کی کمی ہے۔ کمپیوٹر کنٹرولڈ اسٹمپنگ مشین ہمارے پاس نہیں تھی اور یہ ٹیکنالوجی ہمیں برطانیہ نے فراہم کی تھی۔"

ہالزن ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ ان پانچوں کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ہالزن قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "امریکیوں کو جب پتا چلے گا تو وہ یقیناً سر پیٹ کر رہ جائیں گے۔ اب ہم بھی ان کی طرح دولت مند ہیں۔"

"اور سونے کے وہ سکّے ان ہوور کرافٹس کے ذریعے سپلائی کیے جائیں گے؟" کاگانووک نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک سمجھے۔ ان ہوور کرافٹس کے ذریعے سونا لے آنے کے بعد ہم ہوور کرافٹس کے خلاف بھی تخریبی کارروائی کر کے سینٹرل کمیٹی کو یہ تاثر دینے کی کوشش کریں گے کہ یہ ہوور کرافٹ بے کار ہیں اور ان کی تیاری پر سرمایہ ضائع کیا گیا ہے۔ یہ چین کی آخری کڑی ہوگی۔ اس کے بعد کونسل آف منسٹرز کے چیئرمین کی کرسی پر بیٹھنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

ان پانچوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ کونسل آف منسٹرز کی چیئرمین شپ کا مطلب تھا' سوویت یونین کی حکمرانی۔

"کامریڈ چیئرمین۔" سمنوف دل کی بات زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ "برطانیہ اس معاملے میں ہماری مدد کرنے پر کیسے تیار ہوا؟ کیا اس نے اپنے حصے کا مطالبہ نہیں کیا؟"

"اس قسم کے بین الاقوامی معاملات پر ہمیشہ "لو اور دو" کے اصولوں پر عمل ہوتا ہے۔" ہالزن نے جواب دیا۔ "آپ کو یاد ہوگا کہ تقریباً بیس سال پہلے ہم نے کیوبا میں میزائل نصب کیے تھے لیکن امریکا کی دھمکی کے بعد ہمیں وہ میزائل وہاں سے ہٹا لینے پڑے تھے۔ امریکا ہمیں افغانستان سے نکلنے کی بھی دھمکی دے سکتا تھا لیکن اس کے جواب میں ہم اس سے وسطی امریکا سے نکلنے کا مطالبہ کرتے۔ جہاں تک برطانیہ کا سوال ہے تو اس کے لیے سلامتی کی ضمانت ہی کافی تھی جس سے اس کے دفاعی اخراجات کا بوجھ کم ہونے میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ ہم نے اسٹمپنگ مشینوں کی بھی بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے اور عرب دیوالیہ ہو جائیں گے تو برطانیہ کو آدھی سے بھی کم قیمت پر تیل خریدنے کا موقع ملے گا۔

"تاریخ کے سب سے بڑے انقلاب کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں کامریڈز۔ ہمارے ایجنٹ زیورچ میں تیار بیٹھے ہیں۔ نری بیا کے مسلمان زید کی طرف سے سونے کی وصولی کا پیغام ملتے ہی وہ بینک سے ساری رقم نکلوا لیں گے۔ اس وقت قندھار میں افغان گوریلوں کی طرف اگرچہ کچھ مشکلات کا سامنا ہے لیکن ہم حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صورت حال ہمارے حق میں ہے۔"

"بالفرض سلطان زید کے ایجنٹ افغانستان میں موجود ہوں اور وہ حقیقت حال کا پتا چلا لیں تو؟" ایک کامریڈ نے کہا۔

"یہ بات پہلے سے میرے ذہن میں بھی تھی۔" ہالزن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس لیے ہم نے یہ بات پھیلا دی کہ سونے کے سکّوں کی ترسیل قندھار ہی سے ہوگی۔ اگر سکّے ماسکو سے بھیجے جانے کی بات ہوتی تو انہیں جعلسازی کا شبہ ہو سکتا تھا لیکن ہم جعلی سکّے پہلے ہی قندھار پہنچا چکے ہیں۔ وہ خزانہ چونکہ قندھار کے نواحی علاقے سے دریافت ہوا تھا اس لیے سکّوں کی ترسیل قندھار ہی سے ہوگی تو کسی قسم کا شبہ نہیں رہے گا۔

"اور اب میں اجازت چاہوں گا دوستو! مجھے پینڈر گڈ نامی اسلحہ کے اس اسمگلر کے بارے میں بھی کچھ سوچنا ہے جو سمجھتا ہے کہ پاکستان سے چند سو قبائلیوں کو ساتھ لے کر افغانستان فتح کر سکتا ہے۔"

○☆○

پینڈر گڈ عرف پائندہ گل قندھار کی طرف سے روسیوں پر حملے کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ وہ اور خلیل اپنی تیار کردہ قبائلیوں کی فوج کے ساتھ پاکستان اور افغانستان کے درمیان آزاد علاقے میں پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ وہ کوئٹہ کے شمال میں کوہ ٹوبہ کاکڑ کا سلسلہ عبور کر کے افغانستان کی بین الاقوامی سرحد کے قریب پہنچ چکے تھے۔ قندھار اب صرف ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔

پائندہ گل نے ایک ٹرک پر اپنی موبائل کمانڈ پوسٹ قائم کر رکھی تھی۔ اس کے چاروں طرف سازو سامان کے انبار اور ٹرکوں کی قطاریں تھیں۔ خیمہ بستی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان خیموں کا رنگ خاکستری تھا۔ ٹرک وغیرہ بھی اسی رنگ سے کیموفلاج تھے۔ فضا سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان پہاڑوں میں کوئی فوج خیمہ زن ہے۔

تین سو سے زیادہ گاڑیاں جن میں پرانی جیپوں سے لے کر نئے مرسڈیز اور امریکی ٹرک تک شامل تھے' اس طرح پھیلائے گئے تھے کہ ہوائی حملے کی صورت میں زیادہ نقصان نہ ہو۔ چھ روسی دشکا اینٹی ائرکرافٹ گنیں مختلف مقامات پر نصب تھیں۔ یہ گنیں روسیوں سے چھینی گئی تھیں اور درّہ کے اسلحہ ساز ماہرین نے ان میں کچھ تبدیلیاں بھی کی تھیں۔

درّہ۔ درّہ آدم خیل۔ پاکستانی سرحد پر آفریدی قبائل کا گڑھ۔ اسلحہ سازی کا بہت بڑا مرکز۔ چترال سے جنوب کی طرف جاتے ہوئے درّہ آدم خیل پائندہ گل کے راستے میں پڑا تھا۔ وہ ان علاقوں میں اپنی فوج کے لیے آدمی جمع کرتا پھر رہا تھا۔ درّہ آدم خیل میں قیام کے دوران پائندہ گل، خلیل اور جرمن بارڈوولف نے اسلحہ کے سلسلے میں کچھ کاروباری معاملات بھی طے کیے تھے۔

۱۸۹۷ء میں اسی مقام پر آفریدی قبائلیوں نے پہلے برطانیہ اور پھر ہندوستان سے معاہدے بھی کیے تھے۔ پوری قوت میں ہونے کے باوجود برطانیہ اس علاقے کے پٹھانوں کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور بالآخر برطانیہ کو یہ معاہدہ کرنا پڑا تھا کہ آفریدی اس علاقے میں اپنی اسلحہ ساز فیکٹریاں قائم رکھ سکتے ہیں۔ برطانیہ کے بعد اب پاکستان کی طرف سے بھی انہیں یہ تمام سہولتیں حاصل تھیں۔

پشاور سے صرف پینتالیس منٹ کے فاصلے پر اس چھوٹی سی بستی کے پُر رونق بازار میں پائندہ گل اور اس کے ساتھیوں کو ضرورت کی ہر وہ چیز مل گئی تھی جو اُن کی جنگی تیاریوں میں کام آسکتی تھی۔

درّہ آدم خیل کے اسلحہ ساز ہر قسم کے روایتی ہتھیاروں کی تیاری میں مہارت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کی برطانوی رائفلوں کی تیاری میں تو انہیں ملکہ حاصل تھا لیکن افغانستان میں جنگ شروع ہونے کے بعد یہاں روسی ہتھیاروں کا بھی سیلاب آگیا تھا۔ یہ وہ ہتھیار تھے جو یا تو روسی فوجیوں سے چھینے گئے تھے یا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے وہ خود فروخت کردیتے تھے۔ یہ روسی ہتھیار درّے کے اسلحہ سازوں کے پاس بھی پہنچ جاتے۔ وہ ان ہتھیاروں پر اپنی مہر لگا کر دوبارہ فروخت کردیتے۔

درّہ کے اسلحہ ساز ان ہتھیاروں کی نقل تیار کرنے میں بھی خاصے ماہر تھے۔ روسی کلاشنکوف کی نقل تیار کرنے کے علاوہ انہوں نے چینی ہتھیاروں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا تھا۔ روس طویل عرصے سے یہ شور مچا رہا تھا کہ چین، افغانستان کو اسلحہ فراہم کررہا ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ قرا قرم ہائی وے کے راستے اسمگل ہو کر پاکستان پہنچنے والے کچھ چینی ہتھیار درّہ کے اسلحہ سازوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اور انہوں نے ان ہتھیاروں کی نقلیں تیار کرنا شروع کردی تھیں۔

لشکر میں تقریباً چھ ہزار سپاہی تھے جنہیں پائندہ گل شمال کے علاقوں سے جمع کرکے یہاں تک لے آیا تھا۔ پائندہ گل کوئی کام ادھورا چھوڑنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے استنبول میں اپنے ایجنٹ کے ذریعے زیورچ کے اسلحہ کے تاجروں کو مشین گنوں اور مارٹرز کا جو آرڈر دیا تھا، وہ چیزیں خلیج کے راستے پہنچ چکی تھیں۔ پائندہ گل کے تمام لشکریوں کے نام رجسٹروں میں درج تھے۔ انہیں نہ صرف وردیاں فراہم کی گئی تھیں بلکہ تصویریں کھینچ کر پاس بکیں بھی تیار کردی گئی تھیں اور انہیں عہدوں کے لحاظ سے مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جا چکا تھا۔

پائندہ گل نے زیورچ کے اسلحہ کے تاجروں اور درّے کے اسلحہ سازوں سے جنگ میں ضرورت کی تمام چیزیں حاصل کرنے کے لیے اپنی آخری پائی تک خرچ کر ڈالی تھی۔ جس طرح نور شریفی، آدم درانی کی معتمدِ خاص تھی اسی طرح مریم بھی پائندہ گل کی معتمدِ خاص بن چکی تھی۔ وہ اس وقت اسلحہ اور دیگر سازو سامان کی فہرستیں چیک کررہی تھی۔

ایک ہزار اینٹی ٹینک روسی اسٹک گرنیڈ۔ ان میں سے کچھ اسرائیل نے مصر کے خلاف اکتوبر کی جنگ کے دوران قبضے میں لیے تھے جو مختلف ہاتھوں میں فروخت ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے، کچھ مصر نے خود فروخت کیے تھے اور کچھ افغانستان میں روسیوں سے چھینے گئے تھے۔ یہ پچاسی ڈالر فی گرنیڈ کے حساب سے خریدے گئے تھے اور نقد ادائیگی کی گئی تھی۔ درّے کی بنی ہوئی کلاشنکوف ۱۲۵ ڈالر اور مشین گن ۵۲۵ ڈالر کے حساب سے خریدی گئی تھیں۔ ایمونیشن، دو ڈالر فی راؤنڈ، رائفلیں چھ لاکھ ڈالر، ایمونیشن فی میگزین پچاس ڈالر، اس کے علاوہ چھوٹے ہتھیار، ایمونیشن، دیگر آلات اور ٹرانسپورٹ ملا کر ٹوٹل دس ملین ڈالر تک پہنچ گیا تھا۔

مریم نے اگلا صفحہ پلٹا۔ اس پر مواصلات میں استعمال ہونے والے آلات، خوراک، ادویات، دوربینیں، دھوپ کے چشمے، چاقو، خنجر، تیل اور فیملی الاؤنسز (فی فیملی ۲۵ ڈالر) کا حساب تھا جس کا ٹوٹل ڈھائی لاکھ ڈالر سے زیادہ تھا۔ دیگر اخراجات ملا کر مجموعی ٹوٹل گیارہ ملین ڈالر سے کچھ اوپر تھا۔ ایک آدمی کی طرف سے یہ عطیہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

"تم واقعی بہت عظیم انسان ہو پائندہ گل۔" مریم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ شاید تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ میں نے بہت بڑی رقم خرچ کی ہے۔" پائندہ گل بولا۔

"ہاں، ایک طرح سے یہی سمجھ لو۔"

"یہ میرا کل اثاثہ تھا۔ اگر میرے پاس دنیا کی ساری دولت ہوتی تو میں اس مقصد کے لیے وہ بھی خرچ کرنے میں دریغ نہ کرتا۔" پائندہ گل نے جواب دیا۔

"لیکن سب کچھ ختم ہو جانے کے بعد کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس کے پاس کچھ ہے اسے آزادی کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔ میرے پاس جو کچھ تھا، میں نے خرچ کردیا لیکن قربانی دینے والا میں اکیلا نہیں ہوں، اور بھی بہت سے صاحبِ دل ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے بریف کیس میں سے خطوط کا ایک بنڈل نکال لیا۔

"یہ تمام خطوط مجھے آج ہی پوسٹ بکس سے ملے ہیں۔ میں

نے انگلینڈ میں اپنے دوستوں کو خطوط لکھے تھے کہ ہمیں افغانستان کی آزادی کے لیے رقم کی ضرورت ہے، جس سے جتنا ممکن ہو سکے ہماری مدد کی جائے۔ یہ انہی دوستوں کے خطوط ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں میں نہیں جانتا۔ انہوں نے بھی میرے دوستوں سے سن کر خطوط لکھے ہیں۔" اس نے خطوط کے بنڈل میں سے ایک لفافہ نکال لیا۔ "اس خط کی پشت پر میں نے ان لوگوں کی فہرست بنائی ہے جو ہمیں عطیات بھیج رہے ہیں۔ اس فہرست میں وہ نام بھی شامل ہیں جنہوں نے ہمیں صرف ایک ایک پونڈ بھیجا ہے اور وہ بھی جنہوں نے ایک ایک لاکھ ڈالر بھیجے ہیں۔ عطیات بھیجنے والوں میں لکھ پتی بھی ہیں اور وہ بھی جنہیں ایک وقت پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ ان میں قیدی بھی ہیں اور اسکول کے بچے بھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انگریز ہمارے دشمن تھے لیکن اب وہ انسانی ہمدردی اور دوستی کا حق ادا کر رہے ہیں۔"

○☆○

قندھار پر بار بار حملے ہوئے تھے اور روسیوں کو ہر مرتبہ ذلت اٹھانی پڑی تھی۔ ۱۹۸۱ء میں جب سوویت فوج نے قندھار پر حملہ کیا تو نہتے اور بے یار و مددگار قوم پرست افغانوں کو پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ اس وقت روسی پانچ مہینے، مئی سے ستمبر تک قندھار پر قابض رہے تھے۔ یہ روسیوں کی وقتی کامیابی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کابل روسیوں کے قبضے میں تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قندھار ہی دراصل پشتون افغانستان کا دارالحکومت تھا اور جنوب کے پتھریلے میدانوں پر اسی کا کنٹرول تھا۔ اگر روسی اس راستے پاکستان یا بحیرۂ عرب تک پہنچنے کا منصوبہ رکھتے تھے تو یہ ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ پاکستان، قندھار سے صرف ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا اور پاکستان کے ذریعے بیرونی دنیا، قندھار میں ہونے والے واقعات سے باخبر تھی اور اس مرتبہ روسیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ شہر پر مکمل قبضہ کر لیں گے۔

پائندہ گل نے جو اب کمانڈر پائندہ گل کہلاتا تھا، اپنے ایک ریڈیو مین کو ایک کاشتکار کے بھیس میں قندھار بھیج دیا تھا تاکہ وہاں سے تازہ ترین اطلاعات ملتی رہیں۔ روسی نہ صرف شہر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے بلکہ ان کا پروگرام یہ بھی تھا کہ کاجا کائی پاور پلانٹ اسٹارٹ کر دیا جائے تاکہ اس علاقے میں فوری طور پر قائم ہونے والی فوجی چھاؤنی کو بجلی فراہم کی جا سکے۔ اس کے برعکس کمانڈر پائندہ گل اور کمانڈر خلیل روسیوں کی تباہی کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

○☆○

انہوں نے پاکستان میں بھی متعدد سول انجینئروں سے رابطہ قائم کر کے کاجا کائی اور ارغنداب ڈیمز کی تباہی کے بارے میں ان کی رائے طلب کی تھی لیکن وہ کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں دے سکے تھے۔ ان کے خیال میں ان دونوں میں سے کسی ڈیم کو گوریلا ایکشن سے تباہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ قندھار کے قریب والا ڈیم تو چٹانوں کے بیچ میں اس طرح بنایا گیا تھا کہ اسے چٹانوں کی بھی قوت حاصل ہو گئی تھی۔ ان انجینئروں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ کوئی اور طریقہ سوچیں۔ مجاہدین نے واٹر اینڈ پاور کے افغان وزیر پروفیسر محمود کو بھی اغوا کر لیا تھا تاکہ اس سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کی جا سکیں لیکن وہ بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

پائندہ گل نے گوریلا آپریشنز کے حوالے سے سوئس آرمی گائیڈ بھی منگوالی تھی۔ اس گائیڈ میں چھاپا مار کارروائیوں کے بارے میں اور تو بہت کچھ تھا لیکن ڈیمز تباہ کرنے کے سلسلے میں کچھ نہیں تھا۔ اس نے پاکستان کے مائننگ انجینئر اور بالآخر پاکستانی فوج کے سابقہ اور موجودہ انجینئروں سے بھی بات کی تھی لیکن انہوں نے ایسے لوگوں سے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا جنہیں قانونی طور پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔

خلیل نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ امریکا جا کر ان لوگوں کو تلاش کیا جائے جنہوں نے یہ ڈیم تیار کیا تھا لیکن پائندہ گل نے اس کی یہ تجویز مسترد کر دی تھی۔

"خلیل! یہ ڈیم انجینئرنگ کا ایک شاہکار ہے۔ کیا تم دنیا میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کر سکتے ہو جو اپنے بنائے ہوئے شاہکار کو تباہ کرنے پر تیار ہو جائے؟"

"تم لوگ شاید یہ بھول گئے ہو کہ میں بھی آرکیٹیکٹ انجینئر ہوں اور کابل میں کام کر چکی ہوں۔" مریم نے ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"اوہاں! میں تو واقعی بھول گیا تھا۔" پائندہ گل نے کہا۔

"یہ دونوں دنیا کے بہترین ڈیم سمجھے جاتے ہیں۔ تیرھویں صدی کے بعد پہلی مرتبہ ان ڈیمز کے ذریعے اس علاقے کی لاکھوں ایکڑ اراضی کو سیراب کیا جائے گا، لاکھوں لوگوں کو پانی اور بجلی فراہم ہوگی۔ کیا تم اس ملک میں رہنے والے کسی ایسے آرکیٹیکٹ انجینئر کے بارے میں سوچ سکتے ہو جسے ٹیکنیکل پوائنٹ آف ویو سے ان ڈیمز سے دلچسپی نہ ہو؟"

"میں نے تو سنا ہے کہ افریقہ کا کاربا ڈیم، دنیا کا سب سے بڑا ڈیم ہے۔ ریفرنس کی تمام کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔" خلیل نے کہا۔

"کاربا۔" مریم نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ "کاربا ڈیم میں ایک لاکھ تیس ہزار کیوبک فٹ پانی ہے جبکہ ارغنداب ڈیم میں تین لاکھ پچاس ہزار کیوبک فٹ پانی موجود ہے۔ ارغنداب کی تعمیر پر ایک سو بیس ملین ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ آج کے حساب سے تین سو پچاس ملین ڈالر کہہ سکتے ہو۔ اس ڈیم سے جو علاقہ سیراب ہوگا، کسی زمانے میں وہ دنیا کا سب سے زرخیز ترین علاقہ تھا۔ اسے ایشیا کا باغ کہا جاتا تھا۔ یہ علاقہ ایک بار پھر پہلے کی طرح آباد ہوگا۔ پندرہ ہائیڈرو پاور پلانٹس سے جو بجلی

حاصل ہوگی' وہ الگ ہے۔ اس بجلی سے علاقے میں جو ترقی ہوگی اس کا بھی تم اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"آسٹریلیا میں تو ہمیں ان باتوں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا گیا۔" خلیل نے کہا۔

"انگلینڈ میں بھی ہم نے کچھ نہیں سنا۔" پائندہ گل نے جواب دیا۔ "لیکن ہم تو ان ڈیمز کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں جو ویرانوں کو مرغزاروں میں تبدیل کرنے والے ہیں' یہاں ایک نئی زندگی کو جنم دینے والے ہیں۔"

"نئی زندگی! گزشتہ چار برسوں میں دس لاکھ سے زائد افراد کی موت کو تم نئی زندگی کہہ رہے ہو۔" خلیل غصے میں بولا۔ "میری یہ بات ذہن میں رکھو کہ یہ روسی اس علاقے کے بچے کھچے لوگوں اور وادیٔ ہلمند کو بھی تباہ کردیں گے۔ قندھار کے قریب وہ چھاؤنی شہریوں کی حفاظت کے لیے نہیں بنائی جا رہی۔ تم لوگ اس چھوٹے جنریٹر کے بارے میں کیوں نہیں سوچ رہے جس سے آج کل شہر کو بجلی فراہم کی جا رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس جنریٹر کو تباہ کردیا جائے تو شاید شہریوں کو کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے' اب نئے سرے سے سوچنا پڑے گا۔" پائندہ گل نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

○☆○

مریم ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔ دو ریڈیو آپریٹر' داؤد اور ذکریا' کمیونیکیشن ٹرک سے اتر کر دوڑتے ہوئے اس طرف آرہے تھے۔

"کمانڈر! حملہ شروع ہو رہا ہے۔ ہمیں اپنے آدمیوں کو الرٹ کردینا چاہیے۔"

ڈھول بجنے لگے اور لوگ اپنے اپنے قبیلے کے سرداروں کے سامنے جمع ہونے لگے۔ پائندہ گل اور خلیل' ریڈیو آپریٹر ذکریا کی بات سن رہے تھے جبکہ مریم نے اس دوران ایک بہت بڑا نقشہ نکال لیا تھا۔

"قندھار سے ہمارے ریڈیو مین نے سگنل دیا ہے کہ قندھار کے تمام ٹیلی فون ڈیڈ ہوگئے ہیں۔" ریڈیو آپریٹر داؤد نے کہا۔ "ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب شہر پر حملہ ہونے والا ہو۔ ہمارے آدمی نے یہ بھی بتایا ہے کہ شہر کے جنوب میں افغان سوویت آرمی کا مشترکہ کمیونیکیشن سسٹم اب قندھار انٹرنیشنل ائرپورٹ پر منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم اس کمیونیکیشن سسٹم کو تباہ کردیں تو اس سے ہمیں بڑی مدد ملے گی۔ ۸۶۴ کلو ہرٹز پر چلنے والا قندھار ریڈیو بھی ابھی ابھی بند ہوگیا ہے۔" داؤد اور ذکریا کے سانس ابھی تک پھولے ہوئے تھے۔

"ائرپورٹ پختہ سڑک کے ذریعے شہر سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہے۔" پائندہ گل نے نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت شام کے سات بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔ اگر ہم شمال مغرب کی طرف سے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کریں تو اس میں کم از کم دو گھنٹے لگیں گے۔ ہمیں روسیوں کے کمیونیکیشن سسٹم کو تباہ کرنے کے ساتھ ان کے زیادہ سے زیادہ جہازوں کو نقصان پہنچانے کے بعد شہر پر ہونے والے حملے کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ٹھیک؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے دوسروں کی طرف دیکھا۔ ان سب نے اثبات میں سر ہلا دیے۔

اسی وقت ریڈیو ٹرک سے سائرن بجا دیا گیا۔ تمام گروپ اپنے اپنے کمانڈروں کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ وہ دس گروپ تھے اور ہر گروپ میں چھ سو آدمی تھے۔ ہر گروپ کو بیس بیس کی ٹولیوں میں تقسیم کردیا گیا۔

"میرے بہادرو!" پائندہ گل نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ ہم خانہ بدوشوں کا سخت ریت والا راستہ اختیار کریں گے۔ قندھار سے کوئٹہ جانے والی پختہ سڑک سے دور رہنے کی کوشش کی جائے گی کیونکہ اس سڑک پر روسی اور افغان فوجی دستے گشت کرتے رہتے ہیں۔ ایک بات کا خیال رہے کہ تمام آدمی بارودی سرنگوں کا خیال رکھتے ہوئے دیکھ کر چلیں گے۔ نہ تو کسی قسم کی روشنی کی جائے گی اور نہ ہی کوئی سگریٹ پیے گا تاکہ ہم دشمن کی نظروں میں نہ آسکیں۔"

"حملہ کب کیا جائے گا پائندہ گل؟" طالب خان نے پوچھا۔ وہ عیسیٰ خیل گروپ کا سردار تھا اور اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔

"حملے کے لیے وقت آنے پر بتا دیا جائے گا لیکن خبردار!" پائندہ گل نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے حکم کے بغیر کوئی بھی شخص فائر نہیں کرے گا۔ دن کے وقت اورنج فلیئر اور رات کو سبز روشنی کا سگنل دیا جائے گا۔ ہمارا رخ قندھار ائرپورٹ کی طرف ہوگا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر سرداروں کو بریفنگ دینے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد لشکر حرکت میں آگیا۔ کسی گاڑی کی بتیاں نہیں جلائی گئی تھیں۔ وہ بڑی خاموشی سے تاریکی میں آگے بڑھ رہے تھے۔

○☆○

عقاب کی فوج

۹ بجے شب

آدم درانی کی توقع کے عین مطابق روسیوں نے شمال کی طرف سے حملہ کیا تھا۔ قندھار شہر دریائے ارغنداب اور دریائے ترناک کے مقام اتصال کے قریب ہی واقع ہے۔ اس کے جنوب میں "صحرائے ریگستان" واقع ہے۔ اگر روسی اس طرف سے حملہ آور ہوتے تو انہیں نہ صرف دریائے ارغنداب پر کشتیوں کا پل بنانا پڑتا بلکہ آگے بڑھنے میں بھی خاصی دشواری پیش آتی جبکہ شمال کی طرف قندھار شہر کو ملانے والی ایک پختہ سڑک موجود تھی جس پر نہ

صرف ٹینک چل سکتے تھے بلکہ دیگر سازو سامان بھی آسانی سے لایا جا سکتا تھا۔ یوں بھی روسیوں نے قندھار پر جب بھی حملہ کیا' اسی راستے کا انتخاب کیا تھا۔

عقاب کے حریت پسندوں کی تعداد اب تین سو کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ کاجا کائی کے علاقے سے قندھار کی طرف منتقل ہو چکے تھے۔ کیپٹن اعظم بے چُرائے ہوئے اپنے روسی ریڈیو پر روسیوں کے ریڈیائی پیغامات سن رہا تھا۔ ایک موقع پر اس نے ہیڈ فون سر سے اتار دیا اور ٹرک پر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدم درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ لوگ قندھار پر شب خون مارنے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"کوئی تفصیل؟" آدم درانی نے پوچھا۔ وہ ٹرک کو لگنے والے جھٹکوں کی وجہ سے سیٹ پر بری طرح اچھل رہا تھا۔

"میں سننے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اعظم بے نے کہتے ہوئے ہیڈ فون دوبارہ کانوں سے لگا لیے۔ چند لمحوں بعد بولا۔ "ماضی میں وہ ہمیشہ دن کے وقت حملہ آور ہوتے رہے ہیں لیکن اب ان کا خیال ہے کہ انفرا ریڈ سرچ لائیٹس کی مدد سے ٹینکوں کی بھاری تعداد سے رات کے وقت کیا جانے والا حملہ زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انہیں انفرا ریڈ سرچ لائیٹس کی برتری حاصل ہے لیکن انفرا ریڈ کے باوجود انہیں کچھ مسائل کا سامنا ہے۔"

"وہ حملہ کس وقت اور کس مقام پر کریں گے؟ ان کی اصل قوت؟" آدم درانی نے پوچھا۔

"اصل قوت کا اندازہ لگانا دشوار ہے لیکن ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں مقامی وقت کے مطابق رات کو ٹھیک گیارہ بجے شوراب کے مقام پر پہنچ جائیں گے۔ یعنی دو گھنٹے میں.... ایک منٹ...." اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر درانی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چند لمحے ریڈیو پر کچھ سنتا رہا پھر بولا۔ "وہ کہہ رہے ہیں کہ کابل گیٹ' شہر کی حدود تک پہنچنے سے پہلے انہیں کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہیں ہمارا یا اس علاقے میں موجود مجاہدین کی کسی اور پارٹی کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مارچ جاری رکھو۔ شوراب سے نصف میل جنوب کی طرف ایک تنگ سی گھاٹی ہے' ہم اس گھاٹی میں اپنا کیمپ لگائیں گے اور وہیں سے ان کے خلاف اپنی کارروائی کا آغاز کریں گے۔" آدم درانی نے کہا۔

کیپٹن اعظم بے نے ٹرک ڈرائیور کو رفتار تیز کرنے کو کہا اور زلیکوف کی طرف دیکھنے لگا جو آج کم از کم ساتویں مرتبہ اپنا شکاری چاقو تیز کر رہا تھا۔

"زلیکوف! تم اپنا چاقو اس طرح جوتے میں کیوں رکھتے ہو؟ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہاری ایڑی نہ کٹ جائے۔"

"اپنی ایڑی کے بدلے میں اگر کسی ایک روسی کا گلا بھی کاٹ دوں تو میرے لیے یہ سودا مہنگا نہیں ہوگا۔" زلیکوف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اب وہ اپنے ٹارگٹ سے صرف تین میل کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ مزید بیس منٹ کے بعد انہوں نے ٹرک روک لیے اور اب وہ ٹرکوں سے اتر کر ان ٹیلوں پر چڑھ رہے تھے جہاں سے سڑک مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں آجاتی تھی۔ روسی اسی سڑک سے گزرنے والے تھے۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد فضا میں T-62 ٹینکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں خاصی دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں لیکن بتدریج واضح ہوتی چلی گئیں پھر ان ٹینکوں کے سات سو ہارس پاور ڈیزل انجنوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں اور بالآخر 37 ٹن وزنی عفریت نما ان ٹینکوں کے آہنی پٹوں کے نیچے سڑک کے دبنے کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرانے لگی۔

○☆○

پائندہ گل کی فوج
نو بج کر چالیس منٹ شب

پائندہ گل کا لشکر قندھار انٹرنیشنل ائرپورٹ کے نواح میں پہنچ چکا تھا۔ روسی ہیلی کاپٹر ہوائی اڈے کی حفاظت کے لیے مسلسل پرواز کر رہے تھے۔ پاکستانی سرحد سے یہاں تک کا فاصلہ اس لشکر نے ریکارڈ وقت میں طے کیا تھا' ان کے دو ٹرک ریت میں پھنس گئے تھے اور ان ٹرکوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ پائندہ گل سوچ رہا تھا کہ اگر روسیوں کے پاس انفرا ریڈ نظام موجود تھا تو وہ غیر مؤثر تھا کیونکہ وہ لوگ شاید ابھی تک اس لشکر کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ اگر دیکھ لیا ہوتا تو انہیں اس قدر آسانی سے آگے بڑھنے کا موقع نہ ملتا۔

پشتون لشکر کے اسکاؤٹس کی اطلاع کے مطابق روسیوں کی کسی گشتی پارٹی کو قرب و جوار میں نہیں دیکھا گیا تھا لیکن پائندہ گل اور خلیل کو یقین نہیں آرہا تھا کہ روسیوں نے پاکستان سے آنے والی اس ہائی وے کو غیر محفوظ چھوڑ دیا ہوگا۔ ان کے خیال میں کہیں نہ کہیں کوئی چیک پوسٹ ضرور ہونی چاہئے تھی۔ وہ لوگ افغان علاقے یا غستان میں تقریباً پچیس میل اندر آچکے تھے کہ ایک لڑکا دوڑتا ہوا خلیل کے ٹرک کے پائیدان پر سوار ہو گیا۔ اس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"اگر تم لوگ ائرپورٹ کی طرف جا رہے ہو تو ہائی وے کا راستہ اختیار کیوں نہیں کرتے؟ یہ راستہ تمہیں سیدھا پل تک لے جائے گا اور تم لوگوں کو دریا عبور کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس سڑک پر کہیں بھی روسیوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔" لڑکے نے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس طرف روسی نہیں ہیں؟"

خلیل نے کہا۔

"بُو۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "وہ نہایت بدبودار سگریٹ اور شراب پیتے ہیں اور کم از کم تین میل کے فاصلے سے ان کی بُو محسوس کی جا سکتی ہے۔ بہرحال' میں اس پورے علاقے کا شہنشاہ ہوں اور لوگ میرا احترام کرتے ہیں۔"

"تو شہنشاہ صاحب! تمہاری رعایا کون ہے اور کہاں ہے؟" خلیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

لڑکے نے تاریکی میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس طرف۔ میری رعایا اس طرف ہے۔ بھیڑ' بکریوں کا بہت بڑا ریوڑ۔ میں ان کا بادشاہ ہوں۔ جاؤ' اس طرف تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ یہ کنارویت روڈ ہے۔"

"کیا؟ یہ کون سا روڈ ہے؟" مریم نے پوچھا۔

"کنارویت۔ کالو ریڈو کی کمپنی جنہوں نے یہ سڑک بنائی تھی۔" لڑکے نے جواب دیا اور ٹرک سے چھلانگ لگا کر تاریکی میں غائب ہوگیا۔

خلیل نے اسے تائید غیبی سمجھتے ہوئے پائندہ گل کو اشارہ کیا اور وہ اپنے ٹرکوں کا رخ بدل کر پختہ سڑک پر آگئے۔ اس طرح ان کی رفتار بھی تیز ہوگئی تھی۔ دریائے آرغستان کے پُل پر بھی انہیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ دریا کا پُل عبور کرکے لشکر رک گیا۔

ہوائی اڈہ اب صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ تیز روشنیوں سے پورا علاقہ جگمگا رہا تھا۔ پائندہ گل' مریم اور خلیل دوربینوں سے کنٹرول ٹاور کا جائزہ لینے لگے۔ کنٹرول ٹاور پر بھی تیز روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔

گوریلوں کے تین دستے روسی ساختہ M-1937 مارٹر لانچر سیٹ کررہے تھے۔ یہ مارٹر کھلی عالمی منڈی سے خریدے گئے تھے۔ کارکردگی میں یہ دوسرے مارٹرز سے بہتر تھے۔ 121 پونڈ وزنی اس مارٹر گن کے ذریعے سات پونڈ وزنی گولا دو میل تک بالکل ٹھیک نشانے پر پھینکا جا سکتا تھا۔

حمزہ خان اس مارٹر بٹیری کا انچارج تھا۔ وہ ایک تجربہ کار جنگجو تھا۔ اس نے پائندہ گل کو فوجی قیادت کے بارے میں بہت سے گُر سکھائے تھے جس کے عوض اس نے فائر ماسٹر کے عہدے کا مطالبہ کیا تھا۔

"مارٹرز سیٹ ہوچکے ہیں۔" پائندہ گل کو اس کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ اندھیرے میں بھی اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ محسوس کرسکتا تھا۔ حمزہ خان عمان سے جنگ کے دوران ایرانی فوج میں خدمات انجام دے چکا تھا۔ اسے روسی ہتھیاروں کے استعمال کا بھی وسیع تجربہ تھا۔

"کتنے مارٹر آپریشن میں استعمال ہورہے ہیں حمزہ؟" پائندہ گل نے پوچھا۔

"پانچ مارٹر اسمبل ہوچکے ہیں اور تمہارے احکامات کے منتظر ہیں۔" حمزہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں سنسنی تھی۔ جیسے ایکشن کے لیے مزید انتظار اس سے برداشت نہ ہورہا ہو۔

"یہاں سے کنٹرول ٹاور اور ریڈیو کے انٹینا کا فاصلہ کتنا ہے؟"

"رینج فائنڈر کے مطابق کنٹرول ٹاور کی سرچ لائٹس کا فاصلہ 2371 میٹر ہے۔ جبکہ مارٹر کی زیادہ سے زیادہ مؤثر رینج 3069 میٹر ہے۔ ٹارگیٹ ایکوریٹ رینج میں ہے۔" حمزہ خان نے جواب دیا۔

پائندہ گل یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ حمزہ خان فوجی اصطلاحات بھی بڑی مہارت سے استعمال کررہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ٹاور کے ٹرانسمیٹر کو تباہ کردیا جائے تو قندھار شہر پر حملے کی آخری تیاریوں میں مصروف روسی یقیناً بدحواس ہوجائیں گے۔

"وہ ٹاور تمہارا ٹارگٹ ہے۔ ہمارے اور ائرپورٹ کی عمارت کے درمیان دشمن فوجیوں کی موجودگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے لیکن اگر وہ کسی طرف سے آبھی جائیں تو کسی نئے حکم کا انتظار کیے بغیر ان کے سامنے مارٹر گولوں کی بارش کردو۔ سمجھ گئے فائر ماسٹر؟"

"سمجھ گیا کمانڈر۔"

"اور اب تمام مارٹر لوڈ کردو۔" پائندہ گل نے کہا۔

"رینج شاٹ کے لیے مارٹر لوڈ کرو۔" حمزہ نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔

"مارٹر بٹیری۔ رینج شاٹ ریڈی۔ فائر!"

حمزہ نے پائندہ گل کا یہ آرڈر اپنے ماتحتوں تک پہنچا دیا اور اس کے ساتھ ہی فضا لرز اٹھی۔

دو گولے ٹاور سے پہلے گرے۔ تیسرا گولہ ٹاور کے اوپر سے ہوتا ہوا پچھلی طرف کہیں جا کر گرا۔ جبکہ دو کنٹرول ٹاور اور ٹرانسمیٹنگ انٹینا پر لگے۔

"رزلٹ بُرا نہیں ہے حمزہ۔" پائندہ گل چیخا۔ "اب تین گولے ٹاور پر اور دو ریڈیو انٹینا پر پھینکو۔"

پائندہ گل اور خلیل آنکھوں پر دوربین لگائے ائرپورٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر ریڈیو انٹینا شعلوں میں لپٹ کر نیچے گر گئے اور کنکریٹ کے بنے ہوئے ٹاور کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ بیشتر لائٹیں بجھ گئیں۔ عمارت کے دوسرے حصوں پر جو روشنیاں ابھی تک جل رہی تھیں وہ بھی دُھوئیں میں دُھندلا گئی تھیں۔

مارٹر گولوں کی بارش جاری تھی۔ ٹرمنل بلڈنگ کی خوب صورت محرابیں زمین بوس ہوچکی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی آریانا افغان ہوائی شرکت' آریانا افغان ائر کمپنی کا نیون سائن بھی ختم ہوگیا تھا۔ بہت جلد پچاس فٹ چوڑا اور پچھتر فٹ لمبا ہینگر بھی شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔ یہ ہینگر امریکن فیڈرل ایوی ایشن ایجنسی نے تعمیر کیا تھا اور اس میں وائڈ باڈی ہوائی جہازوں کے لیے خاصی گنجائش تھی۔

"سیز فائر۔ آفرین مجاہدین۔" پائندہ گل نے چیخ کر کہا۔ تمام مجاہدین مارٹر گنوں کی اس کارکردگی پر چیخ چیخ کر اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے۔

ائرپورٹ پر کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ یہ حملہ ان کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ کمانڈنگ جنرل پہلے تو یہ سمجھا کہ ہوائی حملہ ہو رہا ہے۔ وہ اپنے بالوں میں سے پلاسٹر کے ٹکڑے جھاڑتا ہوا خندق کی طرف دوڑا۔ اس وقت وہ خندق ہی اس کے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔ اس کا ایڈ جوئنٹ کئی منٹ کی کوشش کے بعد انتظامی بلاک سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

"مشرق کی طرف سے مارٹروں سے حملہ ہوا ہے کامریڈ جنرل۔" اس نے بتایا۔

"مارٹر؟ کیسے مارٹر؟ کیا مزید افغان فوجی غداری کے مرتکب ہوئے ہیں یا پاکستان کی طرف سے آنے والی کسی فوج نے حملہ کیا ہے یا پھر سب سے بڑے دہشت گرد عقاب کے آدمیوں نے شمال سے یہاں آکر حملہ کیا ہے؟" جنرل چیخ رہا تھا۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کامریڈ جنرل۔"

"معلوم کرو یہ سب کیا ہے احمق کہیں کے۔" جنرل چیخا۔ "یہ بھی معلوم کرو کہ ائرپورٹ ڈیفنس فورس کیا کر رہی ہے۔ اگر گولے اسی طرح برستے رہے تو ہم سب یہیں دفن ہو جائیں گے۔"

جنرل افغانستان کی اس لڑائی سے تنگ آ چکا تھا۔ وہ طویل عرصہ سے یہاں تعینات تھا۔ شدید گرمی نے اسے بُری طرح جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اب وہ اس فوجی زندگی سے اُکتا گیا تھا۔ اب وہ ریٹائر ہونا چاہتا تھا تاکہ زندگی کا باقی حصہ بالٹک کے جنگل میں واقع اپنے کاٹیج میں آرام اور سیر و تفریح کرتے ہوئے گزار دے لیکن اسے اپنا یہ خواب پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سینٹرل ایشیا میں گویا پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس نے جیب سے آخری ہوانا سگار نکالا اور دانتوں سے کاٹ کر اس کا سرا پنکچر کرنے لگا۔ یہ بات بھی اس کے لیے باعثِ اطمینان تھی کہ وہ ائرپورٹ کی حفاظت کا ذمے دار نہیں تھا۔ کرنل انتونوف یہاں کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ ماسکو یا افغان ہائی کمان کے سامنے جواب دہی بھی اسی کو کرنی تھی۔ ماسکو نے پہلے ہی انہیں خبردار کر دیا تھا کہ افغان گوریلوں کے دو گروہ قندھار کے قرب و جوار میں دیکھے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود کرنل انتونوف ائرپورٹ کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔

اچانک اسے یاد آگیا کہ ایک گھنٹے بعد اس کی فوج ٹینکوں سے قندھار پر حملہ کرنے والی ہے۔ یہ بڑا حملہ اسی کی قیادت میں ہونے والا تھا لیکن کمیونیکیشن سسٹم کی تباہی کے بعد اسے یہ حملہ بھی اب خطرے میں نظر آ رہا تھا۔

"میخائلوف!" اس نے چیخ کر اپنے ایڈ جوئنٹ کو آواز دی۔

"یس کامریڈ جنرل؟"

"ٹینک اٹیک کمانڈر سے مواصلاتی رابطے کا کوئی بندوبست کرو۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ قندھار کی طرف روانہ ہو چکے ہیں اور نارمل نیٹ ورک پر ان کا، ہمارا یا دونوں کا رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ اگر کمیونیکیشن سسٹم بحال نہ ہوا تو ممکن ہے، ہمیں یہ حملہ ملتوی کرنا پڑے۔" جنرل نے کہا۔

"کوشش کرتا ہوں کامریڈ جنرل۔" ایڈ جوائنٹ نے ایڑیاں بجا دیں اور تیزی سے ایک طرف دوڑ گیا۔

کمیونیکیشن سسٹم کو بحال کرنا اگرچہ اس کا کام نہیں تھا لیکن جنرل اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر قندھار پر حملہ ناکام ہو گیا تو وہ خود بھی کورٹ مارشل سے نہیں بچ سکے گا۔

ائرپورٹ پر مارٹر گنوں کا یہ حملہ اچانک ہی ہوا تھا جس سے مواصلاتی نظام تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ جنرل کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ مارٹر کے گولے ہیلی کاپٹر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اگر MI-24 ہیلی کاپٹر بھیجے جائیں تو وہ یقیناً گوریلوں سے نمٹ لیں گے۔ اس نے فوراً ہی احکامات جاری کر دیے۔

دیکھتے ہی دیکھتے تین بڑے گن شپ ہیلی کاپٹر فضا میں پہنچ گئے۔ اگرچہ ائرپورٹ سے ان کا بھی کوئی ریڈیائی رابطہ نہیں تھا لیکن ان کے لیے احکامات واضح تھے۔ بلندی پر پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹروں نے سرچ لائٹس کے ذریعے گوریلوں کو تلاش کر لیا اور وہ بڑی تیزی سے ان پر حملہ آور ہونے کے لیے لپکے۔

ہیلی کاپٹروں کے فضا میں بلند ہوتے ہی پائندہ گل نے اپنے ائر ڈیفنس اسکواڈ کو اشارہ کر دیا تھا۔ اب وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے قبرص سے روسی بزوکا اور راکٹ خریدنے کے سلسلے میں استنبول کے اسلحہ کے تاجر کی بات مان لی تھی۔ یہ راکٹ اس قدر قیمتی تھے کہ انہیں ٹریننگ میں ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے پائندہ گل کے آدمیوں کو ان کے استعمال کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن بہرحال، اس کام کے لیے ایسے آدمی منتخب کیے گئے تھے جو راکٹ لانچر استعمال کرنے میں تھوڑی بہت مہارت رکھتے تھے۔ ان آدمیوں نے اشارہ پاتے ہی لانچر ٹیوبس اس طرح کندھوں پر اٹھا لی تھیں جیسے وہ ساری زندگی ان ہتھیاروں سے کھیلتے رہے ہوں۔ وہ اوپن سائیٹ پر ہیلی کاپٹروں کا نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر کو آہستہ آہستہ دبانے لگے۔ ان کی نظریں سائیٹ پر روشن سرخ نقطے پر مرکوز تھیں اور پھر جیسے ہی سائیٹ پر سبز روشنی نظر آئی انہوں نے ٹریگر پوری طرح سے دبا دیے۔

ٹریگر دبتے ہی میزائل ٹیوب سے نکلے اور آواز سے ڈیڑھ گنا رفتار پر اپنے نشانے کی طرف لپکے۔ ہیلی کاپٹر آٹھ سو فٹ سے زیادہ بلندی پر نہیں تھے۔ عمان کی جنگ میں SAM-7 میزائل نے اس سے چودہ گنا زیادہ بلندی پر برطانوی ہاک ہنٹر بمبار طیارہ مار گرایا تھا اور آٹھ سو فٹ تو زیادہ بلندی نہیں تھی۔ پہلا میزائل جب ایک

MI-24 گن شپ ہیلی کاپٹر پر لگا تو نتیجہ توقع سے کہیں بڑھ کر نکلا۔ وہ تینوں ہیلی کاپٹر مکمل طور پر اگرچہ تباہ نہیں ہوئے تھے لیکن اب وہ کسی کارروائی کے قابل بھی نہیں رہ گئے تھے۔ ایک ہیلی کاپٹر کی بلاسٹ پروف ونڈ اسکرین اڑ گئی تھی' دوسرے کے دُھواں خارج کرنے والے پائپ پر میزائل لگا تھا اور تیسرے ہیلی کاپٹر کا مرکزی روٹر تباہ ہوگیا تھا لیکن یہ ان پائلٹوں کی خوش قسمتی یا مہارت تھی کہ وہ تینوں زخمی ہیلی کاپٹروں کو ائرپورٹ کی حدود میں ہیلی پیڈز پر اتارنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

○☆○

عقاب کی فوج (قندھار شہر کا شمالی علاقہ)
نو بجکر اِکاون منٹ شب

اس رات قندھار شہر پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجی جانے والی فوج کا مین فارمیشن تین سو MBT ہیوی بیٹل ٹینکوں پر مشتمل تھا۔ بیس لائن پوزیشن کی طرف بڑھتے ہوئے یہ ٹینک حملے کے لیے احکامات کے منتظر تھے۔ اسی دوران کیپٹن اعظم بے نے ٹینکوں کے ریڈیائی پیغامات سننے کے لیے اپنا ریڈیو آن کردیا۔ وہ چند لمحوں تک ہیڈ فونز پر سنتا رہا پھر آدم درانی کی طرف مُڑ کر بولا۔

"ان کی کمانڈ اور کنٹرول کمیونیکیشن میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ وہ دوسری ہائی فریکوئنسی استعمال کررہے ہیں جو کسی طرح بھی محفوظ نہیں ہے۔ انہیں مختلف قسم کے احکامات مل رہے ہیں جس سے وہ خاصے بدحواس ہورہے ہیں۔"

"وہ فریکوئنسی غیر محفوظ اور غیر مناسب کیوں ہے؟" آدم درانی نے پوچھا۔

"ان کے ریڈیو کرسٹل کیلی بریٹڈ ہیں جو اچانک تبدیل ہونے والی فریکوئنسیز استعمال نہیں کرسکتے۔ مزید برآں اس ہائی فریکوئنسی کو دوسری جگہوں پر آسانی سے ریسیو کیا جاسکتا ہے۔"

"یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے لیکن اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

"میں نے ریڈیو پر کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ کسی نے قندھار ائرپورٹ کے مین کنٹرول ہیڈ کوارٹر کے مواصلاتی نظام کو تباہ کردیا ہے۔ گوریلا ایکشن۔"

"گڈ! اس کا مطلب ہے کہ ہمارے کچھ دوست اپنا کام کررہے ہیں۔" آدم درانی مسکرایا۔

کچھ عرصے سے بالکل غیر متوقع طور پر افغانستان میں مسلح مجاہدین کے دستوں میں اضافہ ہوگیا تھا لیکن مجاہدین کے یہ دستے جس طرح اچانک نمودار ہوتے تھے اسی طرح اچانک ہی غائب بھی ہوجایا کرتے تھے۔ آدم درانی اپنی جگہ پر گھوم کر چٹان کی آڑ سے نیچے سڑک پر ٹینکوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹینک ایک طویل قطار میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ صورت حال بالکل ہنومان جیسی تھی جب انہوں نے ٹینکوں کے ایک کانوائے کو گھاٹی میں گھیر کر تباہ کردیا تھا۔ یہاں بھی سڑک گھاٹی میں تھی اور ٹینکوں کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

درانی نے اپنے آدمیوں کو دو دو کی ٹولیوں میں گھاٹی کے ساتھ ساتھ چٹانوں پر پھیل جانے کا حکم دیا۔ دس منٹ بعد ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور درانی کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"عقاب! تمام آدمی گھاٹی کے دونوں طرف ٹینکوں کے اس قافلے کے آخری سرے تک اپنی اپنی پوزیشن پر پہنچ چکے ہیں۔"

"گڈ!" آدم درانی بولا۔ ٹینک ابھی تک رکے ہوئے تھے اور ہر ٹینک کا ٹورٹ (ڈھکنا) کھلا ہوا تھا۔ ٹینکوں پر موجود تقریباً سب ہی آدمی سگریٹ پی رہے تھے اور سلگتی ہوئی سگریٹوں کی نہایت مدھم سی روشنی میں کبھی کبھی ان کے چہرے اور سروں پر فولادی ہیلمٹ دکھائی دے جاتے تھے۔ کچھ لوگ اب ٹینکوں سے نیچے اتر آئے تھے اور مواصلاتی رابطے میں گڑبڑ کی باتیں کررہے تھے۔ وہ سب روسی تھے اور آدم درانی کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ اس مرتبہ افغان فوجیوں کو قربانی کے بکرے بنا کر آگے نہیں رکھا گیا تھا۔

روسی ٹینک کمانڈر کا ابھی تک افغان انفنٹری ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم نہیں ہوسکا تھا جس کا مطلب تھا کہ حملے میں تاخیر لازمی تھی۔ حملہ ٹھیک گیارہ بجے ہونا تھا لیکن ابھی تک کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

مشین گنوں' گرنیڈز' راکٹ لانچروں اور ٹینک شکن میزائلوں سے لیس مجاہدین اوپر چٹانوں کی آڑ میں اس طرح گھات لگائے تیار بیٹھے تھے جیسے چیتا اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

آدم درانی کے لیے مزید انتظار کرنا اب قوت برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ ویسے بھی یہ روسی قافلے پر حملے کے لیے بہترین وقت تھا۔ اس نے پہلا گرنیڈ قافلے کے سب سے آگے والے ٹینک کی طرف اچھال دیا۔ یہ گویا مجاہدین کے لیے حملے کا سگنل تھا۔ M PKG-3 روسی گرنیڈ سیدھا ٹینک کے کھلے ہوئے ڈھکنے' ٹورٹ میں گرا۔ آدھا کلوگرام انتہائی طاقتور دھماکا خیز مادے والا یہ گرنیڈ چھ انچ موٹی فولادی چادر کو پھاڑ دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ٹینک کے اندر گرتے ہی یہ گرنیڈ اس زوردار دھماکے سے پھٹا کہ بیس پچیس فٹ دور چٹان کی آڑ میں بیٹھے ہوئے آدم درانی کو بھی یوں لگا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا ہو۔ وہ سنبھل کر ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ یہ پہلا دھماکا دوسرے مجاہدین کے لیے اشارہ تھا۔ انہوں نے بھی فوراً ہی اپنی کارروائی شروع کردی۔ فضا پے در پے دھماکوں سے گونجنے لگی۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے جہنم کے تمام دروازے کھل گئے ہوں۔

آدمیوں کے چیخنے چلّانے' آٹومیٹک رائفلوں کے فائر اور بموں کے دھماکوں کی آوازیں چاروں طرف گونج رہی تھیں۔ ریڈیو آپریٹر ٹینکوں سے نکل آئے تھے۔ ان کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔

وہ ٹینکوں میں بھرے ہوئے ایمونیشن کے پھٹنے سے پہلے ادھر اُدھر بھاگ کر اپنے آپ کو بچانا چاہتے تھے۔ جو لوگ پہلے ہی ٹینکوں سے اُتر چکے تھے' ان پر تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ چند منٹ پہلے تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا لیکن اب فضا دھماکوں اور ڈیزل کے جلنے سے روشن ہو رہی تھی۔ گاڑھے' سیاہ دھوئیں کے مہیب بادل آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ربر' ڈیزل' بارود اور انسانی گوشت جلنے کی بُو فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ روسیوں نے روشنی کے گولے فائر کر دیے تھے لیکن اس کا فائدہ صرف افغان مجاہدین کو پہنچ رہا تھا۔ وہ روشنی میں روسیوں کو چُن چُن کر نشانہ بنا رہے تھے۔

بموں کے دھماکوں کے ساتھ ساتھ مجاہدین کی آوازیں بھی بار بار فضا میں گونج رہی تھیں۔ جب بھی کوئی ٹینک پھٹتا' اللہ اکبر کی صدائیں فضا میں گونج اٹھتیں۔ دس منٹ کے اندر اندر تین سو ٹینک اسکریپ میں تبدیل ہو چکے تھے۔

ان تین سو ٹینکوں میں نو سو فوجی تھے جن میں سے سو کے لگ بھگ زندہ بچ سکے تھے۔ مجاہدین اب چٹانوں سے کود کر سڑک پر آگئے تھے۔ اس طرح دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ روسی بھاگ بھاگ کر اپنی جانیں بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور خون کے پیاسے افغان مجاہدین انہیں پکڑ پکڑ کر ذبح کر رہے تھے۔ تقریباً تمام ہی ٹینکوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ جلتے ہوئے ٹینکوں کی تپش سے مجاہدین کا پسینہ بہہ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جہنم کے کسی حصے میں آگئے ہوں۔

چاند طلوع ہو چکا تھا' کشت و خون ابھی تک جاری تھا۔ ان ٹینکوں کے ساتھ دس بکتر بند گاڑیاں بھی تھیں جو قافلے کے سب سے آخر میں تھیں۔ ان بکتر بند گاڑیوں میں تقریباً ڈیڑھ سو فوجی تھے۔ وہ گاڑیاں آگے لانے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اپنے ساتھیوں کی مدد کر سکیں لیکن ٹینکوں کے بکھرے ہوئے ملبے میں یہ بکتر بند گاڑیاں بھی پھنس کر رہ گئیں۔

کچھ کہنا مشکل تھا کہ یہ کس قسم کی جنگ ہو رہی ہے۔ افغان اگرچہ لڑنے بھڑنے کے عادی تھے لیکن انہیں فوجی قسم کی لڑائیوں کا تجربہ نہیں تھا۔ روسی فوجی سوویت آرمی کی کریم تھے۔ جبری بھرتی کیے جانے والوں کے برعکس یہ لوگ اپنی مرضی سے فوج میں آئے تھے اور انہیں بہترین ٹریننگ اور تجربہ حاصل تھا۔ اناڑیوں اور کھلاڑیوں کی یہ کچھ عجیب سی لڑائی تھی۔

یہ لڑائی تین گھنٹوں تک جاری رہی۔ دونوں پارٹیوں میں سے کسی نے بھی اپنے حریفوں میں سے کسی کو قیدی بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سب بے دردی سے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ افغان اپنی سرزمین پر ان کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے' خواہ وہ قیدیوں کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ اور روسیوں کو اس بات کا خوف تھا کہ اگر وہ یہاں سے زندہ بچ بھی نکلے تو ان کا کورٹ مارشل ہو جائے گا جس میں موت کی سزا بھی مل سکتی تھی۔ ان کے آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی اس لیے وہ بھی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔

رات دو بجے تک لڑائی جاری رہی۔ بالآخر بچے کھچے روسی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا ایمونیشن ختم ہو چکا تھا۔ ان کے تمام ٹینک یا تو مکمل طور پر تباہ ہو چکے تھے یا استعمال کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہ افغان مجاہدین کی ایک بہت بڑی فتح تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ روسیوں نے قندھار پر قبضہ کرنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔

بارود اور چیزوں کے جلنے کی بُو اب بھی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ آدم درانی اور اس کے ساتھی اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے اور مجاہدین اپنے نقصانات کی رپورٹیں پیش کر رہے تھے کہ شہر کی طرف سے آنے والی ایک کھٹارہ سی کار ان کے قریب آکر رک گئی۔

مغربی بزنس سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر آدمی کار رُکتے ہی نیچے اتر آیا۔ اس کے سر پر بڑی سی پگڑی بندھی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی۔

"کاراکش! عقاب... کاراکش کہاں ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

آدم درانی دو قدم آگے بڑھ آیا۔ "میں ہوں کاراکش۔ کیا بات ہے؟"

بوڑھا دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ "میں یعقوب کا بیٹا نیک نام ہوں۔ قندھار سے آیا ہوں۔ لیفٹیننٹ طورا میرا داماد ہے۔ مجھے قوم پرست کمانڈر اشرف نے بھیجا ہے۔ غدار ریڈ افغان سوویت ائرپورٹ کی مدد سے مغرب میں ہرات ہائی وے کی طرف سے ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔"

آدم درانی بُری طرح تھکا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کام سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر آرام کرے گا لیکن اس اطلاع کے بعد آرام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب اسے پتا چل گیا تھا کہ افغان آرمی کہاں ہے۔ روسیوں نے شاید شہر پر دو سمتوں سے بیک وقت حملہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن مواصلاتی نظام میں گڑبڑ کی وجہ سے ان کا پروگرام بھی گڑبڑا گیا تھا۔

"آؤ کمانڈ ٹرک پر چلتے ہیں۔" آدم درانی نے کہا۔ "دیکھتے ہیں' اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

وہ لوگ ٹرک میں آگئے تھے۔ آدم درانی کو بہرحال اس بات کی خوشی تھی کہ اس کا کوئی قریبی دوست شدید زخمی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی اس خود غرضی پر دل ہی دل میں ندامت محسوس کرنے لگا۔ تنظیم میں شامل سب ہی اس کے اپنے تھے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں اس نے نو وارد کی طرف دیکھا۔ اس کی ٹانگ زخمی تھی اور سوٹ پر جگہ جگہ دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس نے نو وارد کی مرہم پٹی

کرنے کو کہا اور دوسروں کا جائزہ لینے لگا۔ ہر ایک کا لباس گرد آلود تھا۔

"قندھار کی صورتِ حال کیا ہے؟" آدم درانی نے نووارد سے پوچھا۔

"ہم نے چھاؤنی میں روس کی باقی ماندہ فوج کا محاصرہ کر رکھا ہے۔" نیک نام نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ محاصرہ ایک ہفتے سے جاری ہے۔ نہ ہم میں سے کوئی چھاؤنی میں داخل ہو سکا ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی باہر آسکا ہے۔ ان کے پاس اسلحہ کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاید وہ باہر نکلنے کی کوشش بھی نہ کریں۔ اشرف خان کوشش کر رہا تھا کہ دیوار میں نقب لگا کر جانباز دستہ اندر بھیجا جائے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ اب تک اندر داخل ہو چکے ہوں گے۔ خدا انہیں کامیاب کرے۔"

"دشمن کی تعداد کیا ہے؟ اسلحہ کس قسم کا ہے اور ٹینک ہیں یا نہیں؟" درانی نے پوچھا۔

"ہمارے اسکاؤٹ آج ہی رات معلومات حاصل کرنے کے لیے اس طرف گئے تھے۔ تاریکی میں وہ زیادہ تفصیل سے تو جائزہ نہیں لے سکے لیکن ان کا خیال ہے کہ ان کے پاس کوئی ٹینک نہیں ہے، صرف ٹرک ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ان افغانوں کی ہے جنہیں کارمل کے احکامات کے تحت جبری بھرتی کیا گیا ہے۔ ان افغانوں کو آگے رکھا گیا ہے۔"

"ان کے دائیں بائیں یا پُشت سے حملہ کرنے کی صورت میں کیا امکانات ہیں؟"

"امکانات تو ہر طرف سے ہیں عقاب۔" نیک نام نے جواب دیا۔ "ہائی وے 75 سے بڑی آسانی اور کسی رکاوٹ کے بغیر وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اپنے آدمیوں کو ٹرکوں میں بھر لو، ہم انہیں سیدھا وہیں لے جائیں گے۔ راستہ میں بتاؤں گا۔ اس جگہ کی نشاندہی بھی میں کروں گا جہاں سے حملہ کیا جا سکتا ہے۔"

آدم درانی نے اپنی AK-47 رائفل کندھے پر لٹکالی۔

"مجاہدو!" وہ ٹرک پر کھڑے ہو کر چیخا۔ "قندھار کی طرف کوچ کی تیاری کرو۔"

تمام مجاہدین ٹرکوں کی طرف لپکے اور چند منٹ بعد یہ قافلہ قندھار کی طرف جا رہا تھا۔

○☆○

پائندہ گل کی فوج۔

قندھار ائرپورٹ۔ ایک بجے شب۔

قندھار ائرپورٹ پر موجود روسیوں کو اب صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ ان کے تین گن شپ ہیلی کاپٹر فضا میں پہنچ چکے تھے جو نیچی پرواز کرتے ہوئے پائندہ گل کی فوج پر مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کر رہے تھے۔ وہ نظر نہ آنے والی انفرا ریڈ سرچ لائٹس کی روشنی میں پائندہ گل کے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان پر گولیاں برسا رہے تھے۔

پائندہ گل کے پاس SAM-7 میزائل ختم ہو چکے تھے۔ اس نے دشکا مشین گنوں کو فائر کا حکم دیا۔ ان کے سروں پر منڈلانے والے ہیلی کاپٹروں کی تمام روشنیاں بند تھیں۔ مشین گنوں پر یوسف زئی قبیلے کے آدمی تھے۔ وہ محض ہیلی کاپٹروں کی آوازوں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ پچاس گولیوں والے تین بیلٹ فائر کرنے کے بعد بالآخر وہ ایک ہیلی کاپٹر کو گرانے اور دوسرے دو ہیلی کاپٹروں کو جزوی طور پر نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

آخری ہیلی کاپٹر جیسے ہی فضا سے غائب ہوا، ٹرکوں کی ایک طویل قطار کیمپ کی طرف سے کابل روڈ پر نمودار ہوئی۔ یہ فوجی صرف پانچ مہینے پہلے یہاں آئے تھے۔ وہ معمولی سی ٹریننگ کر کے آئے تھے اور انہیں حقیقی لڑائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ اب تک دیہی بستیوں میں نہتے دیہاتیوں پر چھاپا مار کارروائیاں کرتے رہے تھے۔ وہ فضا کو روشن رکھنے کے لیے سفید میگنیشم کے فلیئر مسلسل فائر کر رہے تھے۔

"یہ لوگ تاریکی سے خوفزدہ ہیں۔" پائندہ گل چیخا۔

پائندہ گل کے اسکاؤٹس ان پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے تھے اور جب وہ لوگ ٹرکوں سے اُترے تو ان کے اندازے کے مطابق ان کی تعداد آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ جبکہ پائندہ گل کا لشکر چھ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس طرح روسی تعداد میں ان سے دو ہزار زیادہ تھے۔ پائندہ گل کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا تھا۔ اس کے خیال میں ان افغانوں کے لیے تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ تاریخ شاہد تھی کہ دس کے مقابلے میں ایک ہونے کے باوجود افغانوں نے کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔ اس نے اپنی سب مشین گن اٹھالی اور ایمونیشن بردار کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس صورت حال میں بعض اوقات اسے اپنے آپ پر ہنسی آجاتی۔ انگلینڈ میں وہ ٹرانسپورٹ کنگ کے نام سے مشہور تھا اور یہاں ایک عام سپاہی کی طرح لڑ رہا تھا۔

روسی فوج اب پیدل آگے بڑھ رہی تھی۔ ان کے این سی او چیخ چیخ کر تیز تر چلنے کو کہہ رہے تھے اور فوجی چلنے کے بجائے تقریباً دوڑ رہے تھے۔ زمین ہموار ہونے کی وجہ سے انہیں تاریکی میں بھی دوڑنے میں غالباً کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ کبھی جب روشنی کا نیا گولہ فضا میں پھٹتا تو کیمیکل لائٹ میں ان کی خاکی وردیاں سبزی مائل نظر آنے لگتیں۔

اب آگے بڑھنے کے ساتھ ہی انہوں نے فائرنگ بھی شروع کر دی تھی۔ مجاہدین گولیوں سے بچنے کے لیے زمین پر لیٹ گئے۔ انہوں نے اپنے چاقو بھی نکال لیے تھے۔ وہ بے حس و حرکت زمین پر پڑے، فوجیوں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ فوجی شور مچاتے ہوئے حیرت انگیز تیز رفتاری سے ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ یہاں آنے سے تقریباً نصف گھنٹے پہلے تک یہ فوجی دوڑ کا پیتے رہے

تھے جس میں پینتالیس فی صد الکوحل ہوتی ہے۔ الکوحل کے اثر سے ان کے ذہنوں پر کسی حد تک غنودگی سی طاری تھی۔

لشکر کے تمام آدمی بے چینی سے آنے والے لمحات کا انتظار کررہے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے کسی جنگ میں حصہ لیا تھا یا نہیں لیکن خون ریزی ان کی فطرت میں شامل تھی اور وہ آج رات خون کی ندیاں بہتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کا کوئی رشتے دار یا قریبی دوست پُرسکون بستیوں پر روسی حملوں کے دوران جاں بحق نہ ہوا ہو۔ انہوں نے زربل' پکتیا' ننگر ہار اور کنار سے آنے والے ان بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کو دیکھا تھا جن کے جسم زخموں سے چُور تھے۔ کسی کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں' کسی کے بازو اور کسی کے جسم پر گولیوں کے گہرے زخم تھے۔ ان زخمیوں کو طبی امداد کے لیے سرحد کے اس پار پہنچانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ طویل اور نہایت دشوار گزار راستے۔ یہ گھنٹوں کا نہیں' کئی کئی دنوں کا سفر تھا اور بہت سے زخمی تو راستے ہی میں دم توڑ دیتے تھے۔

قبائلی انتقام لینا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ وقت اور موقعے کا انتظار کرتے تھے۔ پائندہ گل کے اس لشکر میں اسحاق خیل قبیلے کے بھی بہت سے آدمی شامل تھے۔ وہ اس لشکر میں صرف اس لیے شریک ہوئے تھے کہ کچھ عرصہ پہلے ان کے ایک رشتے دار ریاض خان اور اس کے کئی رشتے داروں کو روسیوں نے قتل کردیا تھا۔

روسی ہیلی کاپٹروں نے وادیٔ خیر خانہ میں ریاض خان کے گاؤں کو بمباری سے تباہ کردیا تھا۔ ایک کیمیکل بم سے ریاض خان کی بینائی ختم ہوچکی تھی۔ وہ بری طرح زخمی تھا اور اپنے عزیزوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر چلے جائیں لیکن کسی نے بھی اس کی بات نہیں مانی۔ کوئی بھی اسے اس حالت میں چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھا۔ دو مرد اور دو عورتیں اسے گھسیٹتے ہوئے تباہ شدہ مسجد کی طرف لے جارہے تھے کہ روسی ہیلی کاپٹر دوبارہ آگئے اور انہوں نے مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کردی۔ نابینا ریاض اور اس کے ایک کزن عسکر کے جسم گولیوں سے چھلنی ہوگئے لیکن یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ متعدد گولیاں لگنے کے باوجود وہ زندہ تھے۔

تین دیہاتی جنہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا' اپنے ان دو ساتھیوں کو اٹھا کر دو سو میل دور پاکستان کی سرحد کی طرف روانہ ہوگئے۔ انہوں نے دو بوریاں سی کر ان کا اسٹریچر سا بنالیا تھا اور زخمیوں کو اس اسٹریچر پر ڈالا ہوا تھا۔ وہ دریاؤں اور پہاڑوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔

اُنتالیس دن کے اس سفر کے دوران ہیلی کاپٹروں نے ان پر تین مرتبہ حملے کیے لیکن وہ ہر مرتبہ بچتے رہے۔ وہ راستے کی چھوٹی چھوٹی بستیوں سے بھیک مانگتے اور گھاس اور درختوں کے پتے کھاتے ہوئے بڑی حوصلہ مندی سے اپنا سفر طے کرتے رہے۔

جب وہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تو انہیں فوراً ہی مہاجرین کے کیمپ کے ایک ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ یہ چھوٹا سا ہسپتال چند پاکستانی ڈاکٹر انسانی ہمدردی کی بنیاد پر عطیات سے چلا رہے تھے۔ اس ہسپتال کا انتظام اور کارکردگی اس قدر شاندار تھی کہ انٹرنیشنل ریڈ کراس کا وفد بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ طویل راستے کی صعوبتیں برداشت کرکے یہاں پہنچے تھے۔ خطرات کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے لیکن اس پناہ گاہ میں پہنچنے کے تین دن بعد ہی ریاض خان کا انتقال ہوگیا۔

ریاض خان کے انتقال کے بعد اس کے تینوں ساتھیوں کو پشاور سے بارہ میل دور ناصر باغ کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ اس کیمپ کی حالت نہایت ابتر تھی۔ وہ بے یار و مددگار یہاں پڑے رہے۔ کبھی کچھ کھانے کو مل جاتا اور کبھی پانی پی کر ہی گزارہ کرلیتے۔ وہ اپنے آپ کو ریاض خان کی موت کا ذمے دار گردان رہے تھے کہ انہوں نے جلد یہاں پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ لوگ انہیں سمجھاتے کہ ان کا کوئی قصور نہیں لیکن وہ اپنے آپ کو معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔

اور اب۔ ریاض خان کے وہی تین دوست بھی پائندہ گل کے لشکر میں شامل تھے۔ وہ لوگ یہ سوچ کر آئے تھے کہ ریاض خان کے قاتلوں کو ایسی عبرتناک سزا دیں گے کہ زمانہ رہتی دنیا تک یاد کرے گا۔ وہ انہیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ کسی افغانی کی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی۔

اور اس رات لشکر میں شامل اسحاق خیل کے آدمیوں نے۔ کم از کم سو روسیوں کو ذبح کیا۔ وہ ہر روسی کو ذبح کرتے ہوئے ریاض خان اور ان ناموں کا نعرہ لگاتے جنہیں بڑی بے دردی سے اسحاق خیل گاؤں پر شدید بمباری کرکے قتل کردیا گیا تھا۔ اس رات تقریباً چودہ ہزار آدمیوں میں تین گھنٹوں تک دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔

صلاح الدین خان نے اپنی جیب کے پہلو پر بندھی ہوئی چوڑے پھل والی کلہاڑی اتار لی اور شگون کے طور پر چمکتے ہوئے پھل پر تھوک کر اسے انگوٹھے سے دھار پر ملنے لگا۔ کلہاڑی کا یہ پھل چھ سو سال پرانا تھا اور اس پر اس وقت کے نامور اسلحہ ساز سلمان کا نام بھی کندہ تھا۔ کلہاڑی کا دستہ چار فٹ لمبا تھا۔ پچھلے اپریل میں صلاح الدین کے پورے خاندان کو حسین کوٹ نامی گاؤں میں روسیوں نے قتل کردیا تھا۔

صلاح الدین کے آباو اجداد نے بڑی جوانمردی سے حملہ آور یونانیوں' ایرانیوں اور ہندوستانیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ انہوں نے منگولوں' عربوں' تاتاریوں اور انگریزوں کے قدم بھی اس سرزمین پر نہیں ٹکنے دیے تھے۔ صلاح الدین کی رگوں میں بھی انہی بہادر جنگجوؤں کا خون تھا جنہوں نے ہر حملہ آور کے دانت کھٹے کیے تھے۔

صلاح الدین کلہاڑی کو سر سے اوپر گھما رہا تھا۔ کلہاڑی کا بلیڈ فلیئر کی روشنی میں پارے کی طرح چمک رہا تھا۔ بالآخر اس نے دستہ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ کلہاڑی ہوا میں اڑتی ہوئی اس روسی فوجی کی گردن میں پیوست ہوگئی جس نے ابھی ابھی ایک مجاہد کو شہید کیا تھا۔ کلہاڑی کا پھل روسی فوجی کی گردن پر اندر تک پیوست ہوگیا تھا۔ روسی پیچھے مڑا اور دوسرے ہی لمحے ڈھیر ہوگیا۔ اس کا منہ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ صلاح الدین دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور ایک زوردار جھٹکے سے کلہاڑی کھینچ لی۔

"شاباش! چنغلا!" وہ کلہاڑی کو بوسہ دیتے ہوئے چیخا۔

○☆○

اس روسی فوجی نے جھک کر گرنیڈ کی پن نکالی اور بڑی پھرتی سے سیدھا ہو کر گرنیڈ کو پوری قوت سے دُبلے پتلے سیماب خان کی طرف اچھال دیا۔ سیماب خان کی عمر صرف تیرہ سال تھی لیکن یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ دستی بم کی پن کھینچنے کے بعد فیوز کو ڈیٹونیٹ ہونے میں چار سیکنڈ لگتے تھے۔ اس نے ایک ماہر اسپورٹس مین کی طرح اچھل کر گرنیڈ کو ہوا میں کیچ کیا اور پوری قوت سے اسے واپس پھینک کر خود بھی بڑی پھرتی سے زمین پر گر گیا۔

ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ سیماب خان نے جب سر اٹھا کر دیکھا تو اس پر گرنیڈ پھینکنے والا وہی روسی زمین پر پڑا تھا۔ اس کا سر غائب تھا اور کٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارہ اُبل رہا تھا۔ سیماب خان کو متلی سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے چاروں طرف چیخ و پکار کا شور تھا' دھماکے ہو رہے تھے اور بارود کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ روسی پہلا انسان تھا جو اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا اور جب وہ لشکر میں شامل ہوا تھا تو اس کا خیال تھا کہ لڑائی کے دوران کہیں نہ کہیں سے اسے کوئی ہتھیار مل جائے گا۔

وہ چند لمحے اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا رہا پھر اٹھ کر آہستہ آہستہ رینگنے لگا اور بالآخر اسے ہتھیار مل گیا۔ نئی AK-47 کلاشنکوف رائفل کے قریب ہی ایک تھیلے میں دو نہیں' تین میگزین بھی موجود تھے۔ یہ اسی روسی کی کلاشنکوف تھی جسے اس نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ رائفل اٹھا کر ٹریگر دبا کر آگے کی طرف دوڑا۔ رائفل AV آٹومیٹک پر سیٹ تھی۔ دس سیکنڈ کے اندر اندر نصف درجن روسی اس کی گولیوں کا نشانہ بن کر خاک و خون میں لوٹ رہے تھے۔

دس سیکنڈ اور گزر گئے۔ سیماب خان پر جنون سا طاری تھا۔ وہ گولیاں برساتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر وہ خود گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوگیا تھا۔ چند ماہ پہلے جب روسیوں نے اس کے گاؤں پُل صوفیان پر ہوائی حملہ کیا تھا تو وہ واحد انسان تھا جو زندہ بچ سکا تھا۔ روسیوں نے اس کے گاؤں کی پوری آبادی کو موت کی نیند سُلا دیا تھا اور آج اس نو عمر مجاہد نے اپنے گاؤں والوں کے قتلِ عام کا بدلہ لے لیا تھا۔

○☆○

مجاہدین میں گھرے ہوئے روسی فوجیوں کا وہ آخری آدمی تھا جس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پائندہ گل کی رائفل کی سنگین پیوست ہوئی تھی۔ اس نے رائفل کو زوردار جھٹکا دے کر سنگین روسی کے جسم سے باہر کھینچی۔ ٹھیک اسی وقت اس کی نظریں مشرق کی طرف اٹھ گئیں۔ اس طرف آسمان اس طرح روشن ہوگیا تھا جیسے اچانک ہی سورج نکل آیا ہو۔ روسی فوجی کی لاش کے یونی فارم سے سنگین کا خون صاف کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ شاید یہ کوئی نئے قسم کا فلیئر ہے۔ اسی وقت خلیل دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"یہ میرا ایک چھوٹا سا کارنامہ ہے۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"تم نے یہ نئے قسم کے فلیئر کہاں سے لیے تھے؟" پائندہ گل نے پوچھا۔

"فلیئر! میرے پاس تو کوئی فلیئر نہیں تھا۔" خلیل نے حیرت سے کہا۔

"پھر وہ روشنی کیسی تھی؟" پائندہ گل نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اوہ وہ...." خلیل مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ روسیوں کے تیس عدد BTR-60 ٹینک تھے جو دریائے آرغستان کی طرف سے آرہے تھے۔ ہمارے اسکاؤٹس نے انہیں دیکھ لیا اور میں نے سوچا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں نے دریا کے کنارے دس ہزار گیلن والا ایک آئل ٹینک پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں نے وہ تیل پانی میں بہا دیا اور پھر ماچس کی ایک ہی تیلی کافی تھی۔" خلیل نے جواب دیا۔

"اور پھر؟" پائندہ گل نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تیس ٹینک اور پانچ سو چالیس فوجی اگر اس طرف آجاتے تو جنگ کا نقشہ ہی بدل چکا ہوتا لیکن اب وہ سب کے سب اس آگ میں جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔"

"بیچارے!"

"یہ ان بیچاروں کے ساتھ قدرت کا انصاف ہے۔ ان سب کا تعلق اسپیشل یونٹ سے تھا۔ وہ لوگ نہتے اور بے گناہ عوام پر کھولتا ہوا تیل' نیپام بم اور زہریلی گیس برسانے میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ وہ پانچ سو چالیس روسی ہزاروں بے گناہ شہریوں کو موت کی نیند سُلا چکے تھے۔ انہوں نے پاکستانی سرحد کے قریب سیکڑوں دیہاتوں کو پیوندِ خاک کر دیا تھا جو مجاہدین کی مدد کرتے رہتے تھے اور

اب یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ روسی فوجیوں کا ایک اور دستہ اس طرف آرہا تھا۔ خلیل اور پائندہ گل نے رائفلیں سیدھی کرلیں۔

○☆○

عقاب کی فوج

ہرات روڈ باؤنڈری۔ قندھار شہر

دو بجکر تیس منٹ شب

عقاب کے مجاہدین قندھار کے نواح میں ہرات روڈ پر پہنچ چکے تھے جہاں روسی فوج سے ان کا آمنا سامنا ہوگیا۔ روسیوں نے حسبِ معمول افغان فوجیوں کو قربانی کے بکرے بنا کر آگے رکھا تھا۔ وہ لوگ زبردست شیلنگ کررہے تھے۔

افغان مجاہدین تین سو ٹینکوں کے خلاف جنگ میں اگرچہ بری طرح تھک چکے تھے لیکن اس وقت وہ اپنی تھکن بھول گئے تھے۔ وہ جبری طور پر بھرتی کیے ہوئے بددل افغان فوج کے لیفٹ فلینک کو چیرتے ہوئے عقب میں نکل گئے جہاں روسی فوجی ان کی آمد سے بالکل بے خبر تھے۔ افغان فوجی اس صورت حال سے بری طرح بدحواس ہوگئے تھے۔ ان میں سے بیشتر تو اپنی جانیں بچانے کے لیے راہ فرار اختیار کرنے لگے۔

کیپٹن اعظم بے' جانبازوں کے ایک دستے کی قیادت کرتا ہوا پیچھے نکل گیا۔ اس نے روسی بکتر بند گاڑیوں کی ایک پوری لائن تباہ کردی تھی۔ اس کارروائی میں اس کی ایک انگلی بھی کٹ گئی تھی۔

آدم درانی تین روسیوں میں گھر گیا تھا جو اپنی خالی رائفلوں کے بٹوں سے اس پر حملہ کررہے تھے۔ آدم درانی نیچے گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ روسی رائفلوں کے بٹ مار مار کر اسے ختم کردیتے' شہر دار حیدر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ایک روسی کا گلا کاٹ دیا' دوسرے کے پیٹ میں سنگین گھونپی اور تیسرے کو گولی مار کر ختم کردیا۔

آدم درانی کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے حیدر ایک لمحے کو اپنے آپ سے غافل ہوگیا' اسی لمحے ایک روسی سارجنٹ کلاشنکوف سے گولیاں برساتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ حیدر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ روسی سارجنٹ' آدم درانی کی طرف لپکا لیکن ایک مجاہد کی گولی نے اس کی کھوپڑی اڑادی۔

آدم درانی بے حس و حرکت کھڑا کچھ دور ہونے والی لڑائی کو دیکھتا رہا پھر وہ شیر قلعہ کے اسلحہ بردار شہردار حیدر پر جھک گیا' حیدر کی بائیں ٹانگ پر کولہے کے قریب دو تین گولیاں لگی تھیں اور خون بہہ کر گرم ریت میں جذب ہو رہا تھا۔

"گھبراؤ نہیں' تم ٹھیک ہو جاؤ گے غازی!" آدم درانی نے کہا۔

حیدر کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ تاریک آسمان کی وسعتوں میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ تکلیف کی شدت سے اس کے چہرے اور گردن کی نسیں تنی ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ آدم درانی نے پانی کی بوتل اس کے ہونٹوں سے لگادی۔

"میرا آقا۔ کیپٹن جمعہ۔ روسی ہیلی... کاپٹر..."

"آرام سے لیٹے رہو حیدر! تم ٹھیک ہو جاؤ گے" آدم درانی نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔

"میں آرہا ہوں آقا..." حیدر کی آواز میلوں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "میرا ہاتھ پکڑ لو..." اس کی پتلیاں چڑھ گئیں' جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ ہمیشہ کے لیے بے حس و حرکت ہو گیا۔

آدم درانی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے حیدر کی آنکھیں بند کردیں۔ روسی فلڈ لائٹس سے آسمان روشن ہو رہا تھا۔ میدان جنگ میں دن کی سی روشنی نظر آرہی تھی۔

اگرچہ قندھار شہر کے لوگ بھی اب جنگ میں شامل ہو چکے تھے لیکن ان کے پاس ہتھیاروں اور ایمونیشن کی کمی تھی۔ چار چار' پانچ پانچ آدمیوں کی ٹولی میں صرف ایک ایک رائفل تھی۔ اس کے برعکس روسیوں کی مشین گنیں تواتر سے گولیاں اگل رہی تھیں۔ ملحقہ چھاؤنی پر بھی ابھی تک روسیوں کا قبضہ تھا۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے ڈپو کی حفاظت کے لیے بھی سخت انتظامات کیے گئے تھے۔

آدم درانی کے خیال میں صورت حال خاصی سنگین تھی۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ مجاہدین کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ کسی طرف سے کمک کی کوئی امید نہیں تھی' کوئی معجزہ ہی تھا جو انہیں بچا سکتا تھا' اور اس سے پہلے کہ اس کے مجاہدین میدان چھوڑ دیتے' وہ معجزہ رونما ہوگیا۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر آدم درانی چونک گیا' پہلے تو وہ اسے اپنا واہمہ سمجھا لیکن یہ حقیقت تھی۔ لاتعداد گھوڑے تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اب آدمیوں کے شور کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

"تیز... تیز... اور تیز..."

اور پھر وہ گھڑسوار نظر آگئے جو اللہ اکبر کے نعرے بلند کررہے تھے۔ ان گھڑسواروں کا تعلق تیس میل دور کی ایک بستی سے تھا۔ قندھار کا ایک نوجوان رات کی تاریکی میں انتہائی خوفناک تیز رفتاری سے موٹر سائیکل چلاتا ہوا اس بستی میں پہنچا تھا اور اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے وہ لوگ میدانِ جنگ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

مشرقی پہاڑوں میں آباد ان گھڑسواروں کا تعلق قدیم ارغوانی قبیلے سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد صلیبی جنگوں میں حصہ لے چکے تھے۔ درویشوں کے قبیلے کی طرح یہ لوگ بھی مرو اور مرجاؤ کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ ان کا تعلق اگرچہ ارغوان قبیلے سے تھا لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو اغوانی کہلاتے تھے۔

یہ لوگ لمبے لمبے لبادے پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں تسبیح کی طرح کی مالائیں اور لمبے بال چوٹیوں میں بندھے ہوئے تھے۔ بعض نے پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ یہ لوگ تلواروں، کلہاڑیوں اور اسی قسم کے قدیم ہتھیاروں سے لیس تھے۔ عجیب و غریب حلیے کے ان لوگوں کو بہترین شہسوار سمجھا جاتا تھا اور تلوار بازی میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہ لوگ ساٹھ پونڈ وزن کندھے پر لاد کر دن میں پچاس ساٹھ میل کا سفر پیدل ہی طے کر لیا کرتے تھے۔ چوبیس گھنٹے مسلسل سفر کرنے کے بعد بھی اگر انہیں جنگ جیسی کسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تو یہ لوگ بالکل تازہ دم نظر آتے۔

ان کا موجودہ سردار سموری زلزلہ خان اگرچہ دوسروں کی طرح قد آور نہیں تھا لیکن وہ ایک بہادر آدمی تھا۔ وہ یورپ اور روسیوں کے بارے میں بھی تھوڑا بہت جانتا تھا۔ پیدائشی طور پر وہ روسی ہی تھا لیکن اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ وہ جس جگہ پیدا ہوا تھا وہاں بھی روسیوں نے زبردستی قبضہ کر رکھا تھا اور وہاں کے لوگوں سے غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ چند سال پہلے وہ لینن گراڈ گیا تھا تو وہاں روسیوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

جنگجو ہونے کے باوجود اسے مطالعے اور سیر و سیاحت سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کا یہ شوق اسے ایک مرتبہ دریائے نیوا کے کنارے پیٹروگراڈ کے مقام پر بھی لے گیا تھا جہاں میکسم گورکی کی یادگار تھی۔ میکسم گورکی اس کا پسندیدہ مصنف تھا۔ زلزلہ خان اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کا تعلق تاتار نسل سے ہے۔ وہ میکسم گورکی کی یادگار سے باہر نکلا ہی تھا کہ دو فوجیوں نے اسے پکڑ کر ملٹری اسکول میں پہنچا دیا اور اس طرح وہ فوجی تربیت حاصل کرنے لگا۔

اور آج زلزلہ خان اپنے آدمیوں کی قیادت کرتا ہوا انہی روسیوں سے لڑنے جا رہا تھا۔ اس کے خیال میں اگر روسیوں کو افغانستان پر حکومت کرنا تھی تو اس کے لیے انہیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ افغانستان میں روسی فوجی بڑی بے دلی سے لڑ رہے تھے۔ دراصل وہ ان لوگوں کے خلاف لڑنا ہی نہیں چاہتے تھے جنہوں نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

زلزلہ خان اس وقت اپنے تین سو بہادروں کی قیادت کر رہا تھا۔ سب سے آگے والے گھڑسوار نے جنگی پرچم تھام رکھا تھا، اس پرچم پر سنہری دھاگے سے جنگی نعرہ لکھا ہوا تھا۔ "جنت تلوار کے سائے میں ہے" یہ لوگ نعرہ لگاتے ہوئے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

روسی فوج کے این سی او چیخ چیخ کر احکامات جاری کر رہے تھے اور فوجی، ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفلیں سنبھالے پھٹی پھٹی سی نظروں سے عجیب و غریب لباس میں ان گھڑسواروں کو اپنی طرف آتے دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے مُردے قبروں سے نکل کر میدان جنگ میں آ گئے ہوں۔

افغانوں نے ان کی آنکھوں میں خوف محسوس کر لیا تھا۔

"حملہ!" کسی نے چیخ کر کہا۔

یہ آواز سنتے ہی روسی فوجیوں پر عجیب سی دہشت طاری ہو گئی اور پھر اچانک وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن انہیں بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ بجلی کی طرح چمکتی ہوئی تلواریں ان کی گردنیں کاٹنے لگیں۔

○☆○

"حملہ۔ حملہ۔ حملہ۔!"

ملک رمضان خان کی پُرجوش آواز میگا فون پر گونج رہی تھی۔ یہ میگا فون اس نے ایک روسی سارجنٹ سے چھینا تھا۔ جنگی دستہ "طوفان" بڑی تیزی سے ان روسیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جو چٹانوں کے پیچھے چھپ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس طوفانی دستے کا کوئی بھی آدمی قد میں سات فٹ سے کم نہیں تھا۔ ان دیو قامت آدمیوں کو دیکھ کر ویسے ہی دلوں پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔

"حملہ۔ حملہ۔ حملہ!"

روسی ہیلی کاپٹر بھی فضا میں پہنچ چکے تھے لیکن صورت حال ایک بار پھر پیغمان جیسی تھی۔ افغان مجاہدین اور روسی فوجی ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ہیلی کاپٹر نہ تو بم گرا سکتے تھے اور نہ ہی مشین گنوں سے فائرنگ کر سکتے تھے کیونکہ اس طرح افغان گوریلوں کے ساتھ ان کے اپنے آدمیوں کے بھی مرنے کا خطرہ تھا۔

مجاہدین نے سیکڑوں روسیوں کو ایک تنگ سی گھاٹی میں گھیر لیا تھا، ان کے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا، آگے مجاہدین کی صورت میں خوفناک موت تھی اور پیچھے عمودی چٹانیں۔ وہ چٹانوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور مجاہدین انہیں گولیوں سے بھون رہے تھے۔

پو پھٹتے ہی بچے کھچے روسیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس جنگ میں زندہ بچ جانے والے روسیوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی۔ انہیں رسیوں سے باندھ کر ڈال دیا گیا، البتہ چند لوگوں کو زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ آدم درانی نے مجاہدین کو آرام کرنے اور نقصان کا جائزہ لینے کا کہہ کر وہیں کیمپ لگا دیا۔

دن کی روشنی پھیلنے تک تمام رپورٹیں موصول ہو چکی تھیں۔ لیفٹیننٹ طورا کے گروپ کے پچاس افغان فوجیوں کے علاوہ حیدر، زلیکوف اور تین نورستانی جام شہادت نوش کر چکے تھے۔

آدم درانی، نور شریفی اور اس کے دیگر ساتھی ایمونیشن کی پیٹیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، انہیں اپنے تمام مجاہدین کے بچھڑنے کا بے حد صدمہ تھا۔ ان کے وہ ساتھی جو طویل عرصے سے ان کے

شانہ بشانہ روسیوں کے خلاف لڑ رہے تھے' جو شمال کے سفر میں ان کے ساتھ تھے' جو کارا داغ کی فلک بوس اور برف پوش چوٹیوں پر ان کے ساتھ تھے' جنہوں نے ہر مصیبت کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا تھا' اب بے حس و حرکت ان کے سامنے پڑے تھے۔

آدم درانی کا خون کھول رہا تھا۔ ایک لمحے کو تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ ان تمام روسی قیدیوں کو قتل کردے یا انہیں اتنی اذیتیں دے کہ وہ نہ مرسکیں اور نہ زندہ رہ سکیں۔ نور شریفی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی' اس نے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں سے اس کے خیالات پڑھ لیے۔

"نہیں" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

آدم درانی جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے قیدیوں کی طرف دیکھا' خوف و دہشت سے ان کی بُری حالت تھی' بعض تو باقاعدہ کانپ رہے تھے۔

آدم درانی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ اس کے مرنے والے ساتھیوں کے چہرے چادروں سے ڈھکے ہوئے تھے' وہ چادریں اٹھا اٹھا کر باری باری سب کے چہرے دیکھتا رہا۔

"کاراکش! یہ شہادت کے رُتبے پر فائز ہو چکے ہیں" یہ کریمہ کی آواز تھی جس نے اس کی آنکھوں میں بہتے ہوئے آنسو دیکھ لئے تھے۔ "آج میں نے سات کافروں کو اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کیا ہے کمانڈر! اور میرے خیال میں مجھ جیسی عورت کے لیے یہ کافی ہے۔"

کریمہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی' نور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کریمہ جان! ہمارا مقصد قتل و غارت ہرگز نہیں ہے۔ ہم تو اپنے ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہوا ہے' ہمیں بھول جانا چاہیے"

"ابھی نہیں!" کریمہ تن گئی۔ "ابھی تو ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ اپنی سرزمین کو دشمن کے ناپاک قدموں سے بالکل صاف کرنا ہے"

○☆○

مجاہدین نے زخمی روسیوں کو ایک قطار میں لٹا دیا تھا اور اب شہر سے طبی امداد کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک نور شریفی کی نظریں ایک پستہ قامت روسی کے جی پی آفیسر کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا لباس صاف ستھرا تھا اور وہ زخمی بھی نہیں تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے زمین پر پڑے ہوئے زخمی روسیوں کے بیچ میں ٹہل رہا تھا۔ وہ شخص ہر زخمی کے قریب رُک جاتا اور جھک کر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال زخمی کی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیتا' پستول پر سائیلنسر لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے کسی کو فائر کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اس پستہ قامت روسی کے کندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا' جس میں پستول کے میگزین بھرے ہوئے تھے۔ آٹھ زخمیوں کو اسی طرح موت کی نیند سُلانے کے بعد اس کا پستول خالی ہو گیا۔ اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک نیا میگزین نکالا اور بڑی پھرتی سے پستول کا میگزین تبدیل کر کے خالی میگزین تھیلے میں رکھ لیا۔

نور چیختی ہوئی اس کی طرف دوڑی اور تقریباً دس بارہ فٹ دور ہی سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ پستہ قامت روسی نے نور کو چھلانگ لگاتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے بھی پستول اٹھاتے ہوئے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

"رک جاؤ!" وہ چیخا۔ اس کے لہجے میں دھمکی نمایاں تھی۔

اسی دوران آدم درانی بھی اس کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ درانی کا کراٹے کا ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا اور وہ شخص زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور ریت پر جا گرا تھا۔ آدم درانی نے آگے بڑھ کر اس شخص کو زمین سے اٹھا کر اس طرح جھٹکے دیے جیسے وہ کوئی بے جان چیز ہو۔

"اسے اس طرح جھٹکا دینا ضروری ہے ورنہ کراٹے کے لگنے والے ہاتھ سے یہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائے گا۔" درانی نے کہا پھر اس نے روسی کو زمین پر لٹا دیا اور اس کی بیلٹ کھول کر اس کے ہاتھ پُشت پر باندھنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ انگریزی میں بڑبڑا رہا تھا۔

روسی حواس میں آچکا تھا اور انگریزی سمجھتا تھا۔ وہ نفرت بھری نظروں سے درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ذلیل فاشسٹ.... انگریز مداخلت کار....."

"اگر دنیا کو یہ بتایا جائے کہ تم نے اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کیا ہے تو شاید کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ کہانی ہم نے گھڑی ہے۔" آدم درانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اگر میں انہیں ختم نہ کرتا تو تم اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیتے۔ میں نے انہیں اذیتوں سے نجات دلائی ہے۔" روسی نے جواب دیا۔

"ہم ایسا کبھی نہ کرتے۔ قیدیوں کو اذیتیں دینا تم لوگوں کا کام ہے' ہم ایسا نہیں کرتے۔" آدم درانی نے جواب دیا۔

"اگر تم ایسا نہ کرتے تو ریڈ آرمی میں جانے کے بعد انہیں گولی ماردی جاتی۔" روسی نے کہا۔

"گولی ماردی جاتی؟" درانی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ جب کوئی روسی فوج میں بھرتی ہوتا ہے تو اس سے یہ تحریری طور پر عہد لیا جاتا ہے کہ پکڑے جانے کی صورت میں' خواہ وہ زخمی ہو' خودکشی کرلے گا لیکن انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔" روسی نے بتایا۔

نور کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن اس کے یقین نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا

تھا۔ دنیا میں یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟" آدم درانی نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر بٹھا دیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ عام فوجیوں کے برعکس اس کے بال خاصے لمبے تھے لیکن شاید پولیٹیکل پولیس ایسی باتوں سے مستثنیٰ تھی۔

"نہیں افغان دہشت گرد یا انگریز یا تم جو کوئی بھی ہو، ہم پاگل نہیں ہیں۔" روسی کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔

"اوہ!" آدم درانی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

"جس طرح تمہیں اپنے ملک سے محبت ہے، اسی طرح ہم بھی روس سے محبت کرتے ہیں۔ ہم پارٹی کے احکامات کے تابع ہیں اور پارٹی اپنے عوام کی خدمت میں کوشاں ہے۔" روسی نے کہا۔

"خدا تم لوگوں کی مدد کرے۔" نور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"مجھے قتل کردو افغان دہشت گرد۔" روسی، نور کی بات نظر انداز کرتے ہوئے چیخا۔ "میں جانتا ہوں، تم مجھے اذیتیں دے کر مارو گے۔ میں بزدل نہیں ہوں۔"

"اس قیدی کو بھی دوسروں کے ساتھ شہر لے جاؤ۔" آدم درانی نے دو مجاہدین کو اشارہ کیا۔ "اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ تمام قیدی ہمارے پاس امانت ہیں۔" وہ نور کی طرف گھوم گیا۔ "خدا انسان کو انسان بننے کی توفیق دے۔"

○☆○

پائندہ گل کا لشکر۔ قندھار ائرپورٹ
۸ بجے صبح

پشتون تین مرتبہ ائرپورٹ پر روسیوں کا دفاع توڑ چکے تھے۔ صبح صادق کے وقت وہ اس علاقے پر حملہ آور ہوئے جہاں خوراک کا ذخیرہ کیا گیا تھا۔ مشین گنوں کے جوابی فائر سے پہلے وہ مُہر بند ڈبوں میں خوراک کا بہت بڑا ذخیرہ لوٹ کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس حملے میں انہیں اپنے پچاس آدمیوں کی قربانی دینی پڑی تھی۔

اب سورج نکل آیا تھا۔ پانچ پانچ جانبازوں پر مشتمل ٹولیاں روسیوں پر مسلسل حملے کر رہی تھیں۔ ایک پارٹی نے الیکٹرک جنریٹر روم پر حملہ کیا جبکہ دوسری پارٹی نے پچیس میل دور غنداب ٹرائن سے پاور فراہم کرنے والی ہائی ٹینشن لائن کاٹ ڈالی۔ ایک اور جانباز پارٹی نے ائرپورٹ کا ڈیزل ڈپو اُڑا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی ساؤنڈ پروف عمارت ہوا میں اُڑ گئی تھی۔

ان جانبازوں کی سب سے بڑی کامیابی ائرپورٹ پر کھڑے ہوئے ہوائی جہازوں پر حملہ تھا۔ اس وقت ائرپورٹ پر پچاس سے زیادہ فائٹر اور بمبار طیارے کھڑے تھے۔ جانبازوں نے ہیڈ گرنیڈز سے ان طیاروں کے کاک پٹ اور لینڈنگ گیئر تباہ کر دیے تھے۔ خلیل اور پائندہ گل بھی اس کارروائی میں شریک تھے۔ یہ ہوائی اڈہ اس قدر بڑا تھا کہ روسیوں کے لیے بیک وقت ائرپورٹ کی عمارت اور جہازوں کی حفاظت کرنا ممکن نہیں تھا۔

○☆○

ریڈیو پر قندھار کی مجاہد تنظیم سے بات کرتے ہوئے یہ خوش خبری بھی مل گئی کہ شہر پر ہونے والا روسیوں کا حملہ ناکام بنا دیا گیا ہے۔ خلیل کسی طرح ایگل سے بھی رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے مختصر سی گفتگو کے دوران آدم درانی کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کس طرح پائندہ گل کے لشکر میں شامل ہوا تھا۔

"کاراکش! خدا تمہیں سلامت رکھے۔ ہم انہیں یہاں ائرپورٹ پر روکے ہوئے ہیں لیکن ہم انہیں ختم نہیں کر سکتے۔ اب دن کی روشنی پھیل چکی ہے۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر شنداد ائرپیس سے طیارے طلب کر سکتے ہیں۔ اگر تمہارے پاس آدمی اور کافی اسلحہ موجود ہے تو کیا یہاں آکر ہماری مدد کر سکتے ہو؟ اس وقت یہاں مکمل خاموشی ہے، کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں ہو رہی۔"

"ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں، ساڑھے آٹھ بجے تک تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں لیکن ہمارے پاس اینٹی ائرکرافٹ گنیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس ایسی چند گنیں موجود ہیں۔ تمہاری طرف سے کسی بھی قسم کی مدد ہمارے لیے حوصلے کا باعث ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، ہم پہنچ رہے ہیں۔" آدم درانی ریڈیو آف کر کے قاسم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"قاسم! اپنے اور قندھاریوں کے تمام آدمیوں کو جمع کر لو اور حکم دو کہ جو بھی گاڑی دستیاب ہو، اس پر سوار ہو کر ائرپورٹ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ ائرپورٹ یہاں سے صرف اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہمیں روسی فوج یا ائرفورس کے آنے سے پہلے ان عفریتوں کو ہر صورت میں روکنا ہے۔"

ائرپورٹ پر پائندہ گل نے اپنے تمام کمانڈروں کو جمع کر لیا۔ "قندھار سے عقاب کمک لے کر پہنچ رہا ہے۔ ان "بحری عفریتوں" ہوور کرافٹس پر حملہ کرنے کی تیاری کرو۔ اب روسیوں کو حقیقی سزا دینے کا وقت آگیا ہے۔"

○☆○

ہرات سے صرف پچھتر میل جنوب میں ویسٹ اینڈ ساؤتھ ائر کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر شنداد ائرپیس روسی جنگی طیاروں سے بھرا پڑا تھا۔ نویں ائرفلیٹ کو گزشتہ رات سے کابل کے ذریعے قندھار سے متعلق متضاد اور عجیب و غریب اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ بالآخر کابل کے شمال میں بگرام پیس کے کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے ائرفورس کے اپنے ریڈیو نیٹ ورک پر رابطہ قائم ہو گیا۔ شنداد ائرپیس کے کمانڈنگ جنرل کو اسکی کو ہیڈ کوارٹر سے حکم ملا کہ جتنے بھی جنگی طیارے دستیاب ہیں، انہیں فوری طور پر قندھار کی طرف روانہ

کردیا جائے۔

"قندھار شہر کو نظرانداز کرتے ہوئے انٹرنیشنل ائرپورٹ کا محاصرہ کرنے والے افغان دہشت گردوں کو چُن چُن کر ختم کردیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ائرپورٹ پر موجود خفیہ طیاروں "ہوورکرافٹس" کی ہر ممکن حفاظت کی جائے۔"

بگرام کمانڈ ہیڈ کوارٹر کے احکامات بالکل واضح تھے۔ شنداد بیس سے ٹیک آف کرنے والا پہلا فلیٹ MIG - 23 میکویان طیاروں پر مشتمل تھا جو مغرب میں فلاگر کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ان طیاروں میں R 29 B توماسکی انجن نصب تھے جو چھ ہزار پونڈ وزنی بم لے کر آواز سے ڈھائی گنا رفتار سے پرواز کرسکتے تھے۔ قندھار، شنداد سے صرف تین سو پچاس ناٹیکل ہوائی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ طیارے کا آپریشنل ریڈیس صرف پانچ سو میل تھا اور اس میں ڈسٹ فلٹر کے استعمال اور انجنوں کو پاور سپلائی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان طیاروں کے پائلٹ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر زیادہ سے زیادہ رفتار حاصل کرنے کے لیے آفٹر برنرز کو آن کردیا جائے تو اتنا زیادہ فیول خرچ ہوگا کہ وہ اپنے بیس پر واپس نہیں آسکیں گے اس لیے قندھار کی طرف ٹیک آف کرتے ہوئے کم سے کم تیل استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

"پندرہ طیاروں پر مشتمل پہلا فلیٹ قندھار کے لیے ٹیک آف کرچکا ہے۔" جنرل کوالسکی نے بگرام ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ دی۔

"قندھار ائرپورٹ پر دہشت گردوں کا محاصرہ ختم کرنے کے لیے اگر تمام طیاروں کی ضرورت پڑے تو بھیج دو۔ اوور....." چند لمحے خاموشی رہی پھر مزید کہا جانے لگا جسے جرنل کوالسکی توجہ سے سنتا رہا۔ جو کچھ بھی کہا گیا تھا، اس کا مطلب یہی تھا کہ قندھار میں موجود آرمی کی مدد کے لیے ہر ممکن اقدام کیا جائے۔

جنرل کوالسکی کے پاس رن وے پر ساٹھ عدد MIG 23 اور دس عدد MIG-17 طیارے موجود تھے لیکن ان طیاروں کے فیول ٹینک چھوٹے تھے۔ وہ شنداد سے پرواز کرکے قندھار پر مجاہدین کے خلاف چند منٹ کی کارروائی کرنے کے بعد شنداد یا ہرات بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جنرل کوالسکی نے ان طیاروں کو آپریشنل زون سے ہٹا لینے کا حکم دیا۔ ان کے علاوہ جنرل کے پاس پندرہ طیارے ایسے تھے جو اس مشن کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتے تھے لیکن ان میں بھی دس طیارے تیار تھے جبکہ پانچ کی سروس وغیرہ ہو رہی تھی۔ اس نے ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ پیش کردی۔

"پندرہ طیارے ہیں کامریڈ جنرل۔ دس آپریشنل اور پانچ زیرِ سروس ہیں۔"

"دس طیارے کافی نہیں ہوں گے۔ باقی پانچ طیاروں کو دوبارہ چیک کرو۔ میکینکس سے کہو کہ کم سے کم تین طیاروں کو فوری طور پر قابلِ استعمال بنائیں۔ یہ جنگ ہے، پکنک نہیں۔" ہیڈ کوارٹر سے جواب ملا۔ جنرل کوالسکی طویل عرصے سے ائرفورس سے وابستہ تھا۔ وہ روسی میکینکس سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ لوگ شیخیاں بہت بگھارتے تھے مگر عملی طور پر بہت پھسڈی تھے۔

فلاگر طیاروں کو سینٹرل ایشیا میں پہلے ہی آزمایا جا چکا تھا۔ ناٹو میں شامل مغربی ممالک کے فائیٹر طیاروں کے مقابلے میں ان کی کارکردگی بہت اچھی تھی۔ حکم ملتے ہی یہ طیارے رن وے سے ٹیک آف کرتے ہی پچاس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے۔ ہر طیارے پر تین ہزار کلوگرام وزنی بم اور دیگر تباہ کن دھماکا خیز مادّہ لدا ہوا تھا۔

یہ طیارے جب قندھار کے مغرب میں اسّی ناٹیکل میل کے فاصلے پر واقع لشکرگاہ نامی شہر کی فضا میں پہنچ کر چھ ہزار فٹ کی بلندی پر آئے تو انہیں زبردست ہوا کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کالی آندھی تھی۔ ایرانی سرحد میں حامون جھیل کے ساحلی علاقے سے شروع ہونے والی یہ خوفناک آندھی قندھار کے شمال اور مشرق میں واقع پہاڑی سلسلوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ ایک سو دس میل سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے چلنے والی یہ آندھی زمین سے آسمان تک ریت کی دبیز چادر پھیلا دیتی۔ بیشتر مکانوں کی چھتیں اُڑ جاتیں، تناور درخت جڑوں سے اُکھڑ جاتے اور انسانوں اور مویشیوں تک کو اپنے ساتھ اڑا کرلے جاتی۔

روسی طیاروں کے ائرانٹیکس پر اگرچہ فاضل فلٹر لگے ہوئے تھے لیکن وہ بھی ریت کو انجنوں میں داخل ہونے سے نہ روک سکے۔ ائرپورٹ کے قریب پہنچتے تک چھ فلاگر طیارے پوری طرح مصیبت میں گرفتار ہوچکے تھے۔ طاقتور توماسکی انجن بار بار کھانس رہے تھے۔ پائلٹ، انجنوں سے ریت نکالنے کے لیے بار بار آفٹر برنرز کے سوئچ آن کررہے تھے لیکن آفٹر برنرز کو زیادہ سے زیادہ حرارت حاصل کرنے کے لیے چھ سیکنڈ ضرور لگتے ہیں۔ کالی آندھی میں گھرنے کے چند منٹ بعد ہر قسم کا موسم برداشت کرنے کی صلاحیت رکھنے والے وہ چھ کے چھ MIG-23 طیارے ریگستان میں ٹکڑوں کی صورت میں بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے کسی پائلٹ کے پاس پیراشوٹ نہیں تھی۔ ان پائلٹوں کے جسمانی اعضا بھی ریگستان میں بکھر گئے تھے۔

باقی نو طیارے تند ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے کسی طرح ائرپورٹ کی فضا میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ زمین سے آسمان تک پھیلے ہوئے ریت کے بادلوں کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ فضا میں دو چکر لگانے کے بعد ان طیاروں کے پائلٹ بمشکل ائرپورٹ کو دیکھ سکے۔ انہیں کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ہائی کمان کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے انہوں نے کلسٹر بموں کی بارش شروع کردی۔ ہر بم میں ہزاروں کی تعداد میں فولادی سوئیاں، بال بیرنگ اور ایسی ہی خطرناک چیزیں تھیں۔ ریت کے ٹیلوں پر ہزاروں کی تعداد میں گرنے والے یہ کلسٹر بم خوفناک دھماکوں سے پھٹنے لگے۔

ان مگ طیاروں کی آمد سے تین منٹ پہلے ریت کے طوفان نے افغان مجاہدین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی تھی۔ مجاہدین سخت ریت والے ٹیلوں کے پیچھے آڑ لے چکے تھے۔ ریت نے مجاہدین کے ٹرکوں اور ان کی دیگر گاڑیوں کو بھی ڈھک لیا تھا۔ اس طرح انہیں قدرتی طور پر کیموفلاج مل گیا تھا اور انہیں فضائی حملوں سے تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔

طیاروں سے برسائے جانے والے کلسٹر بم کسی سخت چیز یا زمین کی ٹھوس سطح سے ٹکرانے کے بعد پھٹتے تھے لیکن یہاں نرم ریت ہونے کی وجہ سے یہ بم کافی گہرائی میں دھنس کر ڈیٹونیٹ ہوتے۔ ریت میں دھنسنے کی وجہ سے ان کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوتی اور وہ صرف ریت کے بادل ہی اڑا کر رہ جاتے۔

تیز ہوا کی سائیں سائیں اور دور آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے بگولوں کو دیکھ کر مجاہدین سمجھ گئے تھے کہ اب کالی آندھی یا ریت کا طوفان آنے والا ہے۔ انہوں نے اپنی گنوں کو ریت سے بچانے کے لیے ہر ممکنہ حد تک ڈھک لیا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اگرچہ فضا میں طیاروں کی گڑگڑاہٹ سن لی تھی لیکن وہ ریت کی وجہ سے اپنی طیارہ شکن توپیں لوڈ نہیں کر سکتے تھے۔

مجاہدین ریت کے ٹیلوں کے پیچھے دبکے طوفان کے گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔

○☆○

عقاب کی فوجی یونٹ ائرپورٹ سے تقریباً تین میل دور تھی کہ انہیں کالی آندھی نے آلیا۔ ریت کا پہلا حملہ ہوتے ہی مجاہدین نے ٹرکوں سے چھلانگ لگا دی تھی اور وہ ہوا کے رخ پر زمین پر لیٹ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے کپڑوں سے ڈھانپ لیے تھے تاکہ گولیوں کی طرح ٹکراتے ہوئے ریت کے ذروں سے محفوظ رہ سکیں۔

آدم درانی نے بھی چہرے پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ طوفان کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اب گاڑیوں کے انجن اسٹارٹ ہو بھی سکیں گے یا نہیں۔ اگر ٹرکوں کے انجن اسٹارٹ نہ ہوتے تو انہیں تین میل کا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا پڑتا اور یہ فاصلہ کم از کم ایک گھنٹے میں طے ہوتا اور اس طرح ظاہر ہے' انہیں اپنی منزل پر پہنچنے میں بہت دیر ہو جاتی۔

مگ طیاروں نے تین چکر اور لگائے۔ ہر چکر میں وہ بموں کی بارش کرتے رہے۔ بالآخر ان کے فیول ڈائل پر سرخ روشنی کا نقطہ چمکنے لگا۔ چمکتا ہوا یہ سرخ نقطہ اس بات کی علامت تھا کہ ٹینک میں فیول ختم ہو رہا ہے۔

پائلٹوں کو نیچے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ قندھار ائرپورٹ پر لینڈ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ نہ صرف رن وے ان کی نگاہوں سے اوجھل تھا بلکہ ائرپورٹ کا ریڈیائی مواصلاتی نظام بھی تباہ ہو چکا تھا اور وہ کنٹرول سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے شنداد بیس کو صورت حال سے آگاہ کر دیا جہاں سے جنرل کوالسکی نے انہیں واپسی کا حکم دے دیا۔

عقاب اور پائندہ گل کے آدمیوں نے بھی طیاروں کے آخری چکر کی گرج سن لی تھی۔ ان طیاروں کی دور ہوتی ہوئی آواز سے انہیں یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اب یہ طیارے اپنے بیس کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ انجنوں میں ریت بھر جانے کی وجہ سے ان طیاروں کی رفتار میں بیس فیصد کمی آگئی تھی۔

ریت کا طوفان دو گھنٹوں تک جاری رہا۔ تاریکی اس قدر گہری ہو گئی تھی کہ چند انچ کے فاصلے کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی لیکن اب ہوا کی رفتار بتدریج کم ہو رہی تھی اور ریت میں بھی کمی آرہی تھی۔

ائرپورٹ کی حدود میں روسی فوجی کھانستے پھر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ریت کے اس شدید طوفان میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ رن وے پر ریت کے لاتعداد چھوٹے چھوٹے ٹیلے وجود میں آچکے تھے۔ وہ خود بھی ریت سے بھوت بنے ہوئے تھے۔ ریت کی وجہ سے ان کے ہتھیار بیکار ہو کر رہ گئے تھے۔ تیز ہوا سے ان کی وردیاں تک پھٹ گئی تھیں اور اب وہ روسی ان لمحات کو کوس رہے تھے جب فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔

ائرپورٹ سے تین میل دور آدم درانی اور اس کے آدمی ٹرکوں کے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انجنوں میں ریت اس طرح بھر گئی تھی کہ آدھے سے زیادہ ٹرک بیکار ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے ناکارہ ٹرک وہیں چھوڑ دیے اور باقی ٹرکوں میں بیٹھ کر آگے روانہ ہو گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ لوگ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پائندہ گل اور خلیل نے اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر رکھا تھا۔

پائندہ گل اور مریم اپنے ٹرک میں بھری ہوئی ریت صاف کر رہے تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ان کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ آدم درانی کے قافلے کو دیکھ کر وہ اپنا کام چھوڑ کر ان کی طرف آگئے۔ دوسری طرف سے خلیل بھی پہنچ گیا۔

"خوش آمدید کاراکش!" پائندہ گل نے بڑی گرمجوشی سے آدم درانی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"پائندہ گل!" آدم درانی نے اسے گلے سے لگا لیا پھر بولا۔ "ہم حالت جنگ میں ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر روسیوں کے اگلے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری شروع کر دینی چاہیے۔ یا یہ سوچنا چاہیے کہ ائرپورٹ پر قبضہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ وقت ضائع کرنا ہمارے لیے خطرناک ہو گا۔ اگر روسیوں کو تازہ کمک پہنچ گئی تو ہم گھیرے میں آجائیں گے اور پھر شاید ہمارے لیے یہاں سے زندہ بچ نکلنا مشکل ہو جائے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" پائندہ گل نے کہا۔ "آؤ' بیٹھ کر پلاننگ

کرتے ہیں کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ پائندہ گل کے ٹرک میں بیٹھے اگلے مرحلے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

○☆○

قندھار ائرپورٹ کے شمال میں

۱۶ ستمبر۔ ۱۰ بجے صبح

ڈویژنل جنرل زغروف قندھار ائرپورٹ سے تیس میل دور شمال مغرب میں اپنے ائرکنڈیشنڈ کاروان ٹرالر میں بیٹھا بار بار نقشے دیکھ رہا تھا۔

"کیپٹن مسکین! مجھے تو یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم میدان جنگ میں کوئی کارنامہ انجام دے کر بہادری کا تمغہ حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"تو سر۔ کیپٹن مسکین' جنرل کی اجازت سے کچھ رضا کاروں کو لے کر ائرپورٹ کے قریب وہ خلا پُر کر کے افغان دہشت گردوں پر ایسی کاری ضرب لگانا چاہتا ہے کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔" اس کے سامنے کھڑے ہوئے نوجوان کیپٹن نے جواب دیا۔

جنرل زغروف' کیپٹن مسکین کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا اور اس کے خیال میں جنرلوں کو کیپٹن قسم کے افسروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وقت ضائع کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے گہری نظروں سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے کیپٹن کی طرف دیکھا۔ مسکین پارٹی کا ممبر نہیں تھا لیکن وہ ایک ذہین اور باصلاحیت آفیسر تھا لیکن اس کا منصوبہ بہت خطرناک تھا۔

"تمہاری قومیت کیا ہے مسکین؟"

روسی فوج کے قواعد و ضوابط کے مطابق ایک جونیئر آفیسر کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی جنرل سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے لیے تھرڈ پرسن کا صیغہ استعمال کرے۔ مسکین نے بھی یہ ڈسپلن برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیپٹن رپورٹ پیش کرتا ہے گوسپوڈین جنرل! مسکین کا تعلق ترکمانستان میں بحیرۂ کیسپئن کے ساحلی شہر کراسنو واڈک سے ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم ان لوگوں کو ہم سے بہتر جانتے ہو۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ ایک طرح سے تمہارے کزن ہوئے؟" جنرل نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"روسی فوج' دہشت گردوں اور بیرونی مداخلت کاروں کے خلاف افغان سوشلسٹ حکومت کی مدد کرنے کے لیے افغانستان آئی ہے سر!"

"بہت خوب کیپٹن!" جنرل زغروف نے پسندیدگی کے انداز میں سر ہلایا۔ "اب ہم ذرا تمہارا یہ منصوبہ دیکھتے ہیں۔ اگر یہ منصوبہ مجھے پسند آگیا تو میں تمہیں رضا کار جمع کرنے کی اجازت دے دوں گا۔ اس پلان کے مطابق اگر تم موٹر دے کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف سے ہوتے ہوئے ان کھنڈروں اور ٹیلوں پر قبضہ کر لو تو دہشت گردوں کے پہلو پر واقعی کاری ضرب لگا سکتے ہو۔"

وہ کچھ دیر تک اس منصوبے پر بحث کرتے رہے اور بالآخر کیپٹن مسکین کو اس منصوبے پر عمل درآمد کی اجازت مل گئی۔

○☆○

گیارہ بج کر پندرہ منٹ

افغان گوریلوں اور ان کے پشتون اتحادیوں نے ائرپورٹ کو محاصرے میں لے رکھا تھا لیکن روسی ٹینک اور ۳۴۶ واں موٹر رائفل ڈویژن' افغان مجاہدین کو کچلنے کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ گوریلوں نے اگرچہ ائرپورٹ کے محافظوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا لیکن ان کی تعداد کم تھی اور وہ چھدرے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے لیے کمک یا فرار کا راستہ صرف مشرق کی طرف تھا اور کیپٹن مسکین اس راستے کو بلاک کرنے کا منصوبہ لے کر جنرل زغروف کے پاس پہنچا تھا۔

آدم درانی کے اسکاؤٹ اسے ایک ایک لمحے کی اطلاعات پہنچا رہے تھے اور یہ اطلاع اس کے لیے خاصی تشویش ناک تھی کہ روسی بکتر بند گاڑیاں فرار کا یہ راستہ مسدود کرنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔

آدم درانی کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ وہ فوری طور پر اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پچاس میل کے حلقے میں تمام بستیوں' دیہاتوں اور قصبوں کو پیغامات بھیجے جا چکے تھے کہ وہ رضا کار بھیجیں تاکہ متوقع روسی حملے کا مقابلہ کیا جا سکے۔

خلیل اور پائندہ گل کے پاس مناسب تعداد میں آدمی اور اسلحہ موجود تھا تاکہ وہ مغرب کی طرف سے ہرات روڈ بلاک کر سکیں۔ جنوب کا علاقہ دریا کی وجہ سے کسی حد تک محفوظ تھا لیکن ائرپورٹ کے محصورین کو باہر آنے سے روکنے کے لیے رضا کاروں کی ڈیوٹی لگائی جا سکتی تھی۔ ان کے پاس اب روسیوں سے چھینے جانے والے ہتھیار موجود تھے اور وہ لوگ خاصی ٹریننگ بھی حاصل کر چکے تھے۔ شمال کی طرف خندقیں کھود کر غیر تربیت یافتہ پشتونوں اور افغانوں کو بٹھا دیا گیا تھا اور اگر قرب و جوار کے دیہاتوں سے کوئی کمک پہنچنے سے پہلے ہی مشرقی راستہ بلاک کر دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لڑتے لڑتے جان دے دو۔ آدم درانی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت اسے زیادہ سے زیادہ آدمیوں اور گاڑیوں کی ضرورت تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے افغان لیفٹیننٹ کو طلب کر لیا۔

"طورا! جتنے بھی گرنیڈ' رائفلیں' آدمی اور ٹرک لے جا سکتے ہو' لے جاؤ۔ تمہیں کوشش یہ کرنی ہے کہ روسیوں کے پہنچنے سے پہلے پہلے مشرقی کھنڈروں پر قبضہ کر لو۔ اطلاع کے مطابق بکتر بند

گاڑیوں پر آنے والے روسیوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں۔ اگر تم ان کھنڈرات اور ٹیلوں پر قابض ہو کر راستہ کھلا رکھ سکو تو یہ بڑی اچھی بات ہوگی۔ بصورتِ دیگر واپس آجانا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اللہ تمہارا حافظ و ناصر ہو۔"

لیفٹیننٹ طورا نے سیلوٹ کیا اور چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو جمع کرنے لگا۔ "میرے مجاہدو! جلدی کرو۔ تیار ہو جاؤ....."

تقریباً اسی وقت آدم درانی نے اس فوجی قافلے کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ مشرق کی طرف سے پختہ سڑک سے اتر کر اس طرف آنے والی ان روسی بکتر بند گاڑیوں کی تعداد نو تھی۔ ان گاڑیوں کے ریڈیو ایریلز پر سفید جھنڈے لہرا رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے فوج کا یہ یونٹ ہتھیار ڈالنے آرہا ہو۔ آدم درانی کے اندازے کے مطابق ان بکتر بند گاڑیوں میں سوار روسی فوجیوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ کوئی چال نہ ہو اور اگر کوئی چال ہوئی تو بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

آدم درانی نے گوریلوں کو اشارہ کیا کہ ان بکتر بند گاڑیوں کو آگے آنے دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گرنیڈ اسکواڈ اور نشانچیوں کو ائرپورٹ کی طرف جانے والے فیڈر روڈ پر پوزیشن سنبھالنے کا حکم دے دیا۔

"ان پر بھروسہ مت کرنا۔" آدم درانی نے کہا۔ "اگر ذرا بھی گڑبڑ محسوس کرو تو کسی حکم کا انتظار کیے بغیر فائر کھول دینا۔"

بکتر بند گاڑیاں مسلسل آگے بڑھ رہی تھیں۔ اب ان کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ یہ تمام گاڑیاں ریت کے رنگ سے کیموفلاج تھیں اور سامنے کے رخ پر روس کا قومی نشان، سرخ ستارہ بنا ہوا تھا۔ بظاہر کوئی ہتھیار نہیں نظر آرہا تھا لیکن تمام فوجی مکمل فوجی کٹ میں تھے۔ سروں پر فولادی ہیلمٹ بھی نظر آرہے تھے۔

سب سے آگے والی گاڑی میں ایک نوجوان، خوبرو اور دراز قامت آفیسر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ہتھیلیاں سامنے کی طرف تھیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اپنے آپ کو سرنڈر کر رہا تھا۔ اس کے کالر پر سوویت موٹرائزڈ ڈویژن کا مخصوص نشان اور سرخ ستارہ چمک رہا تھا۔ کندھوں پر پتلی سی سرخ پٹی پر چمکتے ہوئے چار ستارے بتا رہے تھے کہ وہ کیپٹن ہے۔

گاڑی رکتے ہی وہ چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا اور متجسس نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گوریلوں کو مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھالے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں یا چہرے پر خوف کے معمولی سے تاثرات بھی نہیں ابھرے تھے۔

"تمہارا لیڈر کہاں ہے؟" اس نے دری زبان میں پوچھا۔

"میں کاراکش ہوں۔ یہاں کا انچارج۔" آدم درانی دو قدم آگے بڑھ آیا۔

نوجوان سوویت آفیسر نے کھٹ سے سیلوٹ کیا۔ "۳۴ ویں ڈویژن کا کیپٹن کرٹ مسکین اپنے دو سو آدمیوں کے ساتھ جن میں لیفٹیننٹ، این سی او اور جوان شامل ہیں، رپورٹ پیش کرتا ہے کمانڈر سر!"

"رپورٹ! تمہارا مطلب ہے کہ تم ہتھیار ڈال رہے ہو؟" آدم درانی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیپٹن مسکین اور اس کے آدمی کمانڈر کی طرف سے حربی فرائض کی انجام دہی کے لیے احکامات کے منتظر ہیں سر!" کیپٹن نے کہا۔

آدم درانی نے گاڑیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں تمام فوجی خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا تم سب بھگوڑے ہو؟"

"ہم اپنی فوج سے منحرف ہو چکے ہیں سر!"

"کیا تم سب روسی ہو؟"

"میں ترکمانی ہوں۔ اگرچہ میرے ساتھیوں میں بیشتر روسی ہیں لیکن ان کا تعلق مختلف قومیتوں سے ہے سر۔" کیپٹن مسکین نے جواب دیا۔

آدم درانی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ کلاں توت کی جھڑپ میں جو روسی فوجی پکڑے گئے تھے وہ ابھی تک مجاہدین کے ساتھ تھے اور مختلف موقعوں پر انہوں نے مجاہدین سے اپنی وفاداری ثابت کر دی تھی لیکن اب ان میں سے بیشتر آدم درانی سے چھٹی لے کر اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتے تھے اور اب قدرت نے ان کی جگہ لینے کے لیے ایک نئی کھیپ بھیج دی تھی۔

"کیپٹن مسکین!" آدم درانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو، ہم پر عنقریب ایک بہت بڑا حملہ ہونے والا ہے۔ ایسی صورت حال میں ہم کسی احتیاطی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جنگ میں حریف کو شکست دینے کے لیے بہت سی چالیں چلی جاتی ہیں۔ بہرحال، تم میرے ساتھ بنکر میں آؤ۔" آدم درانی اسے اپنے ساتھ ایک زیرِ زمین مورچے میں لے گیا۔ "تمہارے خیال میں ہم تمہارے آدمیوں کو زیادہ مؤثر طور پر کس طرح استعمال کر سکتے ہیں؟"

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ۔" کیپٹن مسکین نے کہا۔ "اپنے آدمیوں سے کہیے، ہمیں اپنی گاڑیاں مختلف جگہوں پر پھیلا کر انہیں کیموفلاج کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے بعد میں آپ سے تفصیل سے بات کروں گا۔"

آدم درانی نے اپنے آدمیوں کو بلا کر انہیں بکتر بند گاڑیوں کے سلسلے میں ہدایات جاری کر دیں۔ کیپٹن مسکین نے مطمئن ہو کر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا تعلق تین مختلف کمپنیوں سے ہے اور تمام آدمی رضا

کارانہ طور پر اس گروپ میں شامل ہوئے ہیں۔ میں اور دو لیفٹیننٹ کئی مہینوں سے یہ منصوبہ بنا رہے تھے۔ سب سے پہلے تو ہم نے بڑی احتیاط سے یہ معلوم کیا کہ ہماری رجمنٹ کے کون کون سے آدمی منحرف ہونا چاہتے ہیں پھر ہم نے انہیں مطلع کردیا کہ ہم منصوبہ بنا رہے ہیں اور وقت آنے پر انہیں بتا دیا جائے گا۔ انہیں یہ ہدایات بھی دے دی گئی تھیں کہ جب کسی مخصوص مشن کے لیے رضا کارانہ طور پر خدمات کے لیے کہا جائے تو وہ لوگ اپنا نام پیش کردیں۔ اس طرح آج ہمارا یہ منصوبہ کامیاب ہوگیا۔"

"بہت خوب!" آدم درانی نے مسکراتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"اور اب۔" کیپٹن مسکین بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اس منصوبے کو مزید طویل دے سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" آدم درانی نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا منصوبہ یہ ہے کہ میں ریڈیو پر جنرل کو یہ پیغام دوں کہ ہم نے کھنڈرات پر تو قبضہ کرلیا ہے مگر ہم دشمن کے گھیرے میں آگئے ہیں۔ اس طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ جنرل کا منصوبہ کیا ہے۔ مجھے بریف کرتے ہوئے اس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"گڈ۔" آدم درانی مسکرا دیا۔ "پہلے فائرنگ کا ڈراما ہوجائے' اس کے بعد تم ریڈیو پر جنرل سے رابطہ قائم کرنا۔"

آدم درانی کے مجاہدین اور کیپٹن مسکین کے آدمی کچھ دیر تک زبردست ہوائی فائرنگ کرتے رہے' گرنیڈز سے چند دھماکے بھی کیے گئے۔ اس کے بعد کیپٹن مسکین نے اپنے ہیڈ کوارٹر سے ریڈیو پر رابطہ قائم کیا۔ آپریٹر نے بتایا کہ جنرل زغروف خود اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

"کیا صورت ہے کیپٹن مسکین؟" ریڈیو پر جنرل کی آواز سنائی دی۔

"ہم اگرچہ دشمن کے گھیرے میں ہیں لیکن کھنڈرات پر اب ہمارا قبضہ ہے کامریڈ جنرل۔"

"کیا تم دشمن کو پیچھے دھکیل سکتے ہو؟" جنرل نے پوچھا۔

"نہیں جناب' لیکن ہم آپ کے حملے کو کامیاب بنانے کے لیے کچھ دیر یہاں رک سکتے ہیں۔ ہماری لوکیشن ریفرنس نقشے کے مطابق B*B-765-4588 پوائنٹ K ہے۔" مسکین نے کہا۔

"گڈ!" اب میری بات توجہ سے سنو مسکین۔" جنرل کی آواز سنائی دی۔ "ہم دو بج کر تیس منٹ پر شمال کی طرف سے ٹینکوں سے حملہ کریں گے۔ ابھی تقریباً تین گھنٹے کا وقت باقی ہے۔ ہم اپنے ساتھ ملٹی پل راکٹ لانچر بھی لا رہے ہیں۔ ٹینکوں کو آگے بڑھانے سے پہلے دشمن پر انہی ملٹی پل راکٹ لانچروں سے حملہ کیا جائے گا۔ تین سبز فلیئرز کا مطلب ہوگا۔ "راکٹ اٹیک" دو سرخ فلیئرز کا مطلب ہوگا کہ راکٹوں سے حملہ ختم کردیا گیا ہے۔ یہ دوسرا سگنل ملتے ہی تم کھنڈرات سے نکل کر ان دہشت گردوں پر حملہ کردو۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے دستی بموں سے ہمارے ٹینکوں کو کوئی نقصان پہنچے۔"

"سمجھ گیا گوسپوڈین جنرل۔" کیپٹن مسکین نے جواب دیا۔

"گڈ لک مسکین۔ اوور اینڈ آل۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

افغان مجاہدین اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ائرپورٹ کے ملٹری زون میں آٹھ عدد بڑے ہائنڈ ہیلی کاپٹر بھی موجود تھے جو اُن کے خلاف ایکشن لینے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ہرات کے قریب واقع شنداد ائربیس کسی مؤثر کارروائی کے لیے بہت دور تھا۔ مزید برآں شنداد بیس کا کمانڈر اب ان کی کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کابل کے بگرام ہیڈ کوارٹر کو مگ 23 طیاروں کا حشر معلوم ہوچکا تھا اس لیے ہیڈ کوارٹر سے بھی یہ احکامات جاری کردیے گئے تھے کہ مزید کسی طیارے کو کسی کارروائی میں حصہ لینے کے لیے نہ بھیجا جائے۔ قندھار ائرپورٹ کی صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے بگرام ہیڈ کوارٹر کو بہرحال یہ احساس ہوگیا تھا کہ وہاں گوریلوں سے نمٹنے کے لیے انفنٹری کے علاوہ ہیلی کاپٹروں کی بھی ضرورت تھی لیکن مجاہدین نے MI-24 ہیلی کاپٹروں کا جو حشر کیا تھا وہ اس سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ ان کے پاس انفرادی قوت' طیاروں اور ایمونیشن کی کمی نہیں تھی لیکن وہ کوئی فیصلہ کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔

قندھار ائرپورٹ کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے ہیلی کاپٹروں پر مشین گنیں اور فضا سے زمین پر مار کرنے والے میزائل لوڈ کیے جا چکے تھے۔ چونکہ آندھی کے دوران بھی یہ کاپٹر یہیں کھڑے رہے تھے اور خدشہ تھا کہ ان کے انجنوں میں ریت نہ بھر گئی ہو اس لیے قندھار ائرپورٹ ہیلی کاپٹر کمانڈ نے پہلے کاپٹروں کے انجن اسٹارٹ کرکے انہیں چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔

پائندہ گل انجنوں کی آواز سن کر دوڑتا ہوا آدم درانی کے پاس پہنچ گیا۔

"عقاب!" وہ پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "وہ لوگ ڈھائی بجے کا انتظار کرنے کے بجائے فوراً حملہ کرنے والے ہیں۔ ہیلی کاپٹر اسٹارٹ ہو رہے ہیں۔"

"ہیلی کاپٹر!" آدم درانی اٹھ کر اپنے بنکر سے باہر بھاگا۔

خاردار تاروں کے اس پار' جہاں ریت کی بوریوں کی آڑ میں ائرپورٹ کے روسی محافظ دبکے ہوئے بیٹھے تھے' کافی فاصلے پر وہ ہیلی کاپٹر نظر آرہے تھے۔ وہ کاپٹر اگرچہ رائفل کی رینج میں تھے لیکن رائفل یا AA گن کی گولیاں ان MI-24 ہیلی کاپٹروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔

اچانک ہوا میں تیزی آگئی۔ آدم درانی نے آنکھوں پر ہاتھ

رکھتے ہوئے جنوب کی طرف دیکھا۔

"پائندہ گل! اگر ہوا میں مزید تیزی آجائے اور کچھ دیر تک ریت اُڑتی رہے تو یہ ہیلی کاپٹر ٹیک آف نہیں کر سکیں گے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" پائندہ گل ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ ہوا میں اس سے زیادہ تیزی نہیں آئے گی۔ ہمیں کسی مزید طوفان کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے بجائے کچھ اور سوچنا چاہیے۔ میں ذرا قندھاریوں کو دیکھ کر آتا ہوں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

ہوا میں اگرچہ کسی حد تک مزید تیزی آگئی تھی مگر شاید پائندہ گل کا خیال درست ہی تھا۔ ہوا میں تیزی کے باوجود طوفان کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ آدم سوچ رہا تھا کہ اگر ہیلی کاپٹر فضا میں پہنچ گئے تو بڑے اطمینان سے مجاہدین پر گولیوں کی بارش کرتے رہیں گے۔ آدم درانی یہ بھی سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ ان ہیلی کاپٹروں کا جنرل زغروف کی فوج سے کوئی رابطہ تھا یا نہیں؟ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ فوج حملہ آور ہو یا نہ ہو' یہ ہیلی کاپٹر ہی ان کے لیے بہت بڑا خطرہ تھے۔

پندرہ منٹ گزر گئے۔ اگر صرف انجن چیک کرنا مقصود تھا تو اتنا وقت کافی تھا۔ آدم درانی کی نظریں اسی طرف مرکوز تھیں پھر اچانک وہ ہیلی کاپٹر ایک ایک کر کے فضا میں بلند ہونے لگے۔ ہر ایک کے نیچے چار بیرل والی مشین گنیں اور نصب شدہ بتیس راکٹ صاف نظر آرہے تھے۔ چند منٹ کے اندر اندر وہ آٹھ کے آٹھ ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو چکے تھے۔

کئی ہزار گوریلے ائرپورٹ کو محاصرے میں لیے ہوئے تھے۔ ان کے مزید پھیلنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن زمین کی سطح کی صورت حال ..... سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیشتر گوریلے چھوٹی چھوٹی چٹانوں اور ٹیلوں کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ کچھ نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے چھوٹی چھوٹی خندقیں کھود لی تھیں اور کچھ جھاڑیوں کی آڑ لیے ہوئے تھے۔ تمام گاڑیاں کھلی جگہوں پر کھڑی گویا دشمن کو حملے کی دعوت دے رہی تھیں۔

ہوا اس وقت خاصی تیز ہو گئی تھی لیکن تین ہزار ہارس پاور کے انجنوں والے ان دیو قامت ہیلی کاپٹروں پر اس ہوا کا زیادہ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نصف دائرے میں چکر کاٹ کر حملے کے لیے اس طرف آنے لگے۔

اچانک ائرپورٹ کے گرد محاصرہ کیے ہوئے قندھاری اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کچھ چیزیں اوپر پھینکتے ہوئے ہاتھوں کو سر سے اوپر اٹھا کر اس طرح حرکتیں کرنے لگے جیسے ناچ رہے ہوں۔ آدم درانی پہلے تو یہ سمجھا کہ شاید وہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں کیونکہ وہ واقعی پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہے تھے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگتے اگرتے اور پھر اٹھ جاتے۔

اور پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ بڑی بڑی ہزاروں پتنگیں تھیں جو تیز ہوا کے ساتھ بڑی تیزی سے فضا میں بلند ہو رہی تھیں۔ قندھاریوں کے ہاتھوں میں مانجھے کے بڑے بڑے گولے تھے اور وہ پتنگوں کو بڑی تیزی سے ڈھیل دے رہے تھے۔ پتنگیں دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً چار ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئیں اور عقابوں کی طرح فضا میں پرواز کرنے لگیں۔ ہیلی کاپٹر اسی طرف آرہے تھے اور پھر جیسے ہی پہلا ہیلی کاپٹر قریب پہنچا' قندھاری بڑی مہارت سے اپنی پتنگوں کو اس کی طرف غوطہ دینے لگے۔ پائندہ گل اور خلیل دوڑتے ہوئے آدم درانی کے قریب پہنچ گئے۔

وہ تینوں کمانڈر دم بخود سے کھڑے ہیلی کاپٹروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ پر پھڑپھڑاتے ہوئے مسلسل آگے آرہے تھے۔ ان کا رخ پتنگوں کی طرف تھا۔ کاپٹروں کے پائلٹ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان پتنگوں کی ڈوریں کاپٹر کے روٹرز میں پھنس گئیں تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی لیکن وہ بہرحال مطمئن تھے کہ یہ پتنگیں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی کیونکہ یہ ہیلی کاپٹر کئی مرتبہ جنوب کے ان علاقوں میں پرواز کر چکے تھے جہاں ہزاروں پرندے جھنڈ کی شکلوں میں پرواز کرتے رہتے تھے اور ان ہیلی کاپٹروں کو ان پرندوں سے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

پائندہ گل اور خلیل' آدم درانی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ سنسنی ان کے چہروں سے نمایاں تھی اور وہ بڑی شدت سے آنے والے لمحات کا انتظار کر رہے تھے۔

مزید تین سیکنڈ گزر گئے اور پھر وہ ہوا جس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ فضا یکے بعد دیگرے دھماکوں سے گونجنے لگی۔ پتنگوں سے بندھے ہوئے ہلکے لیکن نہایت طاقتور اسٹک گرنیڈ ہیلی کاپٹروں کے روٹرز سے ٹکرا کر پھٹنے لگے۔ گوریلوں کو تباہ کرنے کے لیے ان ہیلی کاپٹروں پر بے تحاشا گولہ بارود لدا ہوا تھا۔ تین سیکنڈ کے اندر اندر ان میں سے کچھ ہیلی کاپٹر یا تو مکمل طور پر تباہ ہو گئے یا انہیں شدید نقصان پہنچا۔

تین ہیلی کاپٹر زمین پر گر کر دھماکوں سے پھٹ گئے۔ ان تینوں کا عملہ بھی کاپٹروں کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا جبکہ ان کے گرنے سے بارہ تیرہ مجاہدین بھی زخمی ہوئے تھے۔ دو ہیلی کاپٹر شعلوں میں گھر کر پائلٹ سے بے قابو ہو کر قندھار شہر کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے لیکن صرف دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بھی زخمی پرندوں کی طرح قلابازیاں کھاتے ہوئے ریگستان میں ڈھیر ہو گئے۔ ان کے دھماکوں کی آوازیں یہاں تک سنائی دی تھیں۔ باقی تین میں سے ایک شعلوں میں لپٹا ہوا تھا' دوسرے کا مین روٹر ٹوٹ گیا تھا اور تیسرے کے پہلو میں سوراخ ہو گیا تھا۔ وہ تینوں ہیلی کاپٹر کسی نہ کسی طرح ائرپورٹ کے ملٹری زون تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

آدم درانی ان پتنگوں کی کارکردگی دیکھ کر سناٹے میں رہ گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ پتنگیں اس قدر تباہ کن ثابت ہوں گی۔

"قندھاری پچھلے کئی ہفتوں سے یہ پتنگیں تیار کر رہے تھے۔" پائندہ گل نے آدم درانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان پتنگوں کو دھماکا خیز مادے کے ساتھ پہلے کبھی نہیں آزمایا گیا تھا لیکن تم جانتے ہو کہ قندھاری دنیا کے بہترین اور باصلاحیت پتنگ باز ہیں۔"

آدم درانی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ جانتا تھا کہ ملک بھر میں، خصوصاً قندھار میں پتنگ بازی کی چیمپئن شپ ہوتی رہتی تھی مگر آج پتنگ بازی میں تاریخ کی یہ سب سے بڑی اور انوکھی چیمپئن شپ تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج اپنے حریفوں کی پتنگیں کاٹنے کے لیے اپنی پتنگوں کے ساتھ ان قندھاریوں نے بلیڈ کے بجائے روسی RKG گرنیڈ باندھ رکھے تھے۔ یہ وزن میں ہلکے مگر نہایت طاقتور ٹینک کے پرخچے اڑا دینے کے لیے کافی تھے۔

"انہیں اپنے ساتھ پتنگیں لانے کا خیال کیسے آیا تھا؟" آدم درانی نے پوچھا۔

"وہ لوگ بہت عرصے سے یہ پتنگیں تیار کر رہے تھے۔ ان کے پاس چونکہ ہیلی کاپٹروں کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب ہتھیار نہیں تھے اس لیے انہوں نے سوچا کہ اگر کبھی قندھار کی طرف ہیلی کاپٹر آئے تو وہ ان پتنگوں سے ان کا مقابلہ کریں گے لیکن ایسا کوئی موقع نہیں آیا اور جب انہیں ائرپورٹ پر حملہ کرنے کے لیے بلایا گیا تو وہ لوگ پتنگیں اپنے ساتھ لے آئے تھے۔" پائندہ گل نے بتایا۔

آدم درانی نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ بارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔

روسی ٹینکوں کے حملے میں صرف دو گھنٹے رہ گئے تھے۔

○☆○

قندھار ائرپورٹ

بارہ بجے سے ایک بجے دن

عقاب اپنی جنگی کونسل سے صلاح مشورے میں مصروف تھا۔

جنرل زغروف نے حیرت انگیز عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارغنداب کے محافظوں اور دیگر علاقوں سے فوجی جمع کر کے تین نئی رجمنٹس قائم کر لی تھیں جن میں تین سو سے زیادہ M-62 ٹینک بھی شامل تھے۔ ان ٹینکوں کا تعلق بہ ویں آرمی سے تھا جس نے پچھلے سال بھی قندھار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بھاری نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہونا پڑا تھا۔ قندھار ائرپورٹ پر اگرچہ کوئی بھی قابل استعمال گن شپ ہیلی کاپٹر نہیں رہ گیا تھا لیکن پچھلی مرتبہ تقریباً ایسی ہی صورت حال میں روسیوں نے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ وہ غزنی کے قریب واقع ائربیس سے بیک وقت ۲۴۰ ہیلی کاپٹر منگوا سکتے تھے۔

آدم درانی کو اصل خطرہ ملٹی پل راکٹ لانچروں سے تھا جن سے تیس سیکنڈ میں ساڑھے چار ٹن سے زیادہ بارود برسایا جا سکتا تھا۔ یہ راکٹ لانچر اب تک اگرچہ گوریلوں کے خلاف چھوٹی جھڑپوں میں استعمال کیے گئے تھے لیکن یہ کسی بڑی جنگ کے لیے بھی بہت موزوں تھے۔ یا تو روسی افغانستان میں اپنے بعض جدید ترین ہتھیار آزما رہے تھے یا انہیں یہ تجربہ ہوا تھا کہ افغان مجاہدین کچھ زیادہ ہی سخت جان واقع ہوئے تھے کہ جدید ترین ہتھیار بھی ان کے خلاف زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہو رہے تھے۔

ان ہتھیاروں کے علاوہ زمینی فوج کی مدد کرنے والے فراگ فٹ طیارے بھی موجود تھے۔ یہ نئے طیارے اب تک خفیہ رکھے گئے تھے اور ان کے بارے میں مغرب والوں کی معلومات بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہ طیارے اگرچہ باقاعدہ طور پر ۱۹۸۳ء یا ۱۹۸۴ء میں روسی فضائیہ میں شامل ہونے والے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں ۱۹۸۲ء میں ہرات اور قندھار کے محاذوں پر اسکوڈرن کی صورت میں استعمال کیا جا چکا تھا۔ SUKHOI-25 نامی ان طیاروں نے افغان گوریلوں پر گولیوں کی بارش کے علاوہ ہزاروں پونڈ وزنی بم بھی برسائے تھے جن میں فولادی سوئیوں والے کلسٹر بم بھی شامل تھے جن سے مجاہدین کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ یہ SU-25 طیارے قندھار ائرپورٹ سے کچھ فاصلے پر ایک خفیہ ہوائی اڈے پر موجود تھے اور چند منٹ میں قندھار پہنچ سکتے تھے۔

آدم درانی، روسی جنرل کا بہرحال شکر گزار تھا جس نے کیپٹن مسکین کو بتا دیا تھا کہ ان کی انفنٹری، راکٹ لانچر اور ٹینک کہاں جمع ہو رہے تھے اور وہ حملے کا آغاز کہاں سے کریں گے۔ وہ جگہ افغان مجاہدین کی موجودہ پوزیشن سے صرف تین میل شمال میں تھی۔

آدم درانی کو اپنے جاسوسوں سے یہ رپورٹ بھی مل چکی تھی کہ پیدل فوج اور ٹینکوں کے عقب میں تباہ کن راکٹ لانچرز کی بیٹری بھی نصب کی گئی تھی۔ اس بیٹری میں آٹھ راکٹ لانچر شامل تھے۔ ان لانچروں سے برسائے جانے والے راکٹوں کی رینج دس میل تھی۔ ہر لانچر ایک سیکنڈ میں چالیس راؤنڈ فائر کر سکتا تھا اور یہ سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔

آدم درانی کے خیال میں سب سے پہلے انہی لانچروں کو نشانہ بنانا چاہئے تھا۔ اس نے ایک ایسی ٹیم بنانے کا فیصلہ کیا جس میں وہ روسی اور افغان فوجی شامل ہوں جو اُن لانچروں پر کام کر چکے ہوں اور ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات رکھتے ہوں۔

اس مشن کے لیے ایک نہیں کئی ٹیموں کی ضرورت تھی۔ اس مشن پر جانے والوں کے زندہ بچ جانے کے ایک فیصد بھی امکانات نہیں تھے۔ ٹرکوں پر صرف ہینڈ گرنیڈ لے کر روسی فوج کے پیچھے جانا، لانچرز بیٹری کے محافظوں سے نمٹنا اور کریو کو ٹھکانے لگا کر لانچروں کو تباہ کرنا درحقیقت خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔

دو سو آدمیوں کو لائن میں کھڑا کر کے سب سے پہلے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا گیا پھر آدم درانی نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ایسے رضا کاروں کی ضرورت ہے جو 122 ملی میٹر کے BM21 راکٹ لانچروں کی بیٹری کو تباہ کر سکیں۔ اس بیٹری میں آٹھ لانچر شامل ہیں۔ ہر لانچر کو تباہ کرنے کے لیے ایک الگ ٹیم کی ضرورت ہوگی۔ ہر ٹیم میں چھ آدمی شامل ہوں گے جس کا مطلب ہے کہ ہمیں اڑتالیس رضا کاروں کی ضرورت ہے۔ جو ان ٹیموں میں شامل ہونا چاہے' ایک قدم آگے آجائے۔"

ہر شخص ایک ایک قدم آگے آگیا۔

"کیپٹن!" آدم درانی نے کیپٹن مسکین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اڑتالیس آدمیوں کا انتخاب تم خود کرلو۔ ٹیموں کے انتخاب کے بعد تم کیپٹن طارق کی ہدایات کے مطابق کام کرو گے۔"

"یس کمانڈر۔" کیپٹن مسکین نے کہا پھر آدمیوں کی تعداد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سارجنٹ یعقوبوف' عباسوف' ذکریا.... آگے آجاؤ۔"

اور اس طرح لانچروں کی تباہی کے لیے رضا کاروں کا انتخاب مکمل ہوگیا۔

"اور اب ٹینکوں کی تباہی کے لیے۔" آدم درانی بولا۔ "تین سو ٹینک کلوز فارمیشن میں ہیں۔ اگر ہر ٹینک کے لیے تین یا چار آدمیوں کا انتخاب کیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کم سے کم ایک ہزار رضا کاروں کی ضرورت ہوگی۔

"اینٹی ائر کرافٹ گنیں اور دشکا ہیوی مشین گنیں انفنٹری کے مرکز میں ہیں۔ ان کے آس پاس ایمونیشن کے باکس بھی ہوں گے۔ ان پر موقع کی مناسبت سے حملہ کیا جاسکتا ہے۔ گرنیڈز کی رینج بائیس گز ہے۔ اتنے فاصلے سے یہ گرنیڈ چھ انچ موٹی فولادی چادر میں شگاف ڈال سکتے ہیں۔ گرنیڈ پھینکتے ہوئے تم لوگ ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر زمین پر لیٹ جاؤ گے کیونکہ یہ گرنیڈ کسی بھی چیز سے ٹکراتے ہی پھٹ جاتے ہیں۔

"اور آخر میں انفنٹری۔ یہ دراصل دست بدست لڑائی ہوگی۔ اس میں رائفل کو ری لوڈ کرنے کا موقع نہیں ملے گا اس لیے تم لوگ اپنی کلاشنکوف رائفلوں کے آگے لگی ہوئی سنگینیں استعمال کرو گے اور اگر چاہو تو چاقو یا خنجر بھی استعمال کرسکتے ہو۔ جن کے پاس کسی قسم کے ہتھیار نہیں ہیں وہ کسی فائیٹر کے ساتھ رہیں تاکہ اگر وہ دشمن کا نشانہ بن جائے یا اس کے ہاتھوں کوئی روسی مارا جائے تو فوراً اس کے ہتھیار پر قبضہ کیا جاسکے۔"

آدم درانی خاموش ہوگیا۔ تمام ہدایات حاصل کرنے کے بعد مجاہدین اپنی اپنی پوزیشن سنبھالنے کے لیے چلے گئے۔

حملے کے لیے روسیوں کے طے شدہ وقت میں اب نوّے منٹ رہ گئے تھے۔ آدم درانی چشم تصور سے جانباز ٹیموں کے آدمیوں کو راکٹ لانچروں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کے آدمی کامیاب نہ ہوئے تو مجاہدین کی پوری فوج کا صفایا ہوجائے گا۔

آدم درانی جب بنکر میں داخل ہوا تو ریڈیو آپریٹر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے روسیوں سے چھینی ہوئی جاوا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اجنبی بھی بیٹھا ہوا تھا۔

وہ وکٹر اسپانوف تھا' روسی ہیلی کاپٹر پائلٹ۔ جس کا کاپٹر ائرپورٹ کے جنوب میں دریا میں گر کر تباہ ہوگیا تھا۔ وہ پستہ قامت اور قدرے بھاری بھرکم نوجوان تھا۔ اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ بائیں آنکھ کے اوپر ایک چھوٹا سا زخم تھا۔ آدم درانی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ریڈیو آپریٹر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ روسی پائلٹ نے بھی اٹھ کر درانی کو سیلوٹ کیا۔

"جنگی قیدی کیپٹن اسپانوف وکٹر رپورٹ پیش کرتا ہے کیپٹن۔"

"تم اس طرح آزاد کیسے گھوم رہے ہو؟ تمہیں باندھ کر کیوں نہیں رکھا گیا؟" درانی نے اسے گھورا۔

"میں نے وعدہ کیا ہے کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا کمانڈر۔"

"ٹھیک ہے' بیٹھ جاؤ کیپٹن۔" آدم درانی نے کہا۔

کیپٹن اسپانوف بیٹھ کر کچھ دیر تک بنکر میں جلنے والے لیمپ کی طرف دیکھتا رہا پھر آدم درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے کمانڈر؟"

"کوئی خاص بات کہنا چاہتے ہو؟" آدم درانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آج سے پہلے مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ تم افغان لوگ بھی انسان ہو۔" کیپٹن نے کہا۔

آدم درانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ روسی پائلٹ ان لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے لاکھوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اسے علم نہیں تھا کہ مرنے والے انسان تھے یا حیوان۔

کیپٹن اسپانوف کے چہرے کے مسل تن گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔

"افغانوں کا قتلِ عام!" وہ بڑبڑایا۔ "خدا جانتا ہے کہ ان بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہمارے ہاتھ کب صاف ہوں گے۔" وہ سر جھکا کر سسکیاں بھرنے لگا۔

آدم درانی نے آنکھیں بند کرلیں اور دل ہی دل میں زلزلہ بیٹری کی تباہی کے لیے جانے والے مجاہدین کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگا۔

"آج رات سے پہلے یہاں خون کی ندیاں بہیں گی کیپٹن۔" وہ کیپٹن اسپانوف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

کیپٹن نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔

O☆O

ایک بجکر ایک منٹ سے دو بجکر تیس منٹ تک

افغان گوریلے چھوٹی چھوٹی چٹانوں اور ٹیلوں میں سینے کے بل رینگتے ہوئے ان ٹرکوں کی طرف بڑھ رہے تھے جن پر راکٹ لانچر نصب تھے۔ ہر لانچر پر چار آدمیوں کا عملہ اور ایک محافظ تھا جو درجۂ حرارت ۱۰۵ ڈگری فارن ہائیٹ ہونے کے باوجود اوور کوٹ پہنے ٹرک کے سامنے کھڑا تھا۔

رائل افغان آرمی کے سابق کیپٹن طارق نے اپنی ٹیم کے ممبروں کو صلاح مشورے کے لیے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ کیپٹن طارق کے خیال میں اس وقت میٹنگ ضروری ہوگئی تھی کیونکہ ان کے اور راکٹ لانچروں کے درمیان تیس گز کا فاصلہ تھا اور بیچ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ تیس گز کے فاصلے سے لانچروں پر گرنیڈ پھینکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر وہ مزید آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تو انہیں دیکھ لیا جاتا اور کسی وارننگ کے بغیر گولیوں سے بھون دیا جاتا۔

اس نے اس مشن میں شامل پچاس آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں کچھ افغان اور کچھ روسی وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ اس وقت کوئی چال ہی کامیاب ہوسکتی تھی' اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد اس نے تیس آدمی فائر کور کے لیے کیپٹن مسکین کی نگرانی میں وہیں چھوڑے اور باقی آدمیوں کو لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے کندھوں پر گرنیڈز کے تھیلے اور رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ معمول کے مطابق چلتے ہوئے اس موبائل کمانڈ پوسٹ کی طرف بڑھنے لگے جہاں ایک کرنل بیٹھا مائیکروفون پر بات کررہا تھا۔

کیپٹن طارق نے اپنے آدمیوں کو ایک جگہ رکنے کا اشارہ کیا اور خود کرنل کے سامنے پہنچ کر سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔

"افغان ڈیموکریٹک آرمی کی اسپیشل اسکریچ یونٹ کا کیپٹن حسین رپورٹ پیش کرتا ہے سر!"

"یس! کیا رپورٹ ہے کیپٹن؟" کرنل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں کسی قدر حیرت تھی۔

"اسپیشل گارڈ فورس حاضر ہے سر!"

"اسپیشل گارڈ فورس! تمہارے آرڈرز کہاں ہیں؟" کرنل نے کہا۔

"زبانی احکامات ہیں سر! آرٹلری کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے ہمیں حکم ملا ہے کہ یہاں راکٹ لانچروں کی حفاظت کی جائے کیونکہ قرب وجوار میں افغان دہشت گردوں کے دیکھے جانے کی اطلاعات ملی ہیں۔ آپ کے ہر لانچر پر صرف ایک محافظ ہے اور ہیڈ کوارٹر کے خیال میں یہ حفاظتی انتظام کافی اور باعثِ اطمینان نہیں ہے سر!"

"ٹھیک ہے کیپٹن! لیکن تمہارے یہ آدمی دھول مٹی میں کیوں اَٹے ہوئے ہیں؟ ان کی وردیاں بھی نامکمل ہیں۔ ان کا یہ حلیہ قابلِ تعریف نہیں ہے۔" کرنل نے کہا۔

"ہم ایک کارروائی میں حصہ لے کر آئے تھے سر! ہمیں آرام کرنے یا وردیاں تبدیل کرنے کا موقع دیے بغیر یہاں آنے کا حکم دے دیا گیا۔" کیپٹن طارق نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے اپنے حلیے درست کرو۔" کرنل نے کہا۔

لانچرز کے ساتھ کھڑے ہوئے گنرز اور محافظ ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ان میں سے بھی کسی نے شبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

کیپٹن طارق نے کرنل کو سیلوٹ کیا اور اباؤٹ ٹرن ہو کر اپنے آدمیوں کو لانچرز پر پوزیشن سنبھالنے کا حکم دیا۔ ہر لانچر پر دو آدمی تعینات کیے گئے تھے۔

کرنل نے اپنی موبائل کمانڈ پوسٹ کے دروازے پر کینوس کا پردہ گرا دیا تھا اور اب فولڈنگ بیڈ پر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی جنرل زغروف نے ریڈیو پر اس سے رابطہ قائم کیا تھا اور کرنل نے سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دے کر اسے مطمئن کردیا تھا۔ حملے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا اور اس کے خیال میں پندرہ بیس منٹ آرام کرلینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

کیپٹن طارق ذرا سی دیر میں ہی صورت حال کا جائزہ لے چکا تھا۔ ہر لانچر پر ایک این سی او اور محافظ سمیت باقی عام فوجی تھے۔ اس کا سیدھا سادا مطلب تھا کہ رینک کے لحاظ سے وہ ان میں سب سے بڑا تھا۔ اس نے ایک اور چال چلنے کا فیصلہ کرلیا۔

"سارجنٹ ذکریا! ان آٹھوں محافظوں سے کہو کہ ان کی ڈیوٹی ختم ہوگئی ہے۔ تمام حفاظتی انتظامات اب اسپیشل یونٹ کی ذمے داری ہے۔ تم اپنے باقی آدمی ادھر اُدھر پھیلا دو۔"

یہ حکم پا کر محافظ خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ وہ بھاری اوور کوٹ کے فلیپ لہراتے ہوئے تقریباً سو گز دور اپنے خیمے کی طرف دوڑے۔ وہ کئی گھنٹوں سے ڈیوٹی پر کھڑے تھے اور خیمے میں جا کر سب سے پہلے سگریٹ پینا چاہتے تھے۔

طارق نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ انہیں یہاں آئے ہوئے ستائیس منٹ ہوچکے تھے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد اس نے اپنے محافظوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب زمین پر لیٹ گئے۔ ٹھیک اسی لمحے مجاہدین نے AK رائفل سے کلوز رینج سے فائرنگ کرکے پہلے راکٹوں کے گنرز کو ڈھیر کیا پھر جھک کر ٹرکوں کے کیبن' راکٹ کیریرز کے نیچے اور سائٹنگ میکنیزم پر پے در پے گرنیڈ پھینکنے لگے۔ پہلے ٹرکوں کے کیبنوں میں دھماکے ہوئے پھر راکٹ لانچروں کے پرخچے اڑے اور فولادی ٹکڑے چاروں طرف فضا میں بکھرنے لگے۔

بیس ہزار پونڈ دھماکا خیز مادّہ بیک وقت پھٹ پڑا تھا۔ بعض راکٹ ایک ایک کرکے زمین پر ہی پھٹ رہے تھے۔ لانچروں میں لوڈ کیے ہوئے بعض راکٹ' لانچروں کو بھی ان کے کیریر سے اٹھا کر

فضا میں لے اڑے تھے۔ چند منٹ تک فضا خوفناک دھماکوں سے گونجتی رہی۔ تین سو بیس راکٹ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئے تھے۔

کرنل کا سکون رخصت ہو چکا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔ اس تباہی نے اسے واقعی پاگل کر دیا تھا۔ وہ اپنے موبائل کمانڈ پوسٹ ٹرک میں داخل ہوا ہی تھا کہ ریڈیو پر جنرل زغروف کی آواز سنائی دی۔

"راکٹری! صورت حال نہایت سنگین ہو چکی ہے۔ انفنٹری اور ٹینکوں پر مشتمل ایک بہت بڑا دستہ ہماری مدد کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن یہاں سے تقریباً ڈھائی سو کلو میٹر شمال مشرق میں کابل ہائی وے پر موقور کے مقام پر افغان دہشت گردوں نے حملہ کر کے اس دستے کو تباہ کر دیا ہے۔ اب فوری طور پر ہمیں کوئی کمک نہیں مل سکتی۔ ایسی صورت حال میں تمہاری ذمے داری بڑھ گئی ہے۔ ہمارے ٹینکوں اور انفنٹری کے حرکت میں آنے سے پہلے ائرپورٹ کا محاصرہ کرنے والے افغان دہشت گردوں کو تباہ کر دو۔"

کرنل کے جواب دینے سے پہلے ہی کیپٹن طارق کمانڈ پوسٹ ٹرک کا کینوس کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ کرنل نے مائیکروفون پھینک دیا اور میز پر پڑا ہوا پستول اٹھا کر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا سکتا، طارق نے اسے گولی مار دی اور رائفل کے بٹ مار مار کر ریڈیو توڑ دیا۔

اور اس سے پہلے کہ کوئی بھی روسی یونٹ کچھ سمجھ سکتی، کیپٹن طارق اور اس کے ساتھی چٹانوں اور ٹیلوں کے پیچھے محفوظ جگہ پر پہنچ چکے تھے۔

آدم درانی اپنے بنکر میں بیٹھا ہوا تھا۔ قیامت خیز دھماکوں کی آواز سنتے ہی وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی اور پیٹ میں گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال اُبھرا تھا کہ کیا وہ اس مشن پر جانے والے اپنے آدمیوں کو دوبارہ دیکھ سکے گا؟

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کیپٹن طارق اور مسکین اس کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ طارق نے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارا مشن سو فی صد کامیاب رہا ہے کاراکش!"

"بہت خوب!" عقاب نے ان دونوں کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ ان سے اس مشن کی تفصیلات پوچھنا چاہتا تھا کہ ایک آدمی، کیپٹن اعظم بے کا پیغام لے کر پہنچ گیا۔

"کاراکش! روسیوں نے ہماری فرنٹ لائن پوزیشن سے چھ سو گز کے فاصلے پر فیلڈ کمانڈ پوسٹ قائم کر لی ہے۔ یہ کمانڈ پوسٹ

• چہرے کے فاضل اور ناپسندیدہ بالوں کو دُور کرنے والی
• کیل، چھائیوں اور مہاسوں سے نجات دلانے والی

ہومیوپیتھک کریم
بالین
قیمت 60 روپے
علاوہ ڈاک خرچ

ایسا آپ کے بال گر رہے ہیں...؟

قیمت 40 روپے
علاوہ ڈاک خرچ
ہیئر لو
ہیئر لوس کنٹرول

اگر ایسا ہے تو آج ہی چُپ کر کے ہیئر لو خرید لیجئے۔ بال گرنا، سفید ہونا، مہینوں نہیں، ہفتوں نہیں دنوں میں بند، خشکی، سکری بالکل ختم۔
بال بے حد لمبے اور گھنے۔

ہر ہومیوپیتھک، جنرل اور میڈیکل اسٹور پر دستیاب ہے

ڈسٹری بیوٹرز: ولی اینڈ کو کھجی گلی کراچی فون: 220487
وقاص میڈیلین کمپنی بیلا بیڈ لین مارکیٹ، پوک اسٹریٹ لاہور فون: 7230710
محمد صالحین اینڈ سنز صوفے والے چوک بازار ملتان۔ فون: 42173

ہر شہر میں اسٹاکسٹ اور ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہے

صرف ایک خط لکھ کر ہماری منظور کردہ اے۔ اے کمپنیز سے ہدایت ڈاک کی پابند ہو سکتے ہیں
اے اے ایجنسیز پوسٹ بکس نمبر 10933 کراچی 33 پوسٹ کوڈ 74700

انجیب۔ گھڑیالی منڈی محمد صدر کراچی
مہران ہومیو اسٹور۔ آرام باغ کراچی۔
ندیم بھرا اسٹور۔ نزد عباسی شہید ہسپتال نظم آباد کراچی۔
بسم اللہ جنرل اسٹور۔ کورنگی اسٹاپ نمبر ۲ کراچی۔
انصاری میڈیکو۔ نزد ڈاک خانہ اسٹاپ۔ سیاف آباد کراچی
قصری اشد جنرل اسٹور۔ ریشم بازار حیدر آباد۔
ہمارا ہومیو اسٹور لطیف روڈ حیدر آباد۔
اسٹار شاپ فریئر روڈ حیدر سکھر۔
نیو فیشن جنرل اسٹور۔ صوفی بازار راولپنڈی۔
مردان ہومیو اسٹور نندا مارکیٹ مردان۔
نند صارا کیمیکلز۔ شاہین بازار کریم پورہ پشاور
قادر ہومیو کلینک۔ صدر روڈ پشاور۔
وقاص میڈیسن ہاؤس۔ سول لائن جہلم۔
پاکستان جنرل اسٹور۔ کچہری بازار سرگودھا۔
بنگلہ میڈیکل اسٹور کمشنر بازار گوجرانوالہ۔
جرمن ہومیو اسٹور۔ ریلوے بازار گوجرانوالہ۔
شفا میڈیکوز۔ کچہری بازار میاں والی۔
کوثر دواخانہ۔ کارخانہ بازار فیصل آباد
نصر جنرل اسٹور۔ اکبر گلی بازار فیصل آباد
کرن میڈیکل اینڈ جنرل اسٹور۔ پریڈی سوسائٹی کراچی۔
انور ہومیو اسٹور۔ بالو بازار رحیم یار خان۔
راجہ برادرز۔ تحصیل بازار سیالکوٹ۔
پنجاب ہومیو اسٹور۔ پیپر مارکیٹ بازار فیصل آباد۔
راشد ٹریڈرز۔ گورودوارہ روڈ کوئٹہ۔
شیرز ہومیو اسٹور۔ بوہڑ چوک۔ لنکن روڈ لاہور
ملک میڈیکل ہال۔ جناح مارکیٹ چیپٹر چوک بیکرل۔
رشید ٹریڈرز۔ گول چوک۔ وارث مارکیٹ اوکاڑہ۔
طارق میڈیسن کمپنی ماڈل ٹاؤن بی بلاک لاہور۔
نیشنل جنرل اسٹور۔ مدینہ چوک ریشم بازار حیدر آباد۔
نیو دبئی دواخانہ کوئٹہ۔ سیرو روڈ سکھر۔

ائرپورٹ کے ایک اوور ہیڈ واٹر ٹینک پر قائم کی گئی ہے جس تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

"یہ کمانڈ پوسٹ واٹر ٹاور پر کیوں بنائی گئی ہے؟" آدم درانی نے پوچھا۔

"آرٹلری آبزرویشن کے لیے۔ ان کے پاس ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی ہے۔ کیپٹن اعظم بے کا خیال ہے کہ وہ اس کمانڈ پوسٹ اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کو توپ خانے کے فائر کی رہنمائی کے لیے استعمال کریں گے۔" قاصد نے کہا۔

آدم درانی، کیپٹن طارق کی طرف گھوم گیا۔ "کیا اس کمانڈ پوسٹ کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ توپ خانہ استعمال کرنا چاہتے ہیں؟"

"ایسا ہو سکتا ہے۔ ایک سو بائیس ملی میٹر کی چار توپوں کی بیٹری استعمال ہو سکتی ہے۔ اس توپ سے نہ صرف انتہائی طاقتور گولے بلکہ کیمیکل شیل بھی پھینکے جا سکتے ہیں۔" کیپٹن طارق نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ "ان توپوں کی رینج تقریباً دس میل ہے سر!"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ واٹر ٹاور پر کمانڈ پوسٹ کی ہدایات کے مطابق رینج شاٹ فائر کریں گے۔"

"آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ واٹر ٹاور کو تباہ کرنے کے لیے ایک ٹیم بنانی پڑے گی اور یہ بھی معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ توپیں کس جگہ پر نصب کی گئی ہیں لیکن اس دوران...."

"اس دوران اگر ان توپوں سے گولہ باری شروع ہو گئی تو ہمارا بہت نقصان ہو گا۔" آدم درانی نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

"یہ توپیں واقعی بہت زیادہ تباہی پھیلا سکتی ہیں۔" کیپٹن طارق نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" آدم درانی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "جتنی جلدی ممکن ہو سکے، واٹر ٹاور اور توپ خانے پر حملے تیاری کرو۔"

اس دوران اعظم بے بھی اپنا روسی فوج والا ریڈیو لے کر پہنچ گیا۔ وہ مسلسل اس کی سوئی گھما رہا تھا۔ بالآخر وہ دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اٹھاتے ہوئے بولا۔ "آدم! میں نے واٹر ٹاور کمانڈ پوسٹ کے سگنل سن لیے ہیں۔ ان کا کوڈ سگنل "پیرازک" ہے۔"

"لیکن ہمیں اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"اگر واٹر ٹاور تباہ ہو جائے تو یہ کوڈ سگنل ہم استعمال کریں گے۔"

"ہاں۔ بشرطیکہ توپ خانہ پہلے فائرنگ شروع نہ کر دے۔ ٹیسٹ فائر کے بعد وہ ٹارگیٹ کے بارے میں ہدایات طلب کریں گے۔"

لمبی چوڑی بحث میں الجھنے کے بجائے واٹر ٹاور تباہ کرنے کے لیے جانبازوں کی ٹیم روانہ کر دی گئی۔ آدم درانی اور کیپٹن اعظم بے بنکر میں بیٹھے بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔

پانچ، دس، پندرہ اور پھر بیس منٹ گزر گئے۔ آدم درانی سوچ رہا تھا کہ اس کے آدمی واٹر ٹینک تک پہنچ بھی سکے ہوں گے یا نہیں۔ آدم درانی اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک آدمی بھیجنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک کیپٹن طارق اس کے سامنے آ گیا۔ وہ آدم درانی کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"ختم ہو گیا۔" وہ درانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ختم ہو گیا! کیا مطلب؟" درانی نے اسے گھورا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"واٹر ٹاور زمین بوس ہو چکا ہے۔ پہلے ہم نے محافظوں کو ختم کیا اور پھر واٹر ٹاور کے ستونوں کو ڈائنامائیٹ سے اُڑا دیا۔ اب نہ تو وہاں واٹر ٹاور رہا ہے اور نہ ہی فیلڈ کمانڈ پوسٹ۔" طارق نے بتایا۔

قریب بیٹھے ہوئے اعظم بے کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اپنے ریڈیو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"پیرازک کالنگ اناناس.... پیرازک کالنگ...." وہ کال نشر کرنے لگا پھر خاموش ہو کر دوسری طرف کی آواز سنتا رہا پھر بولا۔ "رپورٹ یور آرٹلری کیپیبلٹی.... یس.... میں دُہرا رہا ہوں۔ یہ حکم چاروں فیلڈ توپوں کے لیے ہے۔ اب تم لوگ صرف میرے سگنلز پر عمل کرو گے۔ ہمارا ایک اسپیشل یونٹ فرنٹ لائن سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہے۔ یس ائرپورٹ! یہی وجہ ہے کہ تم انہیں نہیں جانتے.... وہ افغان دہشت گردوں کے درمیان موجود ہیں۔ تم میری ہدایات کے بغیر فائر نہیں کرو گے۔ بصورتِ دیگر ہماری فارورڈ یونٹ کے آدمیوں کے مارے جانے کا اندیشہ ہے۔ سمجھ گئے؟ یس.... میرے رینک اور لوکیشن سے تمہیں غرض نہیں ہونی چاہیے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں کوئی افغان دہشت گرد ہوں جو تم سے بات کر رہا ہے؟ بالکل نہیں۔ اب میں پیرازک کا انچارج ہوں۔ یس۔ ڈوبڑ ٹل فائرنگ آرڈر کے لیے تیار رہو۔ پیرازک آؤٹ...."

اعظم بے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اب ہمارے آدمیوں کو ان کے سروں پر پہنچنے کا موقع مل جائے گا۔ اس دوران میں انہیں کچھ گولہ بارود استعمال کرنے میں مصروف رکھوں گا تاکہ وہ اپنا نشانہ درست کر سکیں۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ریڈیو کا سوئچ آن کر کے مائیک پر بولا۔

"پیرازک اناناس سے مخاطب ہے۔ اب میں تمہیں سمت اور ڈگری کے بارے میں ہدایات دوں گا۔" وہ ایک لمحہ کو رکا پھر بولا۔ "ائرپورٹ کی سمت میں رینج شاٹ فائر کے لیے تیار رہو۔ یہ حکم چاروں توپوں کے لیے ہے۔ ریپیڈ فائر۔ یہی آٹو میٹک آپریشن۔" اس نے رینج بتائی پھر بولا۔ "اناناس ریڈی! پانچ۔ چار۔ تین۔ دو۔ فائر!"

آدم درانی اور اس کے ساتھیوں کی نظریں ائرپورٹ کی طرف مرکوز تھیں۔ اچانک تقریباً تین چوتھائی میل کے فاصلے پر پہلے چار

مہیب شعلے ابھرتے ہوئے نظر آئے پھر یوں لگا جیسے ان کے سروں پر سے چار ایکسپریس ٹرینیں پوری رفتار سے گزر رہی ہوں اور پھر ان کے پیچھے بہت دور اڑتالیس پونڈ وزنی بموں کے چار زوردار دھماکے ہوئے اور ائرپورٹ کے رن وے پر سیاہ گاڑھے دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔

آدم درانی خوشی سے اچھل پڑا۔ اعظم بے نے ریڈیو کا سوئچ آن کردیا اور مائیک پر بولا۔ "گڈ شاٹ اناناس! اب رینج تین میٹر بڑھا دو اور ایلیویشن بارہ ڈگری اوپر کردو۔" وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "اب میں کوشش کررہا ہوں کہ وہ لوگ ائرپورٹ کی چند عمارتوں کو تباہ کرسکیں۔"

تین اور حملے ہوئے اور ائرپورٹ کی متعدد عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن چکی تھیں۔

"دوست! تم واقعی ذہین ہو۔" آدم درانی، اعظم بے کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "دشمن کی آرٹلری کو اسی کے خلاف استعمال کرکے اسے تباہ کرنا تمہارا ہی کام ہے۔"

"کہتے ہیں کہ صحیح قدم اٹھانا بھی ایک فن ہے اور مجھے اس فن میں تھوڑی بہت مہارت حاصل ہے۔" کیپٹن اعظم بے نے جواب دیا۔

اسی وقت توپیں خاموش ہوگئیں۔ "یہ کیا ہوا؟" آدم درانی بولا۔ "اب وہ ہم پر تو حملہ نہیں کررہے؟"

"بالکل نہیں۔" اعظم بے نے کانوں سے ہیڈ فون اتارتے ہوئے کہا۔ "اب دراصل ان کا حساب کتاب ہو رہا ہے۔ ہمارے آدمی ان پر حملہ آور ہوچکے ہیں۔ توپ خانے کا ریڈیو آپریٹر مجھے بتا رہا ہے کہ ان توپوں پر کام کرنے والے اٹھائیس میں سے بیس آدمی مارے جاچکے ہیں اور باقی آٹھ ان کی گرفت میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس توپ خانے سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

راکٹوں کی بیٹری اور توپ خانے کی تباہی کے باوجود روسیوں کی طرف سے حملے کا خطرہ موجود تھا۔ روسی اپنی کتابوں کے اس سبق پر عمل پیرا تھے کہ جب تک آخری آدمی اور آخری ہتھیار دستیاب ہے، دشمن پر حملہ آور ہوتے رہو۔ اور ابھی تو ان کی انفنٹری اور ٹینک رجمنٹ باقی تھی۔ آدم درانی اچھی طرح جانتا تھا کہ احکامات ملتے ہی روسی ان پر حملہ آور ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ توپ خانے کی تباہی کے چند ہی منٹ بعد سوویت کمانڈر نے کارروائی شروع کردی۔ افغان مجاہدین کے دو ہر اول دستے اپنی پوزیشن چھوڑ کر دوڑتے ہوئے آدم درانی کے دستوں سے آن ملے۔ تین سو T62 ٹینک انفنٹری کے ساتھ پوری تیز رفتاری سے جہنم کی بلاؤں کی طرح مجاہدین کی طرف لپک رہے تھے۔

دیو قامت ٹینک تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے بوجھ سے زمین جیسے کانپ رہی تھی۔ ان پر نصب ۱۱۵ ملی میٹر کی توپیں ایک تسلسل سے میزائل برسا رہی تھیں۔ دھوئیں اور بارود سے فضا زہر آلود سی ہو رہی تھی۔

ان ٹینکوں سے برسائے جانے والے راکٹ نرم ریت میں اندر تک دھنس کر پھٹتے تو ریت کے مہیب بادل پھیل جاتے۔ بعض راکٹ سروں کے اوپر سے گزرتے ہوئے کہیں بہت دور جا کر گرتے۔ چاروں طرف دھماکوں کی گونجتی ہوئی آوازیں کسی بھی انسان کے ہوش و حواس چھین لینے کے لیے کافی تھیں۔

ریت میں کھدے ہوئے مورچوں میں چھپے ہوئے افغان گوریلے اب مورچوں سے باہر نکل نکل کر ٹینکوں پر گرنیڈ سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ کوئی ٹینکوں کے راستے پر گرنیڈ پھینک رہا تھا، کوئی فیول ٹینک کو نشانہ بنانے کی کوشش کررہا تھا، کوئی گرنیڈ ٹینک کے اس حصے پر گرتا جہاں گن کو گھمانے والا ایک چھوٹا سا فولادی پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ یہی ٹینک کا نازک ترین حصہ تھا۔

ایک گرنیڈ ایک ٹینک کی بڑی گن کے بیرل میں گرا اور لڑھکتا ہوا سیدھا نیچے چلا گیا جہاں صرف ایک سیکنڈ پہلے بریچ میں گولا بھرا گیا تھا۔ بیرل کے اندر گرنیڈ پھٹنے سے وہ دیو قامت ٹینک کسی ننھے سے کھلونے کی طرح ہوا میں اڑا اور اس کے ٹکڑے چڑیا کے گھونسلے کی طرح چاروں طرف بکھر گئے۔ ٹینک کی توپ کے بیرل میں گرنیڈ پھینکنے کا یہ کارنامہ جابر خان نے انجام دیا تھا۔ اسی حکمتِ عملی پر کام کرتے ہوئے اس نے تین اور ٹینک اڑا دیے۔ وہ ایک اور گرنیڈ پھینکنے کی تیاری کررہا تھا کہ ایک ٹینک پر نصب مشین گن کی گولیوں نے اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کردیا۔ مرتے ہوئے بھی اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گرنیڈ اسی ٹینک کی طرف اچھال دیا جو

ماہنامہ سرگزشت کے جیلی نمبر میں شائع ہونے والی چشم کشا داستان

پھانسی گھاٹ سے ایوانِ اقتدار تک ایک ماجرائے کرب و بلا

زنجیر بدست

مصنف: غلام قادر

اب کتابی صورت میں دستیاب ہے

* ان لمحات کی عکاسی جب صحرائی دنیا کی سیاست ایک نیا رخ اختیار کررہی تھی، وقت کی مقتل گاہ میں پاکستان کا مستقبل قربان کیا جارہا تھا، ایک عہد رخصت ہورہا تھا، ایک نئے دور کا آغاز کیا جارہا تھا۔ ایک رہنما اپنے شہید باپ کے نقشِ قدم پر آگے بڑھ رہی تھی۔

وہ حقائق جو پہلی بار ضابطۂ تحریر میں لائے گئے

قیمت: ساٹھ روپے علاوہ ڈاک خرچ

پتا: ملک پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر 307 کراچی

○☆○

دو جگر چھتیس منٹ دوپہر

ٹھیک بیرل کے دہانے میں گرا۔

دھماکے کی آواز میں بہت کم لوگوں نے جابر خان کو پوری قوت سے چیخ کر "ہاؤزٹ" کہتے ہوئے سنا تھا۔ جابر خان جب پاکستان میں تعلیم حاصل کررہا تھا تو وہ کالج کی کرکٹ ٹیم کا سب سے کامیاب بولر تھا اور آج زندگی کی آخری اننگ میں اس نے روسیوں کے پانچ ٹینک تباہ کرکے پانچ وکٹیں حاصل کرلی تھیں۔

وہ سیکڑوں مجاہدین جو بروقت راستے سے نہیں ہٹ سکے تھے' ٹینکوں کے فولادی پٹوں کے نیچے آکر کچلے گئے تھے۔ ان ٹینکوں کے نیچے آنے والے بعض خوش قسمت بچ بھی گئے تھے اور ان پر یہ دلچسپ انکشاف ہوا تھا کہ اگر ٹینک کے نیچے دونوں پٹوں کے درمیان لیٹا جائے تو ٹینک ان کے اوپر سے گزر جائے گا اور انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

بعض مجاہدین کو اپنے ہی گرنیڈوں کی قوت کا اندازہ نہیں تھا یا انہیں یہ یاد نہیں رہا تھا کہ گرنیڈ پھینکنے کے بعد خود زمین پر لیٹ جانا چاہیے۔ اس طرح وہ خود بھی چیتھڑوں میں بدل گئے تھے۔ بعض مجاہدین مشین گنوں کے فائر کے سامنے تن کر کھڑے ہوجاتے جس سے ان کے جسم چھلنی ہوجاتے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے کسی قسم کی ٹریننگ حاصل نہیں کی تھی یا ان کے پاس تجربے کی کمی تھی۔ ایسے ہی مجاہدین زیادہ تعداد میں اپنی زندگیوں سے محروم ہورہے تھے۔

ان ٹینکوں کا روسی عملہ بھی مشکلات کا شکار تھا۔ یہ روسی ٹینک پرانے چرچل' ٹائیگرز اور شرمن ٹینکوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر نہیں تھے۔ ماڈرن ہونے کے باوجود اس قسم کی جنگ میں یہ ڈ۔تھ ٹریپ بن جاتے تھے۔ اگرچہ وارسا پیکٹ کے اتحادی ممالک نے عرصہ پہلے یہ T-62 ٹینک ترک کردیے تھے لیکن روسیوں کے پاس یہ ٹینک خاصی بڑی تعداد میں موجود تھے اور چونکہ ان کا عملہ بھی تجربہ کار تھا اس لیے روسی اب بھی اس بات پر بضد تھے کہ یہ دنیا کے بہترین ٹینک ہیں لیکن اب جس طرح افغان مجاہدین اپنے گرنیڈز' چند ہیوی دشکا مشین گنوں اور روسیوں سے چھینی ہوئی AA گنوں سے ان کے پرخچے اڑا رہے تھے اس سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ T-62 دنیا کے فرسودہ ترین ٹینک ہیں۔ لیزر کے جدید ترین نظام سے لیس ہونے کے باوجود یہ بھاری بھرکم ٹینک' دشمن کے راکٹوں یا فضائیہ کے لیے بہترین ٹارگٹ تھے۔

جب کوئی ٹینک ہٹ ہوتا تو سب سے پہلے ایک ہزار لیٹر والے لیٹر فیول ٹینک کو آگ لگتی پھر ٹینک میں بھرا ہوا گولہ بارود اپنا کام دکھاتا۔ ایک زوردار دھماکے سے ٹینک کے پرخچے اڑ جاتے اور آگ کا ایک بہت بڑا گولہ فضا کو اپنی لپیٹ میں لے کر پھیلتا چلا جاتا۔

ہٹ ہونے کے بعد ٹینک کو اس قدر جلدی آگ لگتی کہ کریو کو ٹورٹ یا اسکیپ ہیچ کھول کر باہر نکلنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ ٹینک کے اندر گولہ بارود کو آگ لگنے کے بعد کریو کا جو حشر ہوتا اس کا اندازہ لگانا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ شعلوں میں لپٹے ہوئے ٹینک سے اٹھنے والے گاڑھے دھوئیں میں ربر وغیرہ کے ساتھ انسانی گوشت کے جلنے کی بو بھی شامل ہوتی اور اگر کبھی اتفاق سے کریو کو ٹینک سے باہر نکلنے کا موقع مل بھی جاتا تو وہ یا تو افغان مجاہدین کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے یا اپنے ہی ٹینکوں کی مشین گنوں سے برسنے والی گولیوں سے چھلنی ہوجاتے۔

اور جو روسی اس روز تباہ شدہ ٹینکوں میں سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے وہ بھی باقی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی ٹانگ کٹ گئی تھی' کسی کا بازو ندارد تھا اور وہ لوگ شعلوں اور گاڑھے دھوئیں میں گھٹتے ہوئے وہاں سے نکلنے کی کوشش کررہے تھے۔ بیشتر زخمی تو حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ وہ اپنی جگہوں پر پڑے پاگلوں کی طرح چیخ چلا رہے تھے' رو رہے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں' دوستوں اور عزیزوں کے نام لے لے کر انہیں مدد کے لیے پکار رہے تھے لیکن اس جنگ میں ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ان میں سے بعض تو اس قدر شدید زخمی تھے کہ ان کے چند منٹ سے زیادہ زندہ رہنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

بہت کم روسی ایسے تھے جو جلتے ہوئے ٹینکوں میں سے نہ صرف زندہ سلامت نکلنے بلکہ اپنے ساتھ کوئی گرنیڈ یا رائفل وغیرہ بھی نکال لانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان کی حالت سب سے زیادہ قابلِ رحم تھی۔ وہ جلتے ہوئے ٹینکوں' لپکتے ہوئے شعلوں اور سیاہ دھوئیں کے بادلوں اور دشمنوں میں گھرے اس طرح چاروں طرف دوڑ رہے تھے جیسے ان کے دماغ پلٹ گئے ہوں۔ یہ سب کچھ ان کے لیے ایک بھیانک خواب تھا اور وہ اس خواب سے نکلنے کی کوشش کررہے تھے۔

ان روسی فوجیوں نے اپنی ٹریننگ کے دوران یہ پڑھا تھا کہ پیدل فوج ٹینکوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور دنیا کی ہر فوج میں جوانوں کو یہی پڑھایا جاتا ہے لیکن یہاں صورت حال اس کے برعکس نظر آرہی تھی۔ تین سو T-62 ٹینکوں میں سے ڈیڑھ سو ٹینک مکمل طور پر تباہ ہوچکے تھے اور باقی ڈیڑھ سو میں سے بھی بیشتر کو اس طرح نقصان پہنچا تھا کہ وہ استعمال کے قابل نہیں تھے اور جن ٹینکوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا یا استعمال کے قابل تھے' وہ راہِ فرار اختیار کررہے تھے۔

تقریباً ڈیڑھ ہزار افغان مجاہدین اس معرکے میں شہید ہوئے تھے' ایک ہزار کے لگ بھگ زخمی تھے اور اب سوویت انفنٹری آگے بڑھ رہی تھی۔ گرنیڈز اور جدید ترین رائفلوں سے لیس یہ روسی پیدل فوج گروہ در گروہ مجاہدین پر حملہ آور ہورہی تھی لیکن ٹینکوں کے تحفظ کے بغیر یہ فوج اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کررہی تھی۔ افغان مجاہدین انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے

تھے اور بالآخر تقریباً بیس منٹ بعد روسی پیدل فوج کے بھی قدم اکھڑ گئے اور اس طرح روسیوں کا یہ سب سے بڑا حملہ بھی ناکام ہو گیا۔

○☆○

الماس قلعہ

۴ بجے سہ پہر

وہ قدیم قلعہ قندھار ائرپورٹ کے مغرب میں تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں یہ یقیناً مضبوط ترین قلعہ ہوگا لیکن اب تو صرف اس کا نام ہی رہ گیا تھا۔ الماس قلعہ کے کھنڈرات دور تک بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان کھنڈروں میں ہر طرف ریت ہی ریت بکھری ہوئی نظر آرہی تھی۔

کرنل فاران اور اس کی یونٹ کے آدمی الماس قلعہ کے کھنڈروں کی تپتی ہوئی ریت پر صحرائی چھپکلیوں کی طرح دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ کرنل فاران کو پینٹاگون سے ملنے والی ہدایات بالکل واضح تھیں۔ "ان سرفیس ہوور کرافٹس کو تباہ کردو۔ ان کی تباہی سے ہم سوویت یونین پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ہوور کرافٹ بالکل غیر محفوظ اور بیکار ہیں لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی بھی حالت میں روسی فوجیوں سے الجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔"

کرنل فاران کے خیال میں کوئی بات کہنا تو آسان ہوتا ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت ہی مشکل امر ہے۔ اس کے آدمی چھپتے چھپاتے بڑی مشکل سے گزشتہ رات یہاں پہنچے تھے۔ اس قلعے کے کھنڈروں میں آنے کے بعد انہوں نے چند بڑے حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین واقعات کا مشاہدہ کیا تھا۔ پہلے رات کی تاریکی میں افغان مجاہدین پر حملہ آور روسیوں کی پسپائی اور پھر ٹینکوں کی کلاسک لڑائی۔ افغان مجاہدین نے ان بھاری ٹینکوں کو کھلونوں کی طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ کرنل فاران اور اس کے آدمیوں کی انگلیاں اپنی رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں لیکن وہ فائر نہیں کرسکتے تھے۔ خاموش تماشائیوں کی طرح تباہی و بربادی کے یہ مناظر دیکھتے رہے۔

افغان مجاہدین اور روسیوں میں اس زبردست اور مسلسل جنگ کے باوجود کرنل فاران اور اس کے آدمیوں کو ہوور کرافٹس کے قریب جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ہوور کرافٹس ائرپورٹ پر بہت دور کھڑے تھے اور ان کے محافظ اس وقت بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے تھے جب افغانوں نے ائرپورٹ کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا تھا۔

اچانک کرنل فاران کے اعصاب تن گئے۔ ہوور کرافٹس کے ارد گرد اچانک ہی ہلچل سی نظر آنے لگی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان ہوور کرافٹس کے ٹیک آف کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اگر وہ ہوور کرافٹ یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہوگئے تو یہ مشن اسی طرح ناکام ہو جائے گا جس طرح

> ایک امریکی اداکارہ کی شادی کے دن اس کے سیکریٹری نے اسے ایک فہرست دکھائی اور بتایا کہ میڈم ان لوگوں کو دعوت نامے بھیجنا تو بھول ہی گئے۔
>
> "ڈونٹ وری" اداکارہ نے اطمینان سے جواب دیا "ان لوگوں کو اگلی دفعہ بلالیں گے۔"

ایران میں امریکی یرغمالیوں کو رہائی دلانے والا مشن ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔ دو انتہائی طاقتور ہوور کرافٹس کے انجن اسٹارٹ ہو چکے تھے اور ایگزاسٹ پائپ سے سیاہ دھواں خارج ہو رہا تھا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بجنے والے تھے اور کرنل فاران سوچ رہا تھا کہ ان کے مشن کی ناکامی میں بھی صرف چند ہی منٹ رہ گئے تھے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر یہ افغان گوریلے نہ آتے جن کی وہ کوئی مدد بھی نہیں کرسکتا تھا تو وہ ان۔۔۔ ہوور کرافٹس کو تباہ کرکے اب تک اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے ہوتے۔

کرنل فاران کے خیالات کی رو بہک گئی۔ یہ صرف آٹھ گھنٹے پہلے کی بات تھی جب ائرلفٹ کمانڈ کے لاک ہیڈ C-5 گلیکسی طیارے یہاں سے تین سو میل دور بلوچستان کے ایک پتھریلے میدان میں اترے تھے۔ طیاروں سے اترنے کے بعد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ لوگ آٹھ ٹرکوں پر سوار ہو کر افغانستان کے اس ویرانے کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ انہیں الماس قلعہ کے ان کھنڈروں تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہاں روسی ہوور کرافٹس ان کی رینج میں تھے لیکن ابھی تک وہ کچھ نہیں کرسکے تھے۔ اس سے پہلے وہ ایری زونا کے اسپیشل ٹریننگ کیمپ میں تھے جہاں سے انہیں پانچ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے پرواز کرنے والے گلیکسی C-5 طیاروں کے ذریعے بلوچستان لایا گیا تھا۔ اس مشن میں حصہ لینے والے تمام آدمیوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں اور انکل سام نے انہیں صرف اتنا بتایا تھا کہ انہیں افغانوں کی مدد کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔

زبیر فاران اس ٹیم کا واحد آدمی تھا جو باقاعدہ فوجی تھا۔ انہیں تین مہینوں تک اسپیشل کیمپ میں رکھا گیا تھا جہاں امریکیوں نے انہیں ٹریننگ دی تھی۔ امریکی سی آئی اے نے یہ رپورٹ دی تھی کہ ان ہوور کرافٹس کو روسی سرحدوں کی وسعت کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ان دیو قامت طیاروں کے ذریعے ہزاروں فوجیوں کو محاذ پر منتقل کیا جاسکے گا۔

"ان ہوور کرافٹس کو تباہ کردو۔ روسی فوجیوں سے الجھنے کی

ضرورت نہیں۔ اس کے بعد امریکی طیارے بحیرۂ عرب کے ساحل سے تم لوگوں کو اٹھالیں گے۔"

○☆○

آدم درانی، پائندہ گل اور ان کے دوسرے ساتھی موبائل کمانڈ پوسٹ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سنتری کی آواز سن کر باہر دوڑ پڑے۔ اس وقت سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ وہ سب آنکھوں پر ہاتھوں کے سائبان بنائے ائرپورٹ کی طرف دیکھنے لگے جہاں تیس دیو قامت ہوور کرافٹس، انجنوں سے سیاہ دھواں خارج کرتے ہوئے گرجدار آوازوں کے ساتھ آہستہ آہستہ فضا میں اٹھ رہے تھے۔

وہ سب بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے پاس AA گن کا ایک شیل بھی نہیں بچا تھا اور وہ دیو قامت طیارے دشکا مشین گنوں کی رینج سے بہت دور نکل چکے تھے۔ وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ان کی نظروں کے سامنے ان سے دور ہو رہا تھا اور وہ کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

آدم درانی زور زور سے سر کو جھٹکے دے رہا تھا۔ کروڑوں ڈالر مالیت کا خزانہ ماسکو جا رہا تھا۔ روسی جیت گئے تھے۔ اب کوئی معجزہ ہی ہوتا جو اس عظیم خزانے کو ماسکو پہنچنے سے روک سکتا تھا۔

○☆○

الماس قلعہ کے کھنڈرات میں کھڑے ہوئے کرنل فاران نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیا۔

آدم درانی اور اس کے ساتھی حیرت آمیز نگاہوں سے ان دیو قامت طیاروں کو دور ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ یہ معجزوں کا دور نہیں تھا لیکن افغانوں کی مدد کے لیے بابار معجزے رونما ہو رہے تھے اور اس وقت بھی ایک معجزہ ہی رونما ہوا تھا۔ طیاروں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں یوں لگا تھا جیسے اچانک ہی آسمان پھٹ پڑا ہو۔

امریکی سپر ریڈ آئی میزائل طیاروں کے انجنوں سے خارج ہونے والی حرارت پر چند سیکنڈ میں ہزاروں فٹ کا فاصلہ طے کرتے ہوئے طیاروں سے ٹکرا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یوں لگا جیسے سورج کئی ٹکڑوں میں بٹ کر آسمان پر بکھر گیا ہو۔

بڑی دلچسپ صورت حال ان کے سامنے تھی۔ طیاروں کے ٹکڑوں کے ساتھ انسانی اعضا بھی چاروں طرف گر رہے تھے اور ان طیاروں میں بکھرے ہوئے نقلی سنہری سکے بھی فضا میں بکھر گئے تھے۔ سورج کی کرنوں میں چمکتے ہوئے ان سکوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے سنہری بارش ہو رہی ہو۔

ہوور کرافٹس تباہ ہو چکے تھے۔

○☆○

ہالزن، ماسکو میں اپنے دفتر میں بیٹھا سٹلائٹ کے ذریعے ٹیلیویژن پر ان دیو قامت ہوور کرافٹس کے ٹیک آف کا منظر دیکھ رہا تھا۔ تمام طیارے فضا میں بلند ہوئے تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہونے والا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے ٹی وی اسکرین پر جو منظر نظر آیا وہ ہالزن کا دماغ پلٹ دینے کے لیے کافی تھا۔ ٹی وی اسکرین پر آگ کے گولے چمکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ہالزن نے یہ منظر دیکھ کر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا پھر سیدھا ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ٹھیک ہے، مغرب کا مقابلہ کرنے کے لیے دولت اس کے پاس نہیں آسکی تھی لیکن ہوور کرافٹس کی صورت میں یہ جنگی بیڑہ تباہ ہو چکا تھا جس کے بل بوتے پر اس کے سیاسی حریف اسے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہالزن چیئرمین تو بن گیا تھا اور بہت جلد اسے سوویت یونین کا صدر بھی منتخب کرلیا جائے گا۔ یہ روس کی جنگی کونسل کے خلاف اس کی بہت بڑی فتح تھی۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ تو بہتر تھا۔

○☆○

کرنل فاران کا ٹرک مجاہدین کی کمانڈ پوسٹ کے قریب آکر رک گیا۔ فاران چھلانگ لگا کر ٹرک سے اترا۔ اس کے جسم پر گوریلا یونیفارم تھی اور وہ مکمل کٹ میں تھا۔

"تمہارا کمانڈر کون ہے؟" اس نے دری زبان میں پوچھا۔

"خوش آمدید غازی!" آدم درانی نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"ہم وہ چند سرپھرے ہیں جو اپنی اس سرزمین کو دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں دیکھ سکتے۔" کرنل فاران نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ ہم انتظار نہیں کرسکتے۔ ہمیں ایک مقررہ وقت پر بحیرۂ عرب کے ساحل پر چند لوگوں سے ملاقات کرنی ہے۔"

وہ آدم درانی سے ہاتھ ملا کر ٹرک پر سوار ہو گیا اور ٹرک حرکت میں آکر تیزی سے جنوب کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کے باقی ٹرک ایک قطار میں ہلکی رفتار سے جا رہے تھے۔ آدم درانی اور اس کے ساتھی انہیں جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

○☆○

شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پائندہ گل اور کاراکش کا مشترکہ لشکر آزاد علاقے کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ وہ آزاد قبائلی علاقہ جہاں آج تک کسی حملہ آور کے قدم نہیں جم سکے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس وقت تو سفید روسی ریچھ اپنے زخم چاٹ رہا ہوگا لیکن زخم مندمل ہونے کے بعد یہ ریچھ ایک بار پھر ان پر حملہ آور ہوگا اور وہ لوگ بھی اس وقت تک نہ صرف کچھ آرام بلکہ دوبارہ اپنی تیاری مکمل کرلینا چاہتے تھے۔

آدم درانی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ سفید ریچھ، عقاب کو کبھی غافل نہیں پائے گا۔ سفید ریچھ، عقاب کو اپنے آپ پر جھپٹنے کے لیے ہمیشہ تیار پائے گا۔

Scanned By:
AMAN-UL-MUSTAFA
0333-4585215

خوف

عائشہ جمال

اچانک یکے بعد دیگرے رُونما ہونے والی کُتوں کی اموات سے شروع ہونے والا قصّہ۔ یہ اموات اتفاقیہ نہیں، کسی سازش کا حصّہ معلوم ہو رہی تھیں جس کے تانے بانے کوئی خُفیہ ہاتھ بُن رہا تھا مگر کیوں؟

انسان اور جانور کے درمیان انسیت و یگانگت کی پُرتجسس داستان

میں اپنے لان پر پودوں کو پائپ سے پانی دے رہا تھا جب میں نے گلی میں کسی کے چیخنے کی آواز سنی۔ میں نے پائپ گھاس پر پھینکا اور تیزی سے گلی کی طرف لپکا۔ میرا بارہ سالہ کُتا ریکس بھی ایک درخت کے سائے سے اُٹھا اور میرے پیچھے دوڑا۔ اسے اب دوڑنے میں دقت پیش آتی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں کُتا بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ریکس کی ٹانگیں اب گٹھیا زدہ سی رہنے لگی تھیں لیکن اب اسے ہر جگہ میرے پیچھے پیچھے آنے کی زیادہ عادت ہو گئی تھی۔

میرے گھر سے دو گھر چھوڑ کر مجھے کچھ لوگ کھڑے نظر آئے وہ کونی رنالڈ کو گھیرے میں لیے کھڑے تھے جبکہ کونی اپنے چھوٹے سے کُتے کو سینے سے چمٹائے چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ میں اس صورت

حال کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ کُتوں کا قاتل ایک بار پھر کام دکھا گیا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ ماہ کے دوران ہمارے محلّے میں پانچ کُتوں کو زہر دے کر ہلاک کیا جا چکا تھا۔ اب تو میں اس بات پر شکر ادا کرتا تھا کہ میرا کُتا ریکس زیادہ تر میرے پیچھے پیچھے ہی رہتا تھا۔

کونی روتے روتے بولی۔ "بھلا میرے مونی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ یہ تو اتنا معصوم سا کُتا تھا۔ کبھی کسی کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ کوئی انتہائی خبیث اور ظالم شخص ہی اسے ہلاک کرنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔"

اس کا مردہ کُتا مونی جسے وہ سینے سے چمٹائے کھڑی تھی' نہایت مختصر الوجود اور برف کے گالے کی طرح سفید تھا۔ صرف اس کے پنجے مٹی میں لتھڑے نظر آ رہے تھے۔

"کوئی پاگل ہی اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے۔ یہ یقیناً کسی جنونی کا کام ہے۔" جون فورڈ بولا۔ ایک ہفتہ پہلے جون کو بھی اپنا کُتا اپنے پورچ میں مردہ پڑا ملا تھا۔ اسے بھی کسی نے زہر دے دیا تھا۔

"ہوا کیا؟" میں نے وہاں کھڑی مونیکا سے پوچھا۔ مونیکا ہماری گلی میں' سامنے والے مکانوں میں سے ایک میں رہتی تھی۔ اس کا کُتا بھی ایک ماہ قبل اسی طرح مر چکا تھا۔

"مُنّا ہے' کونی نے آج صبح مونی کو تھوڑی دیر کے لیے باہر چھوڑا تھا۔" مونیکا بتانے لگی۔ "مونی چند منٹ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد واپس آیا لیکن جلد ہی اس کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ پھر وہ لان پر لیٹ گیا اور دوبارہ نہیں اُٹھا۔"

اسی اثنا میں والٹ آرمر بھی اپنے گھر سے نکل آیا۔ وہ ہماری گلی کے کونے پر رہتا تھا۔ وہ پہلے ہی افسردہ اور تھکا تھکا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ہجوم کے قریب پہنچ کر اور صورتِ حال کا اندازہ کر کے وہ گویا کچھ اور اداس ہو گیا۔ اس کی حالت قابلِ رحم نظر آنے لگی۔

"آخر یہ کون بدبخت کُتوں کو اس طرح مار رہا ہے؟" وہ بوجھل لہجے میں بولا۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس کے تاثرات سے میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے دل میں ایک بار پھر اپنے کُتے کلین اور اپنی بیوی بیکی کی جدائی کا زخم ہرا ہو گیا تھا۔

ہمارے محلّے میں سب سے پہلے والٹ ہی کا کُتا اس طرح پُراسرار انداز میں ہلاک ہوا تھا۔ یہ اواخر مئی کی بات تھی۔ اس ایک ہفتے ہی کے دوران والٹ کے لیے وہ دوسرا صدمہ تھا۔ اس سے پانچ روز پہلے ہی اس کی بیوی بیکی کسی سفری سیلز مین کے ساتھ فرار ہو چکی تھی۔

پہلے پہل تو ہم یہی سمجھے تھے کہ شاید والٹ کا سُرخ اور جسیم کُتا کلین اپنی مالکن کی جدائی کے غم سے مر گیا تھا کیونکہ بیکی کو اس کُتے سے بہت محبت تھی اور کتا اس سے جتنی محبت کرتا تھا' اس کا تو اندازہ کرنا ہی مشکل تھا۔ کلین کے بعد جب مزید دو کُتے پُراسرار انداز میں مرے تب ہمیں اندازہ ہوا کہ کلین کو بھی درحقیقت زہر ہی دیا گیا تھا۔

بیکی کی کمی صرف ان میاں بیوی کے اپنے کُتے ہی کو نہیں' یقیناً محلّے کے سب کُتوں کو محسوس ہوئی ہو گی کیونکہ وہ کُتوں سے پیار کرتی تھی اور گلی محلّے کے بیشتر کُتے اس سے مانوس تھے۔ کُتوں کا تو آپ کو پتا ہی ہے.... ان سے ذرا محبت کرو۔ وہ جواباً اس سے دس گنا محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

کُتوں کو کسی کے کردار سے بھی کوئی غرض نہیں ہوتی۔ بیکی پر جان نچھاور کرنے والے کُتوں کو بھی اس بات سے غرض نہیں تھی کہ وہ اپنے شوہر کی کچھ زیادہ وفادار نہیں تھی۔ اس پر جوانی کا رنگ کچھ زیادہ ہی چڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوہر والٹ سے عمر میں پندرہ سال چھوٹی تھی۔

اس کی حرکتوں سے اس کے شوہر کے سوا سبھی واقف تھے۔ وہ شوہر کو دھوکا دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی لیکن والٹ کو گویا کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کی پیٹھ پیچھے کیا ہوتا تھا۔ پھر ایک دن آخر کار بیکی گھر سے بھاگ گئی تب گویا اچانک ہی اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ پھر پانچ دن بعد اس کا کُتا بھی مر گیا تب تو والٹ گویا بالکل ہی بکھر کر رہ گیا۔ کسی کی ہمدردی اس کا صدمہ کم نہ کر سکی۔ وہ مہینوں کا بیمار نظر آنے لگا۔

"کوئی جنونی ہی اس طرح کُتوں کو یکے بعد دیگرے ہلاک کر سکتا ہے۔" جون فورڈ نے ایک بار پھر کہا۔ "اب ہمیں پولیس کو مجبور کرنا ہی پڑے گا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کرے۔ پولیس نے ابھی تک اس معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لیا ہے۔"

میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ اس سے پہلے تین کُتوں کی موت کی اطلاع پولیس کو دی گئی تھی۔ تینوں مرتبہ جیک اسپیڈ نامی ایک نوجوان پولیس آفیسر آیا تھا اور پاس پڑوس کے لوگوں سے رسمی سے سوالات کر کے چلا گیا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔

"تم پولیس کو اطلاع دو جون!" مونیکا نے کہا۔ پھر وہ کونی کو اپنے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے بولی۔ "تم اندر چلو کونی ڈیئر! میں فلپ کو فون کر کے آفس سے واپس بُلاتی ہوں۔ اسے اس موقع پر تمہارے پاس موجود رہنا چاہیے۔" فلپ' کونی کے شوہر کا نام تھا۔

کونی سسکیاں لیتی اندر چل دی۔ مردہ کُتے کو اس نے بدستور سینے سے لگایا ہوا تھا۔ مونیکا اسے سہارا دیے ہوئے تھی۔

دفعتاً پڑوس کی ایک عورت مارشا بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ کُتوں کو فریڈ شرمن ہلاک کر رہا ہے۔"

"تمہیں بلا تحقیق کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے مارشا!" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا اور ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ فریڈ شرمن وہاں موجود نہیں تھا۔

"تم ہمیں نصیحتیں کر سکتے ہو کیونکہ تمہارا کُتا ابھی زندہ ہے نیڈ!" مارشا ناگواری سے بولی۔ "جس دن ریکس کو زہر دے کر مار دیا

گیا اس دن دیکھوں گی کہ تم کتنے تحمل سے کام لیتے ہو۔"

مارشا کے چھوٹے سے کتے کو بھی زہر دے کر ہلاک کیا جا چکا تھا۔ دوسرے نمبر پر اسی کی باری آئی تھی۔ مارشا کے تینوں بچے اس کتے سے کھیلتے تھے۔ کتے کے مرنے پر وہ بہت روئے تھے اور کئی دن اداس رہے تھے۔

"مجھے تمہارے احساسات کا اندازہ ہے مارشا!" میں نے بدستور تحمل سے کہا "لیکن فی الحال اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ کتوں کو فریڈ نے ہلاک کیا ہے۔"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ فریڈ کو کتوں سے کتنی نفرت ہے۔ وہ جان سے زیادہ اپنے لان کی حفاظت کرتا ہے۔ کوئی کتا جا کر اگر اس کے لان کو سونگھ بھی لیتا ہے تو فریڈ کو غصے سے دورہ پڑنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ بھلا کسے کتوں سے دشمنی ہو سکتی ہے؟" مارشا نے دلیل دی۔

دل ہی دل میں تو مجھے بھی اعتراف تھا کہ مارشا کی بات میں وزن تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ فریڈ نے خون پسینہ ایک کر کے اپنے لان کو نہایت خوبصورت بنا رکھا تھا اور اسے ہمیشہ شکوہ رہتا تھا کہ کتے آ کر اس کے لان کو خراب کر جاتے ہیں۔ وہ کسی کتے کو لان کا رخ کرتے دیکھ کر دور سے ہی ششکارنے لگتا تھا لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ کتوں کو زہر بھی دے سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد کونی کے گھر کے سامنے سے ہجوم چھٹ گیا اور میں بھی ریکس کے ساتھ اپنے گھر کی طرف لوٹ آیا۔ بارہ سال کا کتا اسی سال کے انسان کی طرح ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ریکس تقریباً میرا ہم عمر ہی تھا۔ نو سال قبل میری بیوی ایلی کا انتقال ہوا تھا۔ تب سے ریکس ہی میرا مستقل رفیق تھا۔ مجھے اس سے بڑی محبت تھی۔ میں سوچ رہا تھا' جب تک کتوں کا قاتل پکڑا نہیں جاتا' مجھے ریکس پر خصوصی نظر رکھنی ہوگی۔

تین گھنٹے بعد جبکہ میں اپنے سبزی کے پودوں کا معائنہ کر رہا تھا' میں نے ریکس کے بھونکنے کی آواز سنی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو کچھ دور پولیس آفیسر جیک اسپیڈ کو کھڑے پایا۔

"ہیلو جیک!" میں نے اس کے قریب پہنچ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم یقیناً کونی کے کتے مونی کی موت کے سلسلے میں آئے ہو گے۔"

"ہاں۔ تمہارا نام؟" وہ پنسل اور نوٹ بک سنبھالے نہایت رسمی انداز میں بولا۔ میں اس سے پہلے بھی تین مرتبہ اسے اپنا نام نوٹ کرا چکا تھا۔

"نیڈ والٹر۔" میں نے اس بار بھی تحمل سے جواب دیا۔

"مسٹر نیڈ والٹر! تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ان کتوں کو کون ہلاک کر رہا ہے؟" اس نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تمہارا کتا اب تک کس طرح زندہ ہے؟" اس نے اچانک

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سچی کہانیاں

مرزا امجد بیگ کی یادداشتیں

شیطان صفت

سبز قدم

ریٹائرڈ ڈی ایس پی ملک صفدر حیات کی ڈائری

دستِ انتقام

اسیرِ ہوس

قانونی پیچیدگیاں' عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات
زن، زر اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی پیشہ ورانہ زندگی کے پیچیدہ کیسوں کی روداد
جرم و سزا کی وہ کہانیاں جو انسانی حرص و ہوس کا آئینہ ہیں

قیمت فی کتاب ۲۵/- روپے، ڈاک خرچ ۱۰/- روپے۔ چاروں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس نمبر ۲۳ رمضان چیمبرز
نزد دفتر اخبار "جنگ" آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ۷۴۲۰۰

ہی سوال کیا۔ اس کے سوال نے مجھے حیران کر دیا۔

تاہم میں نے اس کا جواب بھی تحمل سے دیا۔ "ریکس زیادہ تر میرے ساتھ ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ جب یہ چھوٹا تھا' تب سے ہی میں نے اسے تربیت دی تھی کہ یہ میرا اشارہ پائے بغیر کوئی چیز نہ کھائے کیونکہ یہاں کسی کے لان اور سبزیوں کے باغیچوں وغیرہ کے گرد جنگلا یا دیوار نہیں ہے۔ ان جگہوں پر کیڑے مار اور دوسری زہریلی دوائیں بھی پڑی رہتی ہیں' اس لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس وقت کتا کیا کھا جائے۔"

"فریڈ شرمن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کئی لوگ اس پر شبہ کا اظہار کر رہے ہیں۔" جیک بولا۔

"میری ذاتی رائے میں وہ غصیلا ضرور ہے اور کتوں پر برہم بھی ہوتا ہے لیکن اتنا سنگدل نہیں ہے کہ انہیں زہر دینے لگے۔ تم نے اس سے بات کی؟"

جیک اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ قسمیں کھاتا ہے کہ اسے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔ اس پر..... یا کسی اور پر باضابطہ الزام لگانے کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ اس ایک بلاک کے اندر اندر پانچ کتوں کو زہر دے کر ہلاک کیا جاچکا ہے اور کوئی سراغ نہیں مل رہا کہ کون ایسا کر رہا ہے۔"

"یا کیوں ایسا کر رہا ہے؟" میں نے لقمہ دیا۔

"میرے خیال میں اس کے تین جواز ہی ممکن ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی اس حصے کو کتوں سے پاک کر رہا ہے تاکہ بعد میں اطمینان سے گھروں میں چوریاں کرسکے۔ اسے کتوں کے بھونکنے' کاٹنے کا اندیشہ نہ رہے۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کتے کسی کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ان کے بھونکنے سے کسی کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کسی کو ویسے ہی کتوں سے نفرت ہے جو اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ انہیں ہلاک کرنے پر تل گیا ہے۔"

جیک نے امکانات کا جائزہ تو درست انداز میں لیا تھا لیکن اس کے چہرے پر بے زاری تھی اور وہ تمام گفتگو نہایت بے دلی سے کر رہا تھا۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا "کیا تمہیں پولیس کی ملازمت پسند نہیں ہے؟"

"دراصل پولیس کی ملازمت ویسی ثابت نہیں ہوئی جیسی مجھے توقع تھی۔" اس نے اعتراف کیا۔ "میرا خیال تھا کہ اس ملازمت کے دوران مجھے ہر قدم پر ہیجان' سنسنی اور ایک نئے امتحان کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ابھی تک میں نے سوائے گاڑیوں کے چالان کے چند ٹکٹ کاٹنے اور بچوں کو گلیوں میں فٹ بال کھیلنے سے منع کرنے کے کچھ نہیں کیا۔ ابھی تک مجھے کوئی قابلِ ذکر کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اب مجھے کتوں کے قاتل کو تلاش کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ فلموں اور ڈراموں میں تو پولیس والے کی زندگی بڑی دلچسپ نظر آتی ہے۔"

"ہمارا شہر ذرا چھوٹا اور پُرسکون ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اتنے عرصے میں مجھے ایک آدھ مشکل کیس تو حل کرنے کے لیے ملنا چاہیے تھا۔ کوئی قتل وغیرہ کا معاملہ ہوتا....." اس نے حسرت بھرے انداز میں گہری سانس لی اور دوبارہ تفتیش کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس چوہے مار دوا وغیرہ تو موجود نہیں ہے؟ کیونکہ طبی ماہرین کا خیال ہے کہ ان کتوں کو چوہے مار زہر سے ہلاک کیا گیا تھا۔"

"مجھے کبھی چوہوں نے تنگ نہیں کیا اس لیے میں نے چوہے مار دوا اپنے ہاں رکھنے کی زحمت نہیں کی۔" میں نے جواب دیا۔

جیک نے تفتیش ختم کر دی اور میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگیا۔

اس روز آدھی رات تک مجھے نیند نہیں آئی۔ گرمی اور حبس کے باعث میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ میرے پیروں کی طرف قالین پر لیٹا ہوا ریکس بھی بے چین تھا۔

بالآخر میں نے بستر سے اُٹھتے ہوئے ریکس کو مخاطب کیا۔ "یوں کروٹیں بدلنے سے کیا فائدہ۔ چلو کچھ دیر چل کر برآمدے میں' کھلی ہوا میں بیٹھتے ہیں۔"

ریکس خوشی خوشی دُم ہلاتا میرے ساتھ چل دیا۔ باہر بہرحال اتنا حبس نہیں تھا۔ میں ایک لان چیئر پر بیٹھ گیا۔ ریکس میرے پیروں میں بیٹھ گیا۔ چاروں طرف سکوتِ شب پھیلا ہوا تھا' صرف جھینگروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

دفعتاً ریکس نے تھوتھنی اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھا' بہ دقت اپنی جگہ سے اُٹھا اور برآمدے کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ پہلے میں نے اسے واپس بُلانے کا ارادہ کیا پھر سوچا کہ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھوم پھر لے تو اچھا ہی ہے۔ وہ اب کبھی کبھار ہی اکیلا گھر سے نکلتا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ میری اجازت کے بغیر وہ کچھ نہیں کھائے گا۔ دوسرے اس وقت گلی میں کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا۔

میں نے ریکس کو والٹ آرمر کے گھر تک پہنچتے دیکھا' پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ماضی قریب میں اسے بھی بیکی کی محبت اور شفقت حاصل رہی تھی۔ شاید وہ بے چارہ بیکی کی تلاش میں ہی اس گھر تک گیا تھا۔ شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ بیکی اب اس گھر میں نہیں تھی۔ اگر ہوتی تب بھی وہ اس وقت تو اسے خوش آمدید نہیں کہہ سکتی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ مایوس ہو کر وہ خود ہی واپس آجائے گا۔

اسے میری نظر سے اوجھل ہوئے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آرہا تھا کہ اسے جانے نہیں دینا چاہیے تھا۔ پانچ کتے پہلے ہی ہلاک ہوچکے تھے۔ مجھے خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔

دفعتاً ریکس کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھا اور والٹ آرمر کے گھر کی طرف لپکا۔ گھر کے سامنے وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اسے پکارا لیکن اس کی طرف سے کوئی

ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں گھوم کر جلدی سے مکان کے عقب میں پہنچا۔ والٹ کے عقبی لان پر گھاس اور پودے جھاڑ جھنکاڑ کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں جھینگروں کا شور زیادہ بلند تھا۔

باغیچے کے ایک گوشے سے مجھے ریکس کی غراہٹ سنائی دی۔ میں رکوع کی سی حالت میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ ملگجے سے اندھیرے میں دو پرچھائیاں دیکھ کر میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ایک پرچھائیں انسان کی تھی۔ وہ آگے کو جھک کر کوئی چیز دکھا کر ریکس کو قریب بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری پرچھائیں ریکس ہی کی تھی۔ وہ تیزی سے زمین پر پنجے مار رہا تھا۔

اس شخص کی پشت میری طرف تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نیچی آواز میں کتے کو بلا رہا تھا۔ "آؤ.... آؤ.... یہ کھالو.... بڑا اچھا گوشت ہے.... کھالو۔"

ریکس نے تھوتھنی اٹھا کر ہوا میں سونگھا پھر قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اس شخص کی طرف بڑھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کتے کی طبیعت گوشت پر للچا رہی تھی۔ وہ اس شخص کے بڑھے ہوئے ہاتھ کے عین قریب جا پہنچا تب میں بے اختیار چلا اٹھا۔ "ریکس! کچھ مت کھانا۔"

وہ شخص تیزی سے میری طرف گھوما اور تب میں نے دیکھا' وہ والٹ آرمر تھا!

"تم....؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "تم نے ہی خود اپنے.... اور دوسروں کے کتوں کو ہلاک کیا تھا؟"

"تم غلط سمجھ رہے ہو نیڈ!" وہ بولا۔ آہستگی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے زمین سے ایک بیلچا اٹھالیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تو ریکس کو ویسے ہی کچھ کھانے کے لیے دے رہا تھا۔ یہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت پیارا کتا ہے۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے میں یہاں بیٹھا تھا کہ یہ بھی آن پہنچا۔ میں تو اسے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔"

وہ بات تیزی سے کر رہا تھا لیکن حرکت آہستگی سے کر رہا تھا۔ نہایت غیر محسوس سے انداز میں وہ میرے قریب آرہا تھا۔ میں سحر زدہ سی حالت میں ساکت کھڑا تھا اور چاہنے کے باوجود حرکت نہیں کر رہا تھا۔ شاید میں سوچوں کہ میں کچھ زیادہ ہی الجھ کر رہ گیا تھا۔ کیا واقعی والٹ نے ہی پانچوں کتوں کو ہلاک کیا تھا.... اور اب ریکس کو بھی زہر دینے کی فکر میں تھا؟ لیکن کیوں؟ وہ کیوں انہیں زندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا؟

پھر میری نظر زمین کے اس حصے پر پڑی جسے ریکس کھودنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا' آج صبح ہی میں نے کونی کے کتے مونی کے پنجوں پر بھی مٹی لگی ہوئی دیکھی تھی۔ اچانک ہی جیسے سب کچھ میری سمجھ میں آگیا اور مجھے حیرت ہونے لگی کہ اتنی صاف سی بات ابھی تک ہم میں سے کسی کی بھی سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی؟

اچانک میں گویا ہڑبڑا کر کسی خواب سے بیدار ہوا۔ والٹ بیلچا ہوا میں بلند کر چکا تھا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اسی لمحے ریکس نے والٹ کی ٹانگ جبڑے میں دبوچنے کی کوشش کی۔ بیلچے کا رُخ بدل گیا اور وہ میرے بجائے ریکس کی پسلیوں سے ٹکرایا۔ ریکس زمین پر گر پڑا اور وہیں ساکت ہوگیا۔

"بچاؤ.... بچاؤ...." میں چیختا ہوا گلی کی طرف دوڑا۔

مکانوں میں بتیاں روشن ہونے لگیں۔ میں نے مونیکا' جون اور فریڈ کو یکے بعد دیگرے گلی میں نمودار ہوتے دیکھا لیکن میں دوڑتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ چکرا کر گر پڑا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

دوسرے روز سہ پہر کو پولیس آفیسر جیک اسپیڈ میرے قریب بیٹھا ریکس کا سر سہلا رہا تھا۔ ریکس نہایت وقار اور متانت سے بیٹھا تھا۔ اس کی پسلیوں پر ایک چوڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی تاہم وہ ٹھیک ٹھاک ہی نظر آرہا تھا۔

جیک بولا۔ "نیڈ! یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت زندہ نظر آرہے ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن مجھے کئی ہفتے پہلے حقیقت کو سمجھ جانا چاہیے تھا۔ ریکس کو زمین کھودنے کی کوشش کرتے دیکھ کر بات میری سمجھ میں آئی۔" میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "تمام کتوں کو بیکی آرمر سے محبت تھی۔ وہ اس کی بو سونگھتے ہوئے اس مقام تک پہنچے تھے جہاں وہ دفن تھی اور کھود کر اسے نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ والٹ کے لیے ایک سنگین مسئلہ تھا' اس لیے اسے یکے بعد دیگرے تمام کتوں کو ہلاک کرنا پڑا۔"

"شاید وہ صاف بچ جاتا۔ اس پر نہ تو کسی کو بیکی کے قتل کا شبہ ہوا تھا اور نہ ہی کتوں کے قتل کا۔" جیک بولا۔

"ہم سب یہی سمجھتے تھے کہ وہ صدمے کے باعث ہر وقت مضمحل' تھکا ماندہ اور بیمار بیمار سا دکھائی دیتا ہے لیکن درحقیقت بیکی کے مدفن کی نگرانی کرتے کرتے اس کی بُری حالت ہو چکی تھی جبکہ گلی کا ہر کتا اسے کھود ڈالنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس نے بیکی کو قتل کر کے دفن کیا تھا اور کتوں کی وجہ سے اس راز سے پردہ اٹھنے کا خطرہ تھا۔ آخر کار وہ اس خطرے سے بچ نہیں سکا۔" میں نے اپنے گھٹنے سہلاتے ہوئے گہری سانس لی۔ "بہرحال.... والٹ اتنا احمق نہیں تھا جتنا ہم اسے سمجھتے تھے۔ اسے اپنی بیوی کی حرکتوں کا علم تھا۔"

"پولیس اسٹیشن پہنچ کر اس نے جلد ہی اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔" جیک نے بتایا۔

"آخر کار قتل کا کیس تمہارے حصے میں آہی گیا۔" میں نے کہا۔ "اب تم کیا محسوس کر رہے ہو؟"

جیک سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے' گاڑیوں کے چالان کے ٹکٹ کاٹنا بہرحال قتل کی تفتیش وغیرہ سے بہتر کام ہے۔"

THE CANINE VIGIL
PATRICK SCAFETTI

زندہ کرداروں پر مشتمل ایک روایت شکن سلسلہ

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ

احمد اقبال کے شرربار و شبنم فشاں قلم سے

معاشرے کے اُن ناسوروں کی
رُوداد جو گوشت و پوست سے گزر کر
انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش
نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت
کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن
سلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و
ہراس، تلخ حقیقتیں
شیریں خواب

Scanned By: AMAN MUSTAFA 0333-4585215

قسط نمبر: 131

سکندر بخت میرا نام ہے۔ بچپن میں مجھے کبیر خان بھی کہا جاتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو میرے والد وزیر خان کے سوا تمام افرادِ خانہ شہید ہوگئے۔ والد نے لاہور میں معمولی کاروبار سے نئی زندگی کا آغاز کیا پھر ایک حصہ دار میر شرافت علی کے ساتھ وزیر اینڈ کمپنی قائم کی جو زرعی آلات بناتی تھی۔ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجا گیا۔ چار سال بعد مجھے رُسوا کن حالات میں برطانیہ سے نکلنا پڑا۔ پاکستان پہنچ کر مجھے والد کی دردناک موت سے منسوب پُراسرار حالات کا علم ہوا۔ وہ بدستور صنعت کار تھے مگر انتہائی مفلسی کا شکار رہے اور انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میرے پیچھے ان پر کیا گزری۔ پھر ان کا پارٹنر میر شرافت علی قتل ہوا اور اس جرم میں مجھے ملوث کرلیا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد کی کمپنی کا میرا حصے دار چوہدری دلاور ایک وطن دشمن اسمگلر ہے جو مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو اسلحہ فراہم کرتا ہے۔ اس غدار کے دوسرے ساتھیوں میں ایک بدمعاش استاد پیڈرو ' ایک بدعنوان ایس پی سراج ' ایک بدکردار سابق نواب خسرو جمشید اور اس کا منیجر ڈی سلوا تھے۔ میری مدد میرے بچپن کے دوست محسن نے کی۔ پہلے عبدالودود منظر نام کے ایک ایڈووکیٹ نے میرے مقدمے کی پیروی کی لیکن پھر رابعہ قاری ایڈووکیٹ نے قانونی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ رابعہ سے میرا تعلق ایک عشق بلاخیز میں بدل گیا اور اس نے میرا ساتھ نبھانے کی بھاری قیمت ادا کی۔ ہماری ذاتی دشمنی اب وطن دشمن عناصر کے خلاف ایک جدوجہد بن چکی تھی۔ حالات سخت سے سخت تر ہوتے گئے اور ہمارا ساتھ دینے والوں میں ایک صحافی مرزا غالب ' ایک لڑکی شہلا جو بعد میں محسن کی شریکِ حیات بنی ' فرض شناسی کے جرم میں نکالا جانے والا ایک انسپکٹر اکرام شیخ اور اس کی فتنہ ساماں بہن نازو بھی شامل ہوگئے۔ ہم نے اپنی تنظیم کا نام ایم آر ایس (مائٹ از رائٹ سوسائٹی) رکھا کیونکہ ہمارے نزدیک معاشرے کے ان مجرموں کا علاج قانون کے پاس نہیں تھا۔ وہ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتے تھے لیکن ہم ان کو انہی کے طریقوں سے شکار کرنے لگے تھے۔ اس جنگ میں ہمارا ایک ساتھی ٹیڈی اور دوسرے بہت سے بے گناہ ' سچے اور محبِ وطن لوگ مارے گئے تو ہم نے بھی وطن فروشوں کے بہت سے ٹھکانے تباہ کئے۔ خسرو جمشید اور ڈی سلوا کے علاوہ بھی ہم نے بہت سے غداروں اور غیر ملکی ایجنٹوں کو ٹھکانے لگایا۔ اب ہماری زندگی کا مقصد ہی ان معاشرے کے ناسوروں سے برسرِ پیکار رہنا ٹھہرا۔ خواہ اس راستے میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

گزشتہ قسط کا خلاصہ

میں تیزی سے چوہدری دلاور اور پیڈرو کی طرف لپکا اور ایک تیز رفتار کار کے نیچے آتے آتے بچا۔ پیڈرو مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اندر کوٹھی میں گھس گیا تھا مگر میں نے اسے پکڑلیا اور مار مار کے بُرا حال کردیا۔ اچانک مجھے رابعہ کا خیال آیا۔ وہ میرے پیچھے آرہی تھی مگر اب تک اندر نہیں پہنچی تھی۔ میں پیڈرو کو ایک غسل خانے میں بند کر کے رابعہ کی تلاش میں باہر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک پان والا اندر آگیا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ رابعہ کو چوہدری دلاور اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ میں نے اشتعال کی حالت میں پیڈرو کو پھر مارا اور قریب تھا کہ میں اسے ہلاک کر دیتا' اچانک ایک سب انسپکٹر اور تین چار کانسٹیبل کھڑکی سے کود کر اندر آگئے۔ انہیں چوہدری دلاور نے بھیجا تھا۔ پولیس والوں نے مجھے لے جا کر حوالات میں بند کردیا۔ دوسرے روز صبح چار بجے ایک شخص رفیق مجھے حوالات سے اپنے ساتھ کسی وزیر کی کوٹھی میں لے گیا جہاں چوہدری دلاور پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے پھر وہی پیشکش کی جو پہلے بھی کرچکا تھا کہ میں اس سے مصالحت کرلوں۔ اس نے میرے تمام کیسوں کی فائلیں میرے سامنے ڈال دیں اور کہا کہ یہ سب کیس ختم ہوسکتے ہیں مگر اس شرط پر کہ آئندہ میں اس کا راستہ نہ روکوں۔ اس نے مجھے ایک روز سوچنے کی مہلت دی۔ اس کے کہنے پر رفیق مجھے یوسف کے گھر چھوڑ گیا جہاں سب میرے انتظار میں تھے۔ غالب اور نازو نے یہ بتا کر مجھے پریشان کردیا کہ رابعہ ان سے بات نہیں کرنا چاہتی اور شاید مجھ سے بھی نہ کرے۔ میں نے منظر کے گھر فون کیا تو رابعہ اپنے آفس جاچکی تھی لہٰذا میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ دروازے پر مسلح چوکیدار کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اس نے اور ایک وکیل نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں انہیں دھکا دے کر رابعہ کے کمرے میں گھس گیا لیکن رابعہ نے واقعی مجھ سے بات نہیں کی۔ اس کا رویّہ میرے لیے بہت حوصلہ شکن اور مایوس کن تھا۔ میں انتہائی مایوسی اور اشتعال کے عالم میں واپس آگیا کہ رات کو اس سے گھر آنے پر بات کروں گا۔ میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک رفیق نے آواز دے کر مجھے روک لیا اور ایک سیاہ مرسیڈیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ کوئی خاتون مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ گاڑی میں ایک انتہائی حسین و جمیل خاتون بیٹھی تھی۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور خود کو دلاور کی بہن بتایا۔ اس کا نام غزالہ تھا۔ میں پہلے ہی بہت پریشان تھا' اس کے اس انکشاف نے مجھے مزید پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اچانک میں نے اس عورت کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں اس کی گاڑی میں بیٹھا تو میں نے رابعہ کو اپنے آفس کی گیلری میں کھڑے دیکھا۔ اس کی نظریں مجھ پر تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ رو رہی ہے۔ میں نے چاہا کہ دروازہ کھول کر اُتر جاؤں مگر اس وقت تک مرسیڈیز آگے بڑھ چکی تھی۔

اب آپ مزید واقعات کا مطالعہ کیجئے

میرے ذہن میں بے یقینی' خوف اور انتشار کی آندھی چل رہی تھی جس میں میرا وجود کسی تنکے کی طرح بھٹک رہا تھا۔ بے رحم خیالوں کی دھول نے مجھے اندھا کردیا تھا اور میرے گرد مایوسی کا دل شکن اندھیرا محیط تھا۔ میں اس بچّے کی طرح محسوس کررہا تھا جو اجنبی شہر کی بھیڑ میں کھوجائے اور سہم کر کسی بھی اجنبی کی انگلی پکڑلے۔ یہ سوچے اور جانے بغیر کہ وہ اجنبی اسے دوبارہ زندگی کے گم کردہ رشتوں کی منزل تک پہنچائے گا یا اس جنگل میں چھوڑ آئے گا جہاں سے جرم اور گناہ کے تاریک راستوں کا سفر شروع ہوتا ہے۔

چوہدری دلاور کی دھمکی نے اور رابعہ کی بے رحمی نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو اس حد تک مفلوج کردیا تھا کہ میں آسانی سے رفیق کی دوستانہ سازش اور غزالہ کی سحر آفریں شخصیت' درد آشنائی کے دعوے اور تعاون کی پیش کش کے خلاف مزاحمت نہ کرسکا۔ شاید یہ ایک منفی ردِّعمل تھا۔ اس شخص کی طرح جو غصے کے ساتھ بے بسی اور فرسٹریشن کے ساتھ مایوسی کا شکار ہوکے اپنے تفکرات کو جامِ شراب یا کسی بھی نشے کی کیفیت میں بھول کے سکون اور تقویت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہے' جھوٹے' کمزور سہاروں پر انحصار کی عادت بالآخر آدمی کو اعتماد سے محروم کردیتی ہے۔

غزالہ کی ہپناٹائز کردینے والی نرم آواز میرے کانوں تک یوں آئی جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم۔ جیسے نیند کی ترسی ہوئی بوجھل آنکھوں پر ماما کے رس میں ڈوبی ہوئی لوری کے سُر اُتریں۔ سوکھی کھیتی پر برکھا رُت کا سندیسہ لانے والی پھوار گرے۔

"آخر اتنے پریشان کیوں بیٹھے ہو۔ ٹیک اٹ ایزی۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا "یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔۔۔ میرا مطلب ہے میں نے۔۔۔"

وہ مسکرائی اور اس نے آہستہ سے میرے شانے پر ایک ہاتھ رکھا۔ اس کے غیر معمولی لمبے' گھنے کالے بال اس کی پشت پر ایک ریشمی ڈھیر کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور ہوا کے ساتھ اپنی خوشبو اُڑا رہے تھے۔ اس کی ٹھوڑی سے گردن کے زیریں حصے تک ایک قوس سی بنتی تھی۔ اجلی' بے داغ اور نرم و نازک جلد پر پھسلنے والی نظر بے اختیار بلاؤز کے چاک گریبان تک پہنچ کے تشنہ رہ جاتی تھی۔

خشک لبوں پر زبان پھیر کے میں نے ایک لمبی سانس لی اور خود کو سیٹ کی پشت پر گرادیا۔ ابھی تک میں سیٹ کے کنارے پر یوں بیٹھا تھا جیسے موقع پاتے ہی دروازہ کھول کے باہر کود جاؤں گا۔ میں واقعی بہت TENSE تھا اور بالکل نامعلوم طور پر احساسِ جرم کی ندامت میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ حالانکہ اس کی وجہ کوئی نہیں تھی۔ بس مجھے احساس تھا کہ اچانک سب کچھ غلط ہونے لگا ہے اور ہر بار کسی غلطی کا سلسلہ تقدیر کی ستم ظریفی سے شروع ہوتا ہے تو میری تدبیر کی کوتاہ اندیشی سے منسوب ہوجاتا ہے۔ چوہدری دلاور اور

سینٹ اینڈریوز سرکس کے علاقے میں ڈیوٹی کرنے والا کانسٹیبل ہمیشہ سخت وقت گزارتا تھا۔ جب تیز دھوپ نکلی ہو تو یہ ڈیوٹی اور سخت ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اے ٹو ساحلی سڑک کا تمام ٹریفک بھی ادھر ہی سے گزرتا ہے۔ تین مختلف راستے سینٹ اینڈریوز سرکس کی طرف آتے ہیں۔ ناکافی حد تک چوڑی ویکو اسٹریٹ سے گزرنے کے بعد کہیں اولڈ کینٹ روڈ پر ٹریفک کو کچھ آزادی حاصل ہوتی ہے۔

کانسٹیبل وشنی کو صرف گرمی ہی نہیں ستا رہی تھی، سارجنٹ مور ٹیمر کی بلاوجہ کی ڈانٹ پھٹکار زیادہ تکلیف دہ تھی۔ "گاڑیوں کو حرکت میں رکھو۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں سارجنٹ

قتل کی ایک واردات کی دلچسپ سراغ رسانی اور قانون کے محافظوں کی پریشانی

قانون کی لچک دار ڈوری سے بندھے مجرم اگر ضمانت پر رہا ہو جائیں تو اپنے خلاف گواہی دینے والوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون کے محافظوں کی ان تمام کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے جو انہوں نے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کی تھیں۔ اس پولیس آفسر کا قصہ جو عدالت کے اس رویے سے شاکی تھا۔

سود مند

غلط فہمی

شگفتہ شام

Scanned By: ATAUL MUSTAFA 0333-4585215

مور ٹیمر کے الفاظ دُہرائے۔ پھر بڑبڑایا۔ "کیسے حرکت میں رکھوں جبکہ حرکت کرنے کے لیے گاڑیوں کو جگہ ہی میسّر نہیں۔ اگر یہ روس ہوتا یا امریکا...." اس نے تصور میں خود کو کمر سے ہولسٹر باندھے لیموزین کاروں کے ایک سیلاب کو اپنے اشاروں کے زور پر چار ٹریک والے ہائی وے پر رواں دواں دیکھا۔ "یہ ملک....." وہ پھر بڑبڑایا "....اس ملک کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ یہ سو سال پیچھے ہے۔"

ایک چھوٹی گاڑی، جسے ایک تھکا ماندہ ٹٹو گھسیٹ رہا تھا، کھٹ کھٹ کرتی چوراہے سے گزر رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک لاری تھی، جس سے ایک ٹرالر منسلک تھا۔ پھر سائیکلوں پر سوار چھ لڑکیاں تھیں.... وھٹنی نے سوچا، دو بجنے والے ہیں۔ دو بجے کہیں جان چھوٹے گی میری۔

اس نے ہاتھ بلند کرکے آتی ہوئی کار کو رکنے کا اشارہ کیا پھر اس نے سینٹ اینڈریوز روڈ کے منتظر ٹریفک کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ایک ڈیلیوری وین اور ایک کھلی کار اسٹاپ لائن سے آگے بڑھیں۔ ان کے پیچھے ایک سیلون کار تھی۔ کار کے نزدیک جو ایک وین تھی، اچانک بند ہوگئی۔ وھٹنی نے اور تندہی سے اشارہ کیا لیکن وین بدستور کھڑی رہی۔

"لگتا ہے، انجن بند ہوگیا ہے۔" کانسٹیبل وھٹنی نے تشخیص کیا۔ "کیسا منحوس دن ہے۔ اتنا ٹریفک اور اس پر ایسے موقعے پر یہ اُفتاد۔ آخر یہ سبھی کچھ میرے ہی ساتھ کیوں ہوتا ہے۔"

وہ لمبے ڈگ بھرتا اس منحوس گاڑی کی طرف بڑھا۔ وہ ایک پُرانا، پیچھے سے کھلا پندرہ ہنڈرویٹ والا ٹرک تھا۔ وھٹنی نے ڈرائیور کے کمپارٹمنٹ میں سر ڈالا۔ "اگر تم اسے اسٹارٹ نہیں کرسکتے تو تمہیں اسے دھکا لگانا پڑے گا۔" اس نے کہا۔

پھر وہ بری طرح چونکا۔ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا خالی پن تھا اور پیشانی کی سائیڈ کی طرف ایک صاف ستھرا سوراخ تھا، جس سے اب خون باہر نکلنے ہی والا تھا۔

❋❋❋

انسپکٹر پٹریلا کو اس وقت احساس نہیں ہوا کہ وہ واردات سے ذرا ہی پہلے سینٹ اینڈریوز سرکس سے گزرا ہے۔ وہ ڈنریون اسٹریٹ پر پیدل چل رہا تھا۔ اس سڑک کو جنگ کے زمانے میں بمباری سے تباہ ہونے والی ایک بہت بڑی عمارت، سرکس سے جُدا کرتی ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اسے ساؤتھ بارو اسکول کے کچھ لڑکے دیوار پر بیٹھے نظر آئے۔ اندر کرکٹ ہو رہی تھی۔ پٹریلا نے کھیلنے والوں کو کن انکھیوں سے دیکھا، وہ سب جوان لوگ تھے.... لیکن نوجوان نہیں۔ شاید پرنٹنگ پریس میں کام کرنے والے تھے۔

سرخ بالوں والے بالر نے سر اٹھایا تو پٹریلا کو احساس ہوا کہ وہ اسے پہچانتا ہے۔ وہ اس وقت ایک ضروری اور اہم ملاقات کے لیے جارہا تھا اور رک نہیں سکتا تھا مگر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ساؤتھ بارو سیکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ویدرال سے اس سلسلے میں ضرور بات کرے گا۔ کیونکہ بمباری سے تباہ ہونے والے کچھ مقامات مخدوش بھی تھے اور کھیل کے میدان کی حیثیت سے نامناسب تھے۔ مسٹر ویدرال، پٹریلا کے فلیٹ کے اوپر والے فلیٹ میں رہتے تھے۔

پٹریلا کو روپر نامی ایک شخص سے خفیہ نوعیت کی ملاقات کرنا تھی۔ روپر صبح کے وقت اپنی ڈیلیوری وین چلاتا تھا۔ شام کو وہ اخبار بیچتا تھا لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ تمام وقت اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا تھا۔ اسی لیے وہ پولیس کا ایک کامیاب مخبر بھی تھا۔ پٹریلا کی مخبروں کی فہرست میں اس کا ایک ممتاز مقام تھا۔ وہ بہت مہنگا مخبر تھا لیکن اس کی فراہم کردہ اطلاعات عام طور پر بالکل درست ہوتی تھیں۔

پٹریلا بڑے تحمل سے پورے ایک گھنٹے تک روپر کا انتظار کرتا رہا۔ مایوس ہوکر وہ باہر آیا تو ایک پولیس کار نے اسے دیکھ لیا اور دوبارہ گیبریل اسٹریٹ پہنچا دیا۔ اس کا افسر سپرنٹنڈنٹ بجمن اور بجمن کا افسر چیف سپرنٹنڈنٹ ٹام اس کے کمرے پر قبضہ کیے بیٹھے تھے۔

"میرا خیال ہے، روپر کو تم خود استعمال کررہے تھے؟" ٹام نے پٹریلا سے پوچھا۔ اس کا قد پولیس والوں کے کم سے کم مقررہ قد سے آدھا انچ کم تھا۔ تمام جرائم پیشہ لوگ اسے مانوبلی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

"جی ہاں سر۔ آج لنچ ٹائم میں میری اس سے ملاقات طے تھی مگر وہ نہیں آیا۔" پٹریلا نے جواب دیا۔

"وہ تمہیں کچھ اطلاعات فراہم کرنے والا تھا؟"

"وہ بورنرز ڈکیتی کیس کے متعلق کچھ بتانے والا تھا۔"

"اب وہ کچھ نہیں بتا سکے گا۔" ٹام نے کہا۔ "دو بجے سے کچھ پہلے کسی نے اسے شوٹ کردیا۔ گولی اس کی کنپٹی کے قریب لگی۔ میں نے اتنا صاف ستھرا سوراخ کم ہی دیکھا ہے۔ کام کرنے والے نے بڑی نفاست سے کام دکھایا ہے۔ روپر کی لاش.... اس کی وین ہمیں میسّر ہے۔ ایک ہزار کے قریب افراد ہیں، جن سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ بس یہی ہے اپنا اثاثہ۔"

"یہ سب کچھ شام کے اخبارات میں شائع ہوگا۔" بجمن نے کہا۔ اسے ہر طرح کی پبلسٹی سے نفرت تھی۔ "بلکہ اب تو شاید اخبارات اسٹال پر بھی آچکے ہوں گے۔"

"اگر ایسا ہوا تو اس میں کوئی برائی نہیں۔" ٹام بولا۔ "ہم پبلک سے تعاون کی اپیل کریں گے۔ ہم کہیں گے کہ لوگ آگے آئیں اور ہمیں کام کی جو معلومات فراہم کرسکتے ہیں، کریں۔ یہ ان کا فرض ہے۔ بلکہ ہم بی بی سی سے اعلان بھی نشر کرائیں گے اس

سلسلے میں۔"

"بیانات کہاں لیے جائیں گے؟" پٹریلا نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے' یہ اسٹیشن ہی مناسب رہے گا۔" ٹام نے کہا۔ "اس میں سب کے لیے سہولت ہے۔ لوگوں سے ملاقات کے لیے تمہارا کمرا بے حد موزوں ہے۔"

پٹریلا کو یہی ڈر تھا۔

اخبارات' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے کی جانے والی اپیل کا زبردست نتیجہ نکلا۔ دو دن تک اسٹیشن پر آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ان میں کچھ جھوٹے تھے' کچھ کھسکے ہوئے تھے اور کچھ ایسے تھے' جو اس وقت واقعی سینٹ اینڈریوز سرکس میں موجود تھے۔

سارجنٹ شوا سمتھ جو ہر کام ترتیب اور تنظیم سے کرنے کا عادی تھا' اس قسم کی ایمرجنسی میں بے حد کارآمد ثابت ہوتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر ایک منصوبہ پیش کردیا۔ ایک نقشہ بنایا گیا اور اسے دیوار پر آویزاں کردیا گیا۔ اس نقشے پر مختلف رنگوں کے حوالوں سے تمام گواہوں کی پوزیشن لگا دی گئی۔ جن کے دعوے کی تصدیق نہیں ہوسکتی تھی' انہیں کالا رنگ الاٹ کیا گیا۔ سبز رنگ ان لوگوں کے لیے تھا' جنہیں کسی اور نے بھی دیکھا ہو۔ اور جنہیں دو یا دو سے زائد لوگوں نے سینٹ اینڈریوز سرکس میں موجود دیکھا تھا' ان کے لیے سرخ رنگ تھا۔

پہلے روز سہ پہر کے وقت ایک جوان آدمی اسٹیشن آیا۔ اس نے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے کچھ تصویریں برآمد کیں۔ "میں روزنامہ دی کلارین سے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میرے ایڈیٹر کا کہنا ہے کہ آپ ان تصویروں کو دیکھنا یقیناً پسند کریں گے۔"

پٹریلا نے تصویروں کا جائزہ لیا۔ "بے شک..... یہ دلچسپ تصویریں ہیں۔" اس نے کہا "یہ تمہیں کیسے ملیں؟"

"ہمارے اخبار میں ایک سیریز چھپ رہی ہے..... لندن ٹریفک کی پیشانی پر سیاہ داغ۔ پچھلے ہفتے ہم نے چیئرنگ کراس کو کور کیا تھا۔ یہ ہفتہ سینٹ اینڈریوز سرکس کے نام تھا۔ ہے نا عجیب اتفاق!"

"تو کیا یہ تصویریں واقعی.....؟"

"جی ہاں۔ یہ تصویریں لگ بھگ اسی وقت کی ہیں' جب قتل کی وہ واردات ہوئی۔ ہم نے بارہ اور دو بجے کے درمیان کافی تصویریں کھینچی تھیں۔ دوسرا راؤنڈ پانچ اور سات بجے کے درمیان ہوا' پہلی سیریز کی آخری تصویروں میں آپ کے لیے دلچسپی کا سامان ہوگا۔ یہ دیکھیں..... یہی ہے نا وہ شخص۔"

پٹریلا' سارجنٹ شوا سمتھ اور کانسٹیبل ولموٹ تصویروں کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ تصویریں غیر معمولی تھیں۔ ایسا تھا' جیسے آپ کوئی خواب دیکھیں اور اس کی تصویریں اگلے روز اخبارات میں دیکھ کر حیران ہوں۔ وہ تصویروں کو نقشے کی طرف لے گئے۔

"یہ وہ سیلون کار ہے۔" پٹریلا نے کہا۔ "اور وہ پیچھے بس کی ناک بھی نظر آرہی ہے۔ وہ دھٹنی ہے۔ دوسری طرف کے ٹریفک کو گزرنے کا اشارہ کررہا ہے۔ لگتا ہے' اسے گرمی لگ رہی ہے۔"

سارجنٹ شوا سمتھ نے کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ داڑھی والا جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ڈیڑھ بجے سے ڈھائی بجے تک کلاک کے نیچے کھڑا رہا تھا۔ اب دیکھ لو' وہ کسی تصویر میں بھی موجود نہیں ہے۔ یہ وہ عورت ہے' جو اسے کمیونسٹوں کی حرکت قرار دے رہی تھی۔ اور یہ وہ شخص ہے..... چار کتوں والا۔"

"یہ..... یہ سائیکل ہے نا؟" پٹریلا نے کہا "دیکھو..... مڈگارڈ کا سامنے والا حصہ نظر آرہا ہے۔" اس نے نقشے کی طرف دیکھا۔ "یہ وہ اسکول کی طالبہ ہوگی۔ وہ جو کہہ رہی تھی کہ شاید اس نے فائر کی آواز سنی تھی۔ سنو..... یہ تصویریں تم نے کہاں سے لی ہیں؟" اس نے اخبار کے نمائندے سے پوچھا۔ "اس نقشے پر مجھے بتاؤ۔"

"وہ ایک آفس تھا۔" اخباری نمائندے نے جواب دیا۔ "ہمارا فوٹوگرافر عام طور پر کھڑکیوں سے استفادہ کرتا ہے۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوکر تصویریں کھینچنے کی کوشش کی جائے تو وہاں مجمع لگ جاتا ہے۔ ہاں..... میرے خیال میں یہ ہے وہ جگہ۔ یہ پہلی منزل کی کھڑکی ہے۔ فوٹوگرافر نے ٹیلی اسکوپک لینس استعمال کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تصویر میں بیک گراؤنڈ تو شارپ ہے لیکن پیش منظر قدرے دھندلا ہے۔"

"بھئی..... بہت شاندار تصویریں ہیں!" پٹریلا نے کہا۔ "یہ تصویریں ہمیں نہیں مل سکتیں؟"

"یہ تصویریں آپ ہی کے لیے بنوائی گئی ہیں۔ بس ایک التجا ہے۔ ان سے آپ کو کچھ فائدہ پہنچے تو خبر کے معاملے میں ہمیں ترجیح دیجیے گا۔"

"بے فکر رہو۔ کچھ معلوم ہوا تو ہم سب سے پہلے تمہیں بتائیں گے۔" پٹریلا نے کہا۔

❀❀❀

پٹریلا' سارجنٹ شوا سمتھ اور کانسٹیبل ولموٹ کی مدد سے عینی شاہدوں کی درجہ بندی کررہا تھا۔ اس دوران سپرنٹنڈنٹ بجمن

بہو میکے جاتے ہوئے اپنے بچے کو سسرال میں چھوڑ گئی۔ کچھ دنوں بعد سسرال سے ایک خط ملا۔

"جلدی چلی آؤ' تمہارے بغیر لڑکا اُداس رہتا ہے۔"

جلد ہی ساس کو بہو کا خط ملا۔ لکھا تھا۔

"مہربانی فرما کر صاف صاف لکھیے۔ کس کا لڑکا اُداس رہتا ہے۔ میرا یا آپ کا؟"

بونرز کی مصروفیات کے بارے میں چھان بین کر رہا تھا۔ موریس بونر سیاہ بالوں اور مغرور ناک والا خوبرو جوان تھا۔ "میں اور کرلی چارلی کلب میں اسنوکر کھیل رہے تھے۔" موریس نے بتایا "کوپر بھی وہاں موجود تھا۔ ہم نے ایک بجے کے قریب کھیل شروع کیا اور ڈھائی بجے تک کھیلتے رہے۔"

"کچھ زیادہ لمبا نہیں ہوگیا تھا گیم؟" بنجمن نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"جب کسی چیز میں آدمی کی دلچسپی ہو تو اس بات کی پروا کسے ہوتی ہے۔"

"اور کسی نے بھی دیکھا تھا تمہیں؟"

"آپ تو جانتے ہیں کہ چارلی کلب کتنی پرائیوٹ جگہ ہے۔ ہم چند ہی لوگ وہاں کھیلتے ہیں۔ ویسے میرے خیال میں سامی نے آکر جھانکا تھا ہمیں۔"

سام بونر نے جو اپنے بھائی سے زیادہ موٹا اور بظاہر خوش مزاج تھا' اس بات کی تائید کی۔ خود اس نے دوپہر کا بیشتر حصہ ہیری اور نک کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ لوگ تاش کھیلتے رہے تھے۔ لنچ کے وقفے میں یہ ان کا معمول تھا۔

"یہ بات طے ہوگئی کہ یہ اسی گروہ کا کام ہے۔" بنجمن نے کہا۔ "لیکن یہ بات ثابت کرنا کوئی آسان کام نہیں اور ان کے خلاف گواہی بھی کوئی نہیں دے گا۔ ان سے سب ڈرتے ہیں۔"

"ان دونوں بھائیوں کو تو میں جانتا ہوں۔" پٹریلا نے کہا۔ "نک اور ہیری سے بھی واقف ہوں' اور کون کون ہے اس گروہ میں؟"

"کرلی ہے..... اور سرخ بالوں والا کوپر ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا اور باصلاحیت باکسر تھا۔ مگر پھر ان لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا۔"

پٹریلا کی یادداشت میں کچھ سرسراہٹ سی ہوئی مگر فوراً ہی معدوم ہوگئی۔

"یہ کہنا بہت آسان ہے کہ روپر کو بونرز نے قتل کیا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ان کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔ اتنا ٹھوس کہ مجھے اس میں سے بدبو آرہی ہے۔" بنجمن نے کہا۔ "لیکن عدالت میں ایسے بات نہیں بنتی۔ پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ قتل کیسے کیا گیا۔ اے..... یہ تمہارے دانت کیوں نکلے پڑ رہے ہیں؟"

"یونہی..... میں کچھ سوچ رہا تھا۔" پٹریلا نے جواب دیا۔

❋❋❋

دوسری شام پٹریلا اور اس کے معاونین سامنے آنے والے متعدد امکانات پر غور کر رہے تھے۔ "میرا خیال ہے' اس نظریے کو تو بھول ہی جاؤ کہ کسی نے فٹ پاتھ سے فائر کیا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ بہت بڑا رسک تھا۔"

ولموٹ نے جو جوان بھی تھا اور سراغرسانی کی کہانیاں بھی بڑے شوق سے پڑھتا تھا' کہا "فرض کریں' قاتل نے اٹرگن کو چھتری کی طرح بنا رکھا ہو۔"

"لیکن ایسی بھری دھوپ میں کوئی چھتری لے کر کیوں نکلنے لگا؟"

"چلیں..... چھتری فرض کرلیں۔" ولموٹ نے عاجزی سے کہا۔

"فرض کرنے سے کام نہیں چلے گا۔" پٹریلا بولا۔ "ہم جانتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ سڑک کے دونوں طرف فٹ پاتھ پر موجود ہر شخص کا نام اور پتا ہمارے پاس موجود ہے۔ یہی نہیں' ہمیں معلوم ہے کہ کون کہاں سے آرہا تھا اور کہاں جارہا تھا۔ تمہارے خیال میں ان میں سے کوئی اپنی چھتری روپر پر تان سکتا تھا..... اس طرح کہ کوئی فٹ پاتھ پر چلنے والا اس غیر معمولی انداز کو دیکھ نہ پاتا؟"

"میں آپ سے متفق ہوں سر۔" سارجنٹ شوا سمتھ نے کہا۔ "ہماری تفتیش نے کسی راہ گیر کے فائر کرنے کو خارج از امکان ثابت کردیا ہے اور سامنے والی عمارتوں کی ہر کھڑکی کے مالک کو ہم بار بار چیک کرچکے ہیں۔"

"فرض کریں کہ قاتل آگ سے بچاؤ والے زینوں کے ذریعے چھت پر پہنچ گیا ہو اور....." ولموٹ بولا۔

"اور اس نے ڈرائیور کی سیٹ کے پار روپر کو اس طرح شوٹ کردیا ہو کہ سیٹ میں سوراخ بھی نہ ہو۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ روپر نے کھڑکی سے باہر سر نکالا ہو....." ولموٹ نے ایک اور دلیل دی۔

"بالکل ممکن ہے۔" پٹریلا نے بے حد تحمل سے کہا کیونکہ وہ ولموٹ کو پسند کرتا تھا۔ "لیکن چھت پر موجود رائفل بردار کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ روپر کس وقت' کس موقع پر بے حد درست زاویے سے اپنی کنپٹی اس کے سامنے پیش کرے گا؟"

"میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں سر....." شوا سمتھ نے کہا "..... کہ قاتل بھی کسی گاڑی میں سوار تھا۔ یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ روپر ہر روز شام کے اخبارات خریدنے کے لیے ڈپو جاتے ہوئے اسی راستے سے گزرتا تھا۔ یہ بھی طے تھا کہ سینٹ اینڈریوز سرکس پر وہ ٹریفک میں پھنسے گا۔ قاتل کو بس اتنا کرنا تھا کہ درست لمحے پر اپنی گاڑی میں روپر کے پیچھے یا سائیڈ میں موجود ہو اور جس وقت سگنل ملے اور ٹریفک چلے' روپر کو شوٹ کرتا ہوا آگے نکل جائے۔ معاملات سمجھ میں آتے آتے وہ کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوگا۔"

"شاندار..... بہت خوبصورت۔" پٹریلا نے کہا "اب یہ بھی بتا دو کہ تمہارا ذہن کس گاڑی کی طرف جاتا ہے؟ میرا خیال ہے' تمام گاڑیوں کی شناخت ہوچکی ہے۔"

"ہاں..... یہ ذرا دشوار کام ہے۔" سارجنٹ شوا سمتھ نے

اعتراف کیا۔

"اس سلسلے میں صرف تین مشکوک گاڑیاں ہو سکتی ہیں۔" پٹریلا بولا۔ "یہ الگ بات کہ قتل کسی وقتی اور فوری اشتعال کے تحت کیا گیا ہو' جس کا کوئی امکان نہیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ گاڑی ٹریفک کے اسی دھارے میں رہی ہوگی' جس میں روپر کی گاڑی تھی۔ کسی اور سمت سے سینٹ اینڈریوز سرکس میں داخل ہونے والی گاڑی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ عین اس موقع پر اس کا اور روپر کی گاڑی کا سامنا ہو سکے گا۔ ٹھیک ہے؟"

"جی ہاں۔" ولموٹ نے جواب دیا۔ اسے شوا سمتھ کی کھنچائی بہت اچھی لگتی تھی۔

"اور وہ جو کوئی بھی ہوگا' اس کے پہلو میں رہا ہوگا یا اس سے آگے کیونکہ عقب سے روپر کو شوٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روپر کی گاڑی کے عین آگے ڈیلیوری وین تھی۔ آگے داہنی جانب کھلی کار تھی یا پھر سیلون کار تھی' جو روپر کی کار کے دائیں جانب بالکل برابر کھڑی تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان گاڑیوں میں کون لوگ تھے۔ وہ سب رضاکارانہ طور پر سامنے آئے۔ ان میں سے کسی کا روپر سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں اور سچ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قاتل نہیں لگتا۔ اور پھر....." پٹریلا نے میز پر رکھے ایک کاغذ کو تھپتھپایا۔ "لیبارٹری ٹیسٹ کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ گولی بائیں جانب سے روپر کے سر میں گھسی۔ گولی برابر کی سطح سے..... یا پھر ذرا سا اوپر سے چلائی گئی تھی۔ اس کا انحصار اس پر بھی ہے کہ جس وقت گولی لگی' روپر کا سر کس پوزیشن میں تھا۔ اب ان حقائق کے پیش نظر یہ سوچنا حماقت ہے کہ گولی کسی گاڑی سے چلائی گئی تھی۔ سامنے کھڑی ہوئی کار روپر کی وین کی سطح سے خاصی نیچی تھی....."

"درست۔" ولموٹ نے خوش ہو کر کہا۔ "معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔"

"صرف پیچیدہ کہنے سے کام نہیں بنے گا۔" پٹریلا نے برہمی سے کہا۔ "ہمیں مسئلہ حل کرنا ہے۔ اس میں تو شبے کی گنجائش نہیں کہ روپر کو شوٹ کیا گیا تھا۔ اس نے خود اپنے سر میں گولی نہیں اتاری تھی۔"

اس رات پٹریلا تمام تصویریں اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ تصویریں سامنے پھیلائے بیٹھا رہا پھر وہ مسٹر ویدرال سے ملنے کے لیے گیا' تب بھی تصویریں اس کے ساتھ تھیں۔

مسٹر ویدرال' ساؤتھ بارو سیکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر بہت نفیس طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ تیس سال سے اسکول سے منسلک تھے۔ جنوبی لندن کے باسیوں کے مزاج آشنا تھے۔ کئی نسلیں ان کے ہاتھوں سے نکلی تھیں۔ انہوں نے اسکول کے لڑکوں کو بلوغت کے بعد سبھی کچھ بنتے دیکھا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ جہاں تربیت یافتہ لوگ ہار گئے ہوں' وہاں شوقیہ سراغرساں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" مسٹر ویدرال نے کہا۔

"لیکن مائنڈ نہ کرو تو ذرا یہ محدب عدسہ میری طرف بڑھا دو۔ یہ بڑا شاندار عدسہ ہے۔ یہ مجھے ینگ سائن نے دیا تھا۔ اس کے باپ کو تو تم جانتے ہی ہوگے۔"

پٹریلا' مسٹر سائن کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ ساؤتھ بارو کے علاقے میں مسروقہ اشیا کے دوسرے سب سے بڑے خریدار تھے۔

"یہ وہ تصویر ہے' جو اس وقت لی گئی' جب فائر کیا گیا۔ اور یہ تصویریں اس سے ذرا پہلے کی ہیں۔" مسٹر ویدرال نے تصویروں کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ جب انہیں ہجوم میں اپنا کوئی پرانا شاگرد نظر آتا تو وہ مسکراتے۔ اچانک وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "اوہ..... میرا خیال ہے' یہ تم نے بھی نوٹ کیا ہوگا۔ یہ جو آخری تصویر میں جوان خاتون نظر آ رہی ہے' ایسا لگتا ہے کہ سگریٹ پی رہی ہے۔ عجیب بات ہے نا۔ پہلے والی تصویروں میں ایسا نہیں ہے۔"

"کون سی خاتون؟"

"نہیں..... راہ گیروں میں نہیں' وہ جو ہورڈنگ پر موجود ہے..... دلیے کے اشتہار والے ہورڈنگ پر۔ بورڈ پر لکھا ہے..... میک مین ڈے فن ڈے۔"

پٹریلا نے عدسہ لے کر اس تصویر کو غور سے دیکھا..... پھر اس نے اور تصویروں کو بھی چیک کیا۔ مسٹر ویدرال ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بورڈ پر نظر آنے والی خاتون کے دانتوں کے درمیان کوئی نلکی نما چیز دبی تھی جو ذرا زیادہ لمبی سگریٹ لگتی تھی اور ایسا صرف آخری تصویر میں تھا۔ باقی تصویروں میں اس کا چہرہ صاف تھا۔

اگلی صبح سویرے پٹریلا نے سینٹ اینڈریوز سرکس کے سامنے زمانۂ جنگ کی تباہ شدہ عمارت کے ایجنٹ مسٹر کوپر سے رابطہ کیا۔ سائٹ کی اس سائیڈ کو پوری طرح ہورڈنگز سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

"میں نے تاروں کی یہ باڑھ دو تین دن پہلے لگائی ہے۔" مسٹر کوپر نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ لوگ یہاں گھس آتے ہیں اور پچھلے حصے میں کرکٹ کھیلتے ہیں۔ ویسے پہلے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ آپ خود جانا چاہتے ہیں وہاں؟ خاصا مشکل کام ہے۔"

"کہیں سے ایک سیڑھی کا بندوبست کر لو۔" پٹریلا نے کہا۔ "میں ذرا دائرا دھر اُدھر کر کے جگہ بنا لوں۔"

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہ ایک سائن پینٹر کی دی ہوئی سیڑھی کی مدد سے اس جگہ کھڑے تھے' جو کبھی ایک بڑی عمارت کا بیسمنٹ فلور رہی ہوگی۔

"مائنڈ نہ کرنا لیکن میں یہ کام اکیلا ہی کرنا چاہتا ہوں۔" پٹریلا نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ قدموں کے نشانات ضائع ہوں اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ قدموں کے غیر ضروری نشانات بنیں۔"

مسٹر کوپر نے متجسس نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "یہ اس قتل کی

واردات کا جھگڑا تو نہیں؟"

"ممکن ہے۔ کیوں؟"

"میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ کرکٹ کھیلنے کے لیے کوئی اتنی زحمت کیوں کرے گا۔ آپ خود دیکھ لیں، یہاں پہنچنا کوئی آسان کام تو نہیں۔ میرا خیال ہے، مجھے پہلے ہی آپ کو یہ بات بتا دینا چاہیے تھی۔"

"ہاں۔ لیکن خود کو الزام بھی نہ دو۔ میں نے تو خود انہیں کھیلتے دیکھا تھا لیکن مجھے کچھ بھی نہیں سوجھا۔ ذرا یہ سیڑھی پکڑو پلیز۔"

وہ عقبی دیوار پر چڑھا۔ گراؤنڈ فلور پر خودرو جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان آگے بڑھا۔ اب اسے ایک شہتیر پار کرنا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ دو عمارتیں رہی ہوں گی، جن کے عقبی حصے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ ایک ڈنریون روڈ کے رخ پر تھی اور دوسری سینٹ اینڈریوز سرکس کے سامنے تھی۔ اس وقت وہ نسبتاً بڑی عمارت میں تھا۔ ہورڈنگز کی قطار اس کے اوپر تھی۔ ہورڈنگز کے نچلے حصے بھی اس کی آنکھ سے اوپر ہی تھے۔

ہورڈنگز کے عقب میں وہ دیوار تھی جو مقامی انتظامیہ نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ بمباری کے فوراً بعد کی بات تھی۔ وہاں بہت بڑا گڑھا ہوگیا تھا۔ لوگوں کو اس میں گرنے سے بچانے کے لیے وہ دیوار تعمیر کی گئی تھی۔

پٹریلا نے دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار پر چڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن ایک طرف پتھروں کا ایک خاصا اونچا ڈھیر تھا۔ وہ اسٹارٹ لینے کے لیے بہت مناسب جگہ تھی۔ پتھروں کے ڈھیر کی جڑ میں قدموں کے بہت ہلکے لیکن واضح نشانات تھے۔ پٹریلا نے ان نشانات کو بڑی محبت سے دیکھا۔

اس نے سوچا، بڑی خوش قسمتی ہے کہ بارش نہیں ہوئی۔ اب اسے کسی چیز سے ڈھانپ دوں پھر جلد سے جلد اس کا نمونہ اٹھوا لیا جائے گا۔ اور بہتر یہی ہے کہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش دوسری طرف سے کی جائے۔

وہ جہاں سے آیا تھا، وہیں واپس آگیا۔ اس نے سیڑھی کھینچی اور اسے لے کر ہورڈنگز کے پاس آیا۔ سیڑھی کی مدد سے ان نشانات سے بچ کر چڑھنا ممکن ہوگیا۔ اس نے تصور میں تصویروں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دلیے کا ہورڈنگ کون سا ہے۔ بائیں جانب بیئر کا پوسٹر تھا۔ پھر پٹرول کا ہورڈنگ تھا۔ دلیے کا ہورڈنگ اس کے بعد تھا..... یا مزید ایک ہورڈنگ چھوڑ کر۔

وہ جانتا تھا کہ اسے کس چیز کی تلاش ہے۔ پھر بھی اسے تلاش کرنے میں پانچ منٹ لگ گئے۔ ہورڈنگ سے بارہ انچ چوڑا اور چار انچ اونچا حصہ کاٹا گیا تھا اور اتنی صفائی سے کاٹا گیا تھا کہ دوبارہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ پٹریلا نے ناخنوں کی مدد سے لکڑی کے اس ٹکڑے کو باہر نکالا۔ سامنے پوسٹر کا پچھلا حصہ تھا۔ اس میں سے بھی کاٹ کر ایک کھڑکی سی نکالی گئی تھی پھر کاغذ دوبارہ چپکا دیا گیا تھا۔

پٹریلا نے انگلی کے کنارے سے اسے کھولا اور جھانکا۔ پندرہ فٹ دور..... اور اپنے ہی چہرے کی سطح پر اسے ایک بس ڈرائیور کا چہرہ نظر آیا۔ رائفل کی مدد سے وہ اسے بڑی آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔

❋❋❋

"وہ سوچا سمجھا حملہ تھا۔" پٹریلا نے نمن سے کہا۔ "وہ جانتے تھے کہ روپر ہر روز تقریباً اسی وقت سینٹ اینڈریوز سرکس سے گزرتا ہے۔ یہ طے تھا کہ عقب سے سائٹ میں داخل ہوتے ہوئے انہیں دیکھ لیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے لنچ کے وقفے میں کرکٹ کھیلنے کا ڈھونگ رچایا اور گولی موریس بونر نے چلائی۔"

"بڑا رسک لیا انہوں نے۔" نمن نے تبصرہ کیا۔ "فرض کرلو، کوئی پولیس مین وہاں سے گزرتا اور انہیں دیکھ لیتا۔ وہ یقیناً کسی نہ کسی کو پہچان بھی لیتا۔"

پٹریلا کا چہرہ شرمندگی سے تمتما اٹھا۔ "ایسا ہوا تھا۔" اس نے کہا۔ "میں نے انہیں کھیلتے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے ایک کو پہچان بھی لیا۔ وہ سرخ بالوں والا کوپر ڈکسن تھا۔ میں نے ایک بار اسے کورٹ میں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے کھٹک جانا چاہیے تھا لیکن نہیں کھٹکا۔"

"اوہ۔ بہرحال وقت آنے پر تم اسے پہچان سکو گے۔ لڑکوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"عام حالات میں، میں نہیں سمجھتا کہ وہ گواہی دیں گے لیکن ہیڈ ماسٹر ویدرال نے مجھے بتایا ہے کہ ان میں ایک آئرش لڑکا بھی تھا..... اوکونر نام کا۔ یہ جنوبی علاقے کے آئرش لوگ بونرز کو پسند نہیں کرتے۔ یہ مقامی سیاست کا کرشمہ ہے۔ میں اسے پوری طرح نہیں سمجھتا لیکن ویدرال کو یقین ہے کہ اوکونر گواہی ضرور دے گا اور اگر اس نے گواہی دی تو دوسرے لڑکے بھی اس کی پیروی کریں گے۔"

"لڑکوں نے موریس کو عقبی حصے میں اترتے دیکھا ہوگا؟" نمن نے پوچھا۔

"اوکونر تو یہی کہتا ہے اور پتھروں کے ڈھیر کے نیچے ایک واضح نقش پا ملا ہے۔ وہاں سے وہ دیوار پر چڑھا ہوگا۔ تین واضح نشانات چھجے پر بھی ملے ہیں۔ وہ خاصا کام آئیں گے۔"

"بشرطیکہ موریس نے ان جوتوں کو دوبارہ پہن نہ کرلیا ہو۔" نمن نے کہا۔ "لیکن امکان ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ عادی مجرموں سے بھی غلطیاں سرزد ہو ہی جاتی ہیں۔"

وہ بیٹھے تجزیہ کرتے رہے۔

"تم اچھے گواہ ثابت ہوگے۔" نمن نے پٹریلا سے کہا۔

"لیکن تم نے صرف ایک آدمی کو دیکھا ہے۔ جبکہ لڑکوں نے ان چھ کے چھ کو دیکھا ہے لیکن لڑکے گواہوں کے کٹہرے میں خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ جوتوں کے نشانات سائنٹیفک گواہی ثابت ہوں گے۔ یہ فیصلہ کن بھی ہوسکتا ہے۔ جیوری کے اراکین کو ایسے ثبوت بہت اپیل کرتے ہیں۔ دیکھو..... میں ڈائریکٹر آف پبلک پراسیکیوشن سے بات کروں گا۔ اس کی رائے کی بڑی اہمیت ہے۔"

❋❋❋

کیس عدالت میں پیش ہوا تو بہت بڑی خبر بن گیا۔ پبلک اس بے رحمانہ اور سفاکانہ قتل میں دلچسپی لے رہی تھی۔ مجسٹریٹ کی کورٹ میں ہونے والی سماعت بھی کچھ کم سنسنی خیز نہیں تھی۔ حالانکہ وہ ابتدائی سماعت تھی۔ اصل جنگ تو اولڈ بیلی کی بڑی عدالت میں ہونا تھی۔ یہ ابتدا میں ہی طے ہوگیا کہ جنگ زوردار ہوگی۔ موریس بونر کا وکیل صفائی بڈھا، موٹا اور تجربہ کار والٹر فرنچ مین تھا۔ دوسرے پانچ ملزمان کی طرف سے مائیکل ہارش پیش ہوا۔ وہ فوجداری مقدمات کا ابھرتا ہوا نوجوان وکیل تھا جس کی صلاحیتوں کے سبھی معترف تھے۔

بعد میں پٹریلا نے غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ وہ ہارش کو بہت زیادہ ناپسند کرتا تھا لیکن اس کیس میں نقصان مسٹر فرنچ کی طرف سے پہنچا تھا۔ ہارش نے تو پولیس کے لیے کھلم کھلا ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے جو کیچڑ اچھالی تھی، اس میں سے کچھ صحیح معنوں میں چپکی بھی تھی۔

مثلاً اس نے یہ حقیقت اجاگر کردی تھی کہ پٹریلا ساؤتھ بارو سیکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ویدرال کے نیچے والے فلیٹ میں رہتا تھا اور زیادہ تر گواہوں کا تعلق اسی اسکول سے تھا۔ اسے بنیاد بنا کر اس نے مقدمے کو گھڑا ہوا ثابت کرنے کی کوشش کی، جو کسی حد تک مؤثر ثابت ہوئی۔

اس تھکا دینے والے موضوع پر دیر تک بولنے کے بعد اس نے کہا۔ "اور انسپکٹر، اب ہم اس موقعے کی طرف آتے ہیں، جب تم میرے مؤکل مسٹر ڈکسن کو اس وقت پہچاننے میں ناکام رہے، جب تم نے بقول خود اسے کرکٹ کھیلتے دیکھا لیکن بعد میں تمہیں اس کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ شاید بعد میں تم نے مسٹر ڈکسن کو اس لیے پہچان لیا کہ تمہارے افسرانِ بالا یہی چاہتے تھے۔"

اس میں جواب طلب کوئی بات نہیں تھی لیکن ہارش سانس لینے کے لیے رکا تھا۔ پٹریلا نے موقع پاکر کہا۔ "جی ہاں۔"

"تم اتفاق کرتے ہو کہ یہ ایک غیر معمولی بات تھی؟"

"کون سی بات؟" پٹریلا نے دریافت کیا۔

"یہ کہ تم نے پہلی بار مسٹر ڈکسن کو دیکھا تو پہچاننے میں ناکام ہوگئے۔"

"میں نے اسے پہچان لیا تھا۔" پٹریلا نے کہا۔ "لیکن اس کی شناخت نہیں کرسکا تھا۔"

"اس بات کا کیا مطلب ہوا بھلا؟"

"یہ کہ میں نے چہرے سے اسے پہچان لیا تھا لیکن نام یاد نہیں کرپایا تھا۔"

"پہلے تم نے اسے کب دیکھا تھا؟"

وہ بہت خطرناک سوال تھا۔ پٹریلا اس سوال کا جواب دیتے دیتے رہ گیا کہ اسی کورٹ میں، ایک ماہ پہلے۔ لیکن یہ جواب ایک ٹیکنیکی غلطی ہوتا۔ چنانچہ اس نے جواب دیا۔ "میں نے اسے کچھ عرصہ پہلے دیکھا تھا۔"

"بعد میں تم نے اسے کیسے پہچانا؟"

"مجھے کئی تصویریں دکھائی گئیں پھر میں نے اسے بھی دیکھا اور پہچان لیا کہ میں نے کرکٹ کھیلتے اسے دیکھا تھا۔"

"یعنی دباؤ ڈالا گیا تم پر تو تمہیں اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تمہیں پورا یقین ہے کہ جس شخص کو تم نے دیکھا اور شناخت نہیں کرسکے، وہی شخص تھا، جسے بعد میں تم نے دیکھا اور شناخت کرلیا؟"

"جی ہاں۔"

اس کا مطلب ہے کہ تمہاری یادداشت قانون ضرورت کے تحت کام کرتی ہے؟"

پٹریلا کو خوشی تھی کہ سب کچھ ہارش کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا۔ اگلے گواہ مسٹر ویدرال تھے۔ ان سے متعلقہ لڑکوں کے کردار کے متعلق پوچھا گیا۔ وہاں مسٹر ہارش سے غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے مسٹر ویدرال پر تند و تیز جرح کی۔ تجربے کی کمی کی وجہ سے وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں معاملات کو جوں کا توں چھوڑ دینا بہتر ہوتا ہے۔

"مسٹر ویدرال! یہ فطری بات ہے کہ آپ اپنے شاگردوں کے بارے میں اچھا بیان دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اسی لیے آپ ان کی سچائی اور قوتِ مشاہدہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔" ہارش نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے ہارش کہ گرائمر کے جو بنیادی اصول تمہارے دماغ میں، میں مسلسل چار سال تک ٹھونستا رہا، تم انہیں اتنی جلدی بھول گئے۔ میرے خیال میں عدالت میں بھی غلط زبان بولنے کی گنجائش نہیں۔ یہ سچائی کیا ہوتی ہے، یہاں اس کا کیا محل۔ تم شاید حق گوئی کہنا چاہ رہے تھے۔"

پریس والوں کے تو مزے آگئے۔ اگلے روز سرخی لگی۔ وکیل کی اپنے ہیڈ ماسٹر کے ہاتھوں بھری عدالت میں کھنچائی۔

پٹریلا کو اپنے طرزِ عمل پر خاصی داد ملی۔ وہ خود بھی بہت خوش تھا لیکن نوجوان وکیل کے سامنے اس پر ایسے لمحے بھی آئے، جب اسے ہارش سے ہی نہیں، برطانیہ کے قانونی نظام سے بھی نفرت

محسوس ہوئی۔ بہرحال اسے پہلے ہی خبردار کردیا گیا تھا اور کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیاری بھی کرادی گئی تھی۔

لیکن ایک پولیس مین کا' جسے مجرموں سے نمٹنے کے لیے جسمانی طور پر تیار کیا جاتا ہے' ہارش جیسے بال کی کھال نکالنے اور ذہن استعمال کرنے والے وکیلوں سے کیا مقابلہ ہوسکتا ہے اور پھر اخبارات..... سرخیاں جمانے کے لیے انہی نکات کا سہارا کیوں لیتے ہیں' جو پولیس کے خلاف جاتے ہیں۔ پٹریلا اس تجربے سے گزرنے کے بعد ہذیانی انداز میں یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ مثلاً اخباروں نے سرخی لگائی..... "سراغرساں کی مطلبی یادداشت۔ وکیل ہارش کا بیان" لیکن اخبار نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ مجسٹریٹ نے اس کے خلاف وکیل کے بعض ریمارکس کو عدالتی کارروائی سے حذف کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے وکیل کو محتاط رہنے کی تنبیہہ کی تھی۔

یہ رویہ کیا اس لیے تھا کہ توہین اچھی خبر بنتی ہے یا اس لیے تھا کہ رپورٹر کو ایک ماہ پہلے غلط پارکنگ کے نتیجے میں جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا اور اب وہ اس کا انتقام لے رہا تھا۔

لیکن یہ معاملات اتنے اہم نہیں تھے۔ بعد میں جو کچھ ہوا' وہ ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ تباہ کن تھا۔

❋❋❋

پراسیکیوشن نے اپنا کیس مکمل کیا تو مجسٹریٹ نے ایک واضح ہچکچاہٹ کے ساتھ چھ ملزمان کے خلاف مقدمہ سینٹرل کورٹ میں چلانے کی سفارش کردی لیکن ساتھ ہی یہ حماقت کی کہ فرنچ مین کی درخواست پر پولیس کے زبردست دباؤ کے باوجود موریس بونر کے سوا باقی تمام ملزمان کو ضمانت پر رہا کردیا۔ بنجمن نے جس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا' بتایا کہ اسکول کے لڑکوں کی گواہی پراسیکیوشن کیس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور ملزمان کو ضمانت پر رہا کرنا کیس کو تباہ کرنے کے مترادف ہوگا لیکن مجسٹریٹ نے اس کی بات سُنی اور نظرانداز کردی۔

"مجھے ایسا لگا' جیسے میں اپنی کار سے گفتگو کررہا ہوں۔" بعد میں بنجمن نے تبصرہ کیا۔ "اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ سب لڑکے مختلف کہانیاں سنائیں۔ بلکہ سرے سے کوئی کہانی ہی نہ سنائیں تو اس کی یہ خواہش اب ضرور پوری ہوگی۔"

❋❋❋

وہ ستمبر کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ پٹریلا بیڈ کی پٹی پر ٹکا بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔ دس بجے تھے لیکن وہ اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اٹھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ چھٹیوں پر تھا۔

ان چھٹیوں میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ اس پر تھوپی گئی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو بونر کا کیس نمٹنے تک وہ گھریلو اسٹریٹ چھوڑتا بھی نہیں لیکن دو دن پہلے سپرنٹنڈنٹ بنجمن نے براہ راست اسے حکم دیا تھا "اولڈ بیلی میں کیس کی سماعت شروع ہونے سے پہلے ہمیں سانس لینے کی مہلت مل گئی ہے۔ لہٰذا تمہیں آرام کے لیے چھٹی دی جاتی ہے۔"

"لیکن سر' مجھے آرام کی ضرورت....." پٹریلا نے احتجاج کرنے کی کوشش کی۔

"میں تمہاری نہیں' اپنی بہتری سوچ رہا ہوں۔" بنجمن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اگر تم نے ابھی خود کو تازہ دم نہ کیا تو اکتوبر تک نڈھال ہوجاؤ گے۔ ہمارے پاس اسٹاف کم ہے' اس لیے میں تمہیں دس دن سے زیادہ کی چھٹی نہیں دے سکتا لیکن دس دن کی چھٹی تمہیں کرنی ہوگی۔ دل چاہے یا نہ چاہے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

پٹریلا یہ عُذر بھی پیش نہیں کرسکتا تھا کہ وہ چھٹیاں تو گزارنے کے لیے کہیں جا بھی نہیں سکتا۔ کرنل ماؤنٹ اس کا ننھیالی رشتے دار تھا۔ وہ چلٹرن میں رہتا تھا۔ اس نے پٹریلا کو کھلی دعوت دے رکھی تھی کہ وہ جب چاہے چلٹرن آئے اور جتنے دن چاہے اس کے ہاں قیام کرے۔ کرنل نے اس بار خط میں لکھا تھا "چند جوڑے پرانے کپڑے لے آؤ۔ رائفل میں تمہیں مستعار دے دوں گا۔ ہر روز ناشتا تمہیں بستر پر ملے گا اور ہاں..... مجرموں کے بارے میں بھول جانا۔ یہاں جو بڑے سے بڑا مجرم میسّر ہے' وہ پھل چور ہے اور تمام پھل چور میرے دوست ہیں۔"

دو دن پہلے تک پٹریلا کو اس آئیڈیے میں بڑی کشش محسوس ہورہی تھی لیکن اب وہ اس سلسلے میں اتنا پُریقین نہیں تھا۔ وہ بہت تھکن محسوس کررہا تھا اور چڑچڑا ہورہا تھا۔ اسے بے چینی بھی ہورہی تھی اور وہ ہاتھ پاؤں ہلانے کے موڈ میں بھی نہیں تھا۔

اس نے ڈریسنگ گاؤن پہنا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

بظاہر موسم گرما ابھی تک شباب پر تھا۔ درخت پتّوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ موسم گرما کی ہوا فٹ پاتھوں پر آئس کریم کے پیکٹوں کو اڑائے پھر رہی تھی۔ دھوپ کے باوجود پٹریلا نے اپنے جسم میں تھرتھراہٹ محسوس کی۔ اس کا حلق خشک ہورہا تھا اور پاؤں سرد ہورہے تھے۔ کچھ کھانے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ اس نے سوچا' کافی کا ایک کپ بہرحال فائدہ مند ہوگا۔

اسے سہ پہر کی ٹرین سے روانہ ہونا تھا۔ پیک کیا ہوا بیگ اس کے بیڈ کے قریب فرش پر رکھا تھا لیکن اسے خیال آیا کہ گاؤں کے لحاظ سے اس کا یہ سامان ناکافی ہے۔ کرنل نے تو بڑے اطمینان سے لکھ دیا تھا کہ چند جوڑے پرانے کپڑے لے آؤ لیکن یہ بس کہنا آسان تھا۔ وہاں جاکر کمی محسوس ہوتی تو بُرا ہوتا۔ لہٰذا کچھ شاپنگ کرنا ضروری تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ گھر سے نکل آیا۔ وہ ایک خوبصورت دن تھا۔ سورج درختوں کے پتّوں کے درمیان سے جھانک رہا تھا۔ پٹریلا نے سوچا' چہل قدمی بہتر رہے گی۔ سو وہ برنک مین روڈ پر چل دیا۔

براڈوے میں اس نے اسپنک اسٹور سے آدھا درجن رومال خریدے۔ جیکٹ وہاں سے خریدنے کا ارادہ اس نے فسخ کردیا۔ ان

ٹیکسوں سے چلٹرن میں کام نہیں چل سکتا تھا۔ جیکٹ خریدنے کے لیے اسے ویسٹ اینڈ جانا تھا۔ وہاں اسے اپنے مطلب کی جیکٹ مل سکتی تھی۔ اس نے سرے ڈوکس انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی طرف سے شارٹ کٹ لگانے کا فیصلہ کیا۔

چلڈرز اسٹریٹ ایک لمبی اور بور سڑک ہے۔ آگے جاکر وہ دائیں جانب مُڑتی اور ریور اسٹریٹ سے جاملتی ہے۔ پٹریلا کا اندازہ تھا کہ اگر وہ مُڑنے کے بجائے سیدھا چلتا رہے تو ایک عقبی راستہ اسے ڈوکس اسٹیشن کے قریب کہیں پہنچا دے گا لیکن چھوٹی سڑک نے اسے ایک تنگ گلی میں پہنچا دیا' جہاں دونوں طرف مکانوں کی دیواریں تھیں۔ گلی کے اختتام پر ایک گیٹ نظر آیا' جو کھلا ہوا تھا۔

پٹریلا کو بھی ضد ہوگئی کہ اب وہ پلٹے گا نہیں۔ چنانچہ وہ گیٹ سے اندر چلا گیا۔ وہ ایک بجریلا' ڈھلواں راستہ تھا' جو سرے یونین نہر کے گھاٹ کی طرف اتر رہا تھا۔ گھاٹ پر آہنی شہتیروں کی ایک قطار تھی جن سے کشتیاں باندھی جاتی تھیں۔ ایک شہتیر پر سنولائی ہوئی رنگت اور سفید بالوں والا ایک شخص بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔

پٹریلا اسے پہچانتا تھا۔ "ہیلو ڈاکٹر!" اس نے کہا۔

"گڈ مارننگ انسپکٹر۔" بڈھے نے کہا۔ "میری کشتی کا معائنہ کرنے آئے ہو؟"

"نہیں۔ بس یونہی گزر رہا تھا....."

بڈھے نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ "لگتا ہے' تمہیں ڈرنک کی ضرورت ہے۔"

اس کی کشتی "اختتامِ سفر" وہیں بندھی ہوئی تھی۔ وہ پٹریلا کو کشتی پر لے گیا۔ کشتی کافی بڑی تھی۔ نیچے بڑے میاں کی خواب گاہ تھی۔ پٹریلا فاضل بیڈ پر بیٹھ گیا۔ بڑے میاں کافی بنانے میں مصروف ہوگئے تھے۔

کافی بننے میں خاصی دیر لگی۔ پٹریلا کو لگا کہ اتنی دیر میں وہ ایک نیند لے سکتا تھا بلکہ شاید وہ سو گیا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا' بڈھا ڈاکٹر کافی کی پیالی لیے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن کا تاثر تھا۔ "کیا بات ہے بیٹے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" پٹریلا نے کہا..... لیکن اسے اپنی آواز بھاری سی' اجنبی سی لگی۔ "بس کچھ تھکن سی ہے لیکن ٹھیک ہوجاؤں گا۔ آج سے میری چھٹیاں شروع ہورہی ہیں۔"

"ذرا کھڑے ہوکر تو دکھاؤ بیٹے۔"

پٹریلا اٹھنے لگا۔ اچانک ایسا لگا کہ کشتی بندھی ہوئی نہیں ہے۔ پٹریلا کو وہ خطرناک حد تک ڈولتی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز کا کنارہ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دُھند سی چھانے لگی۔ اسے حیرت ہوئی کہ موسم اتنی تیزی سے کیسے بدل گیا۔ اسی لمحے میز کا کنارہ چھوٹ گیا۔ کشتی اور بری طرح ڈولی تھی۔ وہ خود کو سنبھال نہ سکا اور بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ ہر طرف دُھند ہی دُھند تھی۔

"اختتامِ سفر" کا مالک چند لمحے کھڑا اس نوجوان کو دیکھتا رہا' جس نے کافی کی خواہش کی تھی اور کافی پینے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس شخص کو اس علاقے کے اور دیگر ساحلوں کے لوگ ڈاکٹر کہہ کر پکارتے تھے۔ بیس سال میں یہ اس کا اعزازی ٹائٹل بن کر رہ گیا تھا۔ چند ہی افراد جانتے کہ وہ درحقیقت ایک مستند ڈاکٹر ہے۔

ڈاکٹر نے پٹریلا کی پیشانی چھوئی۔ پیشانی بھیگی ہوئی تھی اور تپ رہی تھی۔ اس نے پٹریلا کی نبض تھامی اور چند لمحے اس کے تنفس کا مشاہدہ کرتا رہا پھر اس نے پٹریلا کے جوتوں کے بند کھولے اور انہیں اتار کر بیڈ کے نیچے رکھ دیا۔ اس نے اس کا کوٹ اتارا' واسکٹ اتاری' ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔ اپنے بیڈ سے تکیہ اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھا اور اس کے جسم پر کمبل ڈال دیا۔

جانے کتنی دیر بعد پٹریلا کی آنکھیں کھلیں اور اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر اپنی کرسی سے اٹھا اور اس کی طرف لپکا۔

"سنو..... اسے پینے کی کوشش کرو۔" اس نے پانی کے گلاس میں دو سفید ٹکیاں ڈالیں اور گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ "میں نے بے ہوشی کے دوران انہیں تمہارے حلق سے اتارنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسے میں کبھی خطرناک پھندہ بھی لگ جاتا ہے۔"

"یہ کیا ہے؟ اور ہوا کیا ہے مجھے؟" پٹریلا نے کہا "کیا میں بے ہوش ہوگیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں فلو ہوگیا ہے۔ بخار بہت تیز ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تم نے بتایا تھا کہ تمہاری چھٹیاں شروع ہورہی ہیں۔"

"جی ہاں..... دس دن کی چھٹی۔" پٹریلا نے کہا اور گلاس خالی کردیا۔

وہ پھر سو گیا..... لیکن وہ اچھی نیند نہیں تھی۔ اسے اپنی ہڈیاں تک دُکھتی محسوس ہورہی تھیں۔ عجیب عجیب خواب بھی دکھائی دیے۔ وہ گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا تھا اور ایک مگرمچھ جرح کیے جارہا تھا..... اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

بالآخر اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کے سامنے ایک دشوار مرحلہ تھا..... یہ سمجھنے کا کہ وہ کہاں ہے۔ سب سے پہلی بات جو اس کی سمجھ میں آئی' وہ بہاؤ کا احساس تھا۔ اس بار جو ہچکولے تھے' وہ ہذیانی کیفیت کا شاخسانہ نہیں' بلکہ حقیقی تھے اور اس بار وہ ناخوشگوار بھی نہیں تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جھولا جھول رہا ہے۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھا۔ اس کے نتیجے میں اسے بری طرح چکر آئے اور دوبارہ لیٹنا پڑ گیا۔

اگلی بار اس نے کہنی کا سہارا لے کر خود کو بڑی حد تک اٹھایا۔ فرش سے منسلک میز اس کے ہاتھ سے دور نہیں تھی۔ وہاں پانی کا جگ رکھا تھا۔ اس نے جگ اٹھا کر منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پورا

پانی پی گیا۔ پانی اسے کچھ کڑوا لگا تاہم ذائقہ ناخوشگوار نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ لیٹا..... اور تکیے پر سر ٹکنے سے پہلے وہ پھر سو چکا تھا۔

اب کے اس کی آنکھ کھلی تو رات کا وقت تھا۔ کیبن میں پیرا فین لیمپ روشن تھا' اس نے پہلو بدلا تو میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا ہوا ڈاکٹر اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

پٹریلا کو اپنا ذہن اب بالکل صاف محسوس ہو رہا تھا۔ "میرا خیال ہے' میں نے آپ کو بہت پریشان کیا ہے۔"

"اس کے برعکس مجھے اتنا سعادت مند مریض پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"میں یہاں کب سے ہوں؟"

"دو دن..... اور دس گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت ہو گیا....."

"گڈ گاڈ!" پٹریلا کو حیرت ہوئی کہ زندگی کا ایک حصہ..... ننھا سا ہی سہی' یوں بے خبری میں گزر گیا۔

"تم نے کہا تھا کہ تم چھٹی پر ہو۔ میں نے سوچا' یہ عرصہ تم میری کشتی پر بھی گزار سکتے ہو۔ ایک ذرا زنگ آلود لیکن مستند ڈاکٹر کی نگرانی میں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی مگر میں نے اپنے ماموں کے ہاں چھٹیاں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"کل صبح ہم انہیں ٹیلی گرام بھیج دیں گے۔"

"اس وقت ہم کہاں ہیں؟ اور یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"تم سوال بہت کرتے ہو۔ دوبارہ بخار چڑھا لو گے۔" بڈھے ڈاکٹر نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ پھر بولا "ہم اس وقت والٹن کے قریب ہیں۔ یہ جگہ لانگ نیک کہلاتی ہے۔ ہم گرین ڈوک' رشیا ڈوک' لیونڈر پونڈ اور اوپن ریور سے گزر کر یہاں پہنچے ہیں۔ بس اب سکون سے سو جاؤ۔"

پٹریلا اگلی صبح سو کر اٹھا تو بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا' یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ ناشتے کے بعد ڈاکٹر کرنل ماؤنٹ کو ٹیلی گرام بھیجنے کے لیے ساحل کی طرف چلا گیا۔ اس نے ٹیلی گرام کا مضمون لکھا اور کلرک کی طرف بڑھا دیا.....

وہ ٹیلی گرام کرنل ماؤنٹ کو چند ہفتے بعد ملا..... لکھا تھا۔ "میں اچانک بیمار ہو گیا ہوں۔ بعد میں خط لکھوں گا۔ پیٹرک۔"

اگلے چھ روز ایسے گزرے کہ پٹریلا کی یادداشت میں اس سے زیادہ خوش گوار عرصہ محفوظ نہیں تھا۔ ناشتا کرنے والے دن وہ بھلا چنگا ہو گیا تھا۔ اگلی صبح وہ اتنا چاق و چوبند تھا کہ کشتی کے معاملات میں ڈاکٹر کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس نے کشتی رانی کے متعلق بے شمار نئی چیزیں سیکھ لیں۔ سب سے زیادہ لطف اسے شام کو آتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا' جب کشتی کو باندھ دیا جاتا اور لیمپ روشن کر دیے جاتے۔ کھانے کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ وہ ڈاکٹر سے اس کے متعلق پوچھتا۔

"میں پچاس سال کا تھا۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "بلکہ یہ عین میرے پچاسویں سالگرہ والے دن کی بات ہے۔ اس روز میں نے ڈاکٹری ترک کی اور کشتی راں بن گیا۔ میں نے دولت کافی کمائی تھی۔ ان دنوں لوگ ڈاکٹر کے پاس اس لیے آتے تھے کہ وہ اسے پسند کرتے اور اس پر اعتماد کرتے تھے۔ آج کل لوگ ڈاکٹر کے پاس اس لیے آتے ہیں کہ گورنمنٹ انہیں ایسا کرنے کو کہتی ہے۔ لہٰذا ان دنوں آمدنی زیادہ تھی۔ میں غیر شادی شدہ تھا۔ فضول خرچ اور شوقین مزاج بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا' اب تک میں اتنا کچھ بچا چکا ہوں کہ اس میں مجھ جیسی لگی بندھی عادات والے آدمی کی زندگی بعافیت گزر سکتی ہے۔ بلکہ میں مزید پچاس سال بھی جیا تو مجھے کمی نہیں ہوگی۔

"اس روز مجھے ایک پرانے مریض نے گھر پر بلایا تھا۔ وہ بزنس مین تھا۔ کروڑپتی نہیں کہ جسے دولت کمانے کا ہوکا ہو۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ محنت کرتا تھا اور فضول خرچ بیوی اور تین بگڑے ہوئے بچوں کے اخراجات پورے کرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔

"میں اس کے گھر پہنچا تو وہ مر چکا تھا۔ میں نے اس روز اپنے پیشے کو خیرباد کہا' اپنا مطب فروخت کیا اور یہ کشتی خرید لی..... اختتامِ سفر!

"میری زندگی کا یہ وہ واحد فیصلہ ہے' جس پر میں کبھی نہیں پچھتایا۔ میں ادھر اُدھر کے چھوٹے موٹے کام پکڑ لیتا ہوں۔ اس سے اخراجات نکل آتے ہیں۔ کبھی کبھی میرا اسٹاک بروکر مجھے مطلع کرتا ہے کہ میرے اسٹاک کی قیمتیں چڑھ گئی ہیں لیکن میں نے کبھی اپنے اسٹاک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ میری موت کے بعد وہ اس میڈیکل کالج کو ملے گا جہاں میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔"

چوتھی شام پٹریلا کو خیال آیا کہ اس نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ پتا چلا کہ ان کی منزل بیسنگ اسٹوک سے چند میل پیچھے ہے۔ وہاں انہیں ایک بہت بڑا پیانو اور کاشت کاری سے متعلق کچھ مشینری اتارنا تھی اور دو ٹوکشتی پر سوار کرانا تھے۔

واپسی کے سفر میں پٹریلا نے ڈاکٹر کو روپر کے قتل اور بونرز کے بارے میں تفصیل سنائی۔ بوڑھا بہت توجہ سے سنتا رہا۔ اس نے درمیان میں صرف ایک بار زبان کھولی۔ "میں کوپر کو جانتا ہوں۔" اس نے کہا "وہ میرے ساتھ کام کرتا رہا ہے۔ اچھا لڑکا تھا وہ..... مگر میں جانتا ہوں کہ اسے بڑی آسانی سے غلط راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔" پھر پوری کہانی سننے کے بعد اس نے آخر میں کہا "تمہارا لب و لہجہ بہت تلخ ہے۔ کیوں؟"

"اب تو میں بہتر ہو گیا ہوں۔" پٹریلا نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ ہم پولیس والے بڑی محنت کرتے ہیں۔ امن و امان کے مفاد میں کچھ خطرات بھی مول لیتے ہیں اور ہمارے ساتھ زیادتیاں بھی ہوتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں' ہمیں قانون کی طرف سے مدد بھی ملنی چاہیے۔ کم از کم قانون تو ہمارا ساتھ دے۔"

"قانون کسی کی طرف داری نہیں کرتا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "جب بھی قانون کسی کی طرف داری کرے گا تو قانون نہیں رہے گا' سیاست دانوں کی پکائی ہوئی کھچڑی بن جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن....."

"اگر قانون یوں تمہاری پشت پناہی کرے کہ تمہیں سب کچھ کرنے کی چھوٹ دے دے تو تمہارا محکمہ اسٹیٹ سیکیورٹی فورس بن کر رہ جائے گا..... گستاپو جیسا۔"

"میں شرط لگاتا ہوں کہ ہماری جگہ گستاپو والوں نے ان چھ بدمعاشوں کو پکڑا ہوتا تو مجسٹریٹ کبھی انہیں ضمانت پر رہا نہ کرتا۔" پٹریلا نے تلخ لہجے میں کہا۔

❋❋❋

پٹریلا کو علم نہیں تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے علاقے میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔

اس کی روانگی کے اگلے روز ہیڈ ماسٹر ویدرال' سپرنٹنڈنٹ نجمن سے ملنے آیا۔ "میں اور پیٹرک بہت اچھے دوست ہیں۔" اس نے کہا "آج صبح میں نے اس کے دروازے پر دستک دی..... یہ جاننے کے لیے کہ وہ چلا گیا ہے یا نہیں۔ سچ یہ ہے کہ اگر وہ بستر پر لیٹا ملتا تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔ پچھلے چند دنوں سے وہ بیمار لگ رہا تھا۔ خیر..... میں اندر گیا۔ اس کا کمرا خالی تھا لیکن اس کا پیک کیا ہوا سوٹ کیس فرش پر رکھا تھا۔ وہ اس نے ساتھ لے جانے کے لیے پیک کیا ہوگا۔"

نجمن پہلے ہی کم مسائل سے دوچار نہیں تھا کہ اس مسئلے کو غیر ضروری اہمیت دیتا۔ اس نے کہا۔ "ممکن ہے' وہ وقت کی کمی کا شکار ہو گیا ہو۔ فرض کرو' ایسی صورت حال ہوئی ہو کہ اسے واپس جا کر بیگ لانے یا ٹرین پکڑنے میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا ہو۔ اس صورت میں وہ کیا کر سکتا تھا؟"

"وہ بہت منظم آدمی ہے۔ میں اس سے بے ترتیبی کی امید نہیں رکھ سکتا۔" ویدرال نے کہا "ناشتے کے برتن بھی بغیر دھلے رکھے تھے۔"

"اگر آپ اتنے ہی پریشان ہیں تو میں اس کے ماموں سے رابطہ کرلوں گا۔ اسے انہی کے ہاں جانا تھا۔ مجھے ان کا فون نمبر دے دیا تھا اس نے۔"

"زحمت نہ ہو تو یہ کام ضرور کرلیں۔" ویدرال نے کہا۔

لیکن کسی کو کوئی زحمت نہیں کرنی پڑی کیونکہ اسی لمحے کرنل ماؤنٹ خود ہی وہاں پہنچ گیا۔ "پیٹرک کیوں نہیں آیا؟" اس نے نجمن سے پوچھا۔

نجمن چکرا گیا۔ "ممکن ہے کوئی غلط فہمی....."

"غلط فہمی کیسی! مجھے اس نے بتایا تھا کہ وہ کون سی ٹرین پر بیٹھے گا اور کس وقت وہاں پہنچے گا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسٹیشن پر اسے ریسیو کرلوں۔ وہ نہیں آیا تو میں نے سوچا' ممکن ہے اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہو اور وہ گھر پر پڑا ہو۔"

"میں جو کچھ کر سکتا ہوں' ضرور کروں گا۔" نجمن نے کہا..... پھر ویدرال کی طرف مڑا۔ وہ پریشان نظر آرہا تھا۔ "دیکھیں..... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تعطیلات گزارنا پٹریلا کا ذاتی معاملہ تھا۔" اس نے کہا۔ "ممکن ہے' اس نے ارادہ بدل دیا ہو اور کہیں اور چلا گیا ہو۔ میں اس معاملے کی چھان بین کروں گا..... لیکن ہم رائی کا پہاڑ نہیں بنا سکتے۔ یہاں معاملات ویسے ہی بہت خراب چل رہے ہیں۔"

❋❋❋

ویدرال قسم کھانے کو تیار تھا کہ خود اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ خبر اسے اس کے ایک شاگرد نے سنائی۔ خبر یہ تھی کہ نوجوان انسپکٹر پٹریلا کو بونرز نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ تفصیل یہ تھی کہ اس کی لاش نہر میں پھینک دی گئی ہے۔

"تم نے یہ کہاں سے سن لیا؟" ویدرال نے اپنے شاگرد مارٹن سے پوچھا۔

"یہ تو سبھی کو معلوم ہے۔" مارٹن نے جواب دیا۔ "اور ہمیں تو یہ فکر ہے کہ اب وہ مائیک' ٹیری اور دوسرے لڑکوں کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ یہ تو ہوگا۔ اس لیے کہ وہ ان کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ لڑکے مل کر ایک طرح کی حفاظتی کمیٹی بنا رہے ہیں۔ انہیں مقدمہ شروع ہونے تک چوکس رہنا ہوگا اور اپنی حفاظت کا بندوبست خود کرنا ہے۔ آئیڈیا اچھا ہے۔ ہے نا سر؟"

"خدا کی پناہ..... خوفناک آئیڈیا ہے یہ۔" ویدرال نے کہا انہوں نے ذہن میں ان لڑکوں کے نام تازہ کیے جو چھ لڑکے گواہی دینے کے لیے آگے آئے تھے ان کے لیڈر مائیک اوکونر اور ٹیری شین تھے۔ دونوں آئرش تھے اور آئرش علاقے میں رہتے تھے' جو اسٹار فورڈ اسٹریٹ' لیٹمار اسٹریٹ اور کٹ اوے لین تک پھیلا ہوا تھا۔

انہوں نے سنا کہ روپر کے قتل سے بھی پہلے سے بونرز اور آئرش لوگوں کے درمیان مخاصمت چلی آرہی تھی۔ سب میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ شیشے ٹوٹے' خون بہا۔ وہ واقعہ ختم مزاج آئرش یادداشت میں محفوظ ہو گیا۔ ویدرال نے سوچا کہ اگر بونرز اور ان کے حامیوں نے یہ فرض کرلیا کہ مائیک اور ٹیری پرانا بدلہ لینے کے لیے ان کے خلاف گواہی دے رہے ہیں تو ساؤتھ بارو اسکول میدان جنگ بن جائے گا۔

یہ خیال آتے ہی وہ پولیس اسٹیشن کی طرف لپکے۔ پتا چلا کہ یہ خبر ان سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی ہے۔

"مصدقہ خبر کوئی نہیں ہے۔" پریشان حال نجمن نے کہا۔ "سنا ہے کہ پٹریلا کو چلڈرز اسٹریٹ میں دیکھا گیا تھا۔ میں نہر کے کنارے کو چیک کرا رہا ہوں۔ لیکن یاد رہے' یہ محض احتیاطی اقدام ہے۔"

"دیکھیں..... اس کی گمشدگی کو چار دن ہو چکے ہیں۔" ویدرال نے کہا۔ "اور آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ غیر ذمے دار آدمی نہیں۔ اگر وہ کہیں چلا بھی گیا ہے تو....." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ بنجمن بھی اس سے کچھ کم پریشان نہیں۔

اس سہ پہر چلڈرز روڈ کے اس سرے پر وہارف کی طرف ایک کانسٹیبل کو ایک شاپنگ بیگ ملا جس میں چھ مردانہ رومال تھے۔ رومال نئے تھے اور بیگ میں اسپنک اسٹور کی رسید بھی تھی۔ اسٹور کی سیلز گرل سے پوچھ گچھ کی گئی۔ اسے پٹریلا یاد تھا..... اور اس نے جس قدر درستی سے پٹریلا کا حلیہ بیان کیا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسے بڑی رغبت سے دیکھتی رہی ہوگی۔ کلرک کا کہنا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہو رہی تھی۔

بنجمن نے سرے کینال کے اس علاقے کی تلاشی کے احکامات جاری کر دیے۔ اس نے ڈسٹرکٹ میں چیف سپرنٹنڈنٹ ٹام کو ارجنٹ نوعیت کا پیغام بھی بھیجا۔ نہر میں تلاش کا کام رات کو بھی جاری رہا۔ آرک لائٹس کی مدد لی گئی تھی۔ اگلی صبح غوطہ خوروں کی ایک ٹیم طلب کر لی گئی۔

اگلی صبح ساڑھے بارہ اسکول کے سو سے زائد لڑکے اسکول لیٹ پہنچے۔ صرف اس لیے کہ وہ یہ تماشہ دیکھنے کے لیے رک گئے تھے۔ اسکول کے پہلے وقفے میں مائیک اوکونر نے اسکول کے لڑکوں کی ایک بھاری جمعیت سے خطاب کیا۔

مسٹر ویدرال کو اس خطاب کی رپورٹ ملی تو انہوں نے سپرنٹنڈنٹ بنجمن کو فون کیا۔ بنجمن اس وقت اپنے افسران کے ساتھ کانفرنس کر رہا تھا۔

"دشواری تو ہوگی۔" ڈوری نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ پورے ڈویژن کا انچارج تھا۔ "پٹریلا کو صحیح طور پر تلاش کرنے کے لیے اضافی نفری درکار ہوگی۔ میرا خیال ہے' میں اضافی مدد طلب کر ہی لوں۔"

مسئلہ لڑکے ہیں۔" بنجمن نے فون ریسیو کرنے کے بعد بتایا۔ "ان کے دماغ میں یہ بات سما گئی ہے کہ بونرز نے گواہی دینے سے روکنے کے لیے پٹریلا کو ٹھکانے لگا دیا ہے اور وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ بونرز دیگر گواہوں کو بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں گے۔"

"تمہیں اس پر یقین نہیں ہے؟" ٹام نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ بعید از امکان ہے۔" بنجمن نے کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ پٹریلا کو کچھ ہو گیا ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ کیا پتا..... وہ بے ہوش ہوا ہو اور نہر میں جا گرا ہو۔ یا یادداشت کھو بیٹھا ہو۔ میں یہ احمقانہ بات نہیں مانتا کہ کوئی جان بوجھ کر..... بقائمی ہوش و حواس کسی گواہ کو قتل کر سکتا ہے۔ سوچیں تو..... کیا وہ اکٹھے سات آٹھ لڑکوں کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں؟"

بعد میں وہ سوچتا رہا کہ کیا وہ خود کو قائل کرنے کے لیے وہ دلائل دے رہا تھا!

اگلی شام..... یعنی پٹریلا کی گمشدگی کے چھٹے روز ویسٹ اسٹریٹ میں جھگڑا ہو گیا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ جھگڑا کیسے شروع ہوا۔ رات ساڑھے نو بجے کی بات ہے۔ کوپر ڈکسن اور کرلی بیٹھے پی رہے تھے۔ اسکول کے لڑکوں کے ایک گروپ نے' جنہیں اصولاً اس وقت گھر سے باہر ہی نہیں ہونا چاہیے تھا' ان پر آوازے کسے۔ چھیڑ خانی اسکول کے لڑکوں نے ہی شروع کی تھی۔ انجام کار کسی نے دودھ کی بوتل پھینک کر ماری' جس کے نتیجے میں کوپر ڈکسن سامنے کے دو دانتوں سے محروم ہو گیا۔ بعد میں ہونے والی ہاتھا پائی کے نتیجے میں ٹیری شین کی کلائی ٹوٹ گئی۔ پولیس کی جمعیت کے پہنچنے کے بعد صورت حال معمول پر آئی۔

ٹیری شین کا باپ ایسا آدمی نہیں تھا کہ اپنے بیٹے کے خلاف جارحیت کو خاموشی سے پی جاتا۔ وہ مانا ہوا ریسلر تھا۔ وہ اب موٹا ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ ٹریننگ سے محروم تھا لیکن اسٹا فورڈ اسٹریٹ کے علاقے میں اس کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اگلی شام وہ آٹھ دس افراد کو ساتھ لے کر کاور اسٹریٹ کے سکس بیلز بار پہنچا' جسے بونرز کا قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت وہاں گروہ کا کوئی آدمی نہیں تھا' سوائے کوپر کے جو پچھلے دروازے سے نکل بھاگا۔ کلی شین اور اس کے ساتھیوں نے دس منٹ تک بار میں خوب توڑ پھوڑ مچائی۔

اگر معاملہ وہیں ختم کر دیا جاتا تو شاید دونوں گروہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے کہ حساب برابر ہو گیا ہے۔ بات ختم ہو جاتی۔

بونرز گروپ کے افراد اور ان کے حامی اب نروس ہو رہے تھے۔ جب تک گروہ قائم تھا' علاقے کے لوگ خوف کی وجہ سے انہیں سلام کرتے تھے لیکن صورت حال خراب ہونے لگی تو گروہ کا شیرازہ منتشر ہوتا دکھائی دینے لگا۔

اسکول کے لڑکے درگزر سے کام لیتے تو معاملہ چند دنوں میں سرد پڑ جاتا لیکن وہ درگزر کے لیے تیار نہیں تھے۔

پٹریلا کی گمشدگی کی نویں رات خاصی گرم تھی حالانکہ وہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ آسمان پر گھٹا تھی اور ماحول پر سکوت تھا۔ سامی بونرز نے وقت گزاری کے لیے چارلی کلب کا رخ کیا۔ وہ اسٹوکر کا بہت شوقین تھا۔

اس نے اپنی کار عقبی گلی میں کلب کے داخلی دروازے کے سامنے کھڑی کی۔ کلب بیس سینٹ میں واقع تھا۔ اترنے کے لیے لوہے کا زینہ تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو اس کی کار کے چاروں ٹائر زمین سے لگے ہوئے تھے۔ پھر اسے ادھر اُدھر پانچ چھ لڑکے کھڑے نظر آئے۔ وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔

"یہ تمہاری حرکت ہے؟" سامی برنز نے پوچھا۔

"ہاں۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ پھر نفرت سے تھوکتے ہوئے بولا۔ "ملعون قاتل۔"

سامی ایک لمحے کو ہچکچایا مگر اسی لمحے اس کے دوست ہیری'

کرلی، کوپر اور نک بھی کلب سے نکل آئے۔ اکیلے پن کا احساس دور ہوا تو سامی شیر ہوگیا۔ اس نے سوچا، سامنے ہے ہی کون..... صرف پانچ لڑکے۔ ان بدبختوں کو سبق دینا ضروری ہے۔ سو سامی نے کار کی عقبی سیٹ کے نیچے سے جیک ہینڈل نکالا اور لڑکوں کی طرف بڑھنے لگا۔ جواب دینے والے لڑکے نے سیٹی بجائی.... اور دیکھتے ہی دیکھتے گلی لڑکوں اور مردوں سے بھر گئی۔

بارو ہائی اسٹریٹ پولیس اسٹیشن میں ڈوری بنجمن کے ساتھ کانفرنس کررہا تھا کہ اس بلوے کی خبر پہنچی۔

"آئرش لوگوں نے سامی بونر اور اس کے ساتھیوں کو ہارٹن اسٹریٹ کے ایک اسنوکر بیس سینٹ میں گھیر لیا ہے۔" ڈوری نے بنجمن کو بتایا "خاصا خون خرابا ہوا ہے۔ وہ لوگ اتنے مشتعل ہیں کہ بونر زان کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ارے نہیں..... میرا تو دل ٹوٹ جائے گا۔" بنجمن نے چڑ کر کہا۔

اتنی دیر میں ڈوری نے اپنے آدمیوں کو احکامات دینا شروع کردیے تھے۔

❋❋❋

دو اسکواڈ کاریں اور ایک ٹینڈر ایک ساتھ ہارٹن اسٹریٹ کے کارنر پر پہنچے۔ ہنگامہ ہو رہا تھا۔ شیشے ٹوٹنے کی آوازوں اور شور و غل سے فضا مرتعش تھی۔

"زبردست پارٹی ہو رہی ہے۔" ڈوری نے کہا۔ پھر وہ ہدایات جاری کرنے لگا۔ "بین..... تم چار آدمیوں کے ساتھ یہیں ٹھہرو۔ انہیں کاروں کے قریب آنے سے روکنا۔" پھر اس نے دوسرے آٹھ آدمیوں کو بڑے محتاط طریقے سے ایک ترتیب دی۔ "سامنے والے دو میرے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر چلیں گے۔ ضرورت پڑے تو قدموں کا استعمال کرنا..... اور ہاتھ نہ چھوٹنے پائیں۔"

وہ انسانی ٹینک کی شکل میں کارنر سے گھومے۔ اسنوکر کلب تک پہنچنے میں انہیں ساٹھ سگین سیکنڈ لگے۔ انہوں نے ٹیبل کو ایک طرف ہٹایا، جسے دروازے کے ساتھ کھڑا کردیا گیا تھا۔ ٹیبل دوبارہ دروازے سے لگا کر انہوں نے اندر کا جائزہ لیا۔

وہاں چار بے حد خوفزدہ افراد سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ پانچواں اوندھے منہ خون کے چھوٹے سے تالاب میں پڑا تھا۔

"ہم اندر تو آگئے ہیں۔" ڈوری نے کہا۔ "لیکن باہر جانا آسان نہیں۔ اس بار وہ ہمارے منتظر ہوں گے۔ وین رائٹ، تم جاکر کوئی دروازہ یا کھڑکی تلاش کرو جس سے باہر جایا جاسکے۔ یہ نیچے کون پڑا ہے بھئی؟"

"یہ کرلی ہے۔" سام بونر نے جواب دیا۔ وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ "انہوں نے اسے ختم کردیا۔ کچھ کرو پلیز!"

"ابھی تک کوئی نہیں مرا ہے۔" ڈوری نے کہا۔

سڑک کی طرف سے چھناکے کی آواز سنائی دی۔ ہجوم نے سامی کی کار کو پہلو کے بل کھڑا کردیا تھا۔ راستہ بلاک ہوگیا تھا۔ فضا میں پٹرول کی بو رچ گئی تھی۔

"ایک کھڑکی ہے سر۔" وین رائٹ نے بتایا۔ "لیکن وہ کسی بند صحن میں کھلتی ہے۔"

"پروا نہیں، چاہے جہنم میں کھلے۔" ڈوری بولا۔ "کہیں نہ کہیں پہنچائے گی تو۔ ہیوز اور گیوگین، تم زخمی کو اٹھاؤ۔ گرا نہ دینا اسے۔ میں اسے ایک پیس میں لے جانا چاہتا ہوں۔ بس اب چل دو۔"

کھڑکی کشادہ نہیں تھی۔ کرلی کو بہ دقت تمام باہر نکالا گیا۔ اسی وقت کمرے میں دھماکا سنائی دیا اور سفید چمک دکھائی دی۔ شاید سامی کی کار جلا دی گئی تھی۔

ڈوری نے صحن میں پہنچ کر اپنی فورس کو پھر منظم کیا۔ "جیسے ہی ہم کارنر پر پہنچیں گے، ہمیں دیکھ لیا جائے گا۔" اس نے کہا۔ "یہ سمجھ لو کہ کچھ بھی ہوجائے رُکنا نہیں۔ اور ہمیں سیدھا کاروں کی طرف جانا ہے۔"

ایک بار پھر ڈوری کی قائدانہ صلاحیت اور متفقہ کوشش کی قوت نے کام دکھایا۔ پھر ان کا مقابلہ ایسے لوگوں سے تھا جن میں تنظیم مفقود تھی۔ وہ سب بخیریت کاروں تک پہنچ گئے۔

"گبرل اسٹریٹ چلو۔" ڈوری نے کہا۔ "اگر ہمارا پیچھا کیا گیا تو فاصلہ زیادہ ہوگا۔"

"وہ پیچھا کریں گے۔" بنجمن نے کہا۔ "لو..... فائر بریگیڈ والے بھی آگئے۔"

وہ کارنر سے گھومے تو انہوں نے پہلے فائر انجن کی گھنٹیوں کی آواز سنی۔

❋❋❋

"اختتامِ سفر" کیبروبل بیسن میں باندھ دی گئی۔ پٹریلا کشتی سے اترا۔ آسمان سیاہ ہو رہا تھا۔ "یہ اچھا ہے کہ تمہارے پاس رین کوٹ موجود ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "کیونکہ یقینی طور پر بارش ہونے والی ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔" پٹریلا نے کہا۔ "اس سے اچھی چھٹیاں میں نے پہلے کبھی نہیں گزاریں۔"

بدنام ترین مجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی مکمل تفصیل

قیمت ۲۰ روپے

چارلس سوبھراج کی سرگزشت

میں ملاحظہ فرمائیں

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

"شکریے کی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر بولا۔ "تمہاری کمپنی میں مجھے بہت لطف آیا۔ پھر کبھی آؤ گے نا؟ جلدی آنا۔"

پٹریلا نے کہا۔ "ضرور آؤں گا۔" لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ ایسا کوئی دوسرا ٹرپ اسے کبھی نہیں مل سکے گا۔

وہ ڈوک کی سیڑھیاں اُترا اور کیمبرویل روڈ پر آگیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ بس کے ذریعے گھر پہنچے مگر جب اسے شمال مغربی اُفق پر دہکتی ہوئی سرخی نظر آئی اور فائر بریگیڈ کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی تو اس نے ارادہ بدل لیا۔ اس نے سوچا' پہلے گبریل اسٹریٹ جاکر صورت حال کے متعلق معلوم کرے۔ وہاں سے گبریل اسٹریٹ دس منٹ کا پیدل راستہ تھا۔

وہ آدھا فاصلہ طے کرسکا تھا کہ اچانک ہی جیسے آسمان پھٹ پڑا۔ بہت تیز بارش شروع ہوگئی۔ اس نے اپنے رین کوٹ کے بٹن اوپر تک لگائے اور دوڑنا شروع کردیا۔

بنجمن اور ڈوری' گبریل اسٹریٹ کی پہلی منزل کی ایک کھڑکی میں کھڑے تھے۔ وہ باہر کھڑے مجمعے کو دیکھ رہے تھے' جس نے پولیس اسٹیشن کی طرف آنے والے تنگ راستے کو مسدود کر رکھا تھا۔ ہجوم زیادہ تر مردوں پر مشتمل تھا۔ چند ایک لڑکے بھی تھے۔

وہ کچھ بھی نہیں کر رہے تھے..... ساکت کھڑے تھے۔

"کاش..... یہ اندر گھسنے کی کوشش نہ کریں۔" ڈوری نے کہا۔ "ورنہ ہمیں کمک طلب کرنا پڑے گی۔ ابھی تک تو ہم نے انہیں ہینڈل کرلیا ہے۔ بس صورت حال اور خراب نہ ہو۔"

"انہیں خود بھی نہیں معلوم کہ یہ کیا چاہتے ہیں۔" بنجمن نے کہا۔ "لیکن انہیں فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ بارش ہو رہی ہے۔ دھمکی کا اثر تو زائل ہو ہی جائے گا۔ ارے..... یہ تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

سرنٹنڈنٹ بنجمن کم ہی ہنستا تھا اور اس کی ہنسی اس وقت بہت زیادہ خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ "میں سوچ رہا تھا کہ ملزمان اپنی ضمانتوں سے خود ہی دستبردار ہوگئے ہیں۔"

"تو اور وہ کیا کرتے۔" ڈوری بولا۔ ابھی دس منٹ پہلے وہ ان سے جُدا ہوا تھا۔ کرلی اس وقت بھی بے ہوش تھا۔ پولیس کا ڈاکٹر اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ دوسرے چار ملزمان کی بھی حالت خراب تھی۔ خوف سے ان کے چہرے سپید پڑ گئے تھے۔ وہ لکھ کر دے چکے تھے کہ وہ ضمانت سے دستبردار ہو رہے ہیں۔ حوالات کی کوٹھری میں داخل ہوتے وقت انہوں نے واضح طور پر سکون کی سانس لی تھی۔

"ہمیں دھٹ کو مب کو مطلع کرنا ہوگا۔" بنجمن نے کہا۔

"ڈوری نے دھٹ کو مب کو ایک شاندار گالی سے نوازا۔ دھٹ کو مب عبوری مجسٹریٹ تھا۔

"کاش..... اب مزید خون خرابہ نہ ہو۔" بنجمن بولا۔ "ہماری پوزیشن بہت اچھی ہوگئی ہے۔ اب لڑکے بے دھڑک گواہی دیں گے اور مجرم سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔"

"میرا خیال ہے' یہ لوگ اب حرکت میں آرہے ہیں۔" ڈوری نے کہا۔

"حرکت؟ ارے..... یہ تو بھاگ رہے ہیں۔"

اور یہ سچ تھا۔ گلی کے دہانے کی طرف ہلچل مچی تھی..... ہلچل کیا' بھگدڑ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ مجمع چھٹ رہا تھا جو لوگ بھاگ نہیں سکے تھے' وہ اِدھر اُدھر دیواروں سے چپک گئے تھے۔ درمیان میں راستہ خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور اس راستے پر.....

"گڈ گاڈ!" بنجمن کے منہ سے نکلا اور اس نے جلدی سے کھڑکی کھول دی۔

اپنے حُلیے کے سلسلے میں پٹریلا ہرگز قصوروار نہیں تھا۔ اس کے لمبے بال بارش میں بھیگ کر کھوپڑی سے چپک گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی بھیگا ہوا تھا اور نیون سائن کی روشنی میں نیلگوں سا لگ رہا تھا۔ کچھ سردی کا اثر بھی ہوگا۔

بنجمن نے خود کو سنبھالا..... سمجھایا کہ ایک مُردہ سراغرساں کے بھوت کا اپنے پولیس اسٹیشن آنا ہرگز قرینِ قیاس نہیں۔ وہ سیڑھیوں کی طرف لپکا' تیزی سے نیچے اترا اور اسٹاف کو چیرتا پھاڑتا پٹریلا کی طرف بڑھا۔ "دروازہ کھولو۔" اس نے اسٹیشن سارجنٹ سے کہا۔

"لیکن سر' مشتعل لوگ....."

"ان کی طرف سے بے فکر ہوجاؤ۔ مجھے یقین ہے' اب کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

دروازہ کھل گیا۔

پٹریلا بڑی بے پروائی سے پُرسکوت کمرے میں داخل ہوا۔

"گڈ ایوننگ سر۔" اس نے کہا۔ "گڈ ایوننگ سارجنٹ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے بینچوں پر بیٹھے باوردی پولیس مینوں کو حیرت سے دیکھا۔ "یہ میرے لیے استقبالیہ کمیٹی کا اہتمام کیوں.....؟"

"تم اوپر چلو۔" بنجمن نے اس سے کہا۔ پھر وہ سارجنٹ کی طرف مُڑا۔ "ڈیوٹی والوں کے سوا باقی سب کی چھٹی کردو۔"

اوپر پٹریلا کو چیف سپرنٹنڈنٹ ڈوری نظر آیا۔ وہ سگریٹ سُلگا رہا تھا۔ اس کی آنکھ کے نیچے نیل پڑا تھا اور کان کی لو زخمی تھی۔

"اب تم آہی گئے ہو تو وضاحت بھی کردو کہ تم کہاں تھے اور کیا ماجرا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟" اس نے کہا۔

پٹریلا کے انداز میں اب بھی بے پروائی تھی۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن کچھ بھی ہو' اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا کیونکہ میں تو ابھی تک چھٹی پر ہوں۔ کل سے ڈیوٹی جوائن کروں گا۔"

PETRELLA'S HOLIDAY
MICHAEL GILBERT

Scanned By:
ATAUL MUSTAFA
0333-4585215

عرب اسرائیل کے پس منظر میں ایک دلچسپ ایڈونچر
ایک بریف کیس کا قصہ جو وجہ نزاع بن گیا تھا۔ اس
میں موجود قیمتی دستاویزات ایک شخص کی جان لے
چکی تھیں اور کئی زندگیوں کے لیے خطرے کی علامت
بن گئی تھیں۔

ایک پاکستانی نژاد مسلمان صحافی کی سنسنی خیز روداد

غلام یا بادشاہ

شائستہ نعیم

میں ہرگز نہیں کہوں گا کہ محمود توفیق میرا جگری یار تھا۔ میں ایک اخباری نمائندہ ہوں، جس کی سلطنت ایک طرف تو قاہرہ سے تہران تک اور دوسری طرف استنبول سے عدن تک پھیلی ہوئی ہے۔ میرے جاننے والوں کی تعداد کم نہیں۔ مجھ جیسے آدمی کے بہترین دوست ایک دوسرے سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ بہرکیف محمود اب کسی کا جگری یار نہیں اور وہ نفرتوں کی سرحد بھی پار کر چکا ہے۔ اب خدا اس کی روح کو سکون عطا فرمائے لیکن مجھے شک ہے کہ وہ اس کا مستحق نہیں۔

میں یہ بھی نہیں جانتا کہ محمود سے کوئی نفرت کرتا تھا یا نہیں۔ اس کی کرسی کی پشت چیر کر عقب سے اس کے دل میں اترنے والا چاقو شاید محض ایک کاروباری آپریشن تھا۔ اس میں کسی ذاتی جذبے کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔

میں اردن میں تھا اور تازہ ترین شامی انقلاب کے سلسلے میں ردعمل نوٹ کرتا پھر رہا تھا۔ میں زیادہ سنجیدہ بھی نہیں تھا کیونکہ

گزشتہ تین برس میں وہ تیسرا ہی انقلاب تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ انقلاب سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان پر ردِ عمل بھی مختلف نہیں ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں گھر بیٹھے بھی اس پر فیچر تیار کر سکتا تھا۔ بغیر کسی بیرونی مدد کے۔ عمان میں اس انقلاب کے بارے میں وہی کچھ کہا جا رہا تھا، جس کی مجھے امید تھی۔ یروشلم کا بھی وہی حال تھا۔ یہاں میں ہمیشہ نیشنل ہوٹل میں قیام کرتا تھا۔ وہاں کے بارمین اور اس کے لطیفوں سے میری پرانی آشنائی تھی۔

بارمین کا ردِ عمل بھی میری توقع کے مطابق تھا۔

ہم بارمین کے ریڈیو پر اسرائیلی خبریں سن رہے تھے۔ یہ بھی سن لیں کہ اگر ہم ریڈیو قاہرہ سے خبریں سن رہے ہوتے تو ہم دونوں کو ہی جیل بھیج دیا جاتا۔ عربوں کی یہ بات ہمیشہ سے میرا دل دُکھاتی رہی ہے۔ بہرحال ہم ریڈیو اسرائیل سے خبریں سن رہے تھے کہ محمود توفیق لفٹ سے برآمد ہوا۔

"مرحبا محمود" میں نے اسے پکارا "کیف الحال؟"

وہ خوش دلی سے مسکرایا اور میری طرف چلا آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں اس وقت کسی سے ہلکی پھلکی گفتگو کی ضرورت محسوس کر رہا تھا اور یہ بھی ہے کہ محمود توفیق جیسے لوگ عام سی خبروں کو مسالے دار بنانے کی اہلیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

"دشمن کے انقلاب کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"فوج اور حکومت ایک شوہر کی دو بیویوں کی طرح ہیں اور ایک دوسرے کو لاتیں مار مار کر پلنگ سے گرانے کی کوشش میں ہیں۔ شام میں امن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک بیوی رکھے اور دوسری کو طلاق دے دے۔"

"لیکن دونوں بیویوں کے رشتے دار بہت اثر و رسوخ والے ہیں۔"

محمود مسکرانے لگا "ٹھیک کہتے ہو عزیز۔ میں تمہیں ایک بات بتا سکتا ہوں...." یہ کہہ کر وہ چُپ ہو گیا اور مجھے پُرخیال نظروں سے دیکھنے لگا۔

"بتاؤ نا... کیا بتانا چاہتے ہو۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی آنکھوں نے بارمین کی طرف موہوم سا اشارہ کیا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ دنیا بھر میں بارمین صرف اپنے بار کے وفادار ہوتے ہیں، انہیں کسی اور کے مفاد کی کوئی پروا نہیں ہوتی اور محمود عام طور پر رازداری سے کام لیتا بھی نہیں تھا۔

میں ابھی سوچ رہا تھا کہ محمود پر دباؤ ڈالوں کہ محمود نے سگریٹ طلب کر لی۔ یوں بارمین کو چند لمحوں کے لیے ہم سے دور جانا پڑا۔ اس دوران محمود میری طرف جھک آیا "پانچ بجے مجھے.... ملو" اس نے سرگوشی میں کہا۔ جس بدنام کیفے کا اس نے نام لیا تھا، وہ میں اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد دُہرانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ پرانے شہر میں واقع تھا۔

میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور سیاست کے موضوع کو ترک کیا اور دس منٹ تک لطیفے بازی کرتے رہے پھر محمود رخصت ہو گیا۔

○☆○

میں محمود کے دیے ہوئے وقت سے ایک گھنٹا پہلے پرانے شہر پہنچ گیا اس لیے کہ میں لندن میں مقیم اپنی رشتے کی ایک خالہ کے لیے کوئی تحفہ خریدنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ خالہ کو پیتل کی چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ چنانچہ ایک گفٹ شاپ پر میں نے کافی سیٹ پسند کیا۔ دُکان دار سے قیمت پر خاصی بحث ہوئی۔ بالآخر میں اسے وہ قیمت دینے پر رضامند ہو گیا جو وہ طلب کر رہا تھا۔ بشرطیکہ وہ پلاسٹک کے اِنر کیس مجھے سیٹ کے ساتھ دے دے۔ پیتل کی پیالیوں کے اندر رکھی جانے والی پلاسٹک کی وہ پیالیاں عام طور پر علیحدہ سے فروخت کی جاتی ہیں۔

بالآخر اس سودے بازی میں جیت میری ہوئی۔ اس فتح کے نشے میں بدمست ہو کر میں نے چند دمشقی چُغے بھی خرید لیے۔ یہ سوچ کر کہ ان میں کافی سیٹ بہت اچھی طرح پیک ہو جائے گا۔ یہ تمام سامان بہ آسانی میرے بریف کیس میں سما گیا۔ میں دُکان سے بہت خوش خوش نکلا... اس حد تک، جتنا پرانے شہر میں ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ وہاں زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلانے کی گنجائش نہیں نکلتی۔ بہرحال میں بہت خوش تھا۔

میں ان گلیوں سے گزرا جہاں دورویہ دُکانیں تھیں اور ہر دُکان اپنے سامنے والی دُکان سے اتنی قریب ہے کہ آپ ان کے درمیان سے گزریں تو دونوں دُکان دار بیک وقت ہاتھ بڑھا کر آپ کی دونوں کہنیاں بہت آسانی سے تھام سکتے ہیں۔ یعنی وہاں سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں۔ البتہ آپ ٹوٹی پھوٹی عربی میں بول سکیں تو دُکان داروں کو یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ سیاح نہیں ہیں چنانچہ میں وہاں سے دوسروں کی نسبت آسانی سے گزر آیا۔

میں کیفے پہنچا تو پانچ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔

کیفے بڑا نہیں تھا۔ وہاں شور شرابہ بہت ہوتا تھا اور دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔ آپ یروشلم کو شہد کی مکھیوں کا چھتا سمجھ لیں تو وہ کیفے اس چھتے کا ایک چھوٹا سا خانہ تھا۔ میں کھڑا اندر کی تاریکی کو نظروں سے ٹٹولتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے محمود توفیق نظر آ گیا۔ وہ ایک بازنطینی طرز کے ستون اور ایک چھوٹی سی میز کے درمیان بری طرح بھنچا بیٹھا تھا۔ ایسے کہ میز کا کنارہ اس کے پیٹ میں گھستا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا کے اشارہ کیا۔ اس تک پہنچنے کے لیے مجھے بازی گری کے جوہر دکھانا پڑے۔

"کیسی منحوس جگہ منتخب کی ہے تم نے؟" میں نے شکایتاً کہا۔

محمود نے کندھے جھٹک دیے "گفتگو کرنے کے لیے یہ بہت مناسب جگہ ہے۔ یہاں شور اتنا ہوتا ہے کہ کوئی کسی کی بات نہیں

سُن سکتا اور اندھیرا اتنا ہوتا ہے کہ پہچاننا تو دور کی بات' کوئی آسانی سے کسی کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔"

ان خصوصیات کے تحت وہاں ہیرے کو آرڈر دینا ناممکن ہی تھا لیکن محمود نے اسے کسی نہ کسی طرح ممکن بنادیا۔ ذرا دیر بعد ہمارے سامنے کافی رکھی تھی۔

"ہاں محمود' اب وہ بات بتادو جو تم وہاں نہیں بتا سکتے تھے" میں نے کہا۔

"وہ... شام کے انقلاب کے بارے میں؟ بات یہ ہے کہ کوئی بات نہیں ہے۔"

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا "تو پھر تم نے...؟"

اس نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلادیے "عزیز... میرے دوست! مجھے میری اس حرکت پر معاف کردینا۔ بات یہ ہے کہ میں تم سے رازداری کے ساتھ نجی نوعیت کی ایک بات کرنا چاہتا تھا۔"

میں اس وقت تک اپنے اخبار کے ایڈیٹر کو ردِّعمل کے سلسلے میں اتنا مواد بھجوا چکا تھا کہ اس طرف سے مجھے بے فکری تھی۔ میں نے سوچا' چلو یہی سہی۔ "تو بتاؤ محمود' میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ بمشکل مجھ تک پہنچ سکی "تم کبھی کبھی دوسری طرف بھی جاتے ہو نا؟"

میں جہاں بیٹھا تھا' وہاں دوسری طرف کا ایک ہی مطلب تھا... اسرائیل! اور پاسپورٹ پر اسرائیل کی مُہر لگی ہو تو عرب ملکوں میں داخلہ خود بخود مخدوش ہوجاتا ہے۔ حالانکہ میں پاکستانی نژاد مسلمان ہوں اور اس حیثیت سے میں اسرائیل نہیں جاسکتا لیکن میں برطانوی شہری بھی ہوں اور برطانیہ کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے سے متعلق ہوں۔ لہٰذا اسرائیل جاتا رہتا ہوں مگر اس کا اعتراف عرب ممالک میں نہیں کرسکتا۔ دونوں طرف جاتے رہنا ڈپلومیسی کا متقاضی ہوتا ہے اور ڈپلومیسی کا مطلب ہے' سچ بولنے سے گریز۔ میں نے خود کو یہ بھی یاد دلایا کہ میں محمود کو بہت زیادہ نہیں جانتا۔ لہٰذا احتیاط ضروری تھی۔ چنانچہ میں نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کرڈالا "تم کیوں پوچھ رہے ہو محمود؟"

"میرے دوست' ایک بار پھر مجھے معاف کرنا۔ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی واقف ہوں کہ تم دوسری طرف جاتے رہتے ہو۔ تمہارا کام ہی ایسا ہے۔ دونوں طرف آؤ جاؤ گے نہیں تو کام کیسے چلے گا تمہارا؟"

"سگریٹ پلاؤ" میں نے مزید مہلت چاہی۔

اس نے میری طرف سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا اور پھر لائٹر جلا کر سگریٹ سُلگانے میں مدد دی "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں دوست" اس نے کہا "میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک ہزار امریکی ڈالر کمانے میں دلچسپی رکھتے ہو؟"

"ہُم..." میں نے اب بھی واضح جواب دینے سے گریز کیا۔

"یہ بریف کیس دیکھ رہے ہو؟" اس نے ایک بریف کیس اٹھا کر دکھایا۔ وہ فرش پر میرے بریف کیس کے برابر ہی رکھا تھا "تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اسے تل ابیب میرے کزن کو پہنچادو" اس نے تل ابیب کا نام ایسے لیا تھا کہ میں محض اس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھ کر ہی سمجھ سکا ورنہ سنائی کچھ نہیں دیا تھا۔ "یہ کام چار دن کے اندر اندر ہوجانا چاہیے' میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس میں کوئی ضرر رساں چیز نہیں۔ اس میں کسی ماہرِ آثارِ قدیمہ ہی کو دلچسپی ہوسکتی ہے۔ مثلاً اس امریکی کو جو اس کے عوض میرے کزن کو بھاری رقم دینے پر آمادہ ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ میں اُدھر نہیں جاسکتا اور میرا کزن ادھر نہیں آسکتا۔"

"تو وہ امریکی تو یہاں آسکتا ہے؟" میں نے نکتہ اٹھایا۔

"نہیں آسکتا۔ وہ یہودی ہے۔"

"اوہ!"

محمود نے بریف کیس دوبارہ فرش پر رکھ دیا۔ "ایک ہزار ڈالر عزیز' جو تم بہ آسانی کماسکتے ہو اور تم میرے خاندان کی ایک طرح سے مالی مدد بھی کروگے۔"

معاملہ عجیب تھا۔ میں پہلے بھی ایسی کئی پیش کشوں کو ٹھکرا چکا تھا۔ پیش کش کرنے والوں میں میرے بعض قریبی دوست بھی تھے۔ میں نے ان کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا۔ ایک ہزار ڈالر کی پیش کش ترغیب انگیز بھی تھی اور شک میں بھی مبتلا کرتی تھی۔ میں بھی ایک عام آدمی ہوں... عام آدمی کی طرح لالچی بھی اور عام آدمی جتنا ہی بزدل بھی۔

"اور کافی پینی چاہیے" میں نے کہا اور سر گھما کر ویٹر کو دیکھنے کی کوشش کی "یہ ویٹر کہاں ملے گا؟"

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے

مفرور ۶ حصے مکمل

طالوت ۳ حصے مکمل

صدیوں کا بیٹا ۵ حصے مکمل

کتابی شکل میں تیار ہیں

آج ہی خط لکھ کر طلب فرمائیں یا اپنے قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ▫ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی نمبر ۱

محمود کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ میں اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔

میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے' بیس سیکنڈ بعد میں نے ویٹر کی طرف سے صبر کیا اور محمود کی طرف مڑا "آجائے گا خود ہی" میں نے کہا "ہاں تو محمود.... بات یہ ہے کہ میں تمہاری مدد ضرور کرتا لیکن یہ کام میرے نقطۂ نظر سے خطرناک ہے۔ مجھے ہر طرف سے بنا کر رکھنی ہے۔ اگر میں یہ کام کرتے ہوئے پکڑا گیا تو بات جرمانے تک محدود نہیں رہے گی۔ میرے لیے اپنا کام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

محمود سامنے کسی چیز کو گھورتا رہا۔ اس نے مجھے جواب نہیں دیا۔

"اگر میرے جواب سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے..." میں کہتے کہتے رک گیا اور اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

محمود کے ہونٹوں کے درمیان جو سگریٹ دبی تھی' جلتے جلتے اس کے ہونٹوں تک آچکی تھی لیکن وہ ساکت بیٹھا تھا' اس نے پلک بھی نہیں جھپکائی۔

"محمود!" میں نے بے ترتیب سانسوں کے درمیان کہا پھر میں اس کی طرف جھکا' میرا ہاتھ اس کی کرسی کے پیچھے تھا "محمود' کیا بات....."

میں پھر کہتے کہتے رک گیا۔ میری آستین کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ وہ چاقو کا دستہ تھا' کرسی کی پشت پتلے بید کی بنی ہوئی تھی۔ چاقو اسے پھاڑتا ہوا اندر گھسا تھا۔ محمود کی پشت سے خون اُبل رہا تھا۔

○☆○

میں نے جو کچھ کیا' بہت تیزی اور سکون سے کیا لیکن وہ بس میری جبلت کا کمال تھا۔ کیونکہ اندر سے تو پریشانی نے مجھے سُن کر دیا تھا۔ کیفے کا ماحول ذرا نہیں بدلا تھا۔ جس کسی نے بھی محمود کی پشت میں چاقو گھونپا تھا' اپنا کام دکھا کے خاموشی سے نکل گیا تھا۔ کسی کو بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کیا ہوا ہے اور قاتل جاتے جاتے بریف کیس بھی لے گیا تھا۔

میری طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ میں نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور اٹھ کھڑا ہوا "اچھا بھئی' پھر ملیں گے" میں نے احتیاطاً کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چند سیکنڈ بعد میں گلی میں تھا... اور تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ بس میں نے دوڑنے سے گریز کیا تھا۔ اس طرح میں خواہ مخواہ لوگوں کی نظروں میں آتا۔

ہیروڈز گیٹ سے گزرنے کے بعد میری حالت بہتر ہوئی۔ اب میرا ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل تھا۔

اصولاً تو مجھے پولیس کو مطلع کرنا چاہیے تھا لیکن اب میں محمود کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے قاتل کے پکڑے جانے کا کوئی موہوم سا امکان بھی نہیں تھا۔ وہ تو مجھے صورتِ حال کا اندازہ ہونے سے پہلے ہی محفوظ ہو چکا تھا۔ اس تنگ و تاریک کیفے میں اسے کوئی دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ مجھے خود خاصی تاخیر سے پتا چلا تھا۔

مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میں نے نادانستگی میں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے مگر مجھے یہ احساس تھا کہ مجھے فوراً اس چکر سے نکل جانا چاہیے۔ اس علاقے میں ایسے معاملات جان لیوا ہی ثابت ہوتے ہیں۔

صلاح الدین روڈ پر پہنچ کر میں نے اپنی رفتار کم کی اور سانسیں ہموار کرنے کی کوشش میں لگ گیا لیکن کوئی بات رہ رہ کے میرے ذہن میں چُبھ رہی تھی۔ بہرکیف خود کو پُرسکون کرنا زیادہ ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے اس خلش کو نظرانداز کر دیا۔

اپنے ہوٹل میں پہنچ کر میں نے بریف کیس بیڈ پر اچھالا تو اچانک وہ الجھن سامنے آگئی۔ جو بریف کیس میں لایا تھا' وہ میرا نہیں' محمود توفیق کا تھا۔

وہ بریف کیس بھی میرے ہی بریف کیس جیسا تھا۔ اس میں حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ میں نے بھی اپنا بریف کیس یروشلم ہی سے خریدا تھا۔ ہاتھ میں لیے ہوئے تو وہ میرے بریف کیس جیسا ہی لگ رہا تھا لیکن اس پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہ میرا نہیں ہے۔ یہ بریف کیس میرے بریف کیس کی نسبت نیا اور گہرے رنگ کا تھا اور اس پر میرے نام کا کارڈ ٹیگ بھی چسپاں نہیں تھا۔ غیرشعوری طور پر میں نے شاید اسی تبدیلی کو محسوس کیا تھا اور یہ بریف کیس مقفل بھی تھا۔

میں نے سوچا' اب صورت حال مختلف ہو گئی ہے' اب تو مجھے پولیس سے رابطہ کرنا پڑے گا لیکن یہ فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ بریف کیس کھول کر دیکھا جائے۔ معلوم تو ہو کہ اس میں ہے کیا... اور یہ کہ میں کس قسم کے معاملے میں ملوث ہوا ہوں۔

میں نے اپنے بریف کیس کی چابی آزمائی لیکن بات نہیں بنی۔ میرے سوٹ کیس کی چابی بھی کام نہ آئی..... لیکن اس میں لگ بہرحال گئی تھی۔ یہ حوصلہ افزا بات تھی۔ چابی تھوڑی سی گھوم رہی تھی۔ میں نے پھر کوشش کی.... بڑی نرمی سے اور ترکیب کے ساتھ۔ پھر اچانک ہی تالا کھل گیا۔

بریف کیس میں نشو پیپر میں لپٹا ہوا ایک پارسل رکھا تھا۔ میں نے کاغذ پھاڑا۔ اندر سے لکڑی کی ایک صندوقچی برآمد ہوئی۔ صندوقچی کو کھولنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر چار عدد سیاہ سی چیزیں رکھی تھیں۔ وہ گلی ہوئی لکڑی کے بہت چھوٹے لٹھے سے لگ رہے تھے لیکن ان کی اوپری سطح درخت کی چھال سے مختلف تھی۔ وہ شاید چرمی کاغذ تھے..."

اچانک میرے ذہن میں گھنٹی سی بجی۔ مجھے یروشلم میوزیم کے منتظمِ اعلیٰ یوسف سعد سے اپنا انٹرویو یاد آگیا۔ ساتھ ہی میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کیا چیزیں ہیں۔ وہ یقیناً بحرِ مُردار کی دستاویزات

تھیں... ممکنہ طور پر اس وقت دنیا کی قیمتی ترین دستاویزات۔

سعد نے جو نسلاً بدو تھا، مجھ سے کہا تھا "میرے میوزیم کو فنڈز کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ مجھے صحرائی بدوؤں سے سودے بازی کرنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اب بھی کچھ قدیم دستاویزات دبائے ہوئے ہیں جو انہیں بحرِ مُردار کے ساحل پر چٹانی غاروں میں ملی تھیں۔ وہ اسے زیادہ قیمت پر بیچنے کے لیے مناسب موقعے کے منتظر ہیں۔"

میں نے سوچا، سعد سے مل لیا جائے، وہ بہتر مشورہ دے سکے گا۔

لیکن اس وقت کوئی سرد، سخت سی چیز میری گُدی سے آ لگی۔ میں عملاً اچھل پڑا۔ لڑکی کی آواز بھی اتنی ہی سخت.... اتنی ہی سرد تھی "سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اب اسے چھونے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ کرو گے تو میں تمہارا بھیجا اُڑا دوں گی۔"

ایک لمحے کو میرے اندر ترغیب ابھری کہ میں فوراً ہی اس پر چھلانگ لگا دوں۔ کالج کے زمانے میں، میں نے جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کی تھی۔ ابھی میری اس صلاحیت کو زنگ نہیں لگا تھا لیکن ڈر یہ تھا کہ وہ یا میں، یا ہم دونوں ہی ان دستاویزات پر گر گئے تو دستاویزات چُرمُرا کر رہ جائیں گی۔ وہ بہت پرانی اور خستہ حال دستاویزات تھیں، کم از کم میں نے خود پر یہی ظاہر کرنا پسند کیا کہ میں ان کی وجہ سے باز رہا تھا۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا۔ پھر میں بہت آہستگی سے سیدھا ہوا۔ میں بیڈ سے دور ہٹا اور پلٹا تاکہ اسے دیکھ سکوں۔ اس کی آنکھیں اور ہاتھ میں موجود ریوالور کی نال میری طرف نگراں رہی۔ دونوں چیزیں میرے ساتھ ساتھ میری سمت میں حرکت کر رہی تھیں "مجھے کیا پروا ہو سکتی ہے۔ یہ دستاویزات ویسے بھی جعلی ہیں۔"

میری ترکیب کارگر رہی.... اس نے چونک کر دستاویزات کی طرف دیکھا۔ میرے لیے اسی ایک ثانیے کی مہلت بہت تھی۔ میں نے اس پر جست لگائی، میرا کھڑا بایاں ہاتھ اس کی کلائی پر پڑا اور داہنے ہاتھ سے میں نے ریوالور کی نال پکڑ لی۔ ہاتھ ٹھیک سے نہیں پڑا تھا لیکن بہرحال ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ہم دونوں ہی کا توازن بگڑ گیا تھا۔ دونوں نیچے گرے اور قالین پر لڑھکنے لگے۔

اس فائٹ میں کوئی جانبازی نہیں تھی۔ بلکہ اس کی فلم بنائی جاتی اور سنسر بورڈ کو پیش کی جاتی تو شاید اسے نمائش کی اجازت بھی نہ ملتی۔ اس کے لڑنے کے انداز میں نسوانی غصہ بھی تھا اور مردانہ مستعدی بھی۔ اور اگر ہم دونوں نیچے گرتے ہوئے ریوالور پر قبضہ کرنے کے چکر میں نہ ہوتے تو ایک دوسرے کو خاصا سنگین نقصان پہنچاتے۔ ریوالور بیڈ کے نیچے جا پڑا تھا۔ یہ احساس ہونے کے بعد ہم دونوں کو صرف دستاویزات کی فکر رہ گئی تھی۔ میں نے جیسے تیسے ٹانگ بیڈ کے نیچے پہنچائی اور ریوالور کو پاؤں مار کر باہر نکال دیا پھر ہم دونوں بیڈ سے دور لڑھکنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کو نوچ رہے تھے اور ریوالور پر قابض ہونے کی فکر میں تھے۔

ریوالور اب ایک گز دور رہ گیا تھا۔ ہم دونوں کے چہرے زمین کی طرف تھے۔ میں نے اپنے بازو سے اس کے کندھے میں لاک لگا رکھا تھا اور اس کی دونوں کلائیاں اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے رکھی تھیں۔ گرفت کی سختی کی مجھے پروا نہیں تھی اور اس کے عورت ہونے کا میں لحاظ نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے کک مارنے کی کوشش کی لیکن میں اس کی رینج سے باہر تھا۔

"بس جانم، تمہیں مات ہو گئی" میں نے ہانپتے ہوئے کہا "اب صلح کی بات کر لیں۔"

مگر اسی وقت میرے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔

○☆○

میں جیسے کسی خواب سے بیدار ہوا... آہستہ آہستہ۔ سب سے پہلے مجھے جو احساس ہوا، وہ سر کی تکلیف کا اور رخسار کے ٹائل والے فرش پر ٹکے ہونے کا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے سب کچھ یاد آنے لگا لیکن ہلنے جُلنے کو جی بالکل نہیں چاہ رہا تھا اور پھر ہلنے جُلنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی بھی طرح سہی، جنگ تو میں ہار چکا ہوں۔ کمرے میں سناٹا تھا۔ میں نے سوچا، یونہی آنکھیں بند کر کے پڑے رہنے میں کیا حرج ہے۔

پھر خیال آیا کہ آخر لڑکی نے کس ترکیب سے میرے پُرزے وار

Scanned By: ATA-UL-MUSTAFA 0333-4585215
SCANNED BY: ATA-UL-MUSTAFA

کیا ہے..... لیکن نہیں.... میرے دماغ کی دُھند چھٹنے لگی۔ مجھے احساس ہوا کہ لڑکی کے لیے تو یہ ناممکن تھا۔ وہ میرے سر پر وار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ یقیناً لڑکی کا کوئی ساتھی ہوگا۔

میں بہت آہستگی سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے اپنے سر کا پچھلا حصہ ٹٹولا' جہاں چھوٹا سا ایک اور سر نمودار ہو چکا تھا۔ بہرحال خوش آئند بات یہ تھی کہ کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی' کھوپڑی چٹخی نہیں تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔

تب مجھے لڑکی فرش پر پڑی نظر آئی۔ میری طرح وہ بھی بے ہوش ہو گئی تھی.... بلکہ اب بھی بے ہوش تھی اور ریوالور غائب تھا۔

میں نے گھوم کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ صندوقچی' بریف کیس اور چرمی دستاویزات... وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ غائب ہو چکا تھا۔

میں چند لمحے وہاں یوں کھڑا رہا کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا پھر میں نے سر جھٹکا۔ اس کے نتیجے میں سر میں جو ٹیسیں اٹھیں' وہ مجھے ہوش میں لے آئیں۔ مجھے جو کچھ ہوا' اسے بھول کر سب سے پہلے لڑکی کی طرف توجہ دینا تھی۔

میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کا اس کا معائنہ کیا۔ مجھ سے لڑائی کے نتیجے میں لگنے والی خراشوں اور چوٹوں کے سوا بظاہر تو وہ ٹھیک ٹھاک تھی۔ بس چمکدار' سیاہ بالوں کے نیچے ایک چھوٹا سا سینگ سا اُبھر آیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا' وہ کراہنے لگی۔

میں ابھی فرسٹ ایڈ سے متعلق اپنی یادداشت کو تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں نے مجھے دیکھا اور فوراً ہی غصے سے دہکنے لگیں۔ اس کے ہاتھ شیر کے پنجوں کی طرح اٹھے۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"آرام سے جانم... ہم دونوں ہی کا کام ہو گیا ہے۔ پہلے کچھ غور کر لو جان" میں نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں پھر گردوپیش کا جائزہ لیا پھر وہ حیران نظر آنے لگی۔

"کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا "وہ جو کوئی بھی تھا یا تھے.... سب کچھ لے گئے ہیں۔ چرمی دستاویزات بھی اور تمہارا ریوالور بھی۔"

"کون تھے وہ؟ ان کے حُلیے..."

"جانم... میں نے انہیں دیکھا ہی کہاں۔ پیچھے سے کسی نے سر پر کچھ مارا اور میں فیوز ہو گیا۔ میرا خیال ہے' تمہارے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں بیڈ کی پٹی پر اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ "ذرا میرا سر ٹٹول کے دیکھو۔ میں اپنے سر پر خود ہی مزید سر اُگانے کی اہلیت ہرگز نہیں رکھتا۔ اے... ذرا آہستہ.... بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ ذرا پیار سے سہلاؤ نا۔"

اس نے میرا گومڑا سہلا کر دیکھا۔ پھر وہ میرے سامنے آبیٹھی "تم کون ہو؟"

"امتیاز عزیز۔ ویسے صرف عزیز کے نام سے پکارا جاتا ہوں۔ روزنامہ لندن ٹائمز کا نمائندہ خصوصی برائے مشرق وسطیٰ" میں نے اپنا پریس کارڈ اور پاسپورٹ نکال کر اسے دکھایا "اب تم بتاؤ۔ تم کون ہو؟"

"میرا تعلق اردن کے محکمۂ نوادرات سے ہے" اس نے بے دھیانی سے کہا۔ وہ میرے کارڈ اور پاسپورٹ کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے بے وقوف بنا رہی ہو" میں نے ہنستے ہوئے کہا "محکمۂ نوادرات کے لوگ مسلح کب سے رہنے لگے؟"

وہ پھر برہم نظر آنے لگی۔ عرب لڑکیاں غصے میں ہوں تو بہت حسین لگتی ہیں۔ اس نے اپنی شرٹ کی جیب سے پلاسٹک کور ڈ کارڈ نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ اس کارڈ پر اس کی تصویر بھی تھی.... اور کارڈ کے مطابق اس کا نام یولہ داؤد تھا۔

"ٹھیک ہے" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو تولنے والی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ بالآخر اس نے کہا "میرے خیال میں ہمارے سروں کے گومڑے کاغذات سے زیادہ مؤثر ثبوت ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو یولہ" میں نے اس سے اتفاق کیا اور اس بنیاد پر اس سلسلے میں جو کچھ جانتا تھا' اسے بتا دیا۔ اس میں سے کچھ تو وہ پہلے سے جانتی تھی۔ وہ محمود توفیق کا تعاقب کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہ بریف کیس کسی اور کے سپرد کرنے والا ہے اور پھر میں محمود سے ملا.... اور اس کے بعد اس نے مجھے بریف کیس لیے باہر آتے دیکھا۔ تب اس نے محمود توفیق کو نظرانداز کر کے میرا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ محمود قتل ہو چکا ہے۔ بہرحال اسے محمود کے قتل کا کچھ غم بھی نہیں تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اس کا بریف کیس اٹھا لایا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا بریف کیس پرانا تھا اور اس پر لیبل بھی لگا تھا" اس نے کہا۔

"تو اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر محمود توفیق کو چرمی دستاویزات کی وجہ سے قتل کیا گیا ہے تو میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ یہ کس کا کام ہے؟"

"وہ کیسے؟"

"زیادہ تجسس مت کرو۔ میں یہ اندازہ بھی لگا سکتی ہوں کہ وہ کہاں گئے ہوں گے" وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی "ہمیں کار کی ضرورت پڑے گی۔"

"میری کار باہر موجود ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے کھینچتی ہوئی باہر لے چلی۔ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہوش آیا تو میں اس کی ہدایات پر اپنی چھوٹی سی کار کو نابلس کی سڑک پر نہایت تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا۔ یولہ میرے برابر بیٹھی تھی۔ اس وقت تک اندھیرا ہو چکا تھا اور میں اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ کی طرف رکھنے پر مجبور تھا۔ ہم رملہ سے گزر گئے۔ اب ساریہ کے ہرے بھرے کھیت سڑک کے اطراف میں نظر آرہے تھے۔ سڑک سنسان تھی۔

میں نے قدرے مطمئن ہو کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"اب مجھے تفصیل بتاؤ" میں نے کہا۔

"بتاتی ہوں لیکن رفتار کم نہ کرو" وہ بولی "ان چرمی دستاویزات کے چکر میں دو گروہ ہیں۔ محمود توفیق ان میں سے ایک میں شامل تھا۔ دونوں گروہ دستاویزات کو دوسری طرف پہنچانے کی کوشش میں تھے لیکن اسرائیلی کوئی بھی نہیں۔ ایک گروہ برطانوی ہے اور دوسرا اطالوی۔"

"اور ہم کس گروہ کے پیچھے جا رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے' برطانوی گروہ کے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"میرے پاس برطانوی قومیت ہے لیکن اگر میرے سر پر برطانیہ کا لگایا ہوا گومڑا ہے تو خانہ جنگی ہو کر رہے گی۔ اور یہ بھی سن لو کہ میں مسلمان ہوں.... اور بنیادی طور پر پاکستانی ہوں۔ ارے.... ایک بات بتاؤ۔ تم لوگوں نے محمود توفیق کو پکڑ کیوں نہیں لیا؟"

"اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اس کا پیچھا کر کے جاننا چاہتے تھے کہ وہ ہمیں کہاں پہنچائے گا۔ پھر یہ بھی دیکھنا تھا کہ محمود کے پیچھے اور بھی کوئی لگا ہوا ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہمیں تنبیہہ کر دی گئی تھی کہ ہم نے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو دستاویزات تباہ کر دی جائیں گی۔ اس لیے میں یہ سمجھی تھی کہ میں جیت گئی۔ میں نے تمہیں عین اس وقت پکڑا تھا' جب دستاویزات میری نظر کے سامنے تھیں۔ لیکن تم..."

"اب شرمندہ نہ کرو۔ مجھے اس وقت حقیقت تو معلوم نہیں تھی" میں نے معذرت کی۔

وہ چند لمحے دل گرفتہ سی بیٹھی رہی۔ پھر بولی "تم نے اپنے بریف کیس پر اپنے نام کا لیبل نہ لگایا ہوتا تو یہ مصیبت نہ ہوتی۔ دوسرے گروہ کو غلطی کا احساس ہوا تو فوراً ہی تلافی بھی ہو گئی۔ انہیں تم تک.... یعنی مجھ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔"

"مجھے تو خالہ کے کافی سیٹ کا غم کھائے جا رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"چھوڑو اس بات کو۔ میرا ذاتی معاملہ ہے" میں نے جواب دیا "یہ بتاؤ' ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"سمارتان لوپ ہول۔"

"یہ کیا بلا ہے؟"

"دو تھن کے قریب عارضی جنگ بندی لائن ناجائز طور پر عبور کرنے کا راستہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے..."

"تم نے پہلے ہی سے اس راستے پر پہرہ کیوں نہیں بٹھایا؟"

"ایسا نہیں ہے۔ بندوبست کر رکھا ہے ہم نے۔ ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی گروہ وہاں سے سرحد پار کرے گا.... ذرا دیکھ کر۔"

میں نے بکری کو بچانے کے لیے تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا۔ کنارے لگے آڑو کے درخت کی کچھ شاخیں کار سے ٹکرائیں۔ ونڈ اسکرین پر خراش لگی لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میں نے وائپر چلا دیا' گاڑی بدستور دوڑتی رہی "دیکھو یولہ!" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ بحرِ مُردار کی چرمی دستاویزات قیمتی ہیں۔ لیکن اب تک کافی دستاویزات مل چکی ہیں۔ مزید چار دستاویزات کی اتنی اہمیت تو نہیں ہو سکتی کہ ان کی خاطر قتل کی نوبت آجائے' دو گروہ آپس میں ٹکرائیں اور محکمۂ نوادرات کے کارکنوں کو اسلحہ دے دیا جائے۔"

"تمہیں ان دستاویزات کے بارے میں علم ہے؟" یولہ نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ بحرِ مُردار کے علاقے مین قمران کی خانقاہ کی لائبریری میں تھے۔ ۶۸ء میں رومیوں نے خانقاہ کو ختم کر دیا مگر اس سے پہلے راہبوں نے دستاویزات کو چھپا دیا تھا۔"

"درست.... لیکن یہ چار دستاویزات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔" یولہ نے کہا "کہا جاتا ہے کہ ان سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ رومیوں سے گھبرا کر خانقاہ والے کسی طرف بھاگے تھے۔ دونوں گینگ ان دستاویزات کی اضافی اہمیت سے واقف ہیں۔ سب اس جگہ پہنچنا چاہتے ہیں' جہاں خانقاہ والوں نے پناہ لی تھی۔ مقصد صرف لوٹنا ہے۔ وہاں سے جو کچھ انہیں ملے گا' بہت بڑا خزانہ ہو گا۔ دنیا کا ہر بڑا میوزیم اس ذخیرے کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے پر مجبور ہو گا۔"

میں بے ساختہ سیٹی بجا کر رہ گیا "واقعی.... تب تو وہ بہت اہم ہوئے۔"

○☆○

ایک کنجوس آدمی نے نوکر سے خوش ہو کر کہا "جاؤ میں نے تمہیں انعام میں وہ بھینس دی جو پچھلے سال گم ہو گئی تھی۔"

کنجوس کی بیوی بولی "آپ اسے وہ گھوڑا کیوں نہیں دے دیتے جو دو سال پہلے مر گیا تھا۔"

○☆○

"اس میں کوئی شک نہیں۔ اب ذرا احتیاط سے چلاؤ گاڑی۔ یہاں سے سڑک بائیں جانب مڑتی ہے۔"

○☆○

آسمان پر نیا نویلا چاند مسکرا رہا تھا۔ پس منظر میں دو تھن کی پہاڑیاں تھیں۔ دو تھن وہ گاؤں ہے جہاں یوسف" کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں پھینک دیا تھا اور بعد میں وہ غلام کی حیثیت سے فروخت کردیے گئے تھے۔ عارضی جنگ بندی لائن اب محض ایک دو میل دور رہ گئی تھی لیکن ہمیں جو جھونپڑی نظر آرہی تھی' وہ ہم سے محض سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھی۔ ہم نے کار کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور پہلے کچھ فاصلہ چل کر اور بعد میں سینے کے بل رینگ کر طے کیا تھا۔

اس وقت ہم زیتون کے درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپے بیٹھے تھے۔

"دائیں جانب والی کھڑکی میں لیمپ روشن ہے" یولہ نے سرگوشی میں کہا "اس کا مطلب ہے کہ خفیہ راستہ کلیئر ہے اور یہ لوگ کسٹمرز کی آمد کے منتظر ہیں۔ یعنی ہم برطانوی گروہ سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"ہم... ارے' تمہیں ان کا خفیہ اشارہ کیسے معلوم ہوگیا؟"

"میں بے خبری میں یہاں نہیں چلی آئی ہوں۔"

"خدا کرے... خیریت رہے۔"

"خاموش۔"

"سوری۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں راستے میں پولیس سے مدد لے لینی چاہیے تھی۔"

"میں جانتی ہوں کہ میں کیا کررہی ہوں" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

مگر مجھے وہ صورت حال کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی "ہم مسلح بھی نہیں ہیں" میں نے اعتراض کیا۔

"تم یہیں ٹھہرو" اس نے کہا اور تاریکی میں ایک طرف رینگ گئی۔ کچھ دیر بعد مجھے قریب سے پتھروں کے سرکائے جانے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد وہ واپس آگئی۔ وہ کوئی لپٹی ہوئی چیز کھول رہی تھی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اس چیز پر رکھا۔ وہ روسی ساخت کا لیوگر پستول تھا۔ میں نے اس سے پستول لینا چاہا مگر اس نے میرا ہاتھ دھکیل دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بہت زیادہ ملوث ہونا بھی نہیں چاہتا" میں نے کہا "میں یہاں اجنبی ہوں۔ تم خود ہی نمٹ لو" لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔

"میرا اپنا ارادہ بھی یہی ہے" وہ بڑبڑائی اور پستول کو لوڈ کرنے لگی "تم بے فکر رہو' یہ جال بڑی احتیاط سے بچھایا گیا ہے۔ اب اسی بات سے اندازہ کرلو کہ ہمارے محکمے کے کارکنوں کو کبھی یوں اسلحہ نہیں تھمایا جاتا۔"

وہ اچانک خاموش ہوگئی۔ کوئی جھونپڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر آسمان کے پس منظر میں مجھے ہیولا نظر آیا۔ پہلے ایک' پھر دوسرا۔ وہ دو افراد تھے اور ہمارے بے حد قریب سے گزر رہے تھے۔ میں نے اپنی سانسیں روک لیں۔ پھر میں نے انہیں جھونپڑی میں داخل ہوتے دیکھا۔ جھونپڑی کا دروازہ بند ہوگیا۔

"ٹھیک ہے" یولہ نے سرگوشی میں کہا "عزیز... آؤ میرے ساتھ۔"

"تمہیں یقین ہے کہ ریوالور تمہارے پاس ہی بھٹر رہے گا؟"

"بالکل یقین ہے پھر بھی اس فکرمندی کا شکریہ۔ آؤ۔"

میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ راستے سے واقف معلوم ہورہی تھی۔ جبکہ مجھے ایک قدم آگے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہرحال ہم ٹھوکر کھائے بغیر کھڑکی تک پہنچ گئے۔ ہم نے روشن لیمپ سے ذرا ہٹ کر کھڑکی سے جھانکا۔

دو انگریز... بشرطیکہ وہ انگریز ہوں... اندر موجود تھے۔ ایک لمبا تڑنگا تھا۔ دوسرا کوئی اسکالر معلوم ہورہا تھا۔ وہ ایک عرب جوان سے گفتگو کررہے تھے۔ اسکالر ٹائپ کی بغل میں محمود توفیق کا بریف کیس دبا ہوا تھا۔

ہم وہاں رُکے رہے۔ یہاں تک کہ سب کی پوزیشنیں ہمیں ازبر ہوگئیں۔ پھر ہم دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے پر ہم ایک لمحہ رکے۔ یولہ کے ہاتھ میں پستول تیار تھا۔ پھر یولہ نے لات مار کر دروازہ کھول دیا۔

میں اسے داد دینے پر مجبور ہوں۔ وہ اتنی تیزی سے حرکت میں آئی تھی کہ سب ششدر رہ گئے۔ انہوں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور سمجھ گئے کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔

"بریف کیس کو میز پر رکھ دو لیکن تیزی نہ دکھانا" یولہ نے انگریزی میں کہا۔

طویل القامت آدمی نے جھنجلا کر گالی بکی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ انگریز نہیں' آسٹریلوی ہے لیکن اس نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسکالر ٹائپ کا چہرہ زرد پڑگیا تھا۔ اس نے ہچکچائے بغیر یولہ کے حکم کی تعمیل کی۔ عرب جوان بس تماشا دیکھ رہا تھا۔

"عزیز... تم وہ بریف کیس اٹھا لاؤ" یولہ نے مجھے حکم دیا "لیکن میرے اور ان کے بیچ میں نہ آنا۔"

میں نے بھی خاموشی سے تعمیل کی۔ یولہ کی آواز اور لہجے میں کچھ ایسا ہی جادو تھا۔ یولہ دروازے سے ذرا ہٹ گئی تاکہ ان سبھوں پر بیک وقت نظر رکھ سکے۔ میں نے بریف کیس اٹھایا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔

یولہ عرب جوان سے عربی میں مخاطب ہوئی "رسّی لاؤ اور ان خبیثوں کو باندھ دو۔"

عرب نے بے پروائی سے کندھے جھٹکے۔ وہ جاکر ایک کونے

میں رکھی گندی رسّی اٹھالایا۔ وہ ہر کام بڑی آہستگی سے کررہا تھا۔ یعنی کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

اسی وقت جھونپڑی کا دروازہ دوبارہ کھلا.... اور کم از کم میری سمجھ سے سب کچھ باہر ہوگیا۔

○☆○

جو شخص جھونپڑی میں داخل ہوا' اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ اس نے کہا "کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔" پھر وہ ہم سب کو دیکھتا رہا۔

میں اس شخص کے اور یولہ کے درمیان کھڑا تھا اور اپنی اس پوزیشن کی وجہ سے بے حد خاموش تھا۔

"جمال!" یولہ نے نرم لہجے میں کہا۔

"یولہ!" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

دونوں میں سے کسی نے بھی ریوالور نہیں جھکایا۔

"ہاں جمال.... اب بولو۔"

جمال چند لمحے غور کرتا رہا پھر بولا "اس شریف آدمی سے کہو کہ بریف کیس مجھے دے دے۔"

"یہ تو ممکن نہیں" یولہ نے کہا۔ وہ جمال سے ہی نہیں' مجھ سے بھی مخاطب تھی "پہلے معاملات طے ہوجائیں۔"

"میرا خیال ہے' تم سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"لیکن تم بھی سودے بازی سے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ اور لوگ تو ہیں نہیں۔ اور دیکھو.... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بریف کیس میرے پاس ہے یا تمہارے پاس۔ بس ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہیے" اس نے دونوں سفید فاموں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے اور انداز میں ان کے لیے حقارت اور نفرت تھی "اچھا ایسا کرتے ہیں کہ دو دستاویزات تمہاری اور دو میری۔ اور ان انگریزوں کو لے جانے سے پہلے تم مجھے نکلنے کی معقول مہلت دوگے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں اس دوران سوچتا رہا کہ کہیں برطانوی قومیّت کی وجہ سے میرا شمار بھی "ان انگریزوں" میں تو نہیں کیا جارہا ہے۔

"مجھے افسوس ہے یولہ" بالآخر جمال نے خاموشی توڑی "یوں بات نہیں بنے گی۔ کیونکہ ایک تو اس بات کا امکان ہے کہ تم کسی دشواری میں پڑ کر اپنی دستاویزات گنوا بیٹھوگی۔ دوسری بات یہ کہ میں اپنے لوگوں کو کیسے مطمئن کروں گا؟ چاروں دستاویزات میرے پاس ہوں تو وہ میں ان کے حوالے کردوں گا۔ اس صورت میں تمہارے تذکرے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ٹھیک ہے نا۔ یہ انگریز تو عربی جانتے نہیں۔"

"لیکن عزیز تو جانتا ہے؟"

"یہ تمہارا تذکرہ نہیں کرے گا۔"

پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔ بالآخر یولہ نے ایک سرد آہ بھری۔

"ٹھیک ہے عزیز۔ یہ بریف کیس جمال کو دے دو اور یہ پستول لے لو۔ ویسے جمال' میں تقریباً کامیاب ہوگئی تھی۔ پھر بھی میں نے دستاویزات ان خبیثوں سے تو بچا ہی لیں۔ جمال.... اب میں جاؤں؟"

"اللہ نگہبان۔"

میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ بہرکیف میں نے بریف کیس جمال کی طرف بڑھادیا۔

"ان کی حفاظت کرنا" یولہ نے کہا۔

"تم بے فکر رہو یولہ! السلامُ علیکم۔"

"شالوم جمال" یولہ نے مسکراتے ہوئے کہا.... اور میں سناٹے میں آگیا۔

دروازہ کھلا.... اور پھر بند ہوگیا۔ وہ جاچکی تھی۔

"میرا خیال ہے' تم ان دونوں کو باندھنے والے تھے" جمال نے عرب جوان کو یاد دلایا۔

عرب جوان نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

"تم کون ہو برادر؟" میں نے جمال سے پوچھا۔

"میرا تعلق اردن کے محکمۂ نوادرات سے ہے۔"

مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی "اور یولہ؟"

"وہ اسرائیل کے محکمۂ نوادرات سے تعلق رکھتی ہے۔"

"میں اس کے سلام سے سمجھ گیا تھا" میں نے کہا "لیکن اس وقت میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ عرب نہیں ہے۔"

"اسرائیل میں بھی عربوں کی کمی نہیں" جمال نے کہا "یولہ اور میں آکسفورڈ میں ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔"

"اوہ!"

"مسٹر عزیز! آپ صحافی ہیں نا؟ میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اس چکر میں کیسے پڑ گئے۔ بس اتنا سن لیں کہ آج رات نہ میں نے آپ کو دیکھا ہے اور نہ آپ نے مجھے۔ اور ہم دونوں نے یولہ داؤد کو نہیں دیکھا۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

اس نے بریف کیس اٹھایا "اگر کچھ اہم ہے تو بس یہ دستاویزات ہیں۔ اور ہاں.... آپ یہ ریوالور مجھے دے دیں اور چلے جائیں۔ نابلس پہنچ کر ایک مہربانی کیجیے گا۔ پولیس کو فون کرکے یہاں بھیج دیجیے گا۔ بس انہیں میرا نام [redacted] گا.... جمال حباش۔ اپنا نام نہ دیجیے گا۔"

السلامُ علیکم" میں نے کہا۔

"وعلیکم السلام" اس نے جواب دیا۔

SANARITAN LOOPHOLE
STEWART FARRAR

شارجہ کے ایک فلیٹ میں وی سی آر پر ڈراما چل رہا تھا اور پانچ پاکستانی جو روزگار کے سلسلے میں وہاں مقیم تھے، بڑے شوق سے یہ ڈراما دیکھ رہے تھے۔ ان کے شوق کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس ڈرامے کے ذریعے انہیں اپنے وطن کی گلیاں اور بازار دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ وطن سے دور رہ کر وطن کی یاد کتنی ستاتی ہے، یہ کوئی غریب الوطن ہی بتا سکتا ہے۔

وہ پانچوں پاکستانی اگرچہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے رہنے والے تھے مگر ان میں کوئی تفرقہ یا اختلاف نہیں تھا۔ وہ پانچ بھائیوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے اور غمی خوشی میں دل و جان سے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔

ان میں ایک پاکستانی کا نام محسن علی تھا۔ وہ ایک تعمیراتی کمپنی میں فورمین تھا اور اسے وہاں کام کرتے ہوئے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ جب وہ وہاں آیا تھا تو پچیس چھبیس سال کا خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ ان دنوں اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور مالی حالات بہت خراب تھے۔ گزارا بڑی تنگی سے ہوتا تھا۔ لہٰذا اپنی بیوی کے مشورے پر اس نے باہر جانے کی کوشش شروع کر دی۔

شادی کے ایک سال بعد اس کے ہاں پہلی بیٹی کی ولادت ہوئی تو زچگی کے اخراجات کی وجہ سے وہ قرضے میں پھنس گیا۔

بچی بہت خوبصورت اور صحت مند تھی۔ نانا نے اس کا نام فوزیہ رکھا اور محسن علی سے کہا کہ اسے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر کرنی چاہیے۔ بیوی نے بھی یہی بات کہی، تاہم محسن علی کو کسی یاد دہانی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود بھی بہت فکرمند تھا اور کئی ریکروٹنگ ایجنسیوں کے ذریعے باہر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی ہوش سنبھالنے کے بعد گھر میں تنگی نہ دیکھے۔ وہ اپنی بیوی عارفہ بیگم سے کہا کرتا تھا کہ ان کی بیٹی ناز و نعم میں پرورش پائے گی۔ وہ اس کے عیش و آرام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔

بالآخر اس کی کوششیں رنگ لائیں اور اسے شارجہ میں ملازمت مل گئی۔ جب اس نے پہلی بار امارات کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو وہ بہت خوش تھا۔ گویا اس کے لیے جنت کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اب وہ اپنی بیٹی اور بیوی کے لیے دنیا بھر کی نعمتیں خرید سکتا

Scanned By: AMAN-UL-MUSTAFA 0333-4585215

سرورق کی کہانی

پہلا رنگ

قید بامشقت

اُس نوخیز حسینہ کی عبرت اثر داستان جو باپ کی عزت کو خاک میں ملا کر سپر اسٹار بننا چاہتی تھی

پاکستان میں ہر تیسرا نوجوان دولت کمانے کے لیے باہر جانے کا متمنی نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پاکستان میں سیاسی لوٹ مار کی وجہ سے روزگار کے مواقع بہت کم ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دولت کی ہوس بہت بڑھ گئی ہے۔ ہر شخص اپنے پڑوسی سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ زیادہ تر لوگ پردیس میں بیوی بچوں کو ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ وہ سال بہ سال گھر آتے ہیں اور بہ ظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مہینے میں وہ اپنے بیوی بچوں کے طور طریقوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اُنہیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ دورِ جدید کی چمک دمک اُن کی اولادوں کو کس طرف لے جا رہی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنی اولاد کو رنگین مشغلے یعنی وی سی آر وغیرہ فراہم کرنے میں کسی بُخل سے کام نہیں لیتے۔ جب نادان بچے اور بچیاں اپنے باپ کے دیے ہوئے وی سی آر پر بے ہودہ فلمیں دیکھیں گے تو اُن کے دل میں کسی قسم کا احساسِ ندامت پیدا نہیں ہوگا۔ اُن کے لاشعور میں یہ احساس موجود ہوگا کہ یہ چیز اُن کے والدین نے اُنہیں دی ہے اس لیے یہ بُری نہیں ہو سکتی۔ اگر بُری ہوتی تو والدین دیتے ہی کیوں۔

عبدالقیوم شاد کی یہ کہانی اُن پردیسیوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے جو اپنی اولادوں کی جھولیاں دُنیاوی نعمتوں سے بھرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور یہ بُھول جاتے ہیں کہ نعمتوں کی فراوانی تباہی کا باعث بھی بن جایا کرتی ہے۔

اُن لوگوں کی کہانی جو اولاد کے آرام کے لیے پردیس میں بوڑھے ہو رہے ہیں

تھا۔

اس کی تنخواہ بہت اچھی تھی اور ہفتے میں پندرہ تا بیس گھنٹے اوور ٹائم کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ جب وہ اپنی بیوی کے نام بڑی بڑی رقموں کے ڈرافٹ بھیجتا تو خوشی سے پھول جاتا۔ اسے بڑی طمانیت محسوس ہوتی۔

سال بھر کے بعد اسے چھٹی ملی تو وہ سازوسامان سے لدا پھندا پاکستان پہنچا تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی سال کے بعد اور کبھی دو سال کے بعد پاکستان جاتا اور ڈھیروں چیزیں خرید کر ساتھ لے جاتا۔

وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ اسی اثنا میں وہ تین بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ بیٹا کوئی نہیں ہوا تھا لیکن وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ خدا کی عطا پر خوش تھا۔

ان پندرہ سولہ سالوں میں اس نے مشین کی طرح دن رات کام کیا تھا اور دل میں گمان کرتا رہا تھا کہ وہ اپنی اولاد کے لیے سب کچھ کررہا تھا لیکن یہ بات اس کے دھیان میں نہیں آئی کہ دولت ثانوی چیز تھی، اولاد کو اس کی شفقت اور تربیت کی بھی ضرورت تھی۔

گزشتہ چار پانچ سالوں سے وہ مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے پاکستان میں سکونت اختیار کرلینی چاہیے لیکن عارفہ بیگم اسے ہربار منع کردیتی تھی۔

اب اس کی صحت کمزور ہوگئی تھی اور بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ اس کی جوانی اور توانائی پردیس کی ہواؤں اور فضاؤں میں کہیں گم ہوگئی تھی۔ وہ بڑی شدت سے گھر کے آرام کی ضرورت محسوس کرنے لگا تھا۔

اچانک ڈرامے کا ایک سین دیکھ کر وہ بُری طرح چونک گیا کیونکہ اسکرین پر وہ کسی اور کو نہیں، اپنی نوجوان بیٹی فوزیہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز ماڈرن لباس میں ملبوس نہایت بے باکی سے ڈرامے کے ایک کردار سے باتیں کررہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بُری طرح چکرا گیا اور چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"محسن علی، خیریت تو ہے؟" اس کے قریب بیٹھے ہوئے شیر زمان نے پوچھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

محسن علی جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا "کچھ نہیں، کچھ نہیں۔

SCANNED BY: ATA-UL-MUSTAFA

یونہی چکر آگیا تھا۔"

"یار، تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ زیادہ اوور ٹائم نہ کیا کرو۔" شیر زمان نے کہا۔ "اتنی دولت کیا کرو گے! اب تمہارے آرام کے دن ہیں۔ بہت پیسہ کمالیا ہے تم نے، اور اب تو تمہیں تنخواہ بھی بہت اچھی ملتی ہے۔"

"ہاں دوست، تم ٹھیک کہتے ہو۔" محسن علی نے بظاہر سادگی سے کہا لیکن بیٹی کی آواز اس کی سماعت پر چھریاں چلا رہی تھی اور وہ ندامت سے زمین میں گڑا جارہا تھا۔ اگر اس کے دوستوں کو پتا چل گیا کہ ڈرامے میں کام کرنے والی وہ شوخ سی لڑکی اس کی بیٹی تھی تو وہ ان کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ وہ سر درد کا بہانہ کرکے اٹھا اور دوسرے کمرے میں جاکر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کے سر میں شدید درد ہونا شروع ہوگیا تھا۔

اس کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور ان کے خاندان میں اس قسم کی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پتا نہیں یہ سب کچھ کیسے ہوگیا تھا۔ جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتا تھا تو اس کی تینوں بیٹیاں گھر میں دوپٹا اوڑھے رکھتی تھیں۔ اس کی بیوی اگرچہ بُرقع نہیں پہنتی تھی، تاہم اس کے سامنے ہمیشہ چادر اوڑھ کر باہر جاتی تھی۔ گزشتہ سال اس نے فوزیہ کو بھی چادر اوڑھتے دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی میں گھر میں کوئی بے ہودگی نہیں ہوتی تھی۔ گو کہ گھر میں دو وی سی آر موجود تھے مگر اس کے سامنے کبھی وی سی آر نہیں چلا تھا۔ رات کے دس بجے ٹی وی بھی بند ہوجاتا تھا۔

ان باتوں سے اسے بڑا اطمینان ہوتا تھا کہ عارفہ بیگم نے بچیوں کی بہت اچھی تربیت کی تھی اور گھر کا ماحول بھی بہت پاکیزہ رکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پردیس میں بہت خوش تھا اور بیوی بچوں کی ہر فرمائش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

لیکن آج اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اس کی بیوی اس کی موجودگی میں ڈراما کرتی تھی۔ اس نے بیٹیوں کو بھی اس ڈرامے میں ماہر کردیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے فوزیہ نے سچ مچ کے ڈرامے میں کام کرنا شروع کردیا تھا۔

وہ رات اس نے انگاروں پر لوٹتے گزاری۔ اگلی صبح اسے تیز بخار ہوگیا اور وہ کام پر نہیں جاسکا۔ صبح کے وقت اسے نیند آگئی اور وہ دن کے دو بجے تک سوتا رہا۔ بیدار ہونے کے بعد اس نے کچن میں جاکر اپنے لیے ناشتا تیار کیا اور ناشتے کے بعد پیراسیٹامول کی دو گولیاں کھا کر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوگئی۔ اس نے تیار ہوکر لباس تبدیل کیا اور سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بیوی کو فون کرکے جواب طلبی کرنی چاہیے یا کچھ روز کی چھٹی لے کر خود پاکستان جانا چاہیے۔

تب ہی اسے ڈرامے کا خیال آیا۔ اس وقت وہ فلیٹ میں اکیلا تھا۔ اس نے ڈرامے کی کیسٹ لگا کر وی سی آر کو آن کردیا اور ڈراما دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ ایک صاف ستھرا ڈراما تھا۔ اگر اس کی اپنی بیٹی اس ڈرامے میں کام نہ کررہی ہوتی تو اسے اس میں کوئی خرابی نظر نہ آتی۔

ڈرامے میں فوزیہ ایک دولتمند خاندان کی فرد تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے ایکٹر کو ڈیڈی اور عورت کو ممی کہتی تھی۔ محسن علی پہلے بھی اس ایکٹر کے ڈرامے دیکھ چکا تھا اور اس کی اداکاری کو پسند کرتا تھا لیکن آج وہ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ بہت بُرا لگ رہا تھا۔ ایک سین میں جب اس ایکٹر نے فوزیہ کو بیٹی کہہ کر گلے سے لگالیا تو محسن علی کا خون کھول اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ جوتا اٹھا کر ٹی وی پر دے مارے۔ وہ کچھ بھی تھا، فوزیہ کا باپ بنا ہوا تھا یا دادا، تھا تو ایک اجنبی مرد اور فوزیہ کے لیے نامحرم بھی۔ محسن علی نے کبھی خود بھی اپنی بیٹیوں کو اس طرح سینے سے نہیں لپٹایا تھا اور فوزیہ بھی اس کے سامنے چھوئی موئی بنی رہتی تھی۔ یہاں وہ سرِعام ایک نامحرم مرد کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اس اختلاط سے اس کی نوخیز جوانی میں یقیناً ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور وہ حجاب تار تار ہوگیا ہوگا جو ایک لڑکی کی پاک دامنی کا ضامن ہوتا ہے۔ اس اختلاط کے بعد بے حیائی کا دروازہ کھلنے میں کون سی کسر رہ گئی ہوگی۔ نادان لڑکی کے دل میں ضرور یہ احساس پیدا ہوا ہوگا کہ جو حرکت ایک مرد کے ساتھ کی جاسکتی ہے، وہ دوسرے کے ساتھ کیوں نہیں کی جاسکتی اور جو حرکت سرِعام کی جاسکتی ہے وہ چھپ کر بھی کی جاسکتی ہے۔

اس احساس کے ساتھ ہی محسن علی کے دل میں ڈرامے اور اس کے کرداروں سے نفرت پیدا ہوگئی۔ اس نے اٹھ کر وی سی آر بند کردیا اور حیرت سے سوچنے لگا کہ یہ بُرائی اسے پہلے کیوں نظر نہ آئی۔ صرف اس لیے کہ پہلے وہ دوسروں کی بیٹیوں کو ویسی حرکتیں کرتے دیکھتا تھا۔

اسی عمارت میں ابرار صدیقی نامی ایک بزرگ رہتے تھے۔ وہ صاحبِ علم اور جہاندیدہ شخص تھے اور پاکستانیوں کے مسائل حل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ چونکہ محسن علی کی اپنی عقل اس وقت کام نہیں کررہی تھی اس لیے وہ مشورہ کرنے کے لیے صدیقی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے محسن علی! تم آج کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟" انہوں نے محسن کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "گھر سے کوئی پریشانی کا خط تو نہیں آگیا؟"

"صدیقی صاحب، میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔" محسن علی نے کہا "گھر سے خط تو نہیں آیا مگر پریشانی کی خبر ضرور آئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ اس لیے آپ کے پاس راہنمائی کے لیے حاضر ہوگیا ہوں۔"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ بہت ذاتی قسم کا ہے۔ امید ہے کہ آپ کسی اور سے اس کا ذکر نہیں کریں گے۔" محسن علی نے کہا لیکن اسے خود ہی اپنی بات پر ہنسی آگئی کیوں کہ جس بات کو وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا وہ ٹی وی اور وی سی آر کے ذریعے ایک عالم میں پھیل چکی تھی۔ پردہ صرف اتنا تھا کہ اس کے پردیسی دوستوں کو یہ علم نہیں تھا کہ جس شوخ لڑکی کو انہوں نے ڈرامے میں دیکھا تھا وہ اس کی بیٹی فوزیہ تھی۔

"خاطر جمع رکھو۔" صدیقی صاحب نے کہا "تمہارا راز مجھ تک محدود رہے گا۔"

"صدیقی صاحب، آپ کو یہ بات یقیناً معلوم ہوگی کہ میں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ایک شریف آدمی ہوں اور بڑی بڑی برائیوں سے ہمیشہ دور رہا ہوں۔ ہمارے خاندان میں مذہبی روایات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں عورتوں کی بے جا آزادی اور فیشن کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری عورتیں بھی اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ کل رات ہمارے وی سی آر پر ایک پاکستانی ڈراما چل رہا تھا۔ مجھے ان چیزوں کا زیادہ شوق نہیں ہے لیکن کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں لیکن کل رات اس ڈرامے میں، میں نے جو کچھ دیکھا، اس نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ڈرامے میں میری نوجوان بیٹی، جس کی عمر پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ ہے، اداکاری کر رہی تھی۔ اس سانحے نے مجھے جھنجوڑ کے رکھ دیا ہے۔ غصے اور پریشانی کے باعث مجھے ساری رات نیند نہیں آئی اور صبح بخار بھی ہوگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ زیادہ غصہ مجھے اپنی بیوی پر آرہا ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً سترہ سال ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی جان کو مشقت میں ڈال کر بیوی بچوں کو دنیا جہان کی آسائشیں فراہم کی ہیں۔ دن کو دن نہیں سمجھا اور رات کو رات نہیں سمجھا مگر عارفہ بیگم نے مجھے بتائے بغیر خاموشی سے میری معصوم بیٹی کو برائی کے راستے پر لگا دیا۔"

"محسن علی، یہی تمہاری غلطی ہے کہ تم نے بیوی بچوں کو دنیا جہاں کی آسائشیں فراہم کردیں اور یہ غلطی صرف تم ہی سے نہیں ہوئی اور بہت سے ہم وطن یہ غلطی کر رہے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

"برخوردار، بات یہ ہے کہ تھوڑی سی تنگ دستی انسان کے لیے رحمت کا باعث ہوتی ہے۔ ایسا انسان کسی نہ کسی رنگ میں خدا کو یاد کرتا رہتا ہے لیکن جس شخص کو دنیا کی ہر آسائش ملنی شروع ہوجائے وہ خدا کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے اور جو خدا کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے وہ برائی کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ بہت کم بندے ایسے ہوتے ہیں جو فراخی میں بھی خدا کو یاد رکھتے ہیں۔"

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟" محسن علی نے پوچھا۔ "کون سا طریقہ اختیار کروں جس سے میرے بیوی بچے برائی کا راستہ چھوڑنے پر تیار ہوجائیں؟"

"تمہارا اپنا کیا ارادہ ہے؟"

"میں تو غصے سے بھرا بیٹھا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آج ہی چھٹی لے کر پاکستان چلا جاؤں اور....."

"نہیں...." صدیقی صاحب نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ "جلد بازی اور غصے سے یہ معاملہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تمہاری بیٹی نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ بہت پرکشش ہے۔ آج کل ہر دوسری لڑکی روشنیوں کی اس دنیا میں قدم رکھنے کی خواہش مند ہے۔ تمہیں بہت صبر اور حوصلے سے کام لینا پڑے گا۔ سولہ سال میں تم نے کچھ نہ کچھ بچت بھی کی ہے یا نہیں؟"

"اللہ کے فضل سے کافی بچت کی ہے۔ ایک مکان خریدا ہے اور سات آٹھ لاکھ روپیہ نقد جمع کیا ہے۔"

"یہ روپیہ یہاں کے کسی بینک میں ہے یا پاکستان میں؟"

"یہ روپیہ پاکستان کے ایک بینک میں ہے۔ وہاں میں نے بیوی کے ساتھ مشترکہ اکاؤنٹ کھول رکھا ہے۔"

"مشترکہ اکاؤنٹ کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس... وہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ اگر خدانخواستہ مجھے کوئی حادثہ پیش آگیا تو میرے بیوی بچوں کو رقم نکلوانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"یہ بھی ٹھیک نہیں کیا تم نے۔ پیسے کی اصل قدر کمانے والے کو ہوتی ہے۔ اس معاملے میں بیویاں ذمے داری کا ثبوت نہیں دیتیں۔ بہرحال... میرا مشورہ یہ ہے کہ تم یہاں سے کام چھوڑ کر پاکستان چلے جاؤ اور جمع رقم سے کوئی کاروبار کرلو۔ اگر یہ نہیں کرسکتے تو بیوی بچوں کو مستقل طور پر یہاں بلوالو۔"

"شروع میں، میں نے انہیں یہاں بلایا تھا اور وہ چند مہینے یہاں رہے بھی تھے مگر انہیں یہ جگہ پسند نہیں آئی۔ وہ یہاں مستقل رہنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ مکان کا مسئلہ بھی ہے۔ اسے نہ بند رکھا جاسکتا ہے اور نہ کرائے پر چڑھایا جاسکتا ہے۔"

"تو پھر نوکری چھوڑ دو اور واپس چلے جاؤ لیکن عجلت میں کوئی

▽▽▽

کام نہ کرنا۔"

محسن علی کے دل میں بھی یہی خیال تھا کہ اسے نوکری چھوڑ کر واپس چلے جانا چاہئے۔ سولہ سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اب اس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی اور اسے اپنا وطن بہت یاد آنے لگا تھا۔ اگر عارفہ بیگم اسے منع نہ کرتی تو وہ چار پانچ سال پہلے واپس جا چکا ہوتا۔

اچانک اسے یہ بات بڑی عجیب لگی کہ عارفہ بیگم اسے وطن آنے سے منع کیوں کرتی تھی۔ کیا اسے شوہر سے زیادہ دولت عزیز تھی؟ اسے اپنی سادگی.... بلکہ حماقت پر غصہ آنے لگا۔

اگلے روز اس نے کمپنی کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس کے دوستوں کو اس اچانک فیصلے پر بہت تعجب ہوا مگر اس نے اصل بات کسی کو نہیں بتائی۔

○☆○

کچھ روز کے بعد وہ کراچی پہنچ گیا۔ اس نے کسی کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس اثنا میں اس کے اندر کافی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور چپ چپ سا رہنے لگا تھا لیکن اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال پیدا ہو رہا تھا کہ عارفہ بیگم نے اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے مشورہ کیوں نہیں کیا اور اس پر مستزاد یہ کہ اسے اندھیرے میں رکھا۔ یعنی دھوکا دیتی رہی۔

ایک رات ہوٹل میں گزارنے کے بعد اس نے ایک گاڑی کرائے پر لی اور رات کے وقت اپنے گھر کی گلی میں پہنچ گیا۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ محسن علی مختلف حلیے میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ چند روز تک اپنے بیوی بچوں کی نگرانی کرے گا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں کس قسم کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں یہ احساس بھی تھا کہ ایسا کرنا اچھا نہیں تھا مگر وہ اپنے ہوش و حواس میں کب تھا۔ اس پر جنون کی کیفیت طاری تھی۔ وہ پورے شواہد اور ثبوت کے ساتھ بیوی کے سامنے جانا چاہتا تھا تاکہ وہ کسی بات کی تردید نہ کر سکے۔

گاڑی کے ڈرائیور کا نام شریف خان تھا۔ وہ آٹھ جماعتیں پڑھا ہوا تھا اور خاصا سمجھدار نوجوان تھا۔ اس نے محسن علی کے حکم پر گاڑی روک دی اور اس کے اترنے کا انتظار کرنے لگا لیکن جب محسن علی نے اترنے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تو اس نے پوچھا کہ کیا وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ ایک شخص نے میرے پیسے دینے ہیں مگر وہ میرے قابو نہیں آ رہا۔" محسن علی نے بہانہ بنایا۔ "مجھ سے چھپتا پھر رہا ہے۔ جب بھی میں اس کے دروازے پر جاتا ہوں اندر سے جواب ملتا ہے کہ... صاحب گھر پر نہیں ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہوں گے۔"

"پیسے تو ہیں مگر نیت خراب ہے۔" محسن علی نے اپنے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ گاڑی رکتے ہی باہر نکل کر دروازے کی طرف دوڑتا لیکن اس وقت اس کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ ہر گزرنے والا لمحہ اس کے شکوک میں اضافہ کر رہا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ عارفہ بیگم سولہ سال سے اسے دھوکا دے رہی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اسے پاکستان آنے سے روکتی تھی۔ اس نے اپنی جان کو مشقت میں ڈالے رکھا اور بیوی اس کی قدر کرنے کے بجائے اسے دولت کمانے کی مشین سمجھتی رہی۔

دو سو چالیس گز پر بنے ہوئے اس کے مکان کی بتیاں جل رہی تھیں اور اندر سے میوزک کی آواز آ رہی تھی۔ غالباً ٹی وی یا وی سی آر چل رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک مکان کی نگرانی کرنے کے بعد محسن علی واپس چلا گیا۔ اگلے روز اس نے مختلف وقتوں میں مکان کی نگرانی شروع کر دی۔

تیسرے روز صبح کے وقت اس نے مکان کے سامنے سفید رنگ کی ایک شیراڈ کار کھڑی دیکھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ہیرو ٹائپ کا نوجوان مکان سے باہر نکلا اور سیٹی بجاتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس کے پیچھے فوزیہ اور عارفہ بیگم بھی باہر آئیں۔ عارفہ بیگم نے مختصر بلاؤز والی ساری پہن رکھی تھی اور گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔ یہ اس عارفہ بیگم سے بالکل مختلف تھی جسے محسن علی جانتا تھا۔ فوزیہ نے چست ریشمی سوٹ پہنا ہوا تھا اور دوپٹا بائیں کندھے پر لٹک رہا تھا۔ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور عارفہ بیگم پچھلی سیٹ پر۔

یہ منظر دیکھ کر محسن علی کا خون کھول اٹھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو باہر نکلنے سے باز رکھا۔

"اس گاڑی کے پیچھے چلو۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔

شریف خان نے اپنی ٹویوٹا کار شیراڈ کے پیچھے لگا دی۔ عارفہ بیگم نے سر گھما کر ٹویوٹا کار کی طرف دیکھا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ تاہم وہ اپنے شوہر کو پہچان نہیں سکی کیوں کہ اس نے سر پر بی کیپ اور منہ پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے نوجوان ڈرائیور سے کچھ کہا جو اس کی بات سن کر عقب منظر آئینہ درست کرنے لگا تھا۔

کچھ فاصلے تک ٹویوٹا کار کامیابی سے شیراڈ کا پیچھا کرتی رہی لیکن ایک سگنل پر بتی سرخ ہونے کی وجہ سے شیراڈ کار نکل گئی اور ٹویوٹا پیچھے رہ گئی۔

پانچویں روز محسن علی نے ایک ہنڈا کار اپنے دروازے کے سامنے کھڑی دیکھی۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے اور مکان کے اندر سے کسی انڈین فلم کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

اس اثنا میں ڈرائیور شریف خان کو شک ہو گیا تھا اور وہ سمجھ چکا تھا کہ قرضے والی بات غلط تھی۔

"صاحب' اس طرح تو آپ کا وقت اور پیسہ ضائع ہو رہا ہے۔" اس نے کہا "آپ مجھے حکم دیں' میں ابھی بندے کو باہر بلالاتا ہوں۔ اس کا نام کیا ہے۔"

"ابھی نہیں۔" محسن علی نے جواب دیا۔ "اس طرح سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"ایک بات میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" ڈرائیور نے کہا "اس بنگلے میں دولت کی کمی نہیں ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ان لوگوں کی نیّت خراب ہے۔"

"ہاں..." محسن علی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "نیّت کی خرابی نے دنیا میں بڑے فساد پھیلائے ہیں۔" قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ "شریف خان' تم شادی شدہ ہو؟"

"جی' اللہ کے کرم سے شادی شدہ ہوں۔ دو بچے ہیں۔"

"تنخواہ کتنی ہے تمہاری؟"

"دو ہزار روپے۔ کچھ اوور ٹائم بن جاتا ہے اور آپ جیسے مہربان کچھ ٹپ شپ دیتے ہیں۔ تنگی ترشی میں گزارہ ہو جاتا ہے لیکن کوئی مزہ نہیں ہے۔ میں باہر جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"باہر مت جانا۔" محسن علی نے کہا۔ "میری بات پلّے باندھ لو۔ باہر گئے تو مارے جاؤ گے۔"

"آپ کیسی بات کر رہے ہیں' صاحب!" شریف خان نے حیرانی سے کہا "باہر جانے والوں کے تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ خوب دولت کماتے ہیں۔"

"ہاں..." محسن علی نے گہرا سانس لیا۔ "دولت ضرور مل جاتی ہے لیکن دولت سے زیادہ قیمتی چیزیں چھن جاتی ہیں اور اس نقصان کا پتا اس وقت چلتا ہے جب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اپنے وطن میں جو کچھ مل رہا ہے اسی پر قناعت کرو۔ بیوی بچے بھی خوش رہیں گے اور تم بھی خوش رہو گے۔"

محسن علی کی نظر اپنے گھر کی طرف لگی ہوئی تھی۔ جب وہ بات کر رہا تھا تو ایک خوش لباس شخص باہر آیا۔ اس کے ساتھ عارفہ بیگم اور اس کی تینوں بیٹیاں بھی تھیں۔ چاروں نے جدید فیشن کے لباس پہن رکھے تھے۔ عارفہ بیگم سوٹ والے شخص کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ آج وہ ریشمی شلوار قمیص میں ملبوس تھی اور حسب سابق گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔

محسن علی کا خون کھول اٹھا۔ اس نے شدّتِ جذبات سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ باہر نکل کر اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر دے لیکن اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔

"صاحب' یہ شخص ٹی وی اور فلموں میں کام کرتا ہے۔" ڈرائیور نے سوٹ والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے اس کا نام بھی یاد ہے... بڑا اچھا سا نام ہے..." اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "ہاں یاد آیا... اس کا نام سلمان ہے۔ اچھی اداکاری کرتا ہے۔ اس نے آپ کے پیسے دینے ہیں؟"

سلمان نامی ٹی وی اسٹار جس کی عمر محسن علی سے چند سال زیادہ تھی' ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور عارفہ بیگم کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ تینوں لڑکیاں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ فوزیہ سے چھوٹی بہنوں کے نام نازیہ اور ناہید تھے۔ نازیہ کی عمر چودہ سال اور ناہید کی تیرہ سال تھی۔ محسن علی نے دیکھا کہ نازیہ نے بھی جوانی کی حدود میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو گاڑی کا پیچھا کرنے کے لیے کہا اور حسرت سے سوچنے لگا کہ جو دولت اس نے بیوی بچوں کے آرام و آسائش کے لیے دی تھی اس نے انہیں بربادی کے راستے پر لگا دیا تھا۔

ڈرائیور اپنی گاڑی ہنڈا کار کے پیچھے لگاتے ہوئے بولا۔ "صاحب' آپ کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"تم اسے سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرو۔" محسن علی نے کہا۔ "یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔"

دونوں کاریں مین روڈ پر پہنچ کر ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہو گئیں۔ ڈرائیور نے کہا۔ "اگر آپ نے اس شخص سے پیسے لینے ہیں تو آج بات کرنے کا اچھا موقع تھا۔"

"فکر نہیں کرو..." محسن علی نے کہا "میں آج ہی بات کروں گا۔ آج قرضہ وصول بھی کروں گا اور قرضہ چکاؤں گا بھی۔"

ہنڈا کار کچھ دور جانے کے بعد اعلیٰ قسم کے اسنیک بار کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ شریف خان نے محسن علی کے کہنے پر ٹویوٹا کی رفتار آہستہ کر دی مگر رکا نہیں۔

محسن علی نے دیکھا کہ اس کی بیوی اور بیٹیاں ہنڈا کار سے باہر آئیں اور سلمان کے ہمراہ اسنیک بار کے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

"گاڑی واپس لے چلو۔" محسن علی نے ڈرائیور سے کہا۔

"ہوٹل؟" شریف خان نے پوچھا۔
"نہیں۔ ان لوگوں کے بنگلے پر۔"
ڈرائیور نے اگلے چوراہے سے گاڑی واپس موڑلی اور چند منٹوں کے بعد بنگلے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس مرتبہ محسن علی نے گاڑی بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگوائی اور کچھ دیر تک آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔
"میں اندر جاکر انتظار کروں گا۔" اس نے کہا "تم کل صبح یہاں آجانا۔"
"آپ اندر کیسے جائیں گے؟ گیٹ پر تو تالا لگا ہوا ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔
"دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے۔"
"اوہ! یہ تو زیادہ اچھا خیال نہیں ہے۔ وہ لوگ آپ کو پولیس کے حوالے بھی کرسکتے ہیں۔ آپ کوئی اور طریقہ سوچیں۔"
"وہ ایسا نہیں کرسکتے۔ مجھے مکان کے اندر دیکھ کر ان کے حواس گم ہوجائیں گے۔ تم کل صبح دس بجے تک گاڑی لے کر آجانا اور گھنٹی بجادینا۔"
ڈرائیور نے محسن علی کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے خوف سا محسوس ہوا۔ اس کے چہرے پر اسے عجیب قسم کی وحشت نظر آئی تھی۔
"صاحب، اگر آپ کہیں تو میں کچھ دیر کے لیے یہیں پر رک جاتا ہوں۔" شریف خان نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ اسے محسن سے دلی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا کیوں کہ وہ اسے روزانہ معقول ٹپ دیتا تھا اور اچھی اچھی نصیحتیں بھی کرتا رہتا تھا۔ آج اس کے چہرے کے تاثرات سے اسے ڈر پیدا ہوا کہ کہیں وہ جوش میں کوئی خطرناک حرکت نہ کر بیٹھے۔ ایسی حرکت جس کی تلافی نہ ہوسکے۔
"شاید آپ کو میری ضرورت پڑجائے۔"
محسن علی نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "شریف خان، تمہارا جذبہ قابلِ قدر ہے لیکن فکر نہیں کرو۔ میں جو کچھ کررہا ہوں، بہت سوچ سمجھ کے کررہا ہوں۔ اگر مجھے تمہاری ضرورت ہوتی تو میں خود ہی تمہیں رُکنے کے لیے کہہ دیتا۔"
شریف خان نے جھجکتے ہوئے کہا "صاحب، ہماری جان پہچان صرف چند روز کی ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق آپ بہت نیک اور ہمدرد انسان ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن.... اگر آپ بُرا نہ مانیں تو.... اس وقت آپ بہت غصے میں نظر آرہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ معاملہ صرف قرض کا نہیں ہے۔ میں ان پڑھ اور جاہل سا آدمی ہوں، لیکن میں نے بزرگوں سے سُنا ہے کہ انسان کو غصے کی حالت میں معاملے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اس وقت آپ واپس چلے جائیں اور جب آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے اس وقت آجائیں۔"
محسن علی نے بڑی توجہ سے شریف خان کی بات سُنی، پھر بولا "شریف خان، تمہیں اصل بات معلوم نہیں ہے، اس لیے تم ایسا مشورہ دے رہے ہو۔ میرا غصہ وقتی نہیں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ غصہ بڑھتا جارہا ہے۔ ایک بات بتاؤ۔ یہ عورت، جو تھوڑی دیر پہلے ہُنڈا کار میں یہاں سے گئی ہے، اگر تمہاری بیوی ہوتی اور کار والا اس کا آشنا ہوتا تو تم کیا کرتے؟"
"میں تو ایسی عورت کو...." شریف خان قتل کرنے کی بات کرنے لگا تھا لیکن موقع مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "میں .... ایسی عورت کو ایک منٹ کے لیے برداشت نہ کرسکتا۔ کھڑے کھڑے طلاق دے دیتا۔"
"اور اگر بیوی کے ساتھ تین بیٹیاں بھی ہوتیں تو پھر؟"
شریف خان نے چونک کر کہا "اوہ.... میں سمجھ گیا۔ یہ عورت آپ کی بیوی تھی۔ کیا یہ ناراض ہوکر آپ سے الگ رہ رہی ہے؟"
"یہ بڑی لمبی کہانی ہے پھر کبھی بتاؤں گا۔ ابھی تم جاؤ۔" محسن علی نے کہا۔ "اور میں کسی پرائے گھر میں داخل نہیں ہورہا، یہ میرا اپنا گھر ہے۔ میری محنت کی کمائی سے بنا ہوا ہے۔ میں نے پوری جوانی کولھو کے بیل کی طرح کام کیا ہے۔" جوش کی وجہ سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر نکلا اور گلی میں نظر دوڑائی جو سنسان پڑی تھی۔ دور و نزدیک کوئی شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے گاڑی سے چھوٹا سا بیگ نکالا اور فینڈر پر پیر رکھ کر دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اندر کود گیا۔
شریف خان نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو آگے بڑھا دیا لیکن کونے پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی اور اسٹیئرنگ وہیل پر بازو ٹکا کر صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اچانک اسے ایک خوفناک بات یاد آئی۔ چند روز پہلے اس نے محسن علی کے بیگ میں ایک خنجر دیکھا تھا۔ وہ سخت پریشان ہوگیا اور سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پولیس کو اطلاع دینی چاہیے یا محسن علی کی بیوی کو خطرے سے آگاہ کردینا چاہیے۔ ایک احساس اس کے اندر یہ بھی تھا کہ اسے اس سارے معاملے سے دور ہی رہنا چاہیے۔
اُدھر بنگلے کے اندر محسن علی کمرے کی چابی تلاش کررہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عارفہ بیگم دروازے کی چابی گملے میں رکھ جاتی تھی۔ نصف درجن گملے چیک کرنے کے بعد اسے چابی مل گئی۔ وہ ڈرائنگ روم کا تالا کھول کر اندر داخل ہوگیا اور بتی جلائے بغیر کمرے کا جائزہ لیا۔ باہر جلنے والی بتی سے اندر مدّھم اُجالا ہو رہا تھا۔ کمرے میں پرفیوم کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ محسن علی دوسرے کمرے میں گیا، اس کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ڈرائنگ روم کے دروازے پر دوبارہ تالا لگا کر چابی گملے میں رکھ دی پھر وہ دوسرے کمرے کے دروازے سے اندر چلا گیا اور تاریکی میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس نے اپنے بیگ سے خوبصورت دستے والا خنجر نکال کر میز پر رکھ دیا۔
ڈرائیور شریف خان ہنوز متذبذب تھا۔ کچھ دیر تک وہ وہیں پر

کھڑا انتظار کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب ہنڈا کار واپس آئے گی تو وہ ان کو صورت حال سے آگاہ کردے گا پھر اسے خیال آیا کہ اسے اسنیک بار میں جاکر ٹی وی اسٹار سلمان کو حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے کار اسٹارٹ کی اور اسنیک بار کی طرف روانہ ہوگیا لیکن وہاں پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ کیوں کہ ہنڈا کار اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ کاؤنٹر سے پتا چلا کہ مسٹر سلمان چند منٹ پہلے بل ادا کرکے واپس چلے گئے تھے۔

شریف خان کو اپنی حماقت پر بہت غصہ آیا۔ اسے گلی میں ہی رُک کر انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ دوبارہ کار میں جا بیٹھا اور دل میں دعا کرنے لگا کہ محسن علی کے بیوی بچے گھر جانے کے بجائے کہیں اور چلے گئے ہوں۔

○☆○

اسنیک بار سے رخصت ہونے کے بعد سلمان نے ایک سُپر اسٹور سے آئسکریم خریدی اور پانچوں آئسکریم کے مزے لیتے ہوئے واپس روانہ ہوئے۔

"بھئی' فوزیہ کی اداکاری بہت زبردست ہے۔" سلمان نے کہا۔ "یہ بالکل نیچرل اداکاری کرتی ہے۔"

فوزیہ دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی "آپ ایسے ہی مجھے بنا رہے ہیں۔ میری اداکاری اتنی اچھی بھی نہیں ہے۔"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ہیرے کی پہچان جوہری ہی کرسکتا ہے۔ میں اگلے ڈرامے میں بھی تمہیں چانس دلوانے کی کوشش کررہا ہوں۔ اگر تم محنت کرتی رہیں تو بہت جلد فلمی دنیا کے لوگ تمہاری طرف متوجہ ہوجائیں گے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ مجھے فلموں میں ہیروئن کا چانس بھی مل سکتا ہے؟"

"ہاں.... کیوں نہیں۔" سلمان نے کہا۔ "تھوڑی سی پی آر کی ضرورت ہے۔ تمہارے اندر سُپر اسٹار بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر تم نے شوبزنس سے ناتا برقرار رکھا تو تھوڑے ہی عرصے میں تم شہرت کی بلندیوں تک پہنچ جاؤگی اور پاکستان کے ہر شہر میں تمہاری بڑی بڑی تصویریں لگی ہوں گی۔"

تعریف سچی ہو یا جھوٹی' ہر شخص کو اچھی لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اچھے خاصے جہاندیدہ لوگ بھی تعریف اور چاپلوسی سے متاثر ہوجاتے ہیں اور فوزیہ تو فقط ایک نادان لڑکی تھی۔ اس کا مبالغہ آمیز تعریف کے زہر سے بچنا محال تھا۔ یہ صرف سلمان ہی نہیں تھا جو فوزیہ کی تعریفوں کے پُل باندھتا رہتا تھا بلکہ شوبزنس کے کچھ اور لوگ بھی اس "کارِ خیر" میں شریک تھے۔ ان تعریفوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس نوخیز کلی کا قرب حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ان بے جا تعریفوں کی وجہ سے فوزیہ نے اونچے خواب دیکھنا شروع کردیے تھے۔ وہ تنہائی میں سوچتی کہ اتنے سارے لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اس کے اندر ضرور ٹیلنٹ موجود ہے۔ اگر وہ سُپر اسٹار بن گئی تو دولت اور شہرت اس کے در کی غلام ہوگی۔ کچھ لوگوں نے اس کے کانوں میں یہ بات بھی ڈالنا شروع کردی تھی کہ شہرت کی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے شروع میں "قربانی" بھی دینا پڑتی ہے اور فوزیہ اتنی نادان نہیں تھی کہ قربانی کا مفہوم نہ سمجھ سکتی۔ تاہم اس معاملے میں اس کے ذہن میں اُلجھن پائی جاتی تھی۔ وہ ذہنی طور پر ابھی قربانی کے لیے تیار نہیں تھی۔

"عارفہ بیگم' بیٹی کو اب گھر نہ بٹھالینا۔" سلمان نے کہا۔ "اس کی ترقی کے لیے تمہاری حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔"

"میری طرف سے اسے کھلی اجازت ہے۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ "لیکن اس کے ابّا کی طرف سے ڈر ہے۔ اگر ان کو پتا چل گیا تو وہ بہت شور مچائیں گے۔ دراصل وہ پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔ دعا کریں کہ وہ اور چار پانچ سال تک پاکستان نہ آئیں۔"

"بھئی' یہ چھپنے والی بات نہیں ہے۔" سلمان نے کہا "مجھے تو تعجب ہے کہ ابھی تک ان کو پتا کیوں نہیں چلا۔ پاکستانی ڈرامے تو سب جگہ دیکھے جارہے ہیں۔"

"ان کو اِن چیزوں کا شوق نہیں ہے۔ ویسے بھی ان کو کام سے ہی فرصت نہیں ملتی۔"

"اگر ان کو پتا بھی چل گیا تو اندیشے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑا بہت شور مچا کر چپ بیٹھ جائیں گے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ فلم انڈسٹری کی بعض نامور ہیروئنوں کو اس قسم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بس آپ کو اور فوزیہ کو مضبوط رہنا ہوگا۔"

"یا اللہ' ابّا کو نہ ہی پتا چلے۔" فوزیہ نے کہا۔ "ویسے میں اب بچی نہیں ہوں۔ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ ابّا کو میری ترقی میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے ابّا کو جب دولت کی جھلک نظر آئے گی تو وہ زیادہ مخالفت نہیں کریں گے۔ فلمی لائن میں تم ایک سال میں جتنی دولت کما سکتی ہو' تمہارے ابا نے اتنی دولت دس سال میں بھی نہیں کمائی ہوگی۔"

یونہی باتیں کرتے ہوئے وہ اپنی گلی میں پہنچ گئے۔ سلمان نے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی اور بولا "اچھا بھئی عارفہ بیگم' مجھے اجازت دو۔"

"اتنی جلدی کس بات کی ہے۔" عارفہ نے کہا۔ "ایک کپ کافی کا ہوجائے۔"

فوزیہ باہر نکلی اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر سلمان کا ہاتھ پکڑلیا' بولی "ہم آپ کو ابھی نہیں جانے دیں گے۔ آپ سے ابھی میں نے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

عارفہ بیگم گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی اور گلے سے چابی اٹھا کر ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دیکھا کہ اندر کسی کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ شاید وہ بے خیالی میں بتی بند کرنا بھول گئی تھی۔ اس نے دروازے کا تالا کھولا اور دونوں

بیٹیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔

سلمان باہر گاڑی لاک کر رہا تھا اور فوزیہ اس کے پاس کھڑی تھی۔

عارفہ بیگم ڈرائنگ روم سے ہوتی ہوئی اس بیڈ روم میں پہنچی جس کی بتی جل رہی تھی۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ایک باریش شخص جس نے پی کیپ پہن رکھی تھی' ان کی خاندانی البم پر جھکا ہوا تھا۔ البم کے قریب ہی ایک آبدار خنجر رکھا تھا۔ آہٹ پاکر اس نے عارفہ بیگم کی طرف دیکھا اور خنجر اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں دونوں لڑکیاں بھی ماں کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ چونکہ محسن علی نے داڑھی رکھ لی تھی اور نامانوس لباس میں ملبوس تھا' اس لیے تینوں اسے فوری طور پہچان نہ سکیں۔ تینوں کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔

باہر سلمان نے گاڑی لاک کی اور فوزیہ کے ہمراہ گیٹ میں داخل ہوا۔ تب ہی ایک ٹویوٹا کار اس کی ہنڈا کار کے پیچھے رکی اور ڈرائیور تیزی سے باہر نکلا۔ "سلمان صاحب' رک جائیں۔" اس نے زور سے آواز لگائی۔

اسی لمحے اندر سے چیخوں کی آواز ابھری۔ سلمان نے ایک ثانیے کے لیے پیچھے دیکھا اور تیزی سے اندر بھاگا۔ ڈرائیور بھی اس کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ فوزیہ نے دونوں کی تقلید کی۔

اندر پہنچ کر سلمان نے دیکھا کہ ایک باریش شخص آبدار خنجر ہاتھ میں پکڑے عارفہ بیگم کے سر پر کھڑا ہے۔

"خبردار..." سلمان نے کہا اور کسی ہتھیار کے لیے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

باریش شخص تیزی سے اس کے سر پر پہنچ گیا اور وار کرنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ فوزیہ نے پہلی ہی نظر میں باپ کو پہچان لیا۔ وہ دوڑ کر دونوں کے بیچ میں آگئی۔ ڈرائیور شریف خان بھی ان کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس نے خنجر کے سامنے اپنا ہاتھ کر دیا۔ خنجر اس کے ہاتھ کو زخمی کرتا ہوا رک گیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خنجر سیدھا فوزیہ کے خوبصورت چہرے میں پیوست ہو جاتا۔

شریف خان نے زخمی ہونے کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور محسن علی سے لپٹ گیا۔ لڑکیوں کی چیخوں سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ سلمان پولیس کو فون کرنے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف بھاگا۔ فوزیہ اس کا ارادہ بھانپتی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔

"انکل' یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" اس نے چیخ کر کہا۔ "کسی کو فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے ابا ہیں۔ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔"

سلمان نے ریسیور ہاتھ سے رکھ دیا اور گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ "وہ تمہارے ابا ہیں!" اس نے حیرانی سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ "میں تو اسے کوئی چور سمجھا تھا۔"

محسن علی بنیادی طور پر شریف آدمی تھا۔ جب اس نے سلمان پر وار کیا تھا اور فوزیہ بیچ میں آگئی تھی تو اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وار اس کی بیٹی کے چہرے کو لہولہان کر جائے گا۔ فوزیہ اتنی تیزی سے بیچ میں آئی تھی کہ ہاتھ روکنا مشکل تھا لیکن جب شریف خان نے اس کا وار اپنے ہاتھ پر لیا تو اسے افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ افسوس اس بات پر ہوا کہ ایک بے گناہ شخص اس کے ہاتھ سے زخمی ہوگیا اور خوشی اس بات پر ہوئی کہ اس کی بیٹی زخمی ہونے سے بچ گئی۔

عارفہ بیگم نے شریف خان کے ہاتھ پر کپڑا باندھ دیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس چلا جائے۔

سلمان بغلی دروازے سے باہر نکل گیا تھا اور عجلت میں اپنی کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ محسن علی دوبارہ اس پر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

لیکن محسن علی نے خنجر ہاتھ سے پھینک دیا تھا اور کسی بے بس انسان کی طرح صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے کندھے ڈھلکے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اگر کوئی اندر جا کر دیکھتا تو اسے کھلی ہوئی البم پر بھی اس کے آنسوؤں کی نمی نظر آجاتی۔ انتظار کے دوران وہ البم نکال کر اپنی اور بیوی بچوں کی پرانی تصویریں دیکھتا رہا تھا۔ ان میں اس کی شادی کی تصویریں اور بیٹیوں کے بچپن کی تصویریں تھیں۔

شریف خان نے قالین پر گرا ہوا خنجر اٹھالیا اور بولا "صاحب' میں یہ خنجر ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اگر میرا ہاتھ زیادہ زخمی نہ ہوا تو آپ کے حکم کے مطابق کل دس بجے حاضر ہو جاؤں گا۔"

محسن علی نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر شریف خان کو دیے' بولا۔ "ان پیسوں سے اپنی مرہم پٹی کروالینا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ تمہارے خون نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"صاحب' آپ مذہبی آدمی ہیں۔ آپ کو تو پتا ہونا چاہیے تھا کہ اسلام میں ایسا تشدد جائز نہیں ہے۔"

"مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی لیکن جو کچھ میں نے دیکھا تھا' اس نے مجھے پاگل بنا دیا تھا۔"

شریف خان ڈرائیور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

عارفہ بیگم' جو شوہر کو خنجر بدست دیکھ کر خوفزدہ نظر آرہی تھی' اب اسے آنسو بہاتے دیکھ کر پُراعتماد لگ رہی تھی۔

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔

محسن علی کچھ نہیں بولا۔ تینوں لڑکیاں ابھی تک خوفزدہ تھیں اور کچھ فاصلے پر خاموش کھڑی تھیں۔

"یہ کون سا طریقہ ہے گھر آنے کا!" عارفہ بیگم نے مزید کہا۔ "نہ اپنے آنے کی اطلاع دی اور نہ سیدھے گھر آئے۔ ذرا دیکھیں تو بچیوں کے رنگ خوف کی وجہ سے کیسے سفید پڑ گئے ہیں۔ سامان کہاں ہے آپ کا؟ آپ کب کراچی آئے ہیں؟"

بیوی کی باتیں سن کر محسن علی پر دوبارہ جنون طاری ہونے لگا۔

اس نے سوچا، یہ عورت اپنی حرکتوں پر نادم ہونے کے بجائے اُلٹا سوالات اور سرزنش کررہی ہے۔ وہ صوفے سے اٹھا، آستین سے آنسو پونچھے اور پورے قد کے ساتھ تن کر عارفہ بیگم کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"میں.... کئی دن سے تمہاری نگرانی کررہا تھا۔" اس نے بیوی کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

عارفہ بیگم اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گھبرا گئی اور دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

محسن علی ایک قدم آگے بڑھا اور دوبارہ کسی روبوٹ کی طرح بولا۔ "میں نے کہا ہے کہ میں کئی دن سے تمہاری نگرانی کررہا تھا۔"

نازیہ اور ناہید خوف کے باعث رونے لگیں۔

"شش... شاید آپ کی.. طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ "آپ بیٹھیں..... بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے.... وہ جوس بنا کر لاتی ہوں۔ یا.... آپ کافی پینا پسند کریں گے؟"

"میں.... تمہارا... خون پینا پسند کروں گا۔" محسن علی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ میں اس نگرانی کے دوران کیا کچھ دیکھ چکا ہوں؟"

"جج... جی... جی ہاں بالکل اندازہ ہوگیا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔" محسن علی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم بھی اِدھر آجاؤ اور یہ رونا دھونا بند کرو۔ میں کوئی ڈاکو نہیں، تمہارا باپ ہوں۔"

"دد... دیکھیں، اس وقت آپ تھکے ہوئے ہیں۔" عارفہ بیگم نے کہا "آج آرام کرلیں۔ باتیں کرنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔"

"کس نے کہا ہے کہ میں تھکا ہوا ہوں؟"

"م... میرا مطلب ہے کہ.... اس وقت آپ کا موڈ...."

"بیٹھ جاؤ۔" محسن علی نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اسی وقت بات کرنا چاہتا ہوں۔"

عارفہ بیگم صوفے پر بیٹھ گئی۔ تینوں لڑکیاں سہمی سہمی آگے بڑھیں اور اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

"عارفہ بیگم، سترہ سال پہلے جب ہماری شادی ہوئی تھی تو میری تنخواہ کتنی تھی؟" محسن علی نے پوچھا۔

"شش... شاید تین سو روپے تھی۔" عارفہ بیگم نے جواب دیا۔ وہ اس سوال کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔

"ہاں، میری اتنی ہی تنخواہ تھی۔ اس قلیل تنخواہ کی وجہ سے ہمارے گھر میں تھوڑی سی تنگی ضرور تھی مگر بے حیائی نہیں تھی۔ اگر میں باہر نہ جاتا تو اس وقت میری تنخواہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین ہزار روپے ہوتی لیکن میں نے تمہارے عیش و آرام کے لیے اپنی جوانی کے سارے سال بے وطنی میں گزار دیے۔ میں نے روزانہ بارہ بارہ اور چودہ گھنٹے کام کیا۔ ان سولہ سترہ سالوں میں میں

آزمائش کی کڑی دھوپ میں ایک پاکستانی جاں باز کا سفر

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں..... جب خون جگر برفاب ہوا

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلہ وار شائع ہونے والی مقبول کہانی
علی یار خان کی سرگزشت

مجاہد

کتابی شکل میں چار حصے شائع ہوگئے ہیں

قیمت فی حصہ =/۲۵ روپے ..... ڈاک خرچ ۱۰ روپے
چاروں حصے ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳۔ کراچی نمبر ۷۴۲۰۰

نے زندگی کا کوئی سکھ نہیں دیکھا۔ یہ ایک طرح کی قیدِ بامشقت تھی جو میں نے تمہارے آرام کے لیے برداشت کی۔ عارفہ بیگم، میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"نہیں نہیں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" عارفہ بیگم نے مصلحت سے کام لیا۔

"تم لوگوں نے ان سولہ سالوں میں کیا کیا؟ صرف اتنا کیا کہ میری محنت کے پیسے پر عیاشی کی اور مجھے بھلا دیا۔ میں تم لوگوں کی نظروں میں صرف کمانے والی مشین تھا۔ اس سے زیادہ تم نے مجھے کوئی اہمیت نہیں دی۔ میں پاکستان آنا چاہتا تھا مگر تم ہر دفعہ مجھے منع کر دیتی تھی کیوں کہ تمہارے کرتوت ٹھیک نہیں تھے۔ تمہیں ڈر تھا کہ میں واپس آکر تمہارے کھیل تماشوں پر پابندیاں لگا دوں گا۔"

"یہ بات نہیں تھی۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ "دراصل میں چاہتی تھی کہ کاروبار کے لیے کچھ رقم..."

"جھوٹ مت بولو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ آج تم سلامت میرے سامنے بیٹھی ہو۔ یہ سلمان یہاں کیوں آتا ہے؟"

"آ... آپ کوئی غلط مطلب نہ لیں۔ سلمان بُرا آدمی نہیں ہے۔ وہ کسی بُری نیت سے یہاں نہیں آتا۔"

"بکواس مت کرو۔ تمہیں نظر نہیں آتا کہ بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ تم بیٹیوں کو بنا سنوار کے ایک نامحرم مرد کے ساتھ ہوٹلوں میں جاتی ہو۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑی برائی ہے۔ کیا اس شہر میں عورتیں ختم ہو گئی ہیں جو تمہیں ایک نامحرم مرد کے ساتھ دوستی لگانے کی ضرورت پڑی۔ کیوں آتا ہے وہ یہاں پر؟ کیا رشتہ ہے اس کا تمہارے ساتھ؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، وہ آئندہ نہیں آئے گا۔"

"ہاں۔ نیت...!" محسن علی نے تلخی سے کہا۔ "کیا عجیب فلسفہ ہے! نیت اچھی ہو تو بے شک آدمی پرائی عورت کی بغل میں گھس جائے۔ شیطان اسی طرح انسان کو دھوکا دیتا ہے اور وہ لڑکا کون ہے جو شیراڈ کار میں یہاں آتا ہے؟" محسن علی نے فوزیہ کو گھورا۔

"اس کا نام ارشد ہے۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ "ایک بہت بڑے کاروباری باپ کا بیٹا ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ ہمارے ان سے خاندانی تعلقات ہیں۔"

"وہ کیوں آتا ہے یہاں؟ اب دوبارہ نیت والی بات مت کرنا۔ اور یہ فوزیہ اس کے ساتھ کار میں کہاں جاتی ہے؟"

"دیکھیں... جوان بیٹی پر شک نہ کریں۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ "ارشد بہت شریف لڑکا ہے۔ ٹی وی ڈراموں میں بھی کام کرتا ہے۔ وہ ایک آدھ دفعہ ہمیں شاپنگ کے لیے لے گیا تھا۔"

"شک نہ کریں!" محسن علی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "وہی نیت والی بات۔ کس بات پر شک نہ کروں؟ جو میں نے دیکھا ہے کیا وہ برائی نہیں ہے؟ جب ہم اولاد کو چھوٹی برائی کی اجازت دے دیں گے تو بڑی برائی خود اپنا راستہ بنا لے گی۔"

"دیکھیں... آج کل زمانہ بدل گیا ہے۔ کل کو ہم نے لڑکیوں کے رشتے بھی کرنے ہیں۔"

"بہت خوب! بہت آسان طریقہ ہے رشتے کرنے کا۔ لڑکیوں کو لڑکوں سے دوستی کے لیے کھلا چھوڑ دو، رشتے خود بخود ہو جائیں گے۔" محسن علی نے فوزیہ کو گھورا۔ "تم ڈراموں میں بھی کام کرتی ہو؟"

"جج... جی ہاں۔" فوزیہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "ایک پروڈیوسر نے مجھے ڈرامے میں کام کرنے کی آفر کی تھی۔ میں نے امی کی اجازت سے اس کی آفر قبول کر لی۔"

محسن علی بیوی کی طرف مُڑا۔ "تمہیں پتا نہیں کہ ہمارے خاندان میں اس چیز کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔ تم نے مجھے یہ بات کیوں نہ بتائی؟"

"آپ یہاں ہوتے تو ضرور بتا دیتی۔" عارفہ بیگم نے بظاہر ندامت سے کہا "شاید آپ کو پتا نہیں کہ آپ کے کزن حفیظ بھائی کی بیٹی بھی ڈراموں میں آ رہی ہے۔"

"ہر شخص اپنی قبر میں جاتا ہے۔ برائی عام ہو جانے سے برائی جائز نہیں ہو جاتی۔ آج کے بعد اس گھر میں ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔"

کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ محسن علی نے سر جھکا لیا۔ اگرچہ بیوی کو سرزنش کرنے سے اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا تھا تاہم اس کا دکھ کم نہیں ہوا تھا۔

عارفہ بیگم نے لڑکیوں کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور خود محسن علی کے قدموں میں جا کر بیٹھ گئی۔

"مجھے معاف کر دیں۔" اس نے چالاکی سے کہا۔ "آئندہ جیسے آپ کہیں گے ویسے ہی ہوگا۔"

محسن علی سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ اگر وہ بیوی کے چہرے کی طرف دیکھ لیتا تو شاید اسے اس کے چہرے پر پائی جانے والی مکاری نظر آ جاتی۔ عارفہ بیگم اسے خاموش دیکھ کر میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی اور بالآخر اسے رام کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

"سامان کہاں ہے آپ کا؟" اس نے پوچھا۔

"سامان ہوٹل میں ہے۔"

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ لوگ کیا کہیں گے! آپ سیدھے گھر آتے تو ہمیں زیادہ خوشی ہوتی۔ خیر... خوشی تو اب بھی بہت ہو رہی ہے۔ کتنی چھٹی لے کر آئے ہیں؟"

"میں نوکری چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ اب واپس نہیں جاؤں گا۔"

یہ سنتے ہی عارفہ بیگم کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس نے سوچا کہ یہ مصیبت تو ہمیشہ کے لیے نازل ہو گئی۔ تاہم اس نے اونچی آواز سے کہا۔ "یہ اچھا کیا آپ نے۔ ہم بھی آپ کے لیے بہت اداس رہنے لگے تھے۔ بہت وقت گزار لیا پردیس میں! آپ غسل

وغیرہ کرلیں، میں آپ کے لیے کھانا گرم کرتی ہوں لیکن پہلے جاکر بچیوں کو پیار کریں۔ وہ آپ کے رویّے کی وجہ سے بہت دہشت زدہ ہو رہی ہیں۔"

محسن علی بیوی کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا۔ اس نے جاکر بیٹیوں کو پیار کیا اور اپنے رویّے کی معذرت کرنے لگا۔

○☆○

اگلے روز شریف خان ڈرائیور وعدے کے مطابق ٹھیک دس بجے گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ تاہم وہ ٹھیک ٹھاک نظر آرہا تھا۔

اس نے محسن علی کو سلام کرنے کے بعد کہا۔ "جی، اپنے وعدے کے مطابق حاضر ہوگیا ہوں۔"

"تمہارے ہاتھ کا کیا حال ہے؟" محسن علی نے پوچھا۔

"اللہ کے فضل سے ٹھیک ہے۔ رات کو ذرا پریشانی ہوئی تھی۔ کوئی ڈاکٹر پٹی کرنے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ تین ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ پولیس رپورٹ کے بغیر پٹی نہیں کرسکتے۔ میں نے ان کو بہت کہا سر، میں چور ڈاکو نہیں ہوں۔ گھریلو ہلّے گلّے میں چھری لگ گئی ہے مگر وہ نہیں مانے۔ چوتھا ڈاکٹر شریف آدمی تھا۔ اس نے بغیر کسی سوال جواب کے پٹی باندھ دی۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو۔ تھوڑی دیر بیٹھو میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔"

شریف خان نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "صاحب، گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟"

"ہاں... خیریت ہی ہے۔"

شریف خان نے اطمینان کا سانس لیا اور گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد محسن علی تیار ہو کر باہر پہنچا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔

اس کے گھر سے نکلتے ہی عارفہ بیگم حرکت میں آگئی۔ اس نے دروازے کو کنڈی لگادی اور لڑکیوں کو بلا کر کہا۔ "جلدی سے اپنے اپنے کپڑے وغیرہ پیک کرلو۔"

"کیا ہوا؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"ہم اس گھر میں نہیں رہ سکتے۔" عارفہ بیگم نے کہا "تمہارے ابا نے شارجہ کی نوکری چھوڑ دی ہے اور ہمیشہ کے لیے پاکستان آگئے ہیں۔"

"لیکن امی، رات کو تو انہوں نے آپ سے صلح کرلی تھی۔" نازیہ نے کہا۔ "کیا پھر جھگڑا ہوگیا تھا؟"

"اب ہمارا ان کے ساتھ گزارہ نہیں ہوسکتا۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ "ان کا مزاج بہت عجیب ہوگیا ہے۔ رات کو پتا ہے کیا کہہ رہے تھے؟"

"کیا کہہ رہے تھے؟" تینوں لڑکیوں نے بیک وقت پوچھا۔

"کہہ رہے تھے کہ فوزیہ اور نازیہ جوان ہوگئی ہیں۔"

عارفہ بیگم نے جھوٹ بولا۔ "اب ان دونوں کو بُرقع پہننا چاہیے۔"

"کیا؟" فوزیہ نے حیرانی سے کہا۔ "کیا میں بُرقع پہن کر فلموں اور ڈراموں میں کام کروں گی؟"

"رات کی ڈانٹ بھول گئی ہو؟" عارفہ بیگم نے کہا۔ "اس گھر میں رہ کر تم فلمیں دیکھ بھی نہیں سکتی، فلموں میں کام کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ باتوں میں وقت ضائع نہیں کرو۔ جلدی سے اپنی اپنی چیزیں پیک کرنا شروع کردو۔"

لڑکیاں فوراً سامان پیک کرنے لگ گئیں۔

عارفہ بیگم نے سلمان کا فون نمبر ملایا اور رابطہ ملنے کے بعد بولی۔ "سلمان، میں عارفہ بول رہی ہوں۔ جلدی سے گاڑی لے کر یہاں پہنچو۔"

"میں رات کو توبہ کرکے تمہاری گلی سے نکلا تھا۔" سلمان نے کہا۔ "تمہارے جنونی شوہر کی موجودگی میں، میں وہاں نہیں آسکتا۔"

"محسن اس وقت یہاں نہیں ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی فوری ضرورت ہے۔ ہم یہ گھر چھوڑ کر جارہے ہیں۔ تمہارے آنے تک ہم اپنا ضروری سامان پیک کرلیں گے۔"

"پاگل مت بنو۔ گھر چھوڑنے سے گڑبڑ ہوجائے گی۔ کیا تم شوہر کو ایک مہینے کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتیں؟"

"باتوں میں وقت نہیں ضائع کرو۔ محسن علی نوکری چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے پاکستان آگیا ہے۔"

"اوہ! یہ تو تم نے بہت بری خبر سنائی ہے۔ ٹھیک ہے میں پندرہ منٹ کے اندر تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ سامان تیار رکھنا اور ضروری کاغذات بھی اپنے قبضے میں کرلینا۔"

عارفہ نے فون بند کردیا اور اپنی خواب گاہ میں جاکر جلدی جلدی سامان پیک کرنے لگی۔ اس نے الماری سے تمام اہم دستاویزات اور بینک کے کاغذات وغیرہ نکال کر سوٹ کیس میں رکھ لیے۔

پندرہ منٹ کے اندر سلمان وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اندر جاکر پیکنگ کے کام کا جائزہ لیا اور چاروں کو جلدی کام مکمل کرنے کی ہدایت کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ اب وہ محسن علی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی اُلٹی کرکے گیٹ میں کھڑی کی تھی تاکہ سامان رکھنے اور بھاگنے میں آسانی ہو۔ وہ کبھی اندر جاتا اور کبھی باہر آتا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر محسن کی گاڑی آتی دکھائی دی تو وہ چپکے سے کھسک جائے گا۔

اندر افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لڑکیاں کبھی سوٹ کیس بند کرتی تھیں اور کبھی کھولتی تھیں۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی چیز یاد آجاتی تھی۔ کسی کو اپنی سینڈل یاد آجاتی، کسی کو باتھ روم میں رکھا ہوا طلائی ہار

یاد آجاتا اور کسی کو رسّی پر لٹکا ہوا نیا جوڑا یاد آجاتا۔

"کپڑوں اور جوتوں کو بھول جاؤ" عارفہ بیگم کہہ رہی تھی۔ "کپڑے اور خرید لیں گے۔ اگر تمہارے ابا واپس آگئے تو قیامت آجائے گی۔ جلدی کرو' جلدی کرو....."

"بھئی' اب کس بات کی دیر ہے؟" سلمان نے اندر آکر کہا اور دو سوٹ کیس اٹھا لیے۔ "میں یہ سوٹ کیس گاڑی میں رکھ رہا ہوں۔"

"ایک منٹ' ایک منٹ....." فوزیہ نے کہا۔ "میرا میک اپ کا سامان....." وہ ڈریسر پر رکھا ہوا میک اپ کا سامان سمیٹنے لگی۔ "ذرا یہ سوٹ کیس کھولیں۔"

"اوہ میرے خدا....." سلمان نے سوٹ کیس نیچے رکھ کر ہاتھ جھٹکا۔ "یہ چیزیں بازار میں بھی مل جاتی ہیں۔"

نازیہ کو یاد آیا کہ اس کی طلائی چوڑیاں سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھی تھیں۔ اس نے زور سے دراز کھولی تو پوری دراز باہر آگئی اور چیزیں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ "اوہ میرے خدا!" وہ چوڑیاں سمیٹتے ہوئے بولی۔

سلمان نے عارفہ بیگم سے پوچھا۔ "تم نے سارے کاغذات تو رکھ لیے ہیں نا؟"

"ہاں' رکھ لیے ہیں۔" عارفہ بیگم نے جواب دیا۔ "لو یہ سوٹ کیس گاڑی میں رکھو۔"

انہوں نے دوڑ کر سامان گاڑی میں رکھا اور عارفہ بیگم دروازے بند کرنے لگی۔ تب ہی اس کو یاد آیا کہ زیورات کا بیگ تو اندر ہی رہ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر بھاگی۔

"اب کیا مصیبت آگئی؟" سلمان نے جھلّا کر کہا۔

عارفہ بیگم بیگ لیے ہوئے بھاگی بھاگی واپس آئی اور بیگ سلمان کو تھماتی ہوئی بولی۔ "تم گاڑی باہر نکالو' میں تالا لگا کر آتی ہوں۔"

"تالا لگانے کی کیا ضرورت ہے۔" سلمان جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھا۔

چند منٹوں کے اندر ان کی گاڑی مین روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بنگلے کے اندر ہر طرف سامان بکھرا پڑا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہاں زبردست لوٹ مچی ہوئی تھی۔

○☆○

عارفہ بیگم نے سامان اپنے میکے میں رکھا اور لڑکیوں کے ہمراہ سلمان کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے اپنی ماں کو تاکید کردی تھی کہ محسن علی کو سامان یا ان کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔

سلمان شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اس کی بیوی شگفتہ بیگم بھی کسی زمانے میں شوبزنس سے تعلق رکھتی تھی لیکن اسے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ چھوٹے موٹے رول کرتی رہی تھی اور جب اس کا جسم بے کشش ہوگیا تو اس نے گھر داری سنبھال لی۔

جہاں تک سلمان کا تعلق تھا' وہ ہنوز اسمارٹ اور خوبرو شخص تھا۔ اسے شوبزنس میں آنے والی نئی لڑکیوں سے دوستی لگانے کا خاص شوق تھا۔ کبھی کبھی وہ ان لڑکیوں کو گھر بھی لے آتا تھا۔ اس وجہ سے اس کا اپنی بیوی سے جھگڑا چلتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ان حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ شگفتہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی۔ اگر چلی بھی گئی تو اس کا راستہ صاف ہوجائے گا۔

آج صبح وہ عارفہ بیگم اور اس کی بیٹیوں کے ہمراہ گھر پہنچا تو شگفتہ بیگم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کچھ بولے بغیر کچن میں چلی گئی جہاں چولھے پر ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔

سلمان نے عارفہ بیگم کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور کچن میں جاکر بیوی سے بولا "تم صرف نام کی شگفتہ ہو ورنہ ہر وقت افسردہ افسردہ دکھائی دیتی ہو۔ گھر میں مہمان آئے ہیں اور تم کچن میں چلی آئی ہو!"

شگفتہ نے چڑ کر کہا "کرلیا نکاح؟"

"ہائیں! کیا مطلب؟"

"میں بچّی نہیں ہوں۔ دس سال تک اداکاری کی ہے۔ اس عورت کی شکل بتا رہی ہے کہ یہ گھر سے بھاگی ہوئی ہے.... یا اس کے شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"لیکن بیچ میں نکاح کہاں سے آگیا؟"

"تم جیسے دل پھینک ایسی بے سہارا عورتوں کو سہارا دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔" شگفتہ نے تلخی سے کہا۔ "شکل کی اتنی بُری نہیں ہے۔ ساتھ تین پلی پلائی بیٹیاں بھی ہیں۔"

سلمان نے شرارت سے کہا "اگر بیٹی سے نکاح ہوجائے تو کیسا رہے؟"

"شکل دیکھی ہے اپنی آئینے میں؟"

"ٹی وی پر اکثر دیکھتا رہتا ہوں۔ ویسے ایک بات ہے' لڑکی مجھ پر لٹّو ہو رہی ہے۔ بس اشارے کی دیر ہے۔"

"کون سی لڑکی ہے جو تم پر لٹّو نہیں ہے۔ اس کُنبے کو کیوں ساتھ لائے ہو؟"

"ان کے ساتھ تھوڑا سا مسئلہ ہوگیا ہے۔" سلمان سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "عارفہ کا شوہر بغیر اطلاع دیے کراچی آگیا اور کئی دن تک اپنے بیوی بچوں کی جاسوسی کرتا رہا۔ وہ لڑکیوں کی آزادی اور اداکاری وغیرہ کے سخت خلاف ہے اور ان کو پابندیوں میں رکھنا چاہتا ہے اور یہ لوگ پابندیوں میں رہنے کے عادی نہیں ہیں' اس لیے گھر چھوڑ کر آگئے ہیں۔ شاید ان کو ایک دو دن یہاں رہنا پڑے۔"

"مجھے یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان سے کہیں کہ ہوٹل میں چلی جائیں۔ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہماری بھی مصیبت آجائے گی۔"

"بات تو مجھے بھی پسند نہیں ہے۔" سلمان نے دھیمی آواز میں کہا "لیکن اصل بات کچھ اور ہے۔ فوزیہ شوبزنس میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ میں نے ایک دو فلم پروڈیوسروں سے اس کے لیے بات کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے ہیروئن کا چانس مل جائے گا اور اس کے ساتھ اپنا چانس بھی لازمی ہوگا۔ اس لیے میں ان کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ تم ذرا چائے بنا کر لے آؤ اور اپنے چہرے کے تاثرات بھی شگفتہ بنالو۔"

شگفتہ بیگم نے سر جھٹکا اور ہانڈی میں چمچہ چلانے لگی۔

سلمان ڈرائنگ روم میں گیا اور لڑکیوں سے چند باتیں کرنے کے بعد عارفہ بیگم کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔

"ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔" اس نے کہا۔ "تم نے بتایا تھا کہ تمہارا اور محسن کا مشترکہ اکاؤنٹ ہے؟"

"ہاں' ایک یہ مسئلہ بھی ہے۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ "اکاؤنٹ میں کم از کم ڈھائی لاکھ روپے کم ہیں۔ تقریباً ایک لاکھ روپے بڑی بہن نے بیٹی کی شادی کے لیے ادھار لیے تھے۔ سوا لاکھ روپے ادریس بھائی نے مکان کے لیے بطور قرض لیے تھے۔ کچھ رقم مجھ سے خرچ ہوگئی ہے۔ محسن کو اس بات کا پتا چلا تو وہ بہت شور مچائے گا۔"

سلمان نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس!"

"کیا مطلب؟"

"اس وقت اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہوگی؟"

"پانچ لاکھ سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔"

"چیک بک کہاں ہے؟"

"سامان میں ہے۔"

"یہ رقم بھی نکلوالو۔"

"جی!" عارفہ بیگم نے حیرانی سے منہ کھولا۔

"یہ پانچ لاکھ اپنے قبضے میں کرلو۔"

"لیکن..." عارفہ بیگم متذبذب نظر آنے لگی۔

"میری بات غور سے سنو۔" سلمان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تم شوہر کا گھر چھوڑ چکی ہو اور واپسی کا راستہ تقریباً بند ہوچکا ہے۔ یہ رقم اس وقت تمہارے اختیار میں ہے لیکن کل نہیں ہوگی۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اگر یہ دولت تمہارے پرس میں ہوگی تو تمہاری طاقت میں اضافہ ہوگا اور اگر محسن علی کی جیب میں چلی گئی تو اس کی طاقت میں اضافہ ہوگا پھر وہ قانونی اور غیر قانونی طریقے سے تمہارا ناطقہ بند کرنے کی پوزیشن میں ہوگا اور تم اس کا مقابلہ نہیں کرسکوگی۔"

"ہوسکتا ہے کہ محسن سیدھے راستے پر آجائے۔"

سلمان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا بولا۔ "احمقانہ باتیں مت کرو۔ وہ پہلے ہی سیدھے راستے پر ہے۔ ہونا وہی چاہیے جو وہ کہتا ہے۔ حقیقت میں غلط راستے پر تم ہو اور جب غلط راستہ پکڑ ہی لیا ہے تو پھر شرمانا اور گھبرانا کیسا! اور دیکھو' اگر تم صلح کرنا چاہوگی تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ صلح کے بعد تم اپنے شوہر کی رقم بھی واپس کرسکتی ہو اور اگر رقم تمہارے قبضے میں ہوگی تو صلح تمہاری شرطوں پر ہوگی۔"

یہ بات عارفہ بیگم کی سمجھ میں آگئی' بولی۔ "اب آپ نے کام کی بات کی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ محسن ہم سے پہلے بینک پہنچ چکا ہو۔"

"اگر ایسا ہوا تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔ آؤ چلیں۔"

ڈرائنگ روم میں شگفتہ بیگم لڑکیوں سے کچھ چبھتے ہوئے سوالات کررہی تھی۔

سلمان نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر کہا "ہم ذرا... صدر تک جارہے ہیں۔ ایک آدھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" فوزیہ نے کہا۔

لیکن عارفہ نے اسے منع کردیا اور سلمان کے ہمراہ باہر نکل کر کار میں جا بیٹھی۔ شگفتہ بیگم خشمناک نظروں سے دونوں کو جاتے دیکھتی رہی۔

○☆○

محسن علی تقریباً پونے بارہ بجے گھر کے دروازے پر پہنچا اور گیٹ پر تالا دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

"یہ لوگ کہاں چلے گئے؟" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا "یہاں تو تالا لگا ہوا ہے۔"

ڈرائیور شریف خان نے باہر نکل کر گیٹ کی جھری سے اندر جھانکا تو اسے کچھ چھوٹی موٹی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری دکھائی دیں۔

"کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ پڑوسیوں سے معلوم کریں۔"

محسن علی نے پڑوسیوں کی گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا۔ ان کے پڑوسی کا نام صداقت حسین تھا اور وہ ایک فضائی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس وقت وہ ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ دروازہ اس کی بیوی نے کھولا۔

محسن علی نے اسے سلام کرنے کے بعد اپنا تعارف کرایا اور اپنے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھا۔ چونکہ وہ زیادہ عرصہ باہر رہا تھا' اس لیے پڑوسیوں سے اس کی زیادہ جان پہچان نہیں تھی۔

"آپ کی بیوی اور بیٹیاں تھوڑی دیر پہلے کار میں بیٹھ کر کہیں گئی ہیں۔" مسز صداقت نے جواب دیا۔ "بچے بتا رہے تھے کہ وہ لوگ گاڑی میں سامان بھی رکھ رہے تھے۔"

"گاڑی کس کی تھی؟"

"بچوں کو پتا ہوگا۔ میں نے گاڑی نہیں دیکھی۔"

محسن علی' مسز صداقت کا شکریہ ادا کرکے پیچھے ہوگیا اور ڈرائیور سے بولا "تمہاری بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔ آؤ چلیں۔"

"کہاں' ہوٹل؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میری بیگم اپنے میکے گئی ہوگی۔ ان کا

گھر نارتھ کراچی میں ہے۔ وہاں سے پتا کرتے ہیں۔"

"آپ اپنا سامان گھر میں رکھ دیں۔"

"کیسے؟ تالا توڑ دیں؟"

"ادھر مارکیٹ سے چابی بنانے والا مل جائے گا۔"

محسن علی کو ڈرائیور کی تجویز مناسب معلوم ہوئی۔ قریبی شاپنگ سینٹر سے انہیں تالے چابی والا مل گیا۔ وہ اسے گاڑی میں ساتھ لے آئے۔ اس نے نصف گھنٹے میں گیٹ اور اندرونی دروازے کی چابی بنادی۔

محسن علی اندر داخل ہوا تو کمروں میں پھیلی ہوئی افراتفری دیکھ کر سمجھ گیا کہ عارفہ بیگم اسے دھوکا دے گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور کی مدد سے سامان اندر رکھا اور کھلی ہوئی الماریاں چیک کیں۔ اس نے دیکھا کہ بیوی اور بیٹیوں کا سامان غائب تھا۔ لاکر بھی خالی پڑا تھا۔ ضروری دستاویزات اور زیورات بھی غائب تھے۔

"شریف خان' میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوگیا ہے۔" محسن علی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "بلکہ یہ سمجھ لو کہ میں لٹ گیا ہوں۔ بیوی تمام قیمتی چیزیں نکال کر لے گئی ہے۔ رات کو تم نے میرا ہاتھ روک کر اچھا نہیں کیا۔ اگر میں ان دونوں کو ختم کردیتا تو مجھے یہ سب کچھ دیکھنا نہ پڑتا۔"

"پھر آپ کچھ بھی نہ دیکھ سکتے۔" شریف خان نے کہا۔ "آپ کی بیوی قبرستان میں ہوتی اور آپ جیل میں اور آپ کی بیٹیوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔"

"شریف خان' بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن جب آدمی طوفان میں گھر جائے تو پھر وہ ایسی باتیں سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ ٹھیک ہے' تم میرے ساتھ رہو اور مجھے سنبھالتے رہو۔ جب میں کوئی جذباتی حرکت کرنے لگوں تو میرا ہاتھ روک دینا۔"

دونوں گاڑی میں بیٹھ کر عارفہ بیگم کے میکے پہنچ گئے۔ محسن کی ساس کا نام زمانی بیگم تھا۔ اس نے تیوری چڑھا کر داماد کا استقبال کیا۔

"خالہ' وہ عارفہ تو یہاں نہیں آئی؟" محسن علی نے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

"میاں' یہ کیا طریقہ ہے گھر آنے کا!" زمانی بیگم نے کہا "چوروں کی طرح آئے اور گھر آنے کے بجائے بیوی بچوں کی جاسوسی شروع کردی۔"

"وہ... خالہ بات یہ ہے کہ..."

"اے رہنے دو... کیا بات سناؤ گے تم! عارفہ نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے۔ تمہارا یہ ڈرائیور بیچ بچاؤ نہ کراتا تو تم خون خرابہ کر دیتے۔"

"میری بات تو سنیں۔" محسن علی اپنے جوش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کو نہیں پتا کہ عارفہ نے میری بیٹیوں کو کس راستے پر لگا رکھا تھا۔ گھر میں آوارہ لوگ آتے تھے اور لڑکیوں کو ہوٹلوں میں لے جاتے تھے پھر فوزیہ نے ڈراموں میں کام شروع کردیا تھا۔"

"بس بس' بہت ہوگئی تقریر۔ تم سو سال پرانی باتیں کررہے ہو۔ آج کل زمانہ بدل گیا ہے اور میری بیٹی پر الزام مت دھرو۔ اس کے گھر میں کوئی آوارہ شخص نہیں آتا تھا اور ڈراموں میں کام کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ آج کل پڑھی لکھی لڑکیاں ڈراموں میں کام کررہی ہیں۔"

"لڑکیاں اور بہت کچھ کررہی ہیں لیکن مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں ہے اور اسی وجہ سے میں نوکری چھوڑ کر واپس آگیا ہوں۔ کہاں ہیں وہ؟ ان کو بلائیں' میں انہیں لینے آیا ہوں۔"

"وہ یہاں نہیں ہیں۔ عارفہ کوئی آدھا گھنٹا پہلے یہاں آئی تھی پھر واپس چلی گئی۔ وہ بہت غصے میں ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اب اس کا تمہارے ساتھ نبھا نہیں ہوسکتا۔"

"نبھا نہیں ہوسکتا! ہم شادی کے بعد اکٹھے ہی کب رہے ہیں۔ میں تو سترہ سال سے پردیس میں قیدِ بامشقت کاٹ رہا تھا۔ بیوی بچوں کی بہتری کے لیے دن رات محنت کررہا تھا۔ اب ساتھ رہنے کا وقت آیا تو نبھا نہیں ہوسکتا۔ کیا یہ شادی فراڈ تھی؟"

"میاں' جو شخص اپنی بیوی پر خنجر تان لے' اس کا کیا بھروسا۔ ایسے شخص کے ساتھ کوئی عورت بھی نبھا نہیں کرسکتی۔"

"میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔" محسن علی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "لیکن میرا اسے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا ورنہ وہ اس وقت زندہ نہ ہوتی۔ وہ کہاں گئی ہے؟"

"مجھے کیا پتا' تم جانو یا وہ جانے!"

کمرے میں عارفہ بیگم کا بارہ سالہ بھتیجا عرفان بھی موجود تھا۔ اس نے کہا۔ "پھوپی جان بینک گئی ہوں گی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" زمانی بیگم نے غصے سے کہا۔

"میں نے ان کو اپنے بیگ سے چیک بک نکالتے دیکھا تھا۔" عرفان نے کہا "اور چیک بک کا تعلق بینک سے ہی ہوتا ہے۔"

"تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔" زمانی بیگم نے اسے سرزنش کی۔ "جاؤ... جاکر کھیلو۔"

محسن علی آہستہ آہستہ کھڑا ہوگیا۔ بینک سے اسے اپنا مشترکہ اکاؤنٹ یاد آگیا تھا۔ اس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے۔ کہیں عارفہ بیگم مشترکہ اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے تو نہیں گئی تھی؟ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بجنے میں بیس منٹ تھے۔ اس نے ڈرائیور کو چلنے کے لیے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"صدر چلو..." اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اور تیز چلو ورنہ غضب ہوجائے گا۔"

"کیا ہوا صاحب؟" ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میری بیوی شاید بینک گئی ہے۔ بینک میں ہمارا مشترکہ

اکاؤنٹ ہے۔ اس میں سات آٹھ لاکھ روپے جمع ہیں۔ اگر اس نے یہ رقم نکلوالی تو میں بالکل برباد ہو جاؤں گا۔"

شریف خان نے گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ راستہ طویل تھا اور ٹریفک کا خاصا ہجوم بھی تھا لیکن شریف خان گاڑیوں کو اوور ٹیک کرتا ہوا تیزی سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ جب ان کی گاڑی بینک کے سامنے پہنچی اس وقت ایک بجنے میں تین منٹ تھے اور بینک کا دروازہ بند ہونے والا تھا۔

محسن علی گاڑی سے نکل کر تیزی سے بینک میں داخل ہوا اور سیدھا منیجر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ بینک کے اندر نصف درجن کے قریب گاہک موجود تھے۔ ان میں عارفہ بیگم نہیں تھی۔

"سر' میرا نام محسن علی ہے۔" محسن نے بینک منیجر کو سلام کرنے کے بعد کہا۔ "میں آپ کا پرانا اکاؤنٹ ہولڈر ہوں اور چند روز پہلے شارجہ سے وطن آیا ہوں۔"

"تشریف رکھیں۔" منیجر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمارا مشترکہ اکاؤنٹ ہے۔" محسن علی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میرا اور میری بیوی عارفہ بیگم کا۔"

منیجر کے چہرے پر ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "آپ نے کیا نام بتایا اپنا؟"

"محسن علی۔ وہ بات یہ ہے کہ میرا اپنی بیوی سے کچھ... تنازع چل رہا ہے۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اگر میری بیوی کوئی چیک کیش کرانے آئے تو انکار کردیں۔"

"اکاؤنٹ کھلواتے وقت آپ نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔" منیجر نے کہا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ...."

"میں آپ کو لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں آپ کا...."

"اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ لیٹ ہوگئے ہیں۔" منیجر نے اس کی بات کاٹی۔

"کک... کیا مطلب؟"

"آپ کی مسز تقریباً دس منٹ پہلے بینک سے نکل کر گئی ہیں۔"

"اوہ...! اس نے کتنی رقم نکلوائی ہے؟"

"پانچ لاکھ روپے۔"

"اوہ میرے خدا!" محسن علی نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ "باقی کتنی رقم ہے؟"

"تقریباً چھ ہزار روپے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے! میرے حساب سے اکاؤنٹ میں تقریباً آٹھ لاکھ روپے ہونے چاہییں۔"

منیجر نے لیجر منگوایا اور محسن علی کے اکاؤنٹ والا صفحہ کھولتے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس صرف ڈپازٹ کا حساب ہے۔ جو رقمیں نکلوائی گئی ہیں' ان کی تفصیل آپ کو معلوم نہیں ہے۔ یہ دو تو بڑی رقمیں نکلوائی گئی تھیں۔ ایک سوا لاکھ ہے اور دوسری ایک لاکھ۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی رقمیں ہیں۔ پانچ ہزار' سات ہزار' بارہ ہزار' نو ہزار وغیرہ...."

"لیکن.... یہ اتنی بڑی رقموں کے چیک آپ نے کیسے کیش کردیے؟" محسن علی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"ہم اس سے بھی بڑی رقموں کے چیک کیش کرتے رہتے ہیں۔" منیجر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اکاؤنٹ ہولڈر رقم جمع بھی کروا سکتا ہے اور نکلوا بھی سکتا ہے۔ آپ نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی کہ آپ کی بیوی زیادہ سے زیادہ کتنی رقم نکلوا سکتی ہے۔"

"لیکن اس نے اتنی بڑی رقمیں کیوں نکلوائیں؟"

"یہ سوال آپ اپنی مسز سے ہی کریں۔" منیجر نے لیجر بند کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کو اپنے اکاؤنٹ کی اسٹیٹ منٹ کی ضرورت ہو تو کل تشریف لے آئیں۔"

محسن علی کرسی سے اٹھا اور بوجھل قدموں سے واپس چل پڑا۔ اس کی پندرہ سولہ سال کی محنت غارت ہوگئی تھی۔

"صاحب' کیا ہوا؟" شریف نے پوچھا۔

"یہاں بھی وہی ہوا جو گھر میں ہوا تھا۔" محسن علی نے جواب دیا۔ "عارفہ نے مشترکہ بینک اکاؤنٹ کا صفایا کردیا ہے۔ کچھ رقم اس نے پہلے نکلوالی تھی' پانچ لاکھ روپے آج نکلوا کر لے گئی ہے۔ اس نے مجھے بالکل برباد کردیا ہے۔ شریف خان' کیا تم اب بھی میرا ہاتھ روکو گے؟"

"ہاں صاحب' ہاتھ تو میں اب بھی روکوں گا۔" شریف خان نے کہا۔ "اس لیے کہ میں آپ کو پھانسی کے پھندے پر نہیں دیکھنا چاہتا۔ آپ کو صبر سے کام لینا چاہیے۔ ممکن ہے صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔"

محسن علی کسی فوری خیال کے تحت واپس مڑا اور چوکیدار سے دروازہ کھلوانے کے بعد دوبارہ منیجر کے کمرے میں گیا اور کہا۔ "سر' ایک بات اور بتادیں' میری بیوی اکیلی تھی یا اس کے ساتھ کوئی مرد بھی تھا؟"

"اس کے ساتھ ایک اسمارٹ ٹی وی اداکار تھا۔" منیجر نے جواب دیا۔ "اس کا نام غالباً سلمان محمود ہے۔"

"اوہ..." محسن علی نے کہا اور واپس پلٹ گیا۔ "اس دفعہ یہ شخص میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔"

یہ بات اس کے قریب سے گزرنے والے آفیسر نے سن لی۔ اس نے منیجر کے کمرے میں جاکر کہا "عجیب شخص تھا یہ۔ کہہ رہا تھا کہ اس دفعہ وہ شخص اس کے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔ پتا نہیں کس شخص کی بات کررہا تھا۔"

"بے چارہ لٹ گیا۔" منیجر نے کہا۔ "بیوی سے جھگڑا ہوگیا اور وہ مشترکہ اکاؤنٹ سے ساری رقم نکلوا کر لے گئی۔ سات لاکھ سے زیادہ رقم تھی۔"

"وہی تو نہیں جو ٹی وی اداکار سلمان کے ساتھ آپ کے کمرے میں بیٹھی تھی؟"

"ہاں' وہی تھی۔ دو ڈھائی لاکھ اس نے پہلے نکلوا لیے تھے' پانچ لاکھ آج نکلوا کر لے گئی۔ کہہ رہی تھی کہ کسی فلیٹ کا سودا کیا ہے۔ پتا نہیں لوگ بیویوں کے ساتھ مشترکہ اکاؤنٹ کیوں کھلواتے ہیں!"

محسن علی تھکا تھکا سا باہر نکلا اور گاڑی کی سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

"اب کہاں چلیں؟" شریف خان نے پوچھا۔

"کہیں بھی لے چلو۔" محسن علی بجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"صاحب' آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ واقعی اگر انسان دولت کمانے میں لگ جائے تو بیوی بچے کسی دوسری ہی لائن پر چل نکلتے ہیں۔"

"آہ..... بہت دیر کے بعد مجھے اس بات کا پتا چلا۔ بینک منیجر نے بتایا ہے کہ وہ شیطان ٹی وی اسٹار بھی میری بیوی کے ساتھ تھا۔ یہ ساری شرارتیں اس خبیث کی ہیں۔ شریف خان' تمہارے پاس کوئی ریوالور وغیرہ ہو گا؟"

"صاحب' ہمت سے کام لیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

"ایسا کرو' کسی پی سی او پر لے چلو۔ میں سلمان کے گھر کا پتا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ عارفہ بیگم اسی کے گھر گئی ہو گی۔"

شریف خان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پی سی او کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

عین اس وقت بینک منیجر نے سلمان محمود کا فون نمبر ملایا اور رابطہ ملنے کے بعد کہا۔ "سلمان صاحب' میں بینک منیجر ایس بی رضوی بول رہا ہوں۔ مسز عارفہ محسن ابھی تک آپ کے ساتھ ہے؟"

"کیا بات ہے؟" سلمان نے پوچھا۔

"ابھی ابھی مسٹر محسن علی بینک سے نکل کر گئے ہیں۔ وہ بہت غصے میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے اکاؤنٹ سے اتنی بڑی رقم نکلوانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ مسز محسن نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور وہ آپ کو بھی اس دھوکے میں شریک سمجھ رہے ہیں۔"

"رضوی صاحب' کوئی بھی شخص اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکلوا سکتا ہے۔" سلمان نے کہا۔ تاہم اس کی آواز میں اضطراب پایا جاتا تھا۔ "آپ کسی کا چیک کیش کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ میں نے محسن علی کو یہی جواب دیا ہے کہ چیک ضابطے کے مطابق کیش کیا گیا ہے لیکن کچھ اخلاقی ضابطے بھی ہوتے ہیں۔ میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ آپ محتاط رہیں۔ محسن علی جاتے جاتے یہ کہہ گیا ہے کہ آپ اس کے ہاتھ سے بچ نہیں سکیں گے۔"

"میرے بارے میں اس کو کس نے بتایا؟"

"میں نے بتایا۔"

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"سلمان صاحب' یہ بات آپ کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب بھی موقع ہے' خاتون سے کہیں کہ اپنے شوہر سے صلح کر لے۔ اس میں آپ کی بھی بہتری ہے اور خاتون کی بھی۔"

"آپ کے مشورے کا شکریہ۔ خدا حافظ۔"

"ایک اور بات...." منیجر نے کہا "اگر مجھے کہیں پر قانونی شہادت دینی پڑی تو میں یہ ضرور بتاؤں گا کہ جب مسز عارفہ محسن پانچ لاکھ روپے کا چیک کیش کرانے آئی تھی تو آپ اس کے ساتھ تھے۔"

سلمان نے فون بند کر دیا اور عارفہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا جو پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بینک منیجر کا فون تھا؟" اس نے پوچھا پھر اثبات میں جواب پا کر بولی "کیا کہہ رہا تھا؟"

"ہمارے جانے کے بعد محسن علی وہاں پہنچ گیا تھا۔" سلمان نے جواب دیا۔ "رضوی نے اس کو بتا دیا کہ میں بھی تمہارے ساتھ بینک گیا تھا۔ محسن علی کا کہنا ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اتنی بڑی رقم نکلوانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے مجھے نقصان پہنچانے کی دھمکی بھی دی ہے۔"

"اب کیا کرنا چاہیے؟" عارفہ بیگم نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم بیٹیوں کو لے کر فی الحال کہیں اور چلی جاؤ۔ محسن علی ضرور یہاں آئے گا۔ اسے ہمارا گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔ منیجر نے دانستہ شرارت کی ہے۔"

"ویسے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ وقتی اُبال ہے۔ چند دنوں میں ٹھنڈا ہو جائے گا۔ محسن کو بے بس کرنے کے لیے ہمیں کچھ اور اقدام کرنے پڑیں گے۔ ان کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ایک بات تمہیں ماننی پڑے گی۔ بینک سے رقم نکلوانے کا فیصلہ ہم نے بہت بروقت کیا ہے۔ اگر چند منٹ کی دیر ہو جاتی تو یہ پانچ لاکھ روپے تمہارے ہاتھ میں نہ ہوتے۔ اس رقم کے جانے سے محسن علی کی آدھی طاقت ختم ہو گئی ہے۔ تم ایسا کرو کہ.... اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤ۔"

"اسلم بھائی اور بھابی سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ نیز ان کا گھر بھی چھوٹا ہے۔"

سلمان کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "ٹھہرو.... میں فلم پروڈیوسر ناصر حسین سے بات کرتا ہوں۔" اس نے ریسیور اٹھا کر ناصر حسین کا نمبر ملایا۔ "خدا کرے وہ مل جائے...."

دوسری طرف سے کسی خاتون آپریٹر نے جواب دیا اور سلمان کی بات سننے کے بعد ہولڈ کرنے کے لیے کہا۔ چند لمحوں کے بعد ناصر حسین کی آواز سنائی دی۔

"ناصر صاحب' میں سلمان محمود بول رہا ہوں۔"

"سلمان صاحب' کیسے ہیں آپ؟" ناصر حسین نے پوچھا۔

"آج کل کس ڈرامے میں کام کر رہے ہیں؟"

"آج کل ایک اصلی ڈرامے میں کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیسی مدد؟"

"آپ فوزیہ محسن کو تو جانتے ہی ہوں گے؟ چند ڈراموں میں کام کر چکی ہے۔"

"بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔" فوزیہ کا نام سن کر ناصر حسین کی آواز میں کچھ شوخی آگئی۔ "آپ اسے فلم میں کام دلانا چاہتے ہیں؟"

"یہ بعد کی بات ہے۔ اس وقت ایک اور مسئلہ ہے۔ فوزیہ کا باپ شارجہ سے واپس آگیا ہے اور بیوی بچوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ فوزیہ کی دو چھوٹی بہنیں بھی ہیں۔ ان کو چند روز کے لیے رہائش کی ضرورت ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے لیے۔ اس کے بعد وہ اپنا انتظام کرلیں گی۔"

"ماں بھی ساتھ ہے؟"

"ہاں' اس کا نام عارفہ بیگم ہے۔ میرے سامنے ہی بیٹھی ہے۔ تین بیٹیاں ہیں۔ ایک کمرے میں بھی گزارا کرلیں گی۔"

دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"ایک ہفتے کے لیے انتظام ہوجائے گا۔" ناصر حسین نے طویل توقف کے بعد کہا "لیکن اس سے زیادہ نہیں۔"

"میں ذمے دار ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ بلکہ ایک ہفتے سے پہلے ہی کوئی انتظام ہوجائے گا۔"

"میں گھر فون کردیتا ہوں۔ تم ان کو وہاں لے جاؤ۔"

"شکریہ..." سلمان نے کہا اور فون بند کرکے عارفہ بیگم کی طرف دیکھا۔ "ناصر حسین راضی ہوگیا ہے۔ آؤ چلیں لیکن... یہ اتنی بڑی رقم کو ساتھ لیے پھرنا خطرناک ہے۔ اگر کہو تو میں اسے... اپنے لاکر میں رکھوادوں۔"

عارفہ نے تامل کرتے ہوئے کہا "اس وقت تو بینک بند ہوچکے ہوں گے۔ اس کے بارے میں کل سوچیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ تم لوگ گاڑی میں بیٹھو' میں اپنی بیوی کو بتا کر آتا ہوں۔" وہ دوسرے کمرے میں گیا اور شگفتہ بیگم سے کہا "تمہارے لیے اچھی خبر ہے۔ میں ان لوگوں کو ان کے کسی رشتے دار کے پاس چھوڑنے جارہا ہوں۔"

"خود واپس آجانا..." شگفتہ نے چبا چبا کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہیں پر چپک جاؤ۔"

"چپکنے کے لیے ایک ہی بہت ہے۔" سلمان نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

یہاں بھی خوش قسمتی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ ان کے جانے کے صرف پانچ منٹ کے بعد اطلاعی گھنٹی سنائی دی اور شگفتہ کے بارہ سالہ بچے نے اندر آکر بتایا کوئی محسن علی' ابو سے ملنے آئے ہیں۔

"ان سے کہو' ابو گھر میں نہیں ہیں۔"

"میں نے ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھادیا ہے۔"

"ایسے ہی بٹھادیا۔ پوچھ تو لینا تھا۔" شگفتہ نے کہا اور ڈرائنگ روم میں جا پہنچی۔ "جی' وہ سلمان اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ آپ کو کیا کام ہے؟"

"آپ سلمان کی بیگم ہیں؟" محسن علی نے پوچھا اور اثبات میں جواب پاکر بولا۔ "آپ کے شوہر بہت خطرناک کھیل' کھیل رہے ہیں۔ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ان کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

شگفتہ بیگم فکرمندی سے بولی۔ "آپ ہیں کون؟ میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میرا نام محسن علی ہے۔ میں چند روز پہلے شارجہ سے آیا ہوں۔ سلمان میری بیوی اور بیٹیوں کو بہکا کر گھر سے بھگا لایا ہے۔ آج انہوں نے ہمارے مشترکہ اکاؤنٹ سے پانچ لاکھ روپے بھی نکلوا لیے ہیں۔"

"آپ... فوزیہ کے والد ہیں؟"

"ہاں' بدقسمتی سے! سلمان نے میری بیٹی کو سبز باغ دکھا کر اداکاری میں لگا دیا ہے۔ حالانکہ ہمارے خاندان میں ان کاموں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

"دیکھیں جی' میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی۔ مجھے خود بھی سلمان کی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔ جب وہ آپ کے بیوی بچوں کو یہاں لے کر آیا تھا تو میں سخت ناراض ہوئی تھی۔"

"وہ ان کو کہاں لے کر گیا ہے؟"

"کسی رشتے دار کے گھر چھوڑنے گیا ہے۔"

"میں اس پر اغوا کا کیس بنادوں گا۔" محسن نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یہ شریف لوگوں والی حرکت نہیں..."

"دیکھیے محسن صاحب' سلمان پر غصہ مت نکالیے اگر آپ کی بیوی اچھی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ دوسروں کو دھمکیاں دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اپنی بیوی کی فکر کیجیے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ آپ کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں ہوگی۔ اسے آزادی چاہیے۔ آپ کی بیٹیاں بھی فیشن ایبل ہیں۔ وہ پابندیوں میں نہیں رہ سکتیں۔ یا تو ان کے ساتھ سمجھوتا کرلیجیے اور یا انہیں چھوڑ دیجیے۔ یہی اس مسئلے کا حل ہے۔"

"میرے پاس ایک حل اور بھی ہے۔ میں اپنی بیوی اور تمہارے شوہر کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ لوگ برسوں تک یاد رکھیں گے۔ کل تمہارا آوارہ شوہر میرے ہاتھ سے بچ گیا مگر آج نہیں بچے گا۔"

"آپ یہاں سے چلے جائیں۔" شگفتہ بیگم نے کہا۔ "میں سلمان کے کسی عمل کی ذمے دار نہیں ہوں۔ اگر آپ فضول گوئی سے باز نہیں آئیں گے تو میں پولیس کو فون کردوں گی۔"

"میں جارہا ہوں۔" محسن علی اٹھتے ہوئے بولا "لیکن دوبارہ آؤں گا اور... خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔"

شگفتہ نے اس کے جانے کے بعد کھڑاک سے دروازہ بند کر دیا۔ تاہم خوف کی وجہ سے اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد سلمان واپس آیا تو وہ اس پر برس پڑی اور دونوں میں زبردست جھگڑا ہوا۔

○☆○

محسن علی بستر پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ پورے دو ہفتے سلمان اور اپنے بیوی بچوں کو تلاش کرتا رہا تھا مگر ایک کروڑ آبادی کے شہر میں کسی انسان کو تلاش کرنا، بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنے کے برابر تھا۔

ان دو ہفتوں کے دوران محسن علی نے اپنے اور عارفہ بیگم کے رشتے داروں کے گھر پوری طرح چھان مارے تھے، بعض دروازوں پر اس نے کئی کئی بار دستک دی تھی۔ کچھ لوگ اس کو دیکھ کر منہ بناتے، کچھ دروازے سے ہی لوٹا دیتے اور کچھ ہمدردی سے اس کی باتیں سن لیتے لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ بعض لوگوں نے اسے اغوا اور چوری کی رپورٹ درج کرانے کا مشورہ دیا مگر اس کا دل نہیں مانا۔ رپورٹ درج کرانے کا مطلب یہ ہوتا کہ کشیدگی میں مزید اضافہ ہوجاتا۔ نیز وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس اس کی بیٹیوں سے طرح طرح کے سوالات کرکے انہیں ہراساں کرے۔

اس نے اپنے لباس اور حلیے کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ دو ہفتوں کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ ایک دل شکستہ انسان کی طرح بستر پر پڑا تھا۔ اس کے اعصاب شل ہوچکے تھے اور مایوسی انتہا تک پہنچتی جارہی تھی۔

نوکری گئی... جمع پونجی گئی اور بیوی بچے بھی گئے۔ گھر میں گرد اُڑ رہی تھی۔ کمرے اسی حال میں تھے جس حال میں اس کے بیوی بچے انہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ کمروں میں مختلف چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ ان میں میلے کپڑے، پرانے جوتے، رسالے، میک اپ کی چیزیں اور نقلی زیورات وغیرہ شامل تھے۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے اور گھر کے اندر عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ محسن علی نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ہر آہٹ پر چونک اٹھتا تھا۔ شاید اس کے بیوی بچے واپس آگئے تھے یا شاید وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھل جائے گی تو گھر میں بھاری بھار ہوگی۔ کچن سے کھانا پکانے کی آواز آرہی ہوگی۔ بیٹیاں ہنستی مسکراتی چھوٹے موٹے کاموں میں لگی ہوں گی اور وہ ایک فارغ البال سربراہِ خانہ کی طرح روشن لاؤنج میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہوگا۔

لیکن یہ ڈراؤنا خواب طویل ہوتا جارہا تھا۔ محسن علی اٹھ کر بیٹھ گیا اور چند لمحوں تک بکھری ہوئی چیزوں کو گھورتا رہا پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اوپر دیکھا اور کہا۔ "یا خدا! مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے جو تو نے مجھ پر تباہی نازل کی ہے؟"

اسی لمحے طلاقی گھنٹی بجی اور وہ بری طرح چونک گیا۔ شاید... شاید عارفہ بیگم کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا اور وہ واپس آگئی تھی یا اس نے کسی کے ہاتھ صلح کا پیغام بھیجا تھا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے پر گیا اور دیکھا کہ ایک اجنبی شخص، جس نے کچھ قانونی قسم کے کاغذات ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے، سامنے کھڑا تھا۔

"مسٹر محسن علی ولد سلامت علی آپ ہی ہیں؟" اس نے تیکھی اور کرخت آواز میں پوچھا۔

"ہاں، یہ میرا ہی نام ہے۔" محسن علی نے جواب دیا۔ اسے اجنبی کا طرزِ تکلم بہت برا لگا تھا۔

"آپ کی بیوی کا نام عارفہ بیگم ہے؟"

"ہاں، بات کیا ہے؟"

"آپ کے نام عدالت کا سمن آیا ہے۔" اجنبی نے ایک بال پین اور کاغذ محسن علی کی طرف بڑھایا۔

"یہ کس قسم کا کاغذ ہے؟"

"آپ کی بیوی نے عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کیا ہے۔ عدالت نے سماعت کے لیے پندرہ تاریخ مقرر کی ہے۔ یہاں پر دستخط کردیں۔"

"تنسیخِ نکاح کا دعویٰ!" محسن علی نے حیرت سے کہا۔ "لیکن کیوں؟"

"جناب، یہاں دستخط کردیں اور مجھے فارغ کردیں۔ کیوں اور کیا کا جواب دینا میرا کام نہیں ہے۔ میں بیلف ہوں۔ میرا کام صرف سمن پہنچانا ہے۔"

"اگر میں دستخط نہ کروں تو کیا ہوگا؟"

"آپ کی بیوی کے حق میں بہت اچھا ہوگا۔ اسے یک طرفہ ڈگری مل جائے گی۔"

محسن علی نے کاغذ پر دستخط کرکے دونوں چیزیں واپس کردیں۔ بیلف نے بال پین جیب میں رکھا اور ایک لفافہ محسن علی کی طرف بڑھایا۔ "یہ لیجیے..." اس نے اپنی کرخت آواز میں کہا۔ "یہ عرضیٔ دعویٰ کی نقل ہے۔ اس کو پڑھ کر آپ کو پتا چل جائے گا کہ آپ کی بیوی نے تنسیخِ نکاح کا دعویٰ کیوں کیا ہے۔"

محسن علی نے لفافہ لے لیا اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ بیلف اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

"کیا کچھ باقی ہے؟" محسن علی نے پوچھا۔

"خالی ہاتھ چلا جاؤں؟" بیلف نے کہا۔

"کیا؟ تمہیں رشوت چاہیے؟" محسن علی کو غصہ آگیا۔

"ذرا میرے جوتے کی طرف دیکھیں!"
"کیا مطلب؟"
"آپ لوگوں کی خدمت کے لیے در در اور گلی گلی جوتے چٹخانے پڑتے ہیں۔ چھ مہینے کے اندر رئیل لیدر شوز کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں لیکن سرکار ہمیں جوتا الاؤنس نہیں دیتی۔"
"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟ تم میرے پاس منحوس خبر لائے ہو اور رشوت بھی مانگتے ہو!"
"کوئی بات نہیں...." بیلف واپس مُڑتے ہوئے بولا۔ "عدالت میں ملاقات ہوگی۔"
محسن علی دروازہ بند کرکے اندر چلا گیا اور عرضیٔ دعویٰ پڑھنے لگا۔ اس کی بیوی نے اس پر کئی الزامات عائد کیے تھے۔ ان میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ محسن علی نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا لیکن وہ شریف خان ڈرائیور کی مداخلت کے باعث بچ گئی تھی۔ اسے اب بھی جان کا خطرہ تھا۔ محسن علی اسے سارے شہر میں تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔
یہ الزامات پڑھ کر محسن علی کا دماغ گھوم گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جس بیوی کو اس نے سترہ سال ہر طرح کا عیش و آرام فراہم کیا تھا وہ ذرا سی بات پر اس کی دشمن بن گئی تھی۔
اس نے عرضیٔ دعویٰ ایک طرف پھینک دی اور بستر پر لیٹ کر گزرے دنوں کو یاد کرنے لگا۔ ان دنوں کو جو اس نے بیوی بچوں کے آرام کے لیے خود اختیاری قید بامشقت میں بسر کردیے تھے۔
اس روز مارچ کی سات تاریخ تھی اور سمن کے مطابق پیشی کی تاریخ پندرہ تھی۔ ابھی آٹھ دن باقی تھے۔
محسن علی تین چار دن تک اس معاملے پر غور کرتا رہا اور عزیزوں سے مشورے بھی کیے۔ مختلف لوگوں نے مختلف مشورے دیے۔ اکثر نے یہ مشورہ دیا کہ اسے بیوی پر چوری اور دھوکا دہی کا مقدمہ درج کرادینا چاہیے تاکہ اس پر دباؤ پڑے اور وہ صلح کا راستہ اختیار کرے لیکن محسن علی کو ہر بار بیٹیوں کا خیال آجاتا۔ وہ سوچتا کہ مقدمے کی وجہ سے بیٹیاں اس سے بدظن ہوجائیں گی۔ وہ یہی سوچیں گی کہ باپ نے ان کی ماں پر جھوٹا مقدمہ قائم کردیا تھا۔
محسن علی کے ایک رشتے کے چچا تھے، جن کا نام فیض الحسن تھا۔ وہ بوڑھے اور جہاندیدہ انسان تھے۔ انہوں نے محسن کے استفسار پر کہا "میاں، مقدمے بازی سے کبھی کسی کا بھلا نہیں ہوا۔ اس سے تلخی اور دشمنی میں اضافہ ہوگا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنی ساس کی منت سماجت کرکے صلح کی کوئی راہ نکالو۔"
"چچا میاں، وہ لوگ میری بات ہی نہیں سُنتے۔" محسن علی نے دُکھی لہجے میں کہا "دوسری بات یہ ہے کہ عارفہ بیگم اور بیٹیوں کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں ہے۔ وہ پتا نہیں کہاں غائب ہوگئی ہیں۔"
"سب کو علم ہے۔" فیض الحسن برہمی سے بولے۔ "وہ لوگ تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ تمہیں نرمی سے کام لینا چاہیے تھا۔ تم نے برسوں کے بگڑے ہوؤں کو ایک دن میں ٹھیک کرنے کی کوشش کی جو ایک ناممکن بات تھی۔ اگر تمہارے دل میں بیٹیوں کے لیے خیرخواہی ہے تو تمہیں جھکنا پڑے گا ورنہ وہ تم سے دور رہ کر بالکل ہی بگڑ جائیں گی۔ ایسے موقعے پر مصلحت سے کام لینا چاہیے۔"
"چچا میاں، آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں غصے میں آجاتا ہوں۔ مجھ سے ان کی باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔" محسن علی نے کہا۔ چچا میاں کی بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اگر بیوی سے علیحدگی ہوگئی تو بیٹیاں اس کے ہاتھ سے جاتی رہیں گی۔
اس نے فوراً ٹیکسی منگوائی اور فیض الحسن کو ساتھ لے کر اپنے سُسرال پہنچ گیا۔ زمانی بیگم نے اسے دیکھ کر تیوری چڑھائی بولی۔ "دیکھو میاں، ہم نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ ہمارے گھر کے باربار چکر مت لگاؤ۔"
"ہم صلح کا پیغام لے کر آئے ہیں۔" فیض الحسن نے کہا۔ "محسن کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوگیا ہے۔ آئندہ یہ خیال رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی یہی ہے کہ صلح خیر کا باعث ہے۔"
"بڑے صاحب، میں سچی اور کھری بات کرتی ہوں۔ صلح کا دروازہ اس نے خود بند کیا ہے۔"
"صلح کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا کرتا۔ آپ ایسا کریں، اپنی بیٹی کو پیغام بھیج کر بلوالیں۔ مل بیٹھ کر بات ہوگی تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ میں ضامن بن کر ساتھ آیا ہوں۔"
"بھائی صاحب، میری بیٹی اور نواسیاں اس سے خوفزدہ ہیں۔ آپ صلح کی بات کررہے ہیں، وہ اس کے سامنے آتے ہوئے گھبراتی ہیں۔ میری بیٹی تو شاید راضی ہوجائے مگر اس کی بیٹیاں کبھی صلح پر راضی نہیں ہوں گی۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں یہ انہیں آدھی رات کو قتل نہ کردے۔"
محسن علی کو یقین تھا کہ اس کی ساس جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کی بیٹیاں کبھی ایسی نہیں ہوسکتی تھیں۔ وقتی ڈر کی بات اور تھی مگر وہ اس سے ہمیشہ کے لیے دہشت زدہ نہیں ہوسکتی تھیں۔
"خالہ، اس ضد کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔" محسن علی نے کہا۔ "عارفہ بینک سے میری جمع پونجی نکال کر لے گئی ہے۔ پورے آٹھ لاکھ روپے جمع تھے بینک میں۔ میں اتنی آسانی سے یہ زیادتی برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ گھر سے لاکھوں روپے کے زیورات بھی لے گئی ہے۔ آپ میرا صلح کا ہاتھ جھٹک کر اچھا نہیں کررہیں۔"
"اے جاؤ، دھمکیاں کسی اور کو دینا۔" زمانی بیگم ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "جو کچھ بیوی کو دے دیا جائے وہ اسی کا ہوجاتا ہے۔ میری بیٹی نے بینک میں ڈاکا تو نہیں مارا۔ جو رقم تم نے اس کو دی تھی وہی نکالی ہے۔ زیور بھی اسی کا تھا اور ہم نے اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ تو نہیں

رخصت کیا تھا۔ بہت کچھ دے کر بھیجا تھا اور یہ مت بھولو کہ تم نے اس کا زیور بیچ کر ایجنٹ کو پیسے دیے تھے۔"

"وہ زیور میں نے دو مہینے کے اندر بنوا دیا تھا۔"

"یہ ساری باتیں غیر ضروری ہیں۔" فیض الحسن نے کہا۔ "اگر صلح ہو جائے تو یہ زیور اور رقم کا تنازع خود بخود ختم ہو جائے گا۔ میاں بیوی کی دولت مشترکہ ہوتی ہے۔"

"بھائی صاحب، صلح کی بات ختم سمجھیں۔"

"آپ ایسا کریں کہ دونوں کو سامنے بٹھا کر بات کریں۔ میں بھی حاضر ہو جاؤں گا۔ دونوں کے گلے شکوے سُننے کے بعد اندازہ ہو جائے گا کہ کس نے کیا زیادتی کی ہے۔"

عارفہ بیگم کی بڑی بہن نجمہ، جو دوسرے کمرے میں بیٹھی ساری گفتگو سن رہی تھی، اندر داخل ہو کر بولی۔ "میری بہن کو صلح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ کہنا ہے عدالت میں جا کر کہیں۔"

اس نے عارفہ سے سوا لاکھ روپے اُدھار لیے تھے اور صلح کی صورت میں اسے یہ رقم واپس کرنی تھی۔ اس لیے اس کی خواہش یہی تھی کہ صلح نہ ہو۔ اس کا بھائی ادریس احمد بھی صلح کے خلاف تھا کیوں کہ وہ بھی محسن علی کے ایک لاکھ روپے کھا کر بیٹھا ہوا تھا۔

الغرضیکہ گھر کی فضا صلح کے لیے سازگار نہیں تھی۔ محسن علی اور فیض الحسن مایوس لوٹ گئے۔

○☆○

اگلے روز محسن علی ایک وکیل سے ملا اور اسے عرضیٔ دعویٰ دکھانے کے بعد مختصر واقعات بتائے۔

وکیل کا نام علی افسر تھا۔ اس نے محسن علی سے پندرہ بیس منٹ تک سوالات کیے، پھر بولا۔ "کیس کا فیصلہ آپ کے حق میں ہو سکتا ہے لیکن آپ کو کچھ ایسے فیصلے کرنے پڑیں گے جن کو عام حالات میں پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔"

"مثلاً کس قسم کے فیصلے؟"

"محسن صاحب، جب انسان سرکشی پر اُتر آئے تو وہ شرافت اور عقل کی بات سُننے سے انکار کر دیتا ہے۔ ایک ڈاکو کو آپ اس بات پر قائل نہیں کر سکتے کہ ڈکیتی بُرا فعل ہے۔ بلکہ وہ اس بات کو ماننے کے باوجود اپنی حرکت سے باز نہیں آئے گا۔ آپ کی بیوی اس وقت دانستہ شرارت پر تلی ہوئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ شرپسند لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ وہ دلیل کو کبھی تسلیم نہیں کرے گی۔ اسے جھنجوڑنا پڑے گا اور کسی شرپسند کو جھنجوڑنے کا قانونی طریقہ یہ ہے کہ اسے مقدمات میں جکڑ دیا جائے۔"

"کون سے مقدمات؟"

"پہلا مقدمہ حدود آرڈیننس کے تحت سلمان اور عارفہ بیگم کے خلاف درج کرایا جائے گا۔ دوسرا گھر کے قیمتی سامان کی چوری کا اور تیسرا امانت میں خیانت کا۔ آپ نے بینک میں جو رقم جمع کی تھی، وہ آپ کی امانت تھی۔ آپ نے محبت اور اعتماد کے اظہار کے طور پر اپنی بیوی کو اپنے اکاؤنٹ میں شریک کیا تھا مگر اس نے بیلنس کا صفایا کر کے امانت میں خیانت کی اور فراڈ کی مُرتکب ہوئی۔ ایک مقدمہ ہم یہ بھی درج کر سکتے ہیں کہ عارفہ بیگم آپ کی بیٹیوں کو بُرائی کے راستے پر لگا رہی ہے، لہٰذا تینوں بیٹیوں کو آپ کی تحویل میں دیا جائے۔"

محسن علی سوچتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب، ان مقدمات سے ہماری بہت بدنامی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ مسئلہ خاموشی اور عزت سے حل ہو جائے۔"

"محسن صاحب، سردیوں کے موسم میں اگر انسان کے پاس ناکافی گرم کپڑے ہوں تو سمٹنے سُکڑنے سے اسے زیادہ سردی لگتی ہے اور اگر آدمی حرکت میں رہے تو سردی کا اثر خاصا کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بدنامی کا معاملہ ہے۔ ایک دفعہ اگر بدنامی کا پہیّہ حرکت میں آ جائے تو پھر بچنے کی کوشش کرنے والا زیادہ بدنام ہوتا ہے۔ آپ کی بیوی خرابی کی ابتدا کر چکی ہے۔ اس خرابی کا علاج یہی ہے کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔"

"میں سوچ کر جواب دوں گا۔" محسن علی نے کہا۔ "فی الحال آپ اس مقدمے کا جواب تیار کر لیں۔ میں دو روز کے بعد دوبارہ آپ کے پاس آؤں گا۔"

"ایک بات تو بتائیں..... آپ کی بیٹیوں کا رویّہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟ کیا وہ آپ کے ساتھ رہنے پر تیار ہو جائیں گی؟"

"ان کا رویّہ میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔ میرے پاس ان کے بہت سے خطوط موجود ہیں۔ جب میں شارجہ میں تھا تو وہ مجھے بہت اچھے اچھے خطوط لکھا کرتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی اپنی ماں کی شکایتیں بھی لکھ دیتی تھیں۔ اس وقت وہ ماں کے دباؤ میں ہیں۔ اگر انہیں آزادی سے اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملا تو مجھے یقین ہے کہ ان کا ووٹ میرے حق میں ہوگا۔"

"ایسی صورت میں ہمارا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔ آپ اچھی طرح سوچ کر آئیں۔" وکیل نے کہا "فی الحال ہم تنسیخ نکاح کے کیس میں تاریخ لے لیں گے۔ جب دیگر مقدمات عدالتوں میں پہنچ جائیں گے تو یہ کیس خود بخود کمزور ہو جائے گا۔ دشمن کو کمزور کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسے اپنی پسند کے محاذوں پر اُلجھا دیا جائے۔"

○☆○

محسن علی دیگر مقدمات کے حق میں نہیں تھا مگر اگلے روز ایک اور بیلف اس کے دروازے پر موجود تھا۔ وہ بھی سمن لے کر آیا تھا۔

"حضورِ والا، محسن علی ولد سلامت علی آپ ہی ہیں؟" اس نے پوچھا اور اثبات میں جواب پا کر ایک کاغذ بڑھایا، بولا "یہاں پر

دستخط کردیں۔"

"سمن تو مجھے پہلے ہی مل چکا ہے۔" محسن علی نے کہا۔

"وہ کوئی اور سمن ہوگا۔" بیلف نے کہا۔ "یہ سمن کل جاری ہوا ہے۔"

"یہ کس مقدمے کا سمن ہے؟"

"یہ جائیداد کا مقدمہ ہے اور مسمات عارفہ بیگم نے دائر کیا ہے۔" بیلف کاغذات پر نظر دوڑاتے ہوئے بولا۔

محسن علی نے دستخط کرکے سمن وصول کیا اور اندر جاکر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ جوں جوں وہ عرضیٔ دعویٰ پڑھتا جارہا تھا اس کے خون کی گردش تیز ہوتی جارہی تھی۔

وہ بنگلا اس نے پردیس میں رہتے ہوئے تعمیر کرایا تھا اور چونکہ وہ خود کراچی میں موجود نہیں تھا' اس لیے پلاٹ عارفہ بیگم کے نام خریدا گیا تھا۔ یہ ساری کارروائی عارفہ کے بھائی ادریس احمد کے ذریعے عمل میں آئی تھی۔ اس نے بنگلے کی تعمیر کے سارے بل وغیرہ بہن کے نام سے بنوائے تھے۔

جب حالات خوشگوار ہوں تو ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دیا کرتا لیکن بعد میں خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ عرضیٔ دعویٰ کے مطابق عارفہ بیگم نے بنگلے کو اپنی ملکیت قرار دیا تھا اور یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ محسن علی نے اسے گھر سے نکال کر بنگلے پر قبضہ کرلیا تھا۔

غصے سے محسن علی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عارفہ بیگم نے اسے کمزور کرنے کے لیے اپنے مطلب کے محاذ کھولنے شروع کردیے تھے۔ وہ اسی وقت تیار ہوکر وکیل کے پاس پہنچ گیا۔

"وکیل صاحب' یہ ایک سمن اور آگیا ہے۔" اس نے لفافہ میز پر پھینکا۔ "آپ نے بالکل صحیح مشورہ دیا تھا۔ میں آپ کے مشورے کے مطابق کیس درج کرانے کے لیے تیار ہوں۔"

"تھوڑی دیر انتظار کریں۔ میں کچھ کاغذات تیار کروالوں پھر آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

○☆○

عارفہ بیگم ایک ہفتہ فلم پروڈیوسر ناصر حسین کے بنگلے پر گزارنے کے بعد نہایت خاموشی سے ایک کرائے کے فلیٹ میں منتقل ہوگئی تھی۔ چونکہ ابھی تک محسن علی کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی عمل میں نہیں آئی تھی اس لیے وہ بہت مطمئن تھی۔

اب سارا کنٹرول سلمان محمود کے ہاتھ میں تھا۔ سارے کام اسی کے مشورے کے مطابق ہو رہے تھے۔ وہ شاطر آدمی روزانہ شام کو فلیٹ پر پہنچ جاتا اور عارفہ بیگم کو نئے نئے خواب دکھاتا رہتا۔ خواب دکھانے کے ساتھ ساتھ وہ اسے تھوڑا تھوڑا خوفزدہ بھی کرتا رہتا تھا تاکہ اس کے اندر زیادہ ہی خود اعتمادی نہ پیدا ہوجائے اور وہ اس کی مدد سے بے نیاز ہوجائے۔

اس رات بھی وہ صوفے پر نیم دراز عارفہ اور اس کی بیٹیوں کو سبز باغ دکھا رہا تھا۔

"ناصر حسین' فوزیہ کو اپنی اگلی فلم میں ہیروئن کاسٹ کرنے پر راضی ہوگیا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "بس ایک فلم میں پرفارمنس دکھانے کی دیر ہے' اس کے بعد اس کے دروازے پر فلم پروڈیوسروں کی لائن لگ جائے گی۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" عارفہ بیگم نے کہا "معاوضہ کتنا مل جائے گا؟"

"پہلی فلم میں تو زیادہ معاوضہ نہیں ملے گا لیکن بعد میں معاوضہ ہماری مرضی کا ہوگا۔" سلمان نے کہا "میں اس کی پبلسٹی کا انتظام بھی کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی سالانہ آمدنی کم از کم ... پچیس تیس لاکھ روپے ہوگی۔"

"اللہ....!" فوزیہ خوش ہوکر بولی "میں سب سے پہلے نئی کار خریدوں گی اور خود ہی ڈرائیو کروں گی۔"

"ہیروئن کو خود کار نہیں چلانی چاہیے۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ "ہم شوفر ملازم رکھیں گے۔ وہ سفید یونیفارم پہنے جب کار کا دروازہ کھولے گا تو تمہاری شان بڑھے گی۔"

"اوہ.... اس طرح کیا مزہ آئے گا۔" فوزیہ نے منہ بسورا۔ "مجھے گاڑی چلانے کا بہت شوق ہے۔"

"شوق پورا کرنے کے لیے کبھی کبھی لمبی ڈرائیو پر نکل جایا کرنا۔" سلمان نے کہا۔ "لیکن اسٹوڈیو آنے جانے کے لیے شوفر ہونا ضرور ہے۔"

میز پر بچے کھچے کھانے کے برتن پڑے تھے۔ عارفہ بیگم نے نازیہ کو برتن اٹھانے کے لیے کہا' پھر بولی۔ "مجھے ان کے ابا کی طرف سے فکر لگی ہوئی ہے۔ پتا نہیں وہ کیا کارروائی کر رہے ہیں۔ کہیں ان کو اس فلیٹ کا پتا نہ چل جائے۔"

"ان کی فکر مت کرو۔" سلمان نے کہا "اگر انہوں نے کچھ کرنا ہوتا تو اب تک کرچکے ہوتے۔ اب ان کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ چکا ہوگا۔"

"اماں بتا رہی تھیں کہ وہ صلح کے لیے ان کے پاس آئے تھے۔ بڑی منتیں کر رہے تھے۔"

"یہ سب میری حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے۔ اگر دشمن کو نہتا کردیا جائے تو اس کے پاس منتوں کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ یہ دوسرا مقدمہ کمر توڑ ثابت ہوا ہوگا۔"

"کیا خیال ہے مکان ہمیں مل جائے گا؟"

"مکان کا خیال چھوڑ دو۔ اس قسم کے مقدمے ذرا لمبے چلا کرتے ہیں۔" سلمان نے شوخ نظروں سے فوزیہ کی طرف دیکھا۔ "وہ تنگ سا مکان ہماری سپر اسٹار کے لائق نہیں ہے۔ اس کے لیے ہم کم از کم دو ہزار گز کا بنگلا خریدیں گے۔ گیٹ پر دو باوردی گن مین ہوں گے اور بنگلے کے اندر پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔"

نازیہ بڑے غور سے یہ باتیں سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا "انکل سلمان، میں بھی فلم اسٹار بن سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں بن سکتی۔ فوزیہ سُپر اسٹار بن گئی تو تمہیں بغیر کسی کوشش کے ہیروئن کا چانس مل جائے گا لیکن فی الحال یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ کیوں کہ جب تک تمہارے ابا کراچی میں موجود ہیں، ہم کھل کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ کراچی میں رُکیں گے نہیں کیوں کہ ان کے پاس پیسہ بالکل نہیں بچا ہوگا۔ وہ دوبارہ شارجہ جانے کی کوشش کریں گے۔" عارفہ بیگم نے کہا۔

"چلے جائیں تو اچھا ہی ہوگا۔ میں نازیہ کو کمرشلز میں چانس دلانے کی کوشش کروں گا۔ اس سے ایک تو آمدنی کی صورت پیدا ہو جائے گی اور دوسرے اس کی کچھ پریکٹس بھی ہو جائے گی لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے ابا اتنی آسانی سے واپس نہیں جا سکیں گے کیوں کہ مقدمات ان کے سر پر لٹک رہے ہیں۔ اگر وہ چلے گئے تو یک طرفہ فیصلہ ہو جائے گا۔ ہمیں فی الحال لاہور چلے جانا چاہیے۔ وہاں فلمی لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے میں آسانی رہے گی۔"

"یہاں مقدمات میں حاضری بھی تو دینی پڑے گی۔"

"لاہور کون سا دور ہے۔ آدمی دو گھنٹے میں کراچی پہنچ جاتا ہے۔ اور وکیل نے بتایا ہے کہ تمہارا ہر پیشی پر حاضر ہونا ضروری نہیں ہے۔ جب تمہاری حاضری ضروری ہوگی وہ ہمیں اطلاع دے دے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ فوزیہ ڈانس سیکھنا بھی شروع کر دے۔ ہیروئن کے لیے ڈانس بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے لاہور ہی مناسب رہے گا۔"

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ فلیٹ کا دروازہ پُرشور آواز کے ساتھ کھلا اور نصف درجن پولیس والے دھڑ دھڑ کرتے اندر گھس آئے۔

لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ سلمان محمود اچھل پڑا۔ عارفہ بیگم لمحہ بھر کے لیے گنگ ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ پولیس نے محسن علی کی رپورٹ پر چھاپا مارا ہے۔

"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" اس نے چیخ کر کہا۔ "کس کی اجازت سے اندر گھسے ہو؟"

چھاپا مار پارٹی کا سربراہ انسپکٹر تھا۔ محسن علی کا وکیل بھی اس کے ہمراہ آیا تھا مگر ابھی باہر کھڑا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" انسپکٹر نے سلمان سے پوچھا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں مشہور ٹی وی اسٹار سلمان محمود ہوں۔" سلمان نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"معاملہ کیا ہے؟"

انسپکٹر نے غصے سے کہا۔ "اپنی شہرت کا رعب ڈالنے کی کوشش مت کرو۔ اس عورت سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"دیکھیں...." سلمان نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "میں آپ کے کسی فضول سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں مہمان کے طور پر یہاں آیا ہوں۔"

انسپکٹر، عارفہ بیگم کی طرف مُڑا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"میں... میں کہتی ہوں آ.... آپ یہاں سے نکل جائیں۔" عارفہ بیگم نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ "یہ.... یہ پردے والا گھر ہے۔ آپ.... آپ دروازے سے باہر کھڑے ہو کر بات کریں۔"

"زیادہ غصہ دکھانے کی کوشش مت کرو۔ میرے پاس تم دونوں کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ ہم بات کرنے نہیں آئے ہیں، تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ تم محسن علی کی بیوی عارفہ بیگم ہو؟"

"ہاں.... ہوں لیکن اب میرا محسن علی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا عدالت میں طلاق کا مقدمہ چل رہا ہے۔"

"طلاق کا نہیں، تنسیخ نکاح کا۔" انسپکٹر نے تصحیح کی۔ "لیکن ابھی مقدمے کی کارروائی شروع نہیں ہوئی، اس لیے تم فیصلہ ہونے تک محسن علی کی بیوی ہی سمجھی جاؤ گی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"جس شخص کی تم منکوحہ ہو اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے!" انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر سلمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس شخص سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"یہ ہمارا ..... فیملی فرینڈ ہے۔ انسان کے ملنے جُلنے والے سب رشتے دار تو نہیں ہوتے۔"

انسپکٹر نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔ "منظور، جاؤ آس پاس کے دو تین فلیٹوں سے دو معتبر آدمیوں کو بلا لاؤ تاکہ ان کی گواہی کے ساتھ ضابطے کی کارروائی مکمل کی جا سکے۔"

"ٹھہرو، ٹھہرو...." سلمان نے منظور نامی سپاہی کو روکا۔ "انسپکٹر صاحب، جلدی مت کریں، ہمیں سوچنے دیں۔ ہم آپ کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پہلے یہ تو بتائیں معاملہ کیا ہے؟ کس جرم کے تحت ہمارے وارنٹ جاری ہوئے ہیں؟"

"آپ کے وارنٹ حدود آرڈیننس کے تحت جاری ہوئے ہیں۔ تم پر الزام ہے کہ تم اس عورت کو اس کے شوہر کے گھر سے بھگا کر لائے ہو اور ہم نے تم دونوں کو اس فلیٹ میں اکٹھے موجود پایا ہے۔ اگر یہ عورت اکیلی اس فلیٹ میں ہوتی تو الزام زیادہ وزنی نہ ہوتا۔"

"لیکن.... میں تو صرف ان سے ملنے آیا تھا۔" سلمان نے صفائی پیش کی۔ "اور کسی سے ملنا کوئی جرم نہیں ہے۔"

"پکڑے جانے کے بعد سب اسی طرح باتیں کیا کرتے ہیں۔ یہ دلیلیں عدالت میں پیش کرنا۔"

وکیل، علی افسر جو کھلے ہوئے دروازے میں کھڑا تھا، دستک دے کر اندر آ گیا۔ بولا "انسپکٹر صاحب، کس بات کی دیر ہے؟ آپ ان کو گرفتار کیوں نہیں کر رہے؟"

"آپ کون ہیں؟" سلمان نے پوچھا۔

"میں درخواست دہندہ کا وکیل ہوں۔" وکیل نے جواب دیا۔
"میرا نام علی افسر ہے۔ میں اپنے مؤکل کے نمائندے کے طور پر یہاں موجود ہوں۔"
انسپکٹر نے کہا "یہ لوگ حیل و حُجّت کر رہے ہیں۔"
"کوئی شخص بھی خوشی سے گرفتاری نہیں دیا کرتا۔" علی افسر نے کہا۔ "آپ ان کو تھانے لے چلیں اور حوالات میں بند کریں۔ ان کی حیل و حُجّت کا خیال کریں گے تو اپنی ذمے داری سے انصاف نہیں کریں گے۔"
انسپکٹر نے عارفہ بیگم اور سلمان سے کہا "آپ نے سُن لی ان کی بات؟ میرے پاس فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ میں صرف قانون نافذ کر سکتا ہوں۔ رپورٹ میں آپ پر یہ بھی الزام عائد کیا گیا ہے کہ آپ اپنے شوہر کے گھر سے زیورات اور نقدی چُرا کر لے آئی ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے سامان کی تلاشی بھی لینا چاہتے ہیں۔"
"کک... کیا آپ ہمارے زیورات اور نقدی بھی اپنے قبضے میں لے لیں گے؟" عارفہ بیگم نے پوچھا۔
"مجبوری ہے۔ اگر آپ نے عدالت میں ان چیزوں کو اپنا ثابت کر دیا تو یہ آپ کو مل جائیں گی۔"
"آپ ذرا دوسرے کمرے میں آئیں...." سلمان نے انسپکٹر سے کہا۔ "ہم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"
"غالباً آپ ان کو رشوت پیش کرنا چاہتے ہیں۔" علی افسر نے کہا "لیکن میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ رشوت لے کر بھی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ وارنٹ عدالت نے جاری کیے ہیں اور باہر پریس کے دو نمائندے بھی موجود ہیں۔ وہ اس چھاپے کی رپورٹنگ کے لیے آئے ہیں۔"
یہ سُنتے ہی دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ انسپکٹر اور وکیل کی منتیں کرنے لگے۔
فلیٹ میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ انسپکٹر نے اس کی تلاشی لے کر زیورات اور نقدی اپنے قبضے میں کر لی۔ نقدی پچاس ہزار روپے سے کچھ زیادہ تھی۔ باقی رقم عارفہ بیگم نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کروا دی تھی۔
انسپکٹر نے کہا۔ "آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں، اس لیے میں آپ کو ہتھکڑیاں نہیں لگاؤں گا۔ آئیں چلیں...."
"امی...!" تینوں لڑکیاں ماں کی طرف لپکیں۔
"میری بچیاں...." عارفہ بیگم نے رونا شروع کر دیا۔
تینوں لڑکیاں بھی رونے لگیں اور ماں سے لپٹ گئیں۔
اچانک عارفہ کو خیال آیا کہ اس کی گرفتاری کے بعد محسن ضرور وہاں آئے گا۔ پولیس کو اسی نے فلیٹ کا پتا بتایا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے انسپکٹر سے کہا۔ "مجھے دو تین منٹ کے لیے اپنی بیٹیوں سے ملنے کی اجازت دیں۔"

انسپکٹر نے اسے اجازت دے دی اور ایک سپاہی سے کہا۔ "صاحب کو نیچے لے جاؤ اور گاڑی میں بٹھاؤ۔"
دو سپاہی سلمان کو باہر لے گئے۔
عارفہ بیگم بیٹیوں کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "ذرا غور سے میری بات سنو۔ ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں اور یہ سب کچھ تمہارے ابا کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد وہ ضرور یہاں آئیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس ذلت سے بچنے کے لیے ہمیں ان سے صلح کر لینی چاہیے۔"
"نہیں..." فوزیہ روتے ہوئے بولی۔ "میرے فلمی مستقبل کا کیا بنے گا۔ ابا مجھے کبھی فلموں میں کام نہیں کرنے دیں گے۔"
"ابھی اس بات کو بھول جاؤ اور توجہ سے میری بات سنو۔" عارفہ بیگم نے کہا "جب ابا یہاں آئیں تو ان کے ساتھ کوئی فضول بات نہ کرنا۔ بس ان کے پیر پکڑ لینا اور ان سے رو رو کر معافی مانگنا۔ میری طرف سے بھی اور اپنی طرف سے بھی۔ اب وہی ہمیں اس مصیبت سے چھُڑا سکتے ہیں۔ ان سے کہنا کہ ہم صلح کرنا چاہتے ہیں۔"
"اگر ابا صلح پر راضی نہ ہوئے تو؟"
"تم رو رو کر فریاد کرو گی تو وہ ضرور صلح پر راضی ہو جائیں گے۔ ان سے کہنا کہ مقدمہ ختم کر دیں۔ اس سے ان کی بھی بدنامی ہوگی۔ اور اگر وہ ہمارے والے مقدمات کی بات کریں تو کہہ دینا کہ ہم بھی مقدمات ختم کر دیں گے۔"
"اس طرح تو...."
"بس جو کچھ میں نے کہا ہے وہی کرنا۔"
"بی بی، جلدی کرو۔" انسپکٹر نے آواز لگائی۔
عارفہ بیگم نے بیٹیوں کو گلے لگا کر پیار کیا اور انہیں روتا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔
لڑکیاں خوفزدہ تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ پس وہ جلدی جلدی اپنی چیزیں پیک کرنے لگیں۔

○☆○

پندرہ منٹ کے بعد دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ تینوں لڑکیاں اچھل پڑیں۔ ناہید، فوزیہ سے لپٹ گئی۔ ان چند دنوں کے دوران عارفہ بیگم نے ان کے دلوں میں باپ کی دہشت بٹھا دی تھی اور ماں کی باتیں مشکل ہی سے ذہن سے نکلتی ہیں۔
"ابا آ گئے...!" ناہید نے کہا۔ وہ سب سے چھوٹی اور ڈرپوک تھی۔ "آؤ کہیں چھپ جائیں۔"
"یاد نہیں، امی نے کیا کہا تھا؟" فوزیہ نے کہا۔ "دروازہ کھولو۔ امی جیل میں ہیں۔ ان کو ابا ہی چھُڑا سکتے ہیں۔"
پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور پوچھا۔ "کون؟"
"بیٹی، دروازہ کھولو۔" باہر سے محسن علی کی آواز سنائی دی۔

"یہ میں ہوں... دروازہ کھولو۔"

فوزیہ نے دروازہ کھولا اور جلدی سے پیچھے ہوگئی۔ محسن علی اندر داخل ہوا اور پیچھے دروازہ بند کردیا۔

تینوں لڑکیاں چار قدم کے فاصلے پر کھڑی خوفزدہ نظروں سے اس کو گھورنے لگیں۔ اچانک فوزیہ کو یوں لگا کہ وہ کیمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ کلیپ دیا جاچکا تھا اور اس کے پارٹ کا انتظار کیا جارہا تھا۔

اس نے اپنے چہرے پر رقت طاری کی اور آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "ابا ہمیں معاف کردیں۔" پھر وہ باپ کے قدموں میں گر گئی اور گریہ وزاری کرنے لگی۔ دوسری بہنوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

محسن علی نرم دل آدمی تھا۔ بیٹیوں کو اس حال میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے تینوں کو اٹھا کر پیار کیا اور کہا "تمہاری امی نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے لیکن مجھے یقین تھا کہ تم تینوں میرے ساتھ ہو۔"

"ابا، ہمیں معاف کردیں۔" فوزیہ نے دوبارہ کہا "امی کو بھی معاف کردیں ہم اپنی غلطی پر شرمندہ ہیں۔"

"میری بچیو، تمہارے ساتھ میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" محسن علی نے کہا اور لڑکیوں کے ساتھ لاؤنج میں جا بیٹھا۔ "لیکن تمہاری امی نے بہت زیادتی کی ہے۔ تمہیں لے کر گھر سے بھاگی، گھر کا قیمتی سامان اٹھا کر لے گئی اور بینک سے آٹھ لاکھ روپے نکلوا لیے جو میں نے کاروبار کے لیے جمع کروائے تھے۔"

"وہ اپنی غلطیوں پر بہت شرمندہ ہیں۔ آپ ان کو معاف کردیں اور پولیس سے چھڑا کر لے آئیں۔ وہ بھی آپ سے معافی مانگ رہی تھیں۔"

"وہ معافی اس لیے مانگ رہی ہے کہ اسے پولیس نے پکڑ لیا ہے۔" محسن علی نے کہا۔ وکیل نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کسی صورت میں سمجھوتے کی بات نہ کرے۔ "اگر وہ صلح کرنے پر آمادہ ہوتی تو مجھ پر مقدمات قائم نہ کرتی۔"

"ابا، انہیں ہماری خاطر معاف کردیں۔" فوزیہ نے روتے ہوئے کہا۔ اگر وہ اداکاری کررہی تھی تو بہت عمدہ اداکاری کررہی تھی۔ "پولیس والے بہت خراب ہوتے ہیں، وہ عورتوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے ہیں۔" اس نے نازیہ کو کہنی ماری اور فرش پر بیٹھ کر باپ کے پیر پکڑ لیے۔ "ہماری خاطر ان کو معاف کردیں.... انہیں گھر لے آئیں...."

نازیہ اور ناہید بھی باپ کے پیروں میں بیٹھ گئیں۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تمہاری امی گھر آجائے۔" محسن علی نے کہا "لیکن بات بہت آگے بڑھ چکی ہے اور میرے اختیار سے باہر نکل چکی ہے۔ مجھے اپنے وکیل سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ تم لوگ اپنا سامان پیک کرلو، میں تمہیں گھر لے جانے کے لیے آیا ہوں۔"

"ہم امی کے بغیر گھر نہیں جائیں گے۔" فوزیہ نے کہا۔

"جب تک امی نہیں آئیں گی، ہم کھانا بھی نہیں کھائیں گے۔" نازیہ نے کہا۔ "ہم بھوکے بیٹھے رہیں گے۔"

محسن علی بیٹیوں کی باتیں سن کر پریشان ہوگیا۔ بالآخر اسے لڑکیوں کے اصرار پر اسی وقت تھانے جانا پڑا۔ جب وہ تھانے کے گیٹ پر ٹیکسی سے اترا تو اس کا وکیل اپنی کار میں واپس جارہا تھا۔ محسن علی کو دیکھ کر اس نے کار روک لی۔

"اوہ.... وکیل صاحب، اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہوگئی۔" محسن علی نے کھڑکی کے قریب جاکر کہا۔ "میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

علی افسر نے کار سائیڈ میں کرکے روک دی اور محسن علی پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔

"تینوں بیٹیاں اپنی ماں کی گرفتاری کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور مسلسل روئے جارہی ہیں۔"

"آپ کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔" وکیل نے کہا "ورنہ ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکیں گے۔"

"وہ صلح کرنا چاہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امی بھی صلح کے لیے تیار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ میں ان کی ماں کو کسی طرح ضمانت پر چھڑا کر گھر لے جاؤں۔"

"مجھے یہ سازش معلوم ہوتی ہے۔ آپ کی بیوی نے پولیس کے ساتھ جانے سے پہلے بیٹیوں سے علیحدگی میں کچھ دیر تک بات کی تھی۔ یہ صلح کی بات اسی نے بیٹیوں کو سکھائی ہوگی۔"

"وکیل صاحب، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ صلح ہوجائے۔"

"دیکھیں، آپ عجلت سے کام مت لیں۔ دو چار دن یہ دباؤ رہنے دیں۔ اس سے آپ کو فائدہ ہوگا۔"

"مجھ سے بیٹیوں کا رونا نہیں دیکھا جاتا۔ وہ میرے پیر پکڑ کر منتیں کرتی رہی ہیں۔"

وکیل کو غصہ آگیا، بولا۔ "ٹھیک ہے، جو آپ کی مرضی میں آئے کریں۔ میں آپ کو مشورہ دے چکا ہوں۔"

محسن علی کو خیال آیا کہ شاید وکیل اپنی فیس کھری کرنے کے لیے صلح میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ وہ کار سے نکل کر تھانے میں چلا گیا اور اپنی بیوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"آپ نے تو ان کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے۔" ایس ایچ او نے کہا "اب یہ ملاقات کس لیے؟ اداس ہوگئے ہیں؟"

"انچارج صاحب، یہ کارروائی میں نے مجبوری کے تحت کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کو گھر میں آباد رکھنا چاہتا ہوں۔ بیٹیوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ عارفہ بیگم صلح کرنا چاہتی ہے۔"

"حضور، یہ قابلِ راضی نامہ کیس نہیں ہے۔" ایس ایچ او

نے کہا۔ "آپ کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمارا کام شروع ہے۔"

"آپ ملاقات کروادیں' اگر عارفہ بیگم واقعی صلح کرنا چاہتی ہے تو پھر آپ کے ساتھ بھی بات ہو جائے گی۔"

ایس ایچ او نے آواز دے کر ایک حوالدار کو بلایا اور کہا "ان کو بیگم صاحبہ سے ملادو۔"

عارفہ بیگم ایک خالی کمرے میں پریشان بیٹھی تھی۔ شوہر کو دیکھ کر وہ ایک دم اٹھی اور بیٹھی بیٹھی آواز میں بولی۔ "میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کردیں۔"

"تم نے شرمندہ ہونے میں بہت دیر کردی۔" محسن علی نے کہا۔ "ایس ایچ او کا کہنا ہے کہ یہ کیس قابلِ راضی نامہ نہیں ہے۔"

"ہماری اس سے بات ہوگئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کوئی راستہ نکالے گا مگر اس کے لیے پچاس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔"

"اور جو کیس تم نے مجھ پر کیے ہیں ان کا کیا بنے گا؟"

"میں انہیں واپس لے لوں گی۔"

● "جو رقم تم نے بینک سے نکلوائی ہے وہ کہاں ہے؟"

"اس میں سے تقریباً چار لاکھ روپے میرے اکاؤنٹ میں جمع ہیں۔ کچھ رقم خرچ ہوگئی ہے اور کچھ پولیس کے قبضے میں ہے۔"

"اکاؤنٹ میں بہت زیادہ رقم تھی۔"

"کچھ رقم میں نے پہلے نکلوالی تھی۔ ایک لاکھ روپے نجمہ باجی نے اور سوا لاکھ روپے ادریس بھائی نے اُدھار لیے تھے۔ وہ بھی واپس مل جائیں گے۔ آپ ایس ایچ او سے بات کرکے مجھے یہاں سے چھڑائیں۔ اس نے کہا ہے کہ اگر آپ اعتراض نہ کریں تو راستہ نکل سکتا ہے۔"

محسن علی صلح پسند آدمی تھا اور مقدمے بازی اس کو پسند نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ "دیکھو عارفہ' تم نے مجھے بہت دُکھ پہنچائے ہیں اور دھوکے بھی بہت دیے ہیں۔ میں کیسے یقین کرلوں کہ آئندہ تم میری وفادار بن کر رہو گی؟"

عارفہ بیگم نے اس کے پیر پکڑ لیے' بولی "میں اپنی بیٹیوں کی قسم کھاتی ہوں کہ آئندہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گی۔ آپ بے شک مجھ سے کاغذ لکھوالیں۔"

اس کی منت سماجت دیکھ کر محسن کو یقین آگیا۔ وہ ایس ایچ او کے پاس گیا اور کہا۔ "میری بیوی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ وہ بہت معافیاں مانگ رہی ہے۔ میں یہ مقدمہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہماری مدد کریں۔"

"محسن علی' یہ کیس عدالت کے ذریعے ہمارے پاس آیا ہے اور اسے عدالت ہی ختم کرسکتی ہے لیکن.... اصل اختیار پھر بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میں چالان ایسا بناؤں گا کہ عدالت کو کیس ختم ہی کرنا پڑے گا۔ اس کام پر پچاس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔"

"آپ نے میری بیوی کے فلیٹ سے پچاس ہزار روپے سے زیادہ رقم برآمد کی ہے۔"

"وہی ہماری فیس ہوگی۔"

"ٹھیک ہے.... مجھے منظور ہے۔" محسن علی نے کہا۔ "آپ میری بیوی کو چھوڑ دیں اور سلمان کو بے شک بند رکھیں۔"

"سلمان کو پہلے چھوڑنا پڑے گا۔ ہم یہ ظاہر کریں گے کہ آپ کی بیوی اپنے میکے میں تھی اور سلمان وہاں موجود نہیں تھا۔ اس سے آپ کا الزام خود بخود باطل ہو جائے گا اور عدالت عارفہ بیگم کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ آپ اپنے وکیل کو سمجھادیں کہ وہ ہمارے چالان پر کوئی اعتراض نہ اٹھائے۔"

محسن علی نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے وکیل کو ساری بات سمجھادے گا۔ ایس ایچ او نے سلمان اور عارفہ بیگم کو بھی اپنے کمرے میں بلالیا اور ان کو ساری بات سمجھانے لگا۔ آخر میں اس نے کہا۔ "اس وقت میں تم دونوں کو رہا کررہا ہوں۔ عارفہ بیگم کو صبح نو بجے عدالت میں پیش ہونا پڑے گا۔ میں یہی ظاہر کروں گا کہ یہ ہماری تحویل میں تھی اور رات اس نے حوالات میں گزاری تھی لیکن میں عدالت سے ریمانڈ طلب نہیں کروں گا۔"

سلمان نے ایس ایچ او کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "ایک بات میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عارفہ بیگم کی گرفتاری اس کے میکے سے ہوئی تھی تو اس کو فلیٹ میں رات گزارنے کے بجائے بچوں کے ہمراہ اپنے میکے چلے جانا چاہیے۔"

"ہوں... یہ بہت مناسب بات ہے۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "محسن صاحب' آپ بھی اس معاملے میں محتاط رہیں اور عدالت کا فیصلہ ہونے تک بیوی بچوں سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔"

"لیکن میں تو انہیں اپنے گھر لے جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" محسن علی نے کہا۔

"ابھی ایسی کوئی بات نہ سوچیں۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "یہ قانونی معاملات ہیں' ایسا نہ ہو کہ کیس آپ کے خلاف ہو جائے۔ عدالت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ کوئی شخص پہلے تو کیس درج کرائے اور پھر عدالت کی مرضی اور علم کے بغیر مدعا علیہ سے صلح کرلے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص عدالت کو کھیل سمجھتا ہے۔"

"ٹھیک ہے...." محسن علی نے گہرا سانس لیا۔ "میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔"

"آپ بھی کل عدالت میں موجود رہیں۔" ایس ایچ او نے کہا اور عدالت کا نمبر وغیرہ بتادیا۔

○☆○

اگلی صبح عارفہ بیگم بیٹیوں سمیت عدالت میں موجود تھی۔ اس کے ساتھ ایک لیڈی کانسٹیبل بھی تھی اور بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ وہ زیرِ حراست تھی۔

محسن علی نے اپنے وکیل کو ساری بات سمجھانے کے بعد تعاون کرنے کی اپیل کی تھی لیکن علی افسر یہ بات سن کر غصے میں آگیا اور وکالت نامہ پھاڑ کر محسن علی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جائیے، کوئی بے وقوف قسم کا وکیل کر لیجیے جس کو صرف فیس سے غرض ہو۔ میں آپ کی وکالت نہیں کر سکتا۔ آپ حد سے زیادہ سیدھے آدمی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر اتنا بڑا سمجھوتا کیسے کر لیا۔ کس بات کی جلدی تھی آپ کو؟"

"وہ... میری بیٹیاں بڑی پریشان تھیں۔"

"محسن صاحب، میں یہ کہوں گا کہ آپ نے ساری زندگی کسی جنگل یا صحرا میں گزاری ہے۔ آپ کو انسانوں کی چالاکیوں اور سازشوں کا بالکل کوئی تجربہ نہیں ہے۔ بہرحال..." اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ "ہر انسان اپنی مرضی کا مالک ہے۔"

محسن علی نے وکیل کو راضی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

تقریباً ساڑھے دس بجے عارفہ بیگم کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ ایس ایچ او نے اپنے مختصر اور عبوری چالان میں کہا کہ عارفہ بیگم کو اس کی ماں کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ گرفتاری کے وقت گھر میں عارفہ کی ماں، بھائی، بہن اور ان کی اولادوں سمیت درجن بھر افراد موجود تھے۔ رپورٹ میں جس دوسرے شخص کو نامزد کیا گیا ہے وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا نام سلمان محمود ہے، وہ بیوی بچوں والا آدمی ہے اور ٹی وی کا معروف فنکار ہے۔ اس کے بارے میں کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی جس سے اس کا ملزمہ سے کوئی ناجائز تعلق ثابت ہوتا۔

مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "زیور اور نقدی کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟"

"جنابِ عالی، ملزمہ کے پاس زیور ضرور موجود تھا۔ وہ میں عدالت کے ملاحظے کے لیے ساتھ لایا ہوں لیکن نقدی کی صورت میں ملزمہ کے پاس سے کوئی بھاری رقم برآمد نہیں ہوئی۔"

"مدعی کا وکیل کہاں ہے؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

پیش کار نے رجسٹر دیکھ کر کہا۔ "وہ غیر حاضر ہے۔ اس نے اپنی غیر حاضری کے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں بھجوائی۔"

مجسٹریٹ نے محسن علی کو کھڑا کر کے پوچھا۔ "آپ کو پولیس کی کارروائی پر کوئی شک یا اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں سر، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" محسن علی نے جواب دیا۔

وکیلِ صفائی خاصا تیز اور ہوشیار شخص تھا۔ اس نے عدالت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جنابِ عالی، انکوائری افسر کے بیان اور مدعی کے اقرار سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ میری مؤکلہ پر جو الزام لگایا گیا تھا وہ جھوٹا اور بدنیتی پر مبنی تھا۔

"حقیقت حال یہ ہے کہ مدعی محسن علی نے اپنی بیوی عارفہ بیگم کو ایک معمولی بات پر قتل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دو اشخاص کی مداخلت کی بنا پر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ان میں سے ایک شخص، جس کا نام شریف خان ہے اور جو رینٹ اے کار کمپنی میں ڈرائیور ہے، بیچ بچاؤ کراتے ہوئے زخمی بھی ہو گیا تھا۔ یہ شخص کراچی میں موجود ہے اور اسے گواہی کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے۔"

محسن علی حیرت سے وکیل صفائی کے دلائل سن رہا تھا۔ مزید حیرت اسے اس بات پر ہو رہی تھی کہ عارفہ بیگم اور اس کی بیٹیاں بڑے اطمینان سے بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھیں۔

"جنابِ عالی، درحقیقت مدعی نفسیاتی مریض ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ شارجہ سے اچانک کراچی پہنچا اور اپنے گھر جانے کے بجائے ہوٹل میں قیام پذیر ہو گیا۔ پھر اس نے ایک کار کرائے پر لی اور بھیس بدل کر اپنے بیوی بچوں کی جاسوسی شروع کر دی۔ آٹھ دس روز تک جاسوسی کرنے کے بعد ایک روز یہ اچانک گھر میں داخل ہوا اور اپنی بیوی پر خنجر سے حملہ کر دیا لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، دو آدمیوں نے بیچ بچاؤ کر کے عارفہ بیگم کی جان بچائی۔" وکیل صفائی کے دلائل جاری تھے۔ "جنابِ عالی، جب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہو تو عورت شوہر کا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ میری مؤکلہ نے بھی یہی کیا اور شوہر کا گھر چھوڑ کر بچیوں کے ہمراہ اپنے میکے چلی گئی۔ مدعی نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور موقع کی تاک میں گھر کے اردگرد منڈلاتا رہا۔ لہٰذا میری مؤکلہ نے مجبور ہو کر تنسیخ نکاح کا کیس دائر کر دیا۔ یہ کیس عائلی عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ اس کیس کا سمن ملنے کے بعد مدعی نے محض انتقامی جذبے سے مجبور ہو کر اپنی بیوی کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت کیس درج کرا دیا لیکن پولیس کی تفتیش سے یہ الزام سراسر جھوٹا ثابت ہوا ہے۔ لہٰذا میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ مدعی کو جرمِ قذف کی دفع تین کے تحت سزا کا مستوجب قرار دیا جائے۔"

یہ دلائل سن کر محسن علی پریشان نظر آنے لگا۔

مجسٹریٹ نے اس سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ آپ اپنی بیوی کی جاسوسی کرتے رہے تھے اور اس پر خنجر سے حملہ کیا تھا؟"

"سر، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اگر میں اپنی بیوی کو قتل کرنا چاہتا تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میری بیوی اور بیٹیاں عدالت میں موجود ہیں۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ ایسی کوئی بات ہوئی تھی یا نہیں۔"

"کیا آپ اپنی بیوی کے بیان کو تسلیم کر لیں گے؟"

"دراصل ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے اور ہم صلح کرنا چاہتے ہیں۔"

مجسٹریٹ نے عارفہ بیگم سے پوچھا۔ "آپ اپنے وکیل کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟"

"میرے وکیل نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ کہا ہے۔" عارفہ بیگم نے بلا تامل کہا۔ "محسن نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا لیکن اس

کا ڈرائیور شریف خان بیچ میں آگیا اور اس کا ہاتھ زخمی ہوگیا۔ یہ بہت ظالم اور سنگدل شخص ہے۔ میری بیٹیاں اس کی شکل دیکھ کر کانپنے لگتی ہیں۔"

محسن علی پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر اپنی بیوی کا گلا دبوچ لے۔ گزشتہ رات وہ اس کے پیر پکڑ کر منتیں کررہی تھی لیکن اب وہ اسے ظالم اور سنگدل قرار دے رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ اگر وہ غصے میں کوئی حرکت کر بیٹھتا تو گویا عدالت میں اپنے ظالم ہونے کا ثبوت فراہم کر دیتا۔ اب اسے اپنے وکیل کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس نے وکیل کے مشورے پر عمل نہ کرکے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اس کی آخری امید اپنی بیٹیوں کے بیان پر تھی۔ اسے یقین تھا کہ بیٹیوں کا بیان اس کے حق میں ہوگا۔

"سر، یہ جھوٹ ہے۔" اس نے عدالت سے کہا۔ "میں ایک ذمے دار شوہر اور محبت کرنے والا باپ ہوں۔ آپ میری بیٹیوں سے پوچھ سکتے ہیں۔"

مجسٹریٹ نے لڑکیوں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "تمہاری اپنے باپ کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"امی ٹھیک کہتی ہیں۔" فوزیہ نے بہنوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ابا بہت ظالم ہیں۔ انہوں نے ہماری امی کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم ایک دن بھی ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

محسن علی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ میں کوئی شے چیخ گئی ہو۔ اس کی نظر دھندلا گئی اور ہر چیز فضا میں تیرتی محسوس ہونے لگی۔ عدالت کا کمرا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل گئی۔

اچانک اس نے قہقہہ لگایا اور ہنستا چلا گیا۔

"آرڈر پلیز..." مجسٹریٹ نے غصے سے کہا۔ "یہ عدالت ہے، مچھلی مارکیٹ نہیں ہے۔ خاموش ہوجاؤ ورنہ میں تمہیں توہینِ عدالت کے جرم میں جیل بھجوادوں گا۔"

لیکن محسن علی ہنستا چلا جارہا تھا۔ اس کی ہنسی میں وحشیانہ پن پایا جاتا تھا۔ چند لمحوں کے اندر عدالت میں موجود ہر شخص کو یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ پاگل ہوگیا تھا۔

وکیل صفائی نے کہا۔ "جناب عالی، میرا خیال ہے کہ مدعی کے دماغ پر اثر ہوگیا ہے۔ اس لیے فی الحال عدالت کی کارروائی ملتوی کردی جائے۔"

مجسٹریٹ ہمدردانہ نظروں سے محسن علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جہاندیدہ شخص تھا اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ محسن علی کو اپنی بیوی اور بیٹیوں کے بیان سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔

محسن علی یکایک چپ ہوگیا اور خالی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔

"آپ کو پتا ہے ظالم اور سنگدل کس کو کہتے ہیں؟" اس نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں... آپ کو نہیں پتا ہوگا۔ آپ اتنی مشکل بات کا جواب نہیں دے سکتے۔ میں بتاتا ہوں... دوستو، غور سے سنو۔ جو شخص بیوی بچوں کے لیے چودہ سال کی قید بامشقت کاٹے... چودہ سال یا سولہ سال؟ نہیں... پندرہ سال! جو شخص پندرہ سال قید بامشقت کاٹے اسے ظالم اور سنگدل کہتے ہیں۔ آج کسی کی جیت ہوئی ہے۔ آج کسی کی ہار... جھوم جھوم کے ناچو آ گاؤ خوشی کے گیت..."

مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "اس کے ساتھ کون ہے؟"

سب لوگ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

انکوائری آفیسر نے کہا۔ "اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ یہ اکیلا آیا تھا۔"

"اکیلے نہ جانا..." محسن علی نے دوسرا گانا شروع کردیا۔ "تمہارے بنا ہم بھلا کیا جئیں گے... اکیلے نہ جانا۔"

مجسٹریٹ نے کہا۔ "اسے ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ آپ اسے اسپتال لے جائیں۔"

○☆○

اس طرح محسن علی کی زندگی کا ایک باب ختم ہوگیا۔ وہ مختلف اسپتالوں اور خیراتی اداروں میں دھکے کھاتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات چپک گئی تھی کہ ظالم اور سنگدل کا کیا مطلب ہے۔

وہ لوگوں کو روک کر پوچھتا۔ "تمہیں پتا ہے، ظالم اور سنگدل کا کیا مطلب ہے؟ مجھے دیکھو... میں ہوں ظالم اور سنگدل!"

شوہر کے پاگل ہونے سے عارفہ بیگم کو کھلی آزادی مل گئی۔ اس نے شوہر کے بنگلے پر قبضہ کرلیا اور بیٹی کو فلمسٹار بنانے کے لیے کوشش شروع کردی۔

سلمان نے دوبارہ اس کے گھر آنا جانا شروع کردیا۔ بیٹیاں بھی ماں کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ باپ کے پاگل ہونے سے انہیں کوئی صدمہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی انہوں نے باپ کے علاج معالجے کے لیے کسی فکرمندی کا اظہار کیا تھا۔

عارفہ بیگم نے لاہور کے چکر لگانے شروع کردیے۔ رقم اس کے پاس موجود تھی اور راہنمائی کرنے والا بھی تھا۔ وہ فوزیہ کو بنا سنوار کر پروڈیوسروں کے پاس لے جاتی اور کبھی اپنی اور کبھی بیٹی کی اداؤں سے کام نکالنے کی کوشش کرتی۔

سلمان پروڈیوسروں کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ اس لڑکی میں سپر اسٹار بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں، بس موقع ملنے کی دیر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ فوزیہ کی اسکرین پر بے مثال تھی۔ اس کی خوبصورتی اور کشش لوگوں کو چونکا دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کئی پروڈیوسروں نے اسے کام دینے کا وعدہ کیا تھا۔

عارفہ بیگم ہر شخص کے سامنے ان "مظالم" کا ضرور ذکر کرتی جو اس کے شوہر نے ان پر روا رکھے تھے۔ اس بار بار کے ذکر کی وجہ سے اسے خود بھی اپنے مظلوم ہونے کا یقین ہوگیا تھا۔ پھر وہ اپنی مظلومیت کے ثبوت میں کہتی۔ "مظلوم کی آہ کبھی بے اثر نہیں

رہتی۔ وہ شخص جو فرعون بن کر ہم پر مسلط تھا ایک دن خدا کی لاٹھی کے نیچے آگیا۔ خدا نے بھری عدالت میں 'لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اس کے ہوش و حواس چھین لیے۔ وہ میری اس معصوم بچی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اسے اداکاری سے روکتا تھا۔ اونہہ..... اب کراچی کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہوگا۔"

فلم پروڈیوسر ناصر حسین کو یہ کہانی اور یہ انجام بہت پسند آیا۔ اس نے ایک مشہور کہانی نویس سے فوزیہ کے حالات پر مبنی کہانی لکھوائی اور اس پر فلم بنانی شروع کر دی۔ فوزیہ کو اس فلم میں ہیروئن کاسٹ کرلیا گیا۔

اس نے کہانی کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "فوزیہ کا باپ عدالت میں اپنی بیوی اور بیٹی پر جھوٹے الزامات کی بوچھار کررہا ہوگا۔ یہ دونوں معصومیت کی تصویر بنی آسمان کی طرف دیکھ رہی ہوں گی۔ پھر ہم کیمرا ٹرک کے ذریعے یہ دکھائیں گے کہ ان دونوں کے گرد نور کا ایک ہالا سا بن گیا ہے اور باپ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سیاہ لہروں کی صورت میں اس ہالے سے ٹکرا رہے ہیں' ہالے سے ٹکرا کر ان میں چنگاریاں سی پیدا ہوتی ہیں۔ پھر یہ چنگاریاں لہروں کی صورت میں واپسی کا سفر شروع کرتی ہیں اور بڑی کڑک دار آواز کے ساتھ باپ کے دماغ سے ٹکراتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ الٹ جاتا ہے اور وہ قہقہے لگانا شروع کر دیتا ہے۔"

اس منفرد انجام کو بہت پسند کیا گیا۔ فلم کا نام "خدا کی لاٹھی" تجویز کیا گیا اور اس پر تیزی سے کام شروع کر دیا گیا۔

چھ مہینے کے بعد فوزیہ ایک ایسی لڑکی کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جسے فلموں میں کام کرنے کا جنون ہے مگر کوئی پروڈیوسر اسے کام دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ ایک دن وہ سوانگ بھر کر ایک پروڈیوسر کے سامنے جاتی ہے۔ اس کے سر اور چہرے کے ایک حصے پر فلم کی پٹی لپٹی ہوئی ہے اور دائیں آنکھ پر کیمرے کا لینس لگا ہوا ہے۔ پروڈیوسر کے سامنے پہنچ کر وہ شوٹنگ کے وقت کہے جانے والے مخصوص الفاظ ادا کرتی ہے۔ "سائلنس..... لائٹس..... ساؤنڈ..... کیمرا..... ایکشن....."

اس طرح وہ پروڈیوسر کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے اور اسے فلم میں کام مل جاتا ہے۔

تقریباً ایک سال کے اندر یہ فلم تکمیل کے آخری مراحل میں داخل ہوگئی۔ اس فلم میں سلمان' فوزیہ کے ظالم باپ کا کردار ادا کررہا تھا۔

ایک شام آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران دھند کی وجہ سے شوٹنگ پیک اپ کر دی گئی اور سب لوگ اسی ہوٹل میں چلے گئے جس میں یونٹ کے افراد مقیم تھے۔ سلمان اور عارفہ بیگم کے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ درمیان میں ایک دروازہ بھی تھا۔

نصف رات کے وقت سلمان کے کمرے سے کچھ عجیب و غریب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں کے ساتھ موسیقی کی آواز بھی آرہی تھی۔ آس پاس کے کمروں میں مقیم افراد نے پہلے تو ان آوازوں پر زیادہ توجہ نہیں دی لیکن جب ان آوازوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تو وہ فکر مند ہوئے اور دروازے کے سامنے اکٹھے ہوگئے۔ ایک شخص ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کو بھی بلا لایا۔ دونوں سو چکے تھے اور آنکھیں ملتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ اس وقت کھٹ پٹ کے ساتھ اندر سے قہقہوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

انہوں نے دروازے پر دستک دی اور آوازیں بھی لگائیں مگر جواب نہیں ملا۔ عارفہ بیگم کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا اور ادھر سے بھی کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ بالآخر ہوٹل کے منیجر کو جگا کر ڈپلی کیٹ چابی سے دروازہ کھولا گیا تو ایک ہولناک منظر دکھائی دیا۔

میز پر شراب کی بوتل' دو گلاس اور چند کھانے کے برتن پڑے تھے جن میں بچا کھچا کھانا موجود تھا۔

کمرے کے واحد بستر پر فوزیہ نیم برہنہ حالت میں بے ہوش پڑی تھی۔ میز کے قریب' فرش پر عارفہ بیگم کی خون میں تربتر لاش پڑی تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر شراب کی ایک دوسری بوتل پہلو کے بل پڑی تھی۔

سلمان محمود کمرے کے ایک کونے میں دبکا بیٹھا' وحشیانہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے بائیں کان کے پاس خون کی ایک لکیر نظر آرہی تھی جو گردن تک چلی گئی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اس نے ایک چادر لپیٹ رکھی تھی اور آنکھیں گھما گھما کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

منیجر نے فوراً پولیس کو اطلاع کر دی۔

بعد میں پتا چلا کہ سلمان کے علیحدہ علیحدہ فوزیہ اور عارفہ بیگم سے تعلقات تھے۔ اس دن جب تینوں شراب پی رہے تھے تو نشے کے عالم میں عارفہ مدہوش ہوگئی اور سلمان فوزیہ کو پیار کرنے لگا۔ اس اثنا میں عارفہ قدرے ہوش میں آگئی اور یہ منظر دیکھ کر چھری سے سلمان پر حملہ آور ہوئی۔ سلمان نے جان بچانے کے لیے بوتل اس کے سر پر دے ماری اور وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مرگئی۔

فلم یونٹ میں ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ اس کی کوشش سے فوزیہ ہوش میں آگئی اور اٹھ کر اپنا لباس درست کرنے لگی۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اتنے میں پولیس بھی موقعے پر پہنچ گئی اور اس نے فوزیہ کو حراست میں لے لیا۔

سلمان پاگل ہوچکا تھا اور کوئی بیان دینے کے قابل نہیں تھا۔ پولیس نے اس کو بھی حراست میں لے لیا اور دونوں کا طبی معائنہ کرایا جس سے یہ معلوم ہوا کہ دونوں نے خوب شراب پی رکھی تھی اور برائی کے مرتکب بھی ہوئے تھے۔

پولیس نے دونوں کے خلاف حدود آرڈیننس اور قتل کا مقدمہ درج کرکے انہیں گرفتار کرلیا۔ قدرت کی جانب سے مکافات عمل مکمل ہوچکا تھا۔ ہر کردار کو اپنے اپنے اعمال کی سزا مل گئی تھی۔

Scanned By: AWAIS MUSTAFA 0333-4585215

دوسرا شخص

سرور اکرام

کہانیاں اسی انداز میں شروع ہوتی ہیں کہ واقعات اُلجھتے اور سلجھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کہانی تو چند کرداروں ہی کی ہے لیکن اس کہانی کے تہ در تہ واقعات کبھی ذہن کی کھڑکیاں کھولتے ہیں اور کبھی مقفل کرتے ہیں۔ بہ ظاہر اس میں بیان کیے گئے معاملات بہت پُراسرار اور پیچ در پیچ ہیں مگر جب اُنہیں واقعات اور حادثات کے تواتر میں دیکھا جائے تو پھر کوئی اُلجھن باقی نہیں رہتی۔ ایک بھٹکی ہوئی رُوح، ایک گم شدہ کہانی نگار اور فلمی دُنیا کی ایک زہرہ جبیں کے مثلث سے تشکیل پانے والی داستانِ حیرت۔

وہ ایک بے پناہ خوب صورت لڑکی تھی۔

بڑے بڑے بال، مست اور مدہوش کردینے والی آنکھیں۔ ستواں ناک، چھوٹے ہونٹ، دراز قامت، متناسب جسم۔ غرضیکہ وہ لڑکی حسن کے معیار پر سو فی صد پوری اُترتی تھی لیکن اس وقت اس کی طرف دیکھنا دل گُردے کا کام تھا۔ وہ ایک ویران سے کمرے کے فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کے چاروں طرف غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ غلاظت اس کی اپنی تھی۔ وہ اپنی دو انگلیاں اپنے منہ میں ٹھونستی اور ایک زوردار ابکائی کے ساتھ اُلٹی کردیتی۔ اس کے چاروں طرف اس کی وہی اُلٹیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ گاڑھی گاڑھی۔ جن میں ہلکی سی پیلاہٹ بھی شامل تھی پھر اس نے عجیب انداز سے مسکراتے ہوئے اس غلاظت میں اپنی ہتھیلیاں بھگونی شروع کردیں اور ان بھیگی ہوئی ہتھیلیوں کو اپنے خوب صورت چہرے پر پھیرنے لگی۔ ذرا سی دیر میں اس کا پورا چہرا اس کی اپنی غلاظت سے لتھڑ چکا تھا۔

اچانک بے شمار روشنیاں جل اُٹھیں۔ کٹ کی آواز کے ساتھ ہی یہ منظر ختم ہوگیا۔ یہ ایک فلم کی شوٹنگ تھی جس کا ایک منظر اتنا ہولناک تھا کہ دیکھنے والے یہ بھول ہی گئے تھے کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے اور کسی فلم کی شوٹنگ ہورہی ہے۔

فلم کا ڈائریکٹر عرفان خالد جھپٹ کر ہیروئن ستارہ کے پاس آگیا۔ اس وقت اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ "ستارہ! کمال کردیا تم نے! کیا پرفارمنس دی ہے۔ میں اس فلم کا ڈائریکٹر ہونے کے باوجود یہ بھول گیا تھا کہ یہ کسی فلم کی شوٹنگ ہورہی ہے۔ میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔"

ڈائریکٹر کی طرح اور بھی بہت سے لوگ ستارہ کو مبارک باد دینے اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔ ان میں فلم کا پروڈیوسر بھی شامل تھا۔ ستارہ کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ مسکراہٹ فخر کا احساس لیے ہوئے تھی۔ جیسے اسے یہ اچھی طرح اندازہ ہو کہ اس نے کیسا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس فلم کا نام "موت کی وادی" رکھا گیا تھا۔ عرفان خالد ایک کامیاب ہدایت کار تھا۔ اس کی کئی فلمیں تہلکہ مچا چکی تھیں۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے کوئی ڈراؤنی ہارر فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن کوئی کہانی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی ہارر فلم ایسی ہو جو بین الاقوامی معیار پر پوری اُتر سکے۔ اس نے اس سلسلے میں کئی کہانیاں بھی سُنیں لیکن ساری کہانیاں اسے مضحکہ خیز معلوم ہورہی تھیں۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھا سوچ بچار میں گم تھا کہ چپراسی نے آکر بتایا کہ کوئی عجیب سا آدمی اس سے ملنا چاہتا ہے۔

"کون ہے وہ آدمی؟" عرفان خالد نے ناگواری سے پوچھا۔ وہ اس وقت کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔

"اپنے آپ کو رائٹر کہتا ہے جناب" چپراسی نے بتایا "کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ کو جس اسٹوری کی تلاش ہے۔ وہ صرف اس کے پاس ہے۔"

عرفان خالد نے چپراسی سے کہا کہ وہ اس رائٹر کو اس کے کمرے میں بھیج دے۔ وہ واقعی ایک پُراسرار اور عجیب سا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اتنا بے حس تھا جیسے پتھر کا بنا ہوا ہو۔ اس کی آنکھیں انتہائی روشن اور نہ جانے کتنے بھید چھپائے ہوئے تھیں۔ عرفان خالد نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر گڑبڑا گیا تھا "جی فرمائیں۔ آپ کیا لائے ہیں؟"

"ایک کہانی" اس نے کہا "میں نے سُنا تھا کہ آپ کو کسی ہارر کہانی کی ضرورت ہے کیونکہ آپ ایک ڈراؤنی فلم بنا رہے ہیں؟"

"کیا آپ نے پہلے بھی کبھی کوئی کہانی لکھی ہے؟"

"جی ہاں" اس نے اپنی گردن ہلا دی "کئی کہانیاں لکھ چکا ہوں لیکن وہ کہانیاں خود مجھ تک محدود رہی ہیں۔ میں نے انہیں شائع کروانے یا کسی کو سُنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ میں کہانیاں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں' اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے لیکن یہ جو کہانی ہے اس کو منظرِ عام پر آنا ہی چاہیے۔ اس لیے میں آپ کے پاس آگیا ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ آپ کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔"

"آپ کا نام کیا ہے جناب!" عرفان خالد نے پوچھا۔

"میرا نام سمندر ہے" اس نے بتایا۔

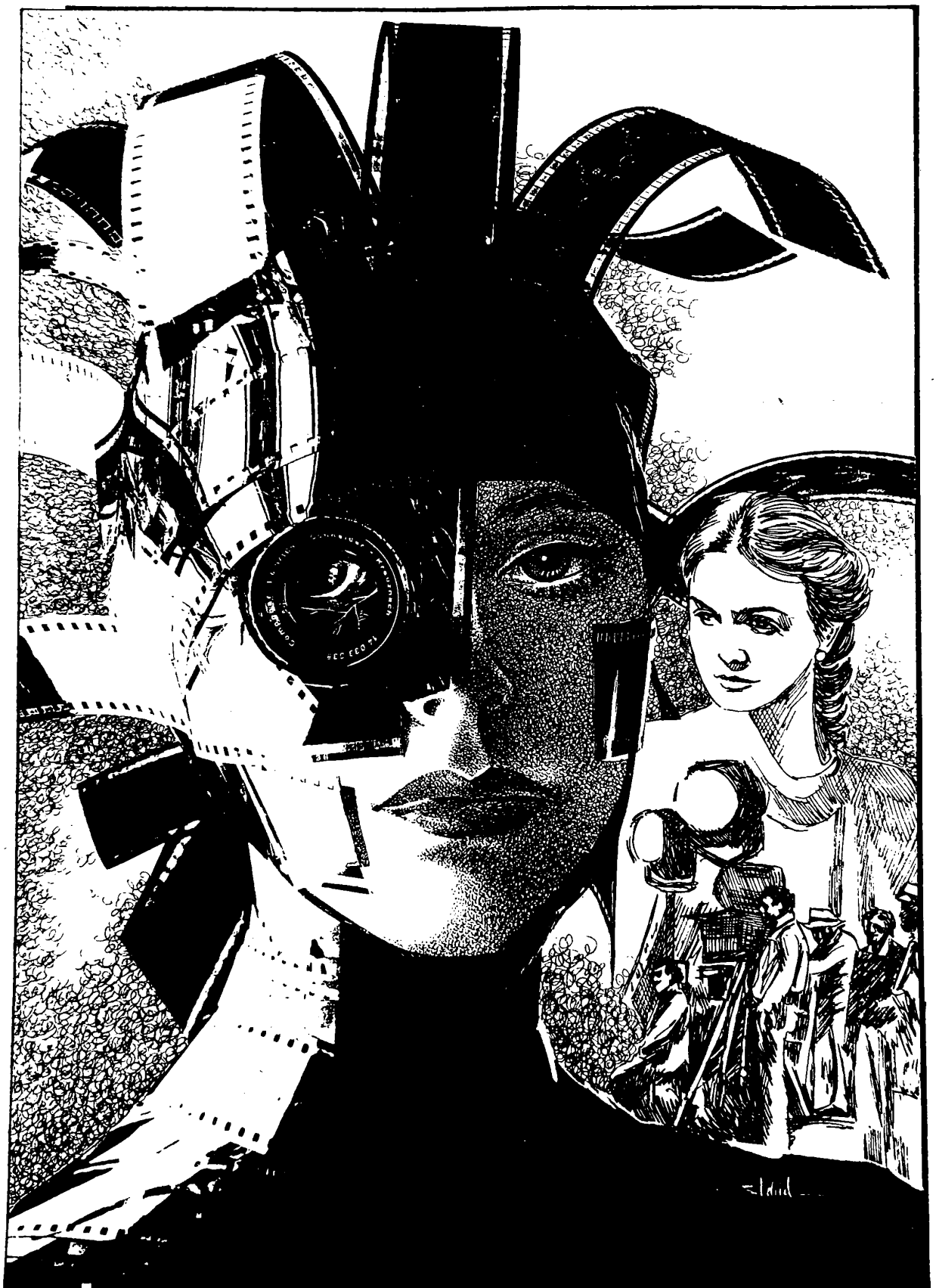

"سمندر!" عرفان نے حیرت سے دُہرایا "صرف سمندر۔ آگے پیچھے کچھ نہیں؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ صرف سمندر ہی اتنا عظیم ہوتا ہے کہ اسے کسی اور کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اپنا یہ مسودہ آپ کے پاس چھوڑے جارہا ہوں اور تین دنوں کے بعد جب آؤں گا تو آپ اس کہانی پر فلم بنانے کا فیصلہ کرچکے ہوں گے۔"

عرفان خالد کو اس کے اعتماد پر حیرت ہورہی تھی لیکن جب اس نے مسودہ پڑھنا شروع کیا تو خود اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ کہانی واقعی اتنی ہی پُراسرار اور بھیانک تھی کہ اگر اس پر چابک دستی سے فلم بن جاتی تو لوگوں کے ہوش اُڑ جاتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک لڑکی تھی جو کسی آسیب کے اثر میں تھی۔ اس کہانی کا ٹریٹ منٹ اور اس کا انداز دوسری ایسی کہانیوں سے بالکل مختلف تھا۔

اب عرفان خالد کو بڑی بے چینی سے اس رائٹر کا انتظار تھا جس نے اتنے اعتماد کے ساتھ اپنی کہانی اس کے حوالے کردی تھی۔ وہ فوری طور پر فلم شروع کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ سمندر اپنے مقررہ وقت پر اس کے پاس آیا تھا۔ عرفان خالد نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا "بھئی! آپ کی کہانی تو واقعی لاجواب ہے۔ آپ نے تو کمال کردیا۔ آپ کا دعویٰ بالکل درست تھا۔ اب میں فوری طور پر اس کہانی کو فلمانے کا ارادہ کررہا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ جناب!" سمندر نے ایک گہری سانس لی "مجھے تو اس بات کی بھی پروا نہیں ہوگی کہ آپ مجھے معاوضہ کیا دے رہے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میں دوسروں سے بالکل مختلف ہوں۔ آپ کا حق نہیں مارا جائے گا" عرفان نے کہا "لیکن اب ایک ایسی دشواری کا سامنا ہے جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا اور وہ الجھن یہ ہے کہ آپ کی اس کہانی کا مرکزی کردار کہاں سے لاؤں! اس کے لیے جو لڑکی چاہیے وہ پوری فلم انڈسٹری میں دکھائی نہیں دیتی۔ کسی میں اتنی صلاحیت نہیں ہے جو اس قسم کے خوفناک کردار ادا کرسکے۔"

"اگر آپ کہیں تو میں آپ کی یہ اُلجھن بھی دور کردوں" سمندر مسکراتے ہوئے بولا "اور میرے پہلے دعوے کی طرح آپ اس دعوے کو بھی سچ پائیں گے۔"

"میں نہیں سمجھا!" عرفان خالد نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اپنی بھانجی ستارہ کو آپ کے پاس لے کر آؤں گا" اس نے کہا "آپ اس کی صلاحیتیں دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ اس پوری انڈسٹری میں اس جیسی اور کوئی نہیں ملے گی۔ اگر اس نے اپنی پرفارمنس سے تہلکہ نہ مچادیا تو میرا نام بدل دیجیے گا۔ مجھے سمندر نہیں ندی یا نالا کہہ لیں۔"

سمندر کی یہ دوسری بات بھی درست ثابت ہوئی۔ ستارہ کو دیکھتے ہی عرفان خالد اُچھل پڑا تھا۔ وہ ایک مکمل لڑکی تھی۔ اتنی خوب صورت کہ پوری فلم انڈسٹری میں اس جیسی اور کوئی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایسے گہرے تاثرات تھے جو اس کو پیدائشی فنکار ظاہر کررہے تھے اور جب فلم کی مہورت ہوئی اور اس نے پہلا ہی شاٹ دیا تو پوری انڈسٹری اُچھل پڑی۔ اس بھیانک کردار کو اس سے بہتر اور کوئی ادا کرہی نہیں سکتا تھا۔

○☆○

ذیشان ایک فلم جرنلسٹ تھا۔

اس نے بہت کم وقت میں شوبزنس میں اپنی ایک ساکھ بنالی تھی۔ وہ جس فلم، جس ڈرامے پر تنقید کردیتا۔ لوگ اس کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے تھے اور جس کی تعریف لکھ دیتا اس کو کامیابی حاصل ہوجاتی تھی۔ اس نے جس فنکار کی تعریف کی اسے عروج پر پہنچادیا۔ فلم اور شوبزنس وغیرہ کے حلقے میں اس کی ساکھ اتنی مستند تھی کہ کوئی دوسرا اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا تھا۔ اس لیے ان حلقوں میں اس کی بے پناہ پزیرائی بھی ہوا کرتی۔ سب ہی اس کی نگاہِ کرم کے منتظر رہتے تھے۔ سب کی یہ خواہش ہوتی کہ ذیشان اس کے بارے میں کچھ لکھ دے۔

ستارہ نے اپنی آمد اور پرفارمنس سے جو تہلکہ مچایا تھا۔ وہ بھی ذیشان کی نگاہوں سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ستارہ خود اس سے ملنے کے لیے آئے گی۔ اس سے درخواست کرے گی کہ اس کے بارے میں کچھ لکھ دیا جائے لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو ذیشان کو حیرت ہونے لگی۔ وہ ایک دن خود عرفان خالد کے دفتر پہنچ گیا۔

"ارے آپ! زہے نصیب" عرفان خالد اسے دیکھ کر خوش ہوگیا تھا "میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ذیشان صاحب کہاں ہیں۔ ان کو تو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ بھلا انڈسٹری میں انقلاب آنے والا ہو اور وہ آپ کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔"

"میں نے بھی آپ کی کہانی کی بہت تعریف سُنی ہے" ذیشان نے کہا "مجھے اُمید ہے کہ آپ کی یہ فلم بہت زبردست ہوگی لیکن اس وقت میں آپ کی ہیروئن ستارہ کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ مجھے اس سے ملاقات کرنی ہے۔"

"ضرور ضرور۔ یہ تو ہماری اور ستارہ دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ خود اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ ارے صاحب، کیا بتاؤں وہ کیا چیز ہے؟"

"لیکن وہ اس وقت ہے کہاں! کیا سیٹ پر ہے؟"

"نہیں۔ آج اس کی ریکارڈنگ نہیں ہے۔ آج دوسرا کام ہورہا ہے۔ آج وہ گھر پر ہوگی۔"

"کیا آپ مجھے اس کے گھر کا پتا دے سکتے ہیں؟"

عرفان خالد یہ سُن کر کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ جیسے پتا بتاتے

ہوئے ہچکچا رہا ہو پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے بولا "سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔ میں اس کا پتا جانتا تو ہوں لیکن خود آج تک اس کے گھر نہیں گیا۔ اس نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ اگر فلم کا کوئی بندہ بھی اس کی طرف پھٹکا تو وہ فلم میں کام نہیں کرے گی۔ یہ اس کی عجیب شرط ہے۔ اس ڈر سے ہم میں سے کوئی بھی اس کی طرف نہیں جاتا۔ اس کوٹھی میں دونوں ماموں بھانجی رہتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان کی طرف سے کبھی کوئی شکایت بھی نہیں ہوئی۔ وہ وقت سے پہلے آجاتی ہے۔ کبھی دیر سے نہیں آئی۔ اس لیے اس کی طرف کسی کو بھیجنے کی یا اس طرف جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

"اس کا کوئی فون نمبر تو ہوگا؟" ذیشان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ یہ بھی کمال ہے کہ اس کے یہاں فون بھی نہیں ہے۔" عرفان خالد نے بتایا "میرا خیال ہے کہ وہ سکون سے رہنا چاہتی ہے۔"

"ہوں" ذیشان نے ایک گہری سانس لی "آپ ایسا کریں۔ مجھے اس کے گھر کا پتا بتادیں۔ اس نے مجھے تو دیکھا نہیں ہے اور میں خود کو ظاہر بھی نہیں کروں گا کہ میرا تعلق اس دنیا سے بھی ہے۔ میں کسی اور بہانے سے اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اخبار والا ہوں نا۔ اس لیے میں یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتا ہوں۔"

عرفان نے ستارہ کے گھر کا پتا بتادیا تھا۔ ذیشان اسی دن اس پتے پر پہنچ گیا۔ وہ مکان شہر کے ایک کم آباد علاقے میں تھا۔ یہاں بڑی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور سب کی سب پرانی طرز کی تھیں۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ بہت بارونق ہوا کرتا تھا لیکن پھر یہاں کی زمین بہت تیزی سے سیم زدہ ہونے لگی۔ درخت جل گئے، گھاس مرجھا گئی۔ دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگیں تو لوگوں نے اس علاقے سے ہجرت اختیار کرلی۔ ابھی بھی کوٹھیاں تو اپنی گردنیں اُٹھائے بڑی شان سے کھڑی تھیں لیکن مکین بہت کم رہ گئے تھے۔

ستارہ کی رہائش بھی ایک کوٹھی میں تھی۔ بہت پرانی کوٹھی تھی۔ دیواروں پر کائی جمی ہوئی تھی۔ دیواروں کی دراڑوں کی درمیان خودرو جھاڑیاں سر اُٹھا رہی تھیں۔ لکڑی کا گیٹ آدھا ٹوٹا ہوا تھا۔ ایسی ویرانی تھی کہ اس کوٹھی میں کسی کے ہونے کا امکان ہی نہیں ہو سکتا تھا لیکن ذیشان کو یہی پتا بتایا گیا تھا۔ سہراب ولا۔ باہر ملگجی سی تختی پر انگریزی میں سہراب ولا ہی لکھا ہوا تھا۔ یہ کوٹھی کسی پارسی کی ملکیت تھی جو نہ جانے کس طرح ستارہ کے پاس آگئی تھی۔

"کوئی ہے؟" ذیشان نے کوٹھی میں داخل ہو کر زور سے آواز دی لیکن جب جواب میں خاموشی ہی رہی تو وہ اور آگے بڑھ آیا۔ ہر طرف خزاں رسیدہ پتے بکھرے ہوئے تھے۔ جو اس کے پیروں کے نیچے آکر چرمر کر رہے تھے۔ عجیب پُراسرار اور آسیب زدہ ماحول تھا۔ ایسا ماحول اس نے صرف فلموں میں دیکھا تھا یا پُراسرار کہانیوں میں پڑھا ہوگا۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ سیڑھیوں تک آگیا۔ پتھر کی یہ سیڑھیاں بھی گرد آلود ہو رہی تھیں۔ اس نے یہاں بھی رک کر آواز دی لیکن خاموشی ہی رہی تھی۔

وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا برآمدے میں آگیا۔ سامنے دو دروازے تھے لکڑی کے قدیم بھاری بھرکم دروازے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازے اندر سے اس طرح بند تھے کہ انہیں جنبش بھی نہیں دی جاسکتی تھی۔ وہ واپس مڑا اور سیڑھیاں اُتر کر اس طرف والے پائیں باغ میں داخل ہوگیا۔ یہاں اسے ایک کھڑکی نظر آئی تھی۔ جس کے ذریعے جھانک کر مکان کے اندر دیکھا جاسکتا تھا لیکن کھڑکی کی طرف جانے کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ اس سے پہلے ہی پائیں باغ میں بنی ہوئی دو قبروں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔

یہ دونوں قبریں پائیں باغ میں ایک بڑے سے درخت کے نیچے بنی ہوئی تھیں اور ان پر کتبے بھی لگے ہوئے تھے۔ ذیشان ان قبروں کے پاس آگیا۔ دونوں قبروں کے کتبے بھی بہت پرانے تھے۔ ان پر کچھ لکھا بھی ہوا تھا۔ ذیشان نے جھک کر ایک قبر کے کتبے کو پڑھا اور بوکھلا کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس قبر پر صاحب قبر کا نام سمندر لکھا ہوا تھا۔ جس کی تاریخ وفات ستر سال پہلے کی تھی۔ یعنی وہ شخص انیس سو چوبیس میں فوت ہوا تھا۔ ذیشان نے دھڑکتے ہوئے دل کے

ایک مکھی نے دوسری مکھی سے کہا "آدمی بہت بے وقوف ہوتے ہیں۔"

"کیوں؟" دوسری مکھی نے پوچھا۔

پہلی مکھی نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے کہ اتنا پیسا خرچ کرکے چھت بناتے ہیں اور اس کے بعد فرش پر چلتے پھرتے ہیں۔"

O☆O

نوجوان نے لڑکی کے باپ سے کہا "جناب بات یہ ہے کہ آپ کی لڑکی مجھ سے شادی پر آمادہ ہے۔"

لڑکی کے باپ نے جواب دیا "میاں صاحب زادے! اس میں کسی دوسرے کا کیا قصور ہے۔ تم گلی کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا اب بھگتو۔"

ساتھ دوسری قبر کے کتبے کو پڑھا اور اس بار اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے اعصاب شل کردیے ہوں۔ اس قبر پر ستارہ لکھا ہوا تھا۔ جس کی تاریخِ وفات انیس سو تیس لکھی تھی۔

○☆○

گلنار کی نیندیں حرام ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ خود بھی فلم انڈسٹری کی ایک خوب صورت اور کامیاب فنکارہ تھی۔ اس نے بہت سی فلموں میں اپنی بے مثال اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ اس نے عرفان خالد کی کئی فلموں میں بھی کام کیا تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ عرفان خالد ایک ذہین ترین ڈائریکٹر ہے۔ اس نے جس کو اپنی فلم میں کاسٹ کرلیا اس کی قسمت بن جاتی تھی۔ گلنار ویسے تو خود ہی ایک سُپر اسٹار تھی لیکن اس کی گزشتہ دو فلمیں بُری طرح فلاپ ہوچکی تھیں۔ اسے اُمید تھی کہ عرفان خالد اسے اپنی نئی فلم میں ضرور کاسٹ کرلے گا۔ لیکن جب اچانک غیر متوقع طور پر اس ہارر فلم کے لیے ایک نئی اداکارہ ستارہ کو لے لیا گیا تو گلنار یہ برداشت نہیں کرسکی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ستارہ کو اس فلم کی کاسٹ سے کس طرح الگ کرے۔ اسے یہ اعتراف تھا کہ ستارہ نے دو چار شاٹس بہت اچھے دیے تھے لیکن ابھی فلم ابتدائی مراحل میں تھی۔ اگر فوری طور پر کچھ ہوجاتا تو گلنار اپنا کھویا ہوا مقام واپس لے سکتی تھی۔ اس نے اپنی اس الجھن کا تذکرہ دلدار سے کیا جو خود بھی ستارہ اور اس کے ماموں کے خلاف بھرا ہوا تھا۔

دلدار انڈسٹری کا ایک بروکر تھا۔ سپلائر تھا۔ وہ ایکسٹرا کے ساتھ ساتھ کہانی نگار اور موسیقار وغیرہ بھی فراہم کردیا کرتا تھا۔ وہ ورزشی جسم کا ایک بھیانک صورت انسان تھا۔ جس کے ایک گال پر چاقو کے ایک زخم نے اس کی صورت کو اور بھی بھیانک بنادیا تھا۔

"بائی جی۔ میں تو خود ان لوگوں کے خلاف بھرا ہوا ہوں" دلدار نے کہا "میں نے اس فلم کی اسٹوری کے لیے نقش صاحب سے بات کرلی تھی۔ وہ مجھے پورے دس ہزار روپے دینے کو تیار ہوگئے تھے۔ میں نے عرفان خالد سے بھی بات کرلی تھی لیکن یہ بیچ میں سمندر نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔ اس حرام زادے نے میرا سارا کام خراب کرکے رکھ دیا۔"

"دیکھو دلدار۔ میں ہر حال میں اس فلم میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ تم کوئی راستہ نکالو۔ ورنہ تم تو جانتے ہو کہ اگر مجھے کام نہیں ملا تو میری ساکھ پر کتنا بُرا اثر پڑے گا۔"

"یہ میں جانتا ہوں بائی جی" دلدار نے اپنی گردن ہلائی "لیکن خود سوچو۔ اب کیا ہوسکتا ہے؟"

"دیکھو۔ میں کسی کا بُرا نہیں چاہتی۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ تم اس کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرو لیکن اتنا تو ہو کہ وہ کچھ دنوں کے لیے کہیں غائب ہوجائے۔ جب وہ اچانک غائب ہوجائے گی تو عرفان مجبور ہو کر کسی اور کی طرف دیکھے گا۔ پھر مجھ سے بہتر اسے اور کون مل سکتا ہے۔"

"لیکن کسی کو غائب کردینا اتنا آسان تو نہیں ہے بائی جی۔ اس کام میں بہت جھنجٹ ہے" دلدار نے کہا "پھر اس کا وہ ماموں تو چین سے نہیں بیٹھے گا نا۔ وہ تو آسمان سر پر اُٹھالے گا۔"

"اوہو۔ جب ستارہ ہی نہیں رہے گی تو اس کا ماموں کیا کرلے گا۔ بس رو دھو کر خاموش ہوجائے گا اور خود سوچو اس کام کے تمہیں پورے تیس ہزار دوں گی۔ تیس ہزار کم تو نہیں ہوتے۔ تم کو چھ مہینوں میں اتنے پیسے نہیں مل سکتے۔ جتنے ایک ہفتے میں کمالوگے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے" دلدار کا چہرہ چمک اُٹھا "ایک مہینے تک اس کا کوئی پتا نہیں چلے گا۔ یہ سب اپنے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

دوسرے دن دلدار نے گلنار کو آکر رپورٹ دی کہ ستارہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے ایک ویران مقام پر قید کردیا گیا ہے۔

"کیا!" گلنار کو پھر بھی یقین نہیں آیا تھا کہ یہ کام اتنی آسانی سے بھی ہوسکتا ہے "کیا کہا! اتنی جلدی۔ آخر یہ کس طرح ہوا۔ تمہیں وہ کہاں ملی تھی؟"

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟" دلدار اپنی ٹھوڑی کو مسلتے ہوئے بولا "کچھ عجیب سا چکر معلوم ہوتا ہے۔ مجھے خود حیرانی ہورہی ہے کہ یہ سب اتنی آسانی سے کیسے ہوگیا۔ کل رات ستارہ کی شوٹنگ تھی۔ گیارہ بجے تک اس نے شوٹنگ کی۔ اس کے بعد وہ اپنے ماموں کے ساتھ اسٹوڈیو سے باہر نکلی اور دونوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میرا ارادہ صرف اتنا تھا کہ میں ان کا تعاقب کروں گا لیکن ہوا یہ کہ ایک ویران سڑک پر اچانک وہ ٹیکسی رُک گئی۔ وہ ایسی سڑک ہے جس کے دونوں طرف دور دور تک کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ خود سوچو' اندھیری رات' ویران مقام' وہ دونوں وہاں نہ جانے کیوں اُترے تھے۔ میں نے بھی اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر روک دی۔ میں نے روشنیاں گل کردی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے ٹیکسی واپس کردی تھی اور خود کھیتوں کے درمیان گھس گئے تھے۔ خود میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ یہ لوگ کہاں جارہے ہیں۔ میں ان کا کھوج لگانے کے لیے خود بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ بڑی مشکلوں سے دونوں سایوں کی طرح آگے جاتے ہوئے دکھائی دے گئے پھر ایک عجیب بات ہوئی" دلدار بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔

دلدار کی اس کہانی نے گلنار کو بھی بے چین کردیا تھا۔ دلدار کی خاموشی اس کی اُلجھن کو ظاہر کررہی تھی "ہاں بتاؤ نا۔ پھر کیا ہوا؟" گلنار نے پوچھا۔

"پھر ہوا یہ کہ وہ دونوں ایک بڑے سے درخت کے پاس بیٹھ گئے اور اس کا ماموں اچانک غائب ہوگیا۔"

"کیا کہا' غائب ہوگیا!"

"ہاں۔ بالکل غائب ہوگیا۔ اس وقت گرچہ اندھیرا تو تھا لیکن ان کے خاکے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ درخت کے پاس پہنچتے ہی ان میں سے صرف ایک رہ گیا اور وہ ستارہ تھی۔ تم تو جانتی ہو کہ میں اچھا خاصا مضبوط دل آدمی ہوں لیکن میں بھی یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ستارہ اس درخت کے چاروں طرف اس طرح گھوم رہی تھی جیسے کسی چیز کا طواف کیا جاتا ہے۔ اندھیری رات' ویران مقام اور ایک لڑکی اس طرح درخت کے گرد چکر لگا رہی ہو اور اس کے ساتھ والا بندہ اچانک غائب ہوگیا ہو۔ یہ تو حیرت کی بات ہے نا۔ مجھے ڈر تو لگ رہا تھا پھر بھی میں آہستہ آہستہ درخت کے پاس پہنچ گیا۔ ستارہ اس دوران درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی تھی اور کمال یہ ہے کہ میں جب اس کے پاس پہنچا تو اس نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اسے میرا ہی انتظار ہو۔ وہ ذرا بھی پریشان یا حیران نہیں تھی' بلکہ مسکرا رہی تھی۔

"کمال ہے" گلنار کی حیرانی بڑھتی جارہی تھی "یہ تو تم عجیب بات بتا رہے ہو۔"

"سُنتی تو رہو۔" دلدار نے کہا "وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ کیونکہ اس نے مجھے اسٹوڈیو میں دیکھ رکھا تھا۔ اسی لیے اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اوہو۔ تم اس طرف کس طرح آنکلے۔ یہ تو بہت خطرناک جگہ ہے۔"

میں نے اس سے کہا کہ میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک ٹیکسی سے دونوں کو اُترتے ہوئے دیکھا۔ میں خیریت معلوم کرنے اس کے پاس چلا آیا ہوں۔ میری بات سُن کر وہ ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے بولی "چلو انڈسٹری میں کوئی تو ایسا ہے جسے میری اور ماموں کی پروا رہتی ہے۔"

میں نے جب اس سے اس کے ماموں کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے درخت کی شاخوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا "ماموں تو اپنے گھر چلے گئے۔ اسی درخت پر ان کا بسیرا ہے" میں نہیں بتا سکتا گلنار کہ اس نے جب یہ بات کی تو میرا کیا حال ہوا تھا۔ خوف کی ایک لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی تھی۔ وہ اس وقت مجھے کوئی انسان تو معلوم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ میں بہت سخت دل آدمی ہوں لیکن اس کی باتوں نے میرے ہوش اُڑا دیے۔ اس نے جب مجھے گھبراتے ہوئے دیکھا تو ہنس کر بولی "اب اتنا گھبرا کیوں رہے ہو۔ جس کام سے آئے ہو وہ کام کرو۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

"کیا!" گلنار اُچھل پڑی "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا اسے معلوم تھا کہ تم...؟"

"ہاں۔ اسے معلوم تھا کہ میں اسے اغوا کرنے کے ارادے سے گھوم رہا ہوں۔ تم سچ مانو۔ میں اس وقت اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا لیکن وہ تو میرے پیچھے پڑ گئی۔ کہنے لگی "دلدار۔ میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ کچھ دن آرام کرلوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا کام نہیں کیا۔ میں کچھ دنوں کے لیے فلمی ماحول سے دور جانا چاہتی ہوں اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم مجھے اغوا کرکے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ کیونکہ یہ سب کچھ میری اپنی مرضی سے ہوگا اور گلنار' اس نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا اور اسے وہاں پہنچا دیا جہاں میں نے اسے اغوا کرکے رکھنے کا پروگرام بنایا تھا اور اب وہ وہیں ہے۔"

گلنار اُلجھ کر رہ گئی۔ دلدار نے جو کہانی سنائی وہ بہت حیرت انگیز تھی۔ ایسے کیسے ہوسکتا تھا کہ کوئی لڑکی خود اپنی مرضی سے اغوا ہوگئی ہو اور وہ بھی ایسے پُراسرار حالات میں۔ دلدار نے یہ کہا تھا کہ ستارہ اس کے قبضے میں ہے لیکن یہ کیسا قبضہ تھا؟ دلدار تو خود ہی اس سے خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا تم مجھے اس کے پاس لے جاسکتے ہو؟" گلنار نے پوچھا "میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"شاید تم کو میری بات پر یقین نہیں ہے" دلدار نے کہا "ٹھیک ہے بائی جی۔ آؤ میرے ساتھ اپنی تسلی کرلو لیکن یہ سوچ لو کہ میں نے صرف تمہارے کہنے پر اس پر ہاتھ ڈالا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے بعد سے اب تک اتنا پریشان ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔ وہ مجھے کوئی انسان نہیں معلوم ہوتی۔ یہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اب چاہے تم مجھے بزدل سمجھو یا بہادر سمجھو۔ خود سوچو کہ یہ سب کیا ہے؟ وہ دونوں جنگل میں کہاں جارہے تھے؟ پھر اس کا ماموں درخت کے پاس پہنچ کر کہاں غائب ہوگیا؟ اور ستارہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کے لیے میری نیت کیا ہے؟"

"دیکھو دلدار۔ اس دور میں ایسی باتیں نہیں ہوا کرتیں۔ بظاہر تو معاملہ بہت اُلجھا ہوا نظر آتا ہے لیکن جب بھید کھل جائے تو سب کچھ مذاق معلوم ہونے لگتا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں' کسی جن یا چڑیل وغیرہ کو فلموں میں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کس کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ اپنی دنیا کو چھوڑ کر ہماری دنیا میں صرف فلموں میں کام کرنے کے لیے آئے گا۔ اس کے علاوہ اس کے ماموں کا اچانک غائب ہوجانا بھی ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم نے خود بتایا ہے کہ وہاں بہت گہرا اندھیرا تھا۔ تو وہ اندھیرے میں کہیں اِدھر اُدھر چلا گیا ہوگا اور ستارہ نے اپنی بات کو پُراسرار بنانے کے لیے یہ کہہ دیا کہ اس کے ماموں کی رہائش درخت پر ہے۔ اب یہ معاملہ ہے کہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ تم نے اس کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا تھا؟"

"ہاں۔ تم خود سوچو۔ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"کیا تم نے اس کے اغوا کے راز میں کسی اور کو بھی شریک کیا تھا؟" گلنار نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ دو آدمی میرے ساتھ کام کرتے ہیں" دلدار نے بتایا "میں نے انہیں بتا دیا تھا۔"

"بس تو ہوسکتا ہے کہ ان دونوں نے ستارہ یا اس کے ماموں

سے تذکرہ کردیا ہو۔ یا کسی اور سے کہہ دیا ہو؟"

"بائی جی۔ تم تو بڑی عقلمند ہو" دلدار نے ایک گہری سانس لی "تم نے تو سارا معاملہ ہی صاف کردیا۔ میں تو خواہ مخواہ اس سے ڈرا ہوا تھا۔"

"اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اسے چھپ کر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں اس کے پاس لیے چلتا ہوں۔"

گلنار نے اپنی گاڑی نکالی۔ دلدار اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر کے سفر کے بعد گاڑی ایک کم آباد علاقے میں پہنچ گئی۔ جہاں ایک بڑے سے احاطے کے درمیان ایک بیرک سی بنی ہوئی تھی۔ گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ دلدار نے گاڑی سے اُتر کر خود ہی گیٹ کھول دیا تھا پھر دونوں گاڑی سے اُتر کر بیرک کے پاس آگئے۔

"وہ اس بیرک میں ہے" دلدار نے اشارہ کیا۔ "تم اس کھڑکی سے اس کو دیکھ سکتی ہو۔"

کھڑکی کے پاس ایک ڈرم پڑا ہوا تھا۔ سلاخوں والی وہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ گلنار اس ڈرم پر چڑھ کر بیرک میں جھانکنے لگی اور پھر ایک زوردار چیخ کے ساتھ لہراتی ہوئی ڈرم سے نیچے آگئی۔ اس کے ہوش وحواس گم ہوگئے تھے۔

"ارے کیا ہوا بائی جی!" دلدار نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا "بتاؤ۔ کیا ہوا' کیا دیکھ لیا تم نے؟"

"وہ... وہ واقعی چڑیل ہے چڑیل" گلنار نے خوف سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا "وہ چھپکلیاں کھا رہی ہے۔ یہ موٹی موٹی چھپکلیاں اس کے منہ میں ٹھنسی ہوئی ہیں" اتنا کہتے ہی اس نے ایک زوردار ابکائی لی اور بے ہوش ہوگئی۔

○☆○

اصغر نیار ایک عیاش طبع انسان تھا۔

اس نے چند ہی برسوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی دولت حاصل کرلی تھی کہ تین چار فلمیں بنا ڈالیں۔ پہلے اس کی ایک دُکان ہوا کرتی تھی۔ اتنے بڑے شہر کا ایک معمولی انسان جسے کوئی نہیں جانتا تھا پھر جب دولت آئی تو اس نے فلم انڈسٹری کا رخ کیا۔ آدمی شروع ہی سے کائیاں اور سمجھ دار تھا۔ اس لیے اس نے اپنی دولت بیمار اور بوڑھے گھوڑوں پر نہیں لگائی۔ بلکہ ایسے ڈائریکٹروں کا انتخاب کیا جو مارکیٹ میں کامیاب فلمیں دے چکے تھے۔ اس نے ایک فلم کے لیے سرمایہ لگادیا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور سرمایہ مع بے پناہ منافع کے واپس آگیا۔

اس کی دوسری فلم بھی بہت کامیاب ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ انڈسٹری میں اس کی ساکھ بنتی گئی پھر یہ سمجھا جانے لگا کہ جس فلم میں اصغر نیار کا پیسہ لگا ہو وہ ضرور کامیاب ہوتی ہے۔ اب اس کی کئی فلمیں زیرِ تکمیل تھیں۔ عرفان خالد کی ہارر فلم کا بھی وہی فنانسر تھا۔ وہ عرفان خالد کی صلاحیتوں کا مدّاح تھا۔ اس کی خود بھی یہی خواہش تھی کہ عرفان اس کے لیے کوئی فلم بنائے۔ اس لیے جب عرفان اپنی نئی فلم کا منصوبہ لے کر اس کے پاس آیا تو وہ انکار نہیں کرسکا۔

"عرفان بھائی۔ میں تمہارے لیے دس پندرہ لاکھ روپے یوں ہی لگانے کو تیار ہوں" اس نے کہا "لیکن یہ ڈراؤنی فلم کا آئیڈیا سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں نے بھی اس کام میں اس لیے ہاتھ ڈالا ہے کہ یہ بالکل نیا آئیڈیا ہے۔ پبلک کو ایک نئی چیز دیکھنے کو ملے گی اور اس کی جو کہانی ملی ہے وہ اتنی دہشت ناک ہے کہ پوری دنیا میں دھوم مچ جائے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنا ملک تو ایک طرف ہم بین الاقوامی مارکیٹ میں بھی ساکھ بنالیں گے۔"

عرفان خالد کی طرف سے اتنی یقین دہانی کافی تھی۔ اصغر نے فوری طور پر سرمایہ فراہم کردیا لیکن وہ اس فلم کی ابتدا نہیں دیکھ سکا۔ اسے اپنے کاروبار کے سلسلے میں کچھ دنوں کے لیے یورپ جانا پڑا۔ وہاں سے واپسی میں اسے پتا چلا کہ اس فلم کے کئی مناظر فلمائے بھی جاچکے ہیں اور ایک نئی لڑکی ستارہ نے تہلکہ مچادیا ہے۔ اس نے اس فلم کے جب رش پرنٹ دیکھے تو خود اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اب تک کے سین تو بے مثال تھے ہی لیکن وہ لڑکی ستارہ بھی بے مثال تھی۔ اس نے ایسا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے فوراً عرفان خالد کو اپنے دفتر میں بُلالیا تھا۔

"بھئی مبارک ہو عرفان صاحب" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "آپ نے تو کمال کردیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ فلم پوری دنیا میں تہلکہ مچادے گی۔ میں اس کی ہیروئن سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ اس وقت کہاں ہوگی؟"

"ایک گڑبڑ ہوگئی ہے نیار صاحب" عرفان دھیرے سے بولا "سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں؟"

"کیوں خیریت تو ہے نا؟"

"ستارہ کہیں غائب ہوگئی ہے۔" عرفان نے بتایا "میں تلاش کرکر کے تھک گیا ہوں۔"

"غائب ہوگئی۔ کہاں' کیسے؟ کس نے بتایا آپ کو۔ وہ پہلے کہاں رہتی تھی! کون تھا اس کے ساتھ؟"

"اس فلم کی پراسرار کہانی کی طرح خود وہ بھی بہت پراسرار سی ہے" عرفان نے کہا "اس فلم کی کہانی اس کا ماموں سمندر میرے پاس لے کر آیا تھا۔ میں اس شخص کو نہیں جانتا تھا لیکن جب اس نے کہانی سنائی تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں نے فوراً ہی اس پر فلم بنانے کا ارادہ کرلیا پھر اس نے اپنی بھانجی ستارہ کا مجھ سے تعارف کروایا۔ پہلی ہی نظر میں وہ لڑکی مجھے پسند آگئی پھر اس نے جو پرفارمنس دی وہ بھی آپ نے دیکھ لی ہوگی۔ وہ ایک بے مثال اداکارہ ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں شہر کی ایک ویران کوٹھی میں رہتے تھے اور ہمیں سختی سے یہ ہدایت کی تھی کہ

ہم میں سے کوئی اس کوٹھی کی طرف نہ جائے۔ ان کے یہاں رابطے کے لیے فون بھی نہیں تھا لیکن مجھے ان سے رابطہ کرنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ وہ دونوں شوٹنگ سے پہلے ہی آجاتے تھے، کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا لیکن اب کئی دنوں سے دونوں ہی غائب ہیں۔"

"اوہ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا" منیار نے کرسی پر پہلو بدلا "کیا آپ نے معلوم کرنے کی کوشش کی؟"

"ہاں۔ میں خود اس کوٹھی کی طرف گیا تھا" عرفان نے بتایا "لیکن وہ بالکل ویران پڑی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔"

"یہ تو بہت عجیب معاملہ ہے" اصغر منیار نے کہا "آخر وہ کہاں جاسکتی ہے؟"

"اس سے بھی عجیب ایک اور بات بھی ہے۔ آپ گلنار کو تو جانتے ہی ہوں گے۔ وہی ہیروئن، جو آپ کی بھی کئی فلموں میں کام کرچکی ہے۔"

"ہاں ہاں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں، کیا ہوا ہے اس کو؟"

"وہ ذہنی مریضہ بن گئی ہے۔" عرفان نے بتایا "اس پر دورے پڑنے لگے ہیں اور وہ ستارہ کا نام لے لے کر زور زور سے چیختی ہے۔ چھپکلی چھپکلی کہتی ہے پھر بے ہوش ہوجاتی ہے۔"

"او خدا!" اصغر منیار نے ایک گہری سانس لی "یہ کیا چکر چل رہا ہے۔ ستارہ آخر ہے کیا بلا؟ اور گلنار سے اس کا کیا تعلق ہوگیا؟"

"یہی تو نہیں معلوم" عرفان نے کہا "میں تو اپنی فلم کی وجہ سے پریشان ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ ایک دو دن اور انتظار کرلوں پھر پولیس کی مدد حاصل کروں گا۔ یہ فلم تو ہرحال میں بننی ہے اصغر صاحب اور سوائے ستارہ کے اور کوئی ایسا کام بھی نہیں کرسکتی۔"

عرفان کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔ اصغر منیار کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ اس نے ستارہ کے رش پرنٹ دیکھ کر نہ جانے کیسے کیسے منصوبے بنالیے تھے لیکن اب ستارہ ہی غائب ہوگئی تھی۔ عرفان نے ستارہ کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ یہ ستارہ تھی کیا! کوئی لڑکی یا کچھ اور...؟

چپراسی نے آکر اسے کرمو کے آنے کی اطلاع دی۔ منیار، کرمو کی آمد کا سُن کر حیران سا ہوگیا تھا۔ کرمو اس کا ایک پرانا ملازم تھا۔ منیار نے شہر سے باہر ایک فارم لے رکھا تھا۔ کرمو اس فارم کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ فارم کے درمیان ایک پرانا ریسٹ ہاؤس بھی بنا ہوا تھا۔ جہاں منیار اپنی من پسند لڑکیوں کو لے جایا کرتا تھا۔ کرمو اس سے ملنے کے لیے کبھی اس کے دفتر نہیں آیا تھا۔ اس کی آمد یقیناً کسی خاص سبب سے تھی۔ اس نے چپراسی سے کہا کہ وہ کرمو کو اندر بھیج دے۔

کرمو اندر آکر سلام کرکے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

خشکی بھگائے، بال بڑھائے، جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ

بیمثال شیمپو سوپ

دورِ جدید کی ایجاد نہیں بلکہ زمانۂ قدیم کا معجزہ ہے۔ ہندوؤں میں کرشن کی گوپیوں کے حسن کے بڑے چرچے تھے۔ کچھ ہندو پروہتوں کے سینوں میں اس حسن کا راز پوشیدہ تھا چونکہ اکبر اعظم بھی حسن کا دلدادہ تھا اس نے اپنی حکمت عملی سے اس راز کو حاصل کیا اور محققین کی مدد سے اپنے حرم کے حُسن کو زندۂ جاوید کردیا۔ وہ حُسن جو کرشن کی گوپیوں اور اندھا سبھا کا ورثہ تھا اور بعد میں مغل محلات کی زینت بنا۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ اس حسن کو تدریج عام کریں گے اس سلسلے کی ہماری پہلی پیشکش ہے بیمثال شیمپو بالوں کی جملہ بیماریوں کا قدرتی اور موثر علاج ہے۔ بیمثال شیمپو بالوں کو لمبا، گھنا، نرم اور چمکدار کرتا ہے اور بال گرنے سے موثر طور پر روکتا ہے کوئی رنگ کلف نہیں مگر اس کا مسلسل استعمال بالوں کو سیاہ کردیتا ہے۔ بیمثال شیمپو سوپ میں مختلف جڑی بوٹیوں کی شمولیت کی وجہ سے ہوسکتا ہے اکثر لوگ میں وہ خوبصورتی نظر نہ آئے جو نہانے کے دوسرے صابنوں میں بظاہر نظر آتی ہے مگر جو فوائد اس کے استعمال سے حاصل ہوتے ہیں وہی اس صابن کی خوبصورتی ہے بیمثال شیمپو سوپ کی قیمت اسکی خوبیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس کا استعمال آپ کو مختلف اقسام کے بیش قیمت شیمپوؤں سے نجات دلادے گا۔ بیمثال شیمپو سوپ سے غسل بھی کیا جاسکتا ہے۔

لیکن

یاد رکھئے یہ بنیادی طور پر بالوں کا صابن ہے۔

"کیا بات ہے کرمو۔ آج اس طرف کیسے آنکلے؟ خیریت تو ہے؟"

"کیا بتاؤں سرکار۔ ایک عجیب معاملہ ہے" کرمو نے ہچکچاتے ہوئے کہا "پتا نہیں آپ کیا سمجھیں' میں تو پریشان ہو کر آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔"

"کیا معاملہ ہے' کچھ بتاؤ تو سہی؟"

"سرکار۔ اپنا جو فارم ہے نا' اس سے کچھ فاصلے پر آپ کو یاد ہوگا کہ ایک پرانی سی بیرک بنی ہوئی ہے۔ وہ بیرک بھی اپنی ہی زمینوں میں آتی ہے سرکار لیکن اس کے طرف آپ نے ابھی دھیان نہیں دیا ہے۔ آپ نے ایک بار اس کو تڑوا کر کچھ اور بنوانے کے لیے بھی کہا تھا لیکن وہ کام ابھی نہیں ہو سکا ہے۔"

"اوہو۔ کیا یہی سنانے کے لیے آئے ہو؟"

"نہیں سرکار۔ بات تو کچھ اور ہے۔ ہوا یہ کہ میں کبھی کبھی اس بیرک کی طرف چلا جاتا ہوں۔ میں یہ دیکھنے کے لیے جاتا ہوں سرکار کہ آج کل چوری چکاری کا زمانہ ہے۔ ڈاکو چور لوگ پولیس سے چھپ کر اس بیرک میں بھی رہ سکتے ہیں۔ اس کو اپنا اڈہ بنا سکتے ہیں۔ بس یہی سوچ کر اس طرف چلا جاتا ہوں۔ تو کل بھی میں یہی دیکھنے گیا تھا سرکار کہ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک لڑکی سوئی ہوئی ہے۔"

"لڑکی!" منیار کی دلچسپی اچانک بڑھ گئی تھی "کیسی لڑکی۔ کون ہے وہ؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا سرکار لیکن اتنا ضرور اندازہ ہے کہ کسی نے اس لڑکی کو وہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ بیرک کے دروازے پر یہ اتنا موٹا تالا بھی لگا ہوا ہے۔ وہ بہت ہی خوب صورت لڑکی ہے سرکار۔ بس میں سیدھا آپ کے پاس چلا آیا۔ میں نے سوچا کہ سب سے پہلے آپ کو بتا دوں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے" منیار اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا "اور خبردار۔ ابھی کسی کو بھی کچھ مت بتانا۔ میں تمہارے ساتھ خود چل رہا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

منیار نے ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔ کرمو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی اس بیرک کے پاس پہنچ گئی۔ منیار نے گاڑی روک دی۔ یہ بالکل ویران علاقہ تھا۔ اس کا ریسٹ ہاؤس بھی اس بیرک سے کچھ فاصلے پر تھا۔ بیرک کے احاطے کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ دونوں گاڑی سے اُتر کر بیرک کی طرف چل دیے۔ بیرک کے دروازے پر واقعی ایک موٹا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ جبکہ بیرک کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

"میں اس کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہوں" منیار نے کہا۔

کھڑکی کے پاس ہی لوہے کا ایک ڈرم تھا۔ منیار اس ڈرم پر چڑھ گیا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے اس نے اپنا چہرہ لگا دیا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ لڑکی اسے دکھائی دے گئی۔ وہ سامنے ہی گھاس پھوس کے بستر پر بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر منیار کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے اپنی نئی فلم کی ہیروئن ستارہ کو پہچان لیا تھا۔

○☆○

ذیشان بہت دیر سے شہر کی ایک لائبریری میں بیٹھا ہوا سر کھپا رہا تھا۔

اسے شہر کی پرانی عمارتوں کی تاریخ کی تلاش تھی۔ اس کی ریسرچ کے مطابق سہراب ولا بھی ایک قدیم عمارت تھی لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اسے کب تعمیر کیا گیا اور کن لوگوں نے اسے تعمیر کیا تھا اور اس میں کن لوگوں نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ یہ ایک دشوار کام تھا۔ اس کے لیے اسے پُرانے اخبارات کی تلاش تھی۔ شاید کوئی سراغ' کوئی نشان ایسا مل جائے جو اس راز سے پردہ اُٹھا سکے۔

اس نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ سہراب ولا میں کیا دیکھ کر آیا ہے۔ وہ قبریں' جن میں سے ایک سمندر کی تھی اور دوسری ستارہ کی۔ اور وہی سمندر اور ستارہ فلم انڈسٹری سے بھی منسلک تھے۔ ان میں سے ایک نے ایک بھیانک کہانی لکھی تھی اور دوسری ایک بھیانک کردار ادا کر رہی تھی اور یہ ایک عجیب پُراسرار صورتِ حال تھی۔ ذیشان لائبریری کو اس لیے کھنگال رہا تھا کہ شاید یہاں سے کوئی ایسا مواد مل جائے جو اس راز کا انکشاف کر سکے لیکن پرانے اخبارات میں بھی کچھ نہیں تھا۔ البتہ اسے انیس سو سینتیس کی چھپی ہوئی ایک کتاب مل گئی۔ جس کتاب کے ٹائٹل پر مصنف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس میں جو کہانیاں بھی ہیں وہ سب کی سب سچی ہیں اور ان سچی کہانیوں میں پہلی ہی کہانی ایسی تھی جس نے ذیشان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔

اس کہانی کا نام ہی سمندر اور ستارہ تھا۔ دراصل اس نام نے ذیشان کو متوجہ بھی کیا تھا۔ ذیشان نے جلدی جلدی ایک طرف بیٹھ کر وہ کہانی پڑھنی شروع کر دی۔ کہانی کے شروع میں مصنف نے ایک عدد نوٹ بھی تحریر کیا تھا۔ وہ نوٹ کچھ یوں تھا "قارئینِ کرام! یہ کہانی جو آپ پڑھنے والے ہیں۔ یہ حرف بہ حرف سچی ہے۔ میں نے اس کہانی کا مواد بڑی مشکلوں سے اکٹھا کیا ہے۔ نہ جانے کتنے پرانے لوگوں سے ملاقاتیں کی ہیں۔ تب جا کر اس کہانی کے تانے بانے ملانے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ اس کہانی کے دو مرکزی کردار ہیں۔ سمندر اور ستارہ۔ اور ان دونوں کی قبریں کراچی کی ایک پرانی کوٹھی کے پائیں باغ میں آج بھی موجود ہیں۔"

یہاں تک تو مصنف کی بات بالکل درست تھی۔ ذیشان خود اپنی آنکھوں سے ان قبروں کو دیکھ آیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کہانی پڑھنی شروع کر دی۔ کہانی کا لبِ لباب کچھ یوں تھا کہ اس شہر کی ایک تھیٹریکل کمپنی میں دو فنکار کام کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام سمندر تھا اور دوسری ستارہ تھی۔ دونوں ماموں بھانجی

تھے۔ سمندر کمپنی کے لیے کہانیاں لکھا کرتا اور ستارہ اداکاری کیا کرتی تھی۔ وہ ایک انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کا حسن دیکھنے کے قابل تھا۔ لوگ اس کھیل کو صرف ستارہ کی وجہ سے دیکھنے کے لیے آیا کرتے۔

پھر ایسا ہوا کہ نہ جانے کس کی نظر ان کی خوشیوں کو لگ گئی۔ ستارہ ایک شخص سے محبت کرنے لگی۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ کیونکہ خود ستارہ کا ماموں سمندر بھی یہی چاہتا تھا کہ ستارہ اپنے گھر کی ہو جائے لیکن وہ شخص بہت بے وفا ثابت ہوا۔ وہ ستارہ کو برباد کر کے اس سے الگ ہو گیا۔ ستارہ کا تڑپنا اس کے ماموں سے نہیں دیکھا گیا۔ اس نے ایک دن اس بے وفا شخص کو قتل کر دیا اور ستارہ کو یہ خبر سُنا دی۔ ستارہ کے دل میں اس بے وفا کی محبت ابھی تک برقرار تھی۔ اس نے اپنے ماموں سے تو کچھ نہیں کہا لیکن خود زہر کھا کر مر گئی۔ اس کی موت کے بعد اس کے ماموں کا بھی دنیا سے دل اُچاٹ ہو گیا اور کچھ دنوں کے بعد وہ بھی مر گیا۔ یہ تھی ان دونوں کی کہانی۔ مصنف کے دعوے کے مطابق ان دونوں کی قبریں سہراب ولا کے پائیں باغ میں بنائی گئی تھیں کیونکہ سہراب ولا کا مالک وہ شخص تھا جس کے تھیٹر میں یہ دونوں کام کیا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کو اتنا پسند کرتا تھا کہ اس نے ان دونوں کی قبریں اپنے پائیں باغ میں بنوا دی تھیں۔

اس کہانی کو پڑھ کر ذیشان پریشان ہو گیا تھا۔ سمندر اور ستارہ۔ ماموں اور بھانجی۔ شوبزنس سے تعلق، تو کیا عرفان کی فلم میں کام کرنے والے وہی دونوں تھے! اس کہانی نے جہاں بہت کچھ سُلجھا دیا تھا وہاں بہت سے معاملات اُلجھ بھی گئے تھے۔ کیا وہ دونوں زندہ انسان تھے؟ بلکہ دو روحیں تھیں جو بھٹکتی ہوئی ایک بار پھر شوبزنس میں داخل ہو گئی تھیں۔ اگر ایسا تھا تو پھر یہ کیسی عجیب بات تھی۔

وہ اسی دن پھر اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ ایک بہت بڑی خبر اس کے سینے میں موجود تھی لیکن وہ ابھی اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسٹوڈیو کے دوسرے لوگوں سے ان دونوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ شاید کوئی ایسا شخص مل جائے جو ان دونوں کو جانتا ہو۔ جس نے ان دونوں کو دیکھ رکھا ہو۔ اسٹوڈیو کے سارے لوگ بھی ذیشان کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور یہاں آتے ہی اسے یہ پتا چلا کہ عرفان خالد کی شوٹنگ رُکی ہوئی تھی۔ کیونکہ شاید ستارہ کی طبیعت خراب تھی۔

ذیشان فی الحال عرفان خالد کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسٹوڈیو کے ایک ایسے آدمی کو تلاش کر رہا تھا جسے اسٹوڈیو کا بھیدی کہا جاتا تھا۔ ذیشان کو اسٹوڈیو کے اندر کی زیادہ تر خبریں اس شخص سے ملتی تھیں۔ وہ میک اپ مین راجا بابو تھا۔ اسٹوڈیو کا بہت پرانا میک اپ مین۔ ذیشان نے اس کا ماہانہ وظیفہ باندھ رکھا تھا جس کے عوض اسے گرما گرم خبریں مل جاتی تھیں۔

راجا بابو اس وقت اسٹوڈیو کے اُجڑے ہوئے لان میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ ذیشان کو دیکھ کر وہ جلدی سے اس کے پاس آ گیا "خیر تو ہے ذیشان بابو۔ بہت دنوں کے بعد دکھائی دیے۔"

"تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں راجا!" ذیشان نے کہا "چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

دونوں اس کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہ راجا بابو کا اپنا مخصوص کمرا تھا۔ ذیشان اس سے اکثر یہیں ملا کرتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اصل موضوع پر آ گیا۔ "بھائی۔ راجا بابو۔ میں دراصل ستارہ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں لیکن اس کا کہیں پتا ہی نہیں ہے۔ کیا آج وہ اس طرف نہیں آئی؟"

"آج کیا وہ تو کئی دنوں سے غائب ہے ذیشان صاحب!" راجا بابو نے بتایا "بے چارہ عرفان خالد اپنا سر پیٹ رہا ہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔ کہاں چلی گئی؟"

"بس اچانک ہی غائب ہو گئی ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں ذیشان صاحب کہ وہ بہت پراسرار لڑکی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔ میرا اتنا تجربہ ہے۔ اتنے برس اس لائن میں گزار دیے ہیں لیکن میں نے ستارہ جیسا کوئی اور نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ آپ میری بات کا مذاق نہ اُڑائیں۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ایک دن تو اس نے مجھے پریشان کر دیا تھا جی۔ میں نے مارے ڈر کے یہ بات کسی کو نہیں بتائی ہے۔ خواہ مخواہ لوگ میرا مذاق اُڑائیں گے۔"

"نہیں، نہیں۔ بتاؤ، کیا بات ہے؟" ذیشان پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے جی کہ وہ اپنا میک اپ خود ہی کیا کرتی۔ اس نے کبھی مجھے ہاتھ لگانے کی اجازت بھی نہیں دی اور میک اپ بھی بہترین کر لیتی تھی۔ ایک دن ریکارڈنگ سے پہلے وہ میرے پاس آئی اور مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس وقت اس کا ماموں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ مجھ سے انور حسین کے بارے میں سوالات کر رہی تھی۔ انور حسین کا نام تو آپ نے سنا ہو گا۔ اب سے بیس سال پہلے اس شخص نے یہیں اسی اسٹوڈیو میں خودکشی کر لی تھی۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی تھی۔ وہ بہت کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کے پاس بہت دولت تھی۔ وہ اس زمانے میں بھی روزانہ سیکڑوں روپے خرچ کر دیا کرتا تھا۔ اسٹوڈیو کا شہزادہ کہلاتا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس کا شوق تھا کہ وہ انڈسٹری میں بامقصد اور اچھی فلمیں بنائے۔ بڑے موضوعات پر بڑی فلمیں بنانا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھول گیا تھا صاحب کہ یہاں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو اس کا ساتھ دیں گے اور ایسے بھی جن کی نگاہیں اس کی دولت کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ تو ہوا یہ صاحب کہ کچھ لوگوں نے مل کر اس کے ساتھ فراڈ کیا اور اس کی

ساری دولت ہتھیالی۔ وہ بے چارہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہوگیا۔ ایسے شاہ خرچ لوگ مفلسی برداشت نہیں کرسکتے۔ اس سے بھی برداشت نہیں ہوا اور اس نے اپنے اسٹوڈیو کے کمرے میں خودکشی کرلی۔"

"ہاں۔ میں نے بھی یہی کہانی سُنی ہے" ذیشان نے کہا "بلکہ میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ اس کا قتل ہوا تھا۔"

"ہاں جی۔ بہت سے لوگوں کا یہی خیال ہے لیکن میں تو وہی کہہ رہا ہوں جو پولیس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔ تو جی ستارہ اسی انور حسین کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ مجھے جو کچھ بھی معلوم تھا وہ میں نے اسے بتادیا پھر جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ انور حسین کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہے تو وہ عجیب انداز سے ہنستی ہوئی بولی "بات یہ ہے راجا بابو کہ آج میں نے انور حسین کو اپنی شوٹنگ دیکھنے کے لیے بُلایا ہے۔"

"کیا!" ذیشان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں جی۔ اس نے یہی کہا تھا اور میں اس کی بات سُن کر ہنس پڑا تھا۔ خود سوچیں مجھے کیسے یقین آسکتا تھا۔ لیکن....." راجا بابو بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔

"لیکن کیا؟" ذیشان نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اس نے غلط نہیں کہا تھا ذیشان صاحب۔ اس نے واقعی انور حسین کو ریکارڈنگ دیکھنے کے لیے بُلالیا تھا۔"

"کیا بکواس کررہے ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے انور حسین کو اس کے ساتھ دیکھا تھا صاحب" راجا بابو نے کہا "آپ نے دیکھا ہوگا کہ اسٹوڈیو کی چھت پر جانے کے لیے پچھلی طرف سیڑھیاں ہیں۔ جن پر کاٹھ کباڑ پھیلا رہتا ہے۔ اس طرف کوئی جایا نہیں کرتا۔ میں یوں ہی ٹہلتا ہوا اس طرف چلا گیا۔ اس وقت عرفان صاحب کی ریکارڈنگ پیک ہوچکی تھی کہ میں نے ان ہی سیڑھیوں پر ستارہ اور انور حسین کو دیکھ لیا۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ میرا انور حسین سے برسوں کا تعلق رہا ہے صاحب۔ میں اسے بھول نہیں سکتا۔ اس کا چہرا ابھی تک میری نگاہوں کے سامنے ہے اور وہ انور حسین ہی تھا۔ سو فیصد انور حسین اور ستارہ اس کے ساتھ تھی۔

○☆○

پورے گھر میں عجیب طرح کی وحشت پھیلی ہوئی تھی۔

بابر نیار اور اصغر نیار دونوں ایک دوسرے کے سامنے کشیدگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بابر نیار، اصغر نیار کا باپ تھا۔ کسی زمانے میں اس کا بھی تعلق فلمی دنیا سے تھا۔ چھوٹے موٹے کردار کیا کرتا تھا۔ انتہائی درجے کا چرب زبان واقع ہوا تھا۔ اصغر نیار کی ساری دولت دراصل بابر نیار ہی کی مرہونِ منت تھی اور ابھی بھی اپنے بیٹے کی جائدادوں اور اس کے کاروبار پر بابر ہی کا عمل دخل تھا۔ بظاہر وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کی نگاہیں اپنے بیٹے کی حرکتوں کی نگرانی کیا کرتی تھیں۔

اپنے زمانے میں وہ ایک عیاش صفت انسان رہا تھا۔ اس کی تصدیق اس کے پچھلے کارناموں اور اس کے چہرے سے ہوتی تھی۔ کثرتِ مے نوشی کا اظہار اس کی آنکھوں سے ہوا کرتا۔ اصغر نیار اپنے باپ کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ اس وقت بھی دونوں باپ بیٹے ایک مسئلے پر اُلجھے ہوئے تھے۔

"میں کہتا ہوں کہ اسے یہاں اُٹھا کر لانے کی کیا ضرورت تھی؟" بابر نیار نے کہا "اگر تم نے اس کو قید سے چھٹکارا دلوا ہی دیا تھا تو اس کو اس کے گھر بھیج دیتے۔"

"بابا۔ یہ تو دیکھو کہ ستارہ میری فلم کی ہیروئن ہے۔ اس کو یہاں تک لانے میں بہت سی مصلحتیں بھی تو ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ آگے جاکر وہ فلم انڈسٹری کے لیے ایسا انمول ہیرا ثابت ہوگی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ میں اس پر احسان کرکے کم از کم پانچ سال کے لیے اسے اپنا پابند کرنا چاہتا ہوں۔ خود سوچو، جب وہ پانچ برسوں تک صرف ہماری ہی فلموں میں کام کرتی رہے گی تو بس اپنی تو چاندی ہی چاندی ہوجائے گی۔"

بابر نیار کے لیے معاملے کا یہ پہلو ہی قابلِ غور تھا۔ اس لیے وہ سوچ میں پڑگیا پھر کچھ دیر بعد اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا "کیا پتا چلا اسے کس نے اغوا کیا تھا؟"

"نہیں" اصغر نے انکار میں اپنی گردن ہلادی۔ "وہ کچھ نہیں بتارہی۔ بس ہنس دیتی ہے۔ وہ ایک عجیب لڑکی ہے بابا۔ اسے جیسے کسی بات کی پروا ہی نہیں ہے۔"

"تو اب کیا سوچا ہے تم نے؟"

"سوچنا کیا ہے۔ فلم کی ریکارڈنگ رکی ہوئی ہے۔ اب پھر شروع ہوجائے گی۔ میں نے عرفان خالد کو بلالیا ہے۔ وہ ابھی آتا ہی ہوگا لیکن میں نے ابھی اسے یہ نہیں بتایا کہ میں نے ستارہ کو تلاش کرلیا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ستارہ کو یہاں دیکھ کر حیران رہ جائے۔"

"چل، میں بھی اسے دیکھتا ہوں" بابر نے بھی کہا "میں نے بھی اس کی اداکاری کی بہت تعریف سُنی ہے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ ستارہ واقعی آسمان کا ستارہ ہے یا زمین کا۔"

ستارہ کے لیے ایک سجا سجایا کمرا مخصوص کردیا گیا تھا۔ اصغر نیار جب کرمو کے ساتھ بیرک میں پہنچا اور اس نے ستارہ کو وہاں قید میں دیکھا تو کسی طرح بیرک کے دروازے پر لگا ہوا تالا کھول کر اندر پہنچ گیا تھا۔ جہاں ستارہ گھاس پھونس کے بستر پر بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے سامنے پہنچ کر اصغر نیار کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ یہ اس کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ورنہ لڑکیوں کے لیے تو اس کا وجود اس عقاب کی طرح تھا جو ذرا سی دیر

میں اپنے پنجوں میں ننھے پرندوں کو گرفتار کرلیتا ہے۔

ستارہ بلاشبہ بہت حسین تھی۔ ایسا حسن تھا جو اس کو جلا کر خاکستر کرسکتا تھا۔ اس کے باوجود اصغر اس کے سامنے پہنچ کر سٹ پٹا گیا تھا۔ اسے ستارہ کی پُراسرار مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں کی چمک سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں اصغر منیار ہوں" اصغر نے اپنا تعارف کروایا "تم جس فلم میں کام کررہی ہو' میں اس کا فنانسر ہوں۔"

"اچھا!" ستارہ نے بے پروائی سے اپنی گردن ہلادی "تو پھر میں کیا کروں؟"

اس کی یہ بات اصغر کے لیے بالکل غیر متوقع تھی "میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں شاید کسی نے یہاں قید کررکھا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"ٹھیک ہے چلو" ستارہ ایک انگڑائی لیتی ہوئی کھڑی ہوگئی "ویسے میرے لیے سب برابر ہے۔ چاہے قید میں رہوں یا قید سے باہر رہوں۔"

اس طرح اصغر اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ پہلے اس نے ستارہ کو کہیں اور لے جانے کے لیے شاید سوچا بھی ہوگا لیکن ستارہ کی بے نیازی نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم کردی۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو اپنے فنانسر کو دیکھ کر آگے پیچھے ہونے لگتی لیکن ستارہ کو جیسے اس کی پروا ہی نہیں تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اسے قید کرنے والا کون ہے اور کیوں قید کیا گیا ہے۔ اصغر نے جب دریافت کیا تو وہ ہنس کر خاموش ہوگئی۔

اصغر اپنے باپ بابر منیار کو اس کمرے میں لے آیا جہاں ستارہ کو رکھا گیا تھا۔ وہ اس وقت مسہری پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ان دونوں کی آہٹ پر بھی اس نے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

"میرا خیال ہے بابا کہ یہ سو رہی ہے" اصغر نے بابر سے کہا۔

بابر اس وقت سخت خوف زدہ معلوم ہو رہا تھا "بیٹے!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا "یہ تو کس کو اُٹھا کر لے آیا ہے؟"

"کیا ہوا بابا! خیر تو ہے؟" اصغر نے گھبرا کر پوچھا۔

"مجھے تو اس لڑکی سے ڈر لگ رہا ہے۔ تو نے بو محسوس کی؟" بابر نے زور زور سے سانسیں لیں۔

"ہاں بابا۔ ایک خاص قسم کی بو آتو رہی ہے" اصغر نے کہا "میں تو اس بو کو شروع سے محسوس کررہا ہوں۔"

"یہ کافور کی بو ہے بیٹے۔ موت کی بو ہے" بابر کی آواز میں اور بھی لرزش آگئی تھی "آ۔ یہاں سے چلتے ہیں۔ اور کسی طرح اسے واپس بھیج دے۔ اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ واپس بھیج دے اس کو..."

بابر خوف زدہ قدموں سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اصغر حیران کھڑا رہ گیا تھا پھر ستارہ کے ہنسنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ستارہ عجیب سے انداز سے ہنس رہی تھی "یہ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا "تم لوگ مجھ سے اتنا خوفزدہ کیوں ہو؟"

"نہیں تو" اصغر نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تم سے کیوں خوف زدہ ہونے لگے۔"

"نہیں۔ تم سب مجھ سے ڈر رہے ہو" ستارہ نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ میں ایسی کون سی بات ہوگئی ہے' جس نے مجھے اغوا کیا تھا۔ وہ بھی بہت ڈرا ہوا تھا اور تم جو مجھے اس قید سے نکال کرلائے ہو' تم بھی ڈرے ہوئے ہو۔ اور اب تمہارے ڈیڈی بھی مجھ سے ڈر رہے ہیں۔ آخر کیوں! کیا میں انسان نہیں ہوں! تم لوگ مجھے کیا سمجھتے ہو؟ اگر تم لوگ مجھے کچھ اور سمجھتے ہو تو یہ لو' میں اپنا ہاتھ آگے بڑھا رہی ہوں' مجھے چھو کر دیکھ لو۔ پاگل ہوگئے ہو تم سب۔ نہ جانے کس نے میرے لیے تمہارے دلوں میں خوف پیدا کردیا ہے۔"

"نہیں' نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے" اصغر جلدی سے بولا "ابا تو اس لیے ڈر گئے کہ تمہارے جسم سے کافور کی بو آرہی ہے۔"

"ہاں یہ دیکھو' یہ رہا وہ کافور!" ستارہ نے اپنے دوپٹے سے ایک گرہ کھول کر کافور کا ایک ٹکڑا اصغر کے سامنے کردیا "یہ ہے وہ کافور۔ تم کو شاید یہ اندازہ نہیں کہ مجھے کتنی خراب جگہ قید کیا گیا تھا۔ بدبو سے میرا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ اس وقت وہاں ایک طاق پر کافور کا یہ ٹکڑا ہی رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کی بو وہاں موجود بدبو سے لاکھ گنا بہتر تھی۔ سمجھے' اس لیے میرے جسم سے کافور کی بو آرہی ہے۔"

"اوہ" اصغر نے ایک گہری سانس لی "تم نے تو میری الجھن دور کردی۔ چلو اب یہ بھی بتادو کہ تمہیں کس نے اغوا کیا تھا اور کیوں اغوا کیا تھا؟"

"نہیں۔ یہ میں نہیں بتاؤں گی" ستارہ نے اپنی گردن جھٹکی "کیونکہ مجھے اغوا کرنے والا میرا ذاتی دشمن ہے۔ میں خود اپنے طور پر اس سے اپنی توہین کا بدلہ لوں گی۔"

اصغر مسکرادیا۔ اس کا سارا وہم دور ہوگیا تھا۔ ستارہ اب ایک لڑکی' ایک عورت کی طرح باتیں کررہی تھی۔ اس کا لہجہ ایک نفرت یا محبت کرنے والے انسان کا لہجہ تھا۔ وہ اپنے دشمن کے خلاف غصے میں تھی اور غصہ سراسر انسانی جبلّت تھا۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" اصغر نے پوچھا "تم کیا کروگی! عرفان خالد تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہے۔"

"اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے" ستارہ نے کہا "میں اگر ابھی تک فلم کی کاسٹ میں ہوں تو یہ فلم ضرور مکمل کرواؤں گی اور فی الحال میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ کیونکہ میرے ماموں کا کوئی پتا نہیں ہے۔ نہ جانے وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ میں ان کے بغیر اکیلے گھر میں کیسے رہ سکتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" اصغر مسکرادیا۔ اب اس کی مسکراہٹ

میں مکاری شامل ہوگئی تھی "تم جب تک جی چاہے یہاں رہ سکتی ہو اور جہاں تک ابا کا معاملہ ہے تو تم ان کی طرف سے پریشان مت ہو۔ میں تمہاری طرف سے ان کی غلط فہمی دور کردوں گا۔"

"اور تمہاری فلم؟" ستارہ نے پوچھا۔

"دو چار دن اگر اس کی شوٹنگ نہیں ہوئی تو کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی" اصغر نے کہا "آخر میں ہی اس کا فنانسر ہوں۔ اتنا نقصان تمہارے لیے تو برداشت کرہی سکتا ہوں۔"

○☆○

وہ ایک نیم روشن سا کمرا تھا۔

اس کمرے میں صرف ایک ایسا بلب روشن تھا جس کو زرد رنگ کے ایک کاغذ سے لپیٹ دیا گیا تھا۔ اس لیے اس کی روشنی پورے کمرے کو عجیب بوجھل سا کررہی تھی۔ اس کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ ایک تخت تھا۔ جس پر سمندر بیٹھا تھا۔ دوسری دیوار کے پاس ایسا دُھواں پھیلا ہوا تھا جو اس آدمی کے اردگرد منڈلا رہا تھا جو اس دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس آدمی کے جسم پر سفید لباس تھا۔

اچانک اس کمرے میں ہلکی ہلکی آوازیں گونج اُٹھیں۔ یہ آوازیں گیدڑوں اور کتّوں کی تھیں جو ایک ساتھ غرا رہے تھے لیکن ان کی غراہٹیں زیادہ بلند نہیں ہوپارہی تھیں۔ ان آوازوں کے ساتھ ہی دیوار کے پاس کھڑے ہوئے سفید لباس میں ملبوس سائے نے اچانک اپنا سفید لبادہ اوپر سے ہٹادیا۔ اب اس کا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ جو کچھ پھولا ہوا تھا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو لہرایا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کے ناخن بھی بہت لمبے لمبے تھے۔ غراہٹوں کی آوازیں بڑھتی جارہی تھیں۔ اس سائے نے اچانک اپنے دائیں پنجوں کے طویل اور تیز دھار ناخنوں سے اپنا پیٹ تھام لیا۔ اس نے اپنے پیٹ کی جلد کو ناخنوں کی گرفت میں لے رکھا تھا۔

سمندر نے یہ دیکھ کر اپنا سرہلایا اور زور سے بولا "ٹھیک ہے۔ بہت اچھے۔ اب جو میں نے کہا ہے اس طرح کرو۔"

سائے نے اپنے ناخنوں کا دباؤ اپنے پیٹ پر بڑھادیا۔ اس کے خنجر جیسے ناخن آہستہ آہستہ اس کے پیٹ میں دھنستے جارہے تھے پھر ناخن اس کے پیٹ میں پوری طرح پیوست ہوگئے۔ پانچ عدد ناخنوں نے اس کے پیٹ میں پانچ سوراخ بنادیے تھے۔ جن سے خون اُبل رہا تھا پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا پورا پیٹ پھاڑ دیا۔ یہ ایک بہت بھیانک اور خوف زدہ کردینے والا منظر تھا لیکن سمندر پر اس منظر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بہت دلچسپی سے اس سائے کے پھٹے ہوئے پیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جس سے خون کے ساتھ ساتھ عجیب عجیب کیڑے مکوڑے بھی لہراتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ ایک بڑی سی چھپکلی بھی پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر نکل کر پٹ سے فرش پر گر پڑی تھی۔

سمندر یہ سب دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سایا شخص اب فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے فرش پر گرے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے پیٹ میں بھرنا شروع کردیا۔ یہ عمل دو تین منٹ تک جاری رہا تھا۔ پھر اس نے اب دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو دبا کر ہلانا شروع کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کا پیٹ اپنی اصل صورت میں آگیا۔ اب کوئی یہ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند لمحوں پہلے ہی پیٹ چاک ہوچکا تھا۔

سمندر تخت سے اُتر کر اس سائے کے پاس آگیا۔ اس نے اس سائے کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا "بہت اچھے۔ اب یہ بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میں روحوں کی دنیا سے آیا ہوں" سائے نے کھوکھلی سی آواز میں کہا۔

"کیوں آئے ہو؟"

"انتقام لینے۔ میں سزا دینا چاہتا ہوں" اس سائے نے جواب دیا۔

"کس کو سزا دینا چاہتے ہو؟"

"اس کو جو میرے راستے میں آیا تھا۔ جس کے لیے میں برسوں سے بھٹک رہا ہوں۔ جس نے میری زندگی برباد کردی تھی۔ جو میرا دشمن تھا۔ میں اس کے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ اس کی روح ہمیشہ کے لیے تڑپتی رہے گی" سائے نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ اس کا قہقہہ اتنا بلند اور بھیانک تھا کہ خود سمندر نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔

○☆○

بابر منیار کو اپنے بیٹے پر بہت غصہ آرہا تھا۔

اس نے اصغر کو سمجھایا بھی تھا کہ وہ اس منحوس اور خطرناک لڑکی کو گھر سے نکال دے لیکن اصغر نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ بابر کو نہ جانے کیوں اس لڑکی کو دیکھ کر خوف محسوس ہوا تھا۔ ایسا خوف جسے وہ کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ کوئی خیال اس کے ذہن میں در آیا تھا۔ اسے کچھ یاد آنے لگا تھا لیکن وہ اپنے ذہن کا تجزیہ بھی نہیں کرپارہا تھا کہ اسے کیا یاد آرہا ہے اور اس کے ساتھ کافور کی خوشبو نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی۔ وہ شروع ہی سے ایک وہمی مزاج انسان واقع ہوا تھا۔ اس لیے اس کی کوشش تھی کہ وہ لڑکی اس کے گھر سے چلی جائے۔ وہ اصغر سے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنی فلم سے نکال دے لیکن اصغر کے تیور کچھ اور تھے۔ وہ شاید اس لڑکی پر دل وجان سے عاشق ہوگیا تھا۔ اس لیے اس نے بابر کے منع کرنے کے باوجود اس لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی اور اب بابر میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی مخالفت مول لے سکتا۔

وہ رات اس کے لیے بہت پریشان کن ثابت ہورہی تھی۔

خوف کے ساتھ ساتھ غصے نے بھی اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے پھر اسے عرفان خالد کا خیال آگیا۔ شاید وہی ایک ایسا شخص تھا جو اس لڑکی کو اس مکان سے دور لے جاسکتا تھا۔ عرفان اس فلم کا ہدایت کار تھا۔ اس کے پاس پچاس بہانے ہوسکتے تھے۔ بابر نیار نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ صبح ہوتے ہی عرفان سے بات کرے گا۔ اس فیصلے نے اسے بڑی حد تک مطمئن کردیا تھا۔ صرف ایک ہی رات کی تو بات تھی۔

پھر نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے اسے بیدار کردیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کمرے کا دروازہ بھی بند کرکے سویا تھا اور اس نے رات کو جلنے والا بلب بھی بجھادیا تھا لیکن اس وقت ہلکی نیلی روشنی والا بلب بھی جل رہا تھا اور کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

اور کمرے کے درمیان اس کی مسہری سے چند قدم کے فاصلے پر ایک سفید خاکہ سا کھڑا ہوا تھا۔ جس کے اردگرد دُھواں سا منڈلا رہا تھا۔ بابر نیار کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ جیسے جیسے اس سائے کے خدّوخال واضح ہوتے چلے گئے ویسے ویسے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی چلی گئیں۔ اس نے اس سائے کو پہچان لیا تھا۔ وہ انور حسین تھا۔ جو کبھی فلم انڈسٹری میں ہوا کرتا تھا لیکن نہیں انور حسین تو بہت پہلے مرچکا تھا۔ اب سے بیس سال پہلے۔ بابر نے خود اس کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی دی تھی پھر وہ کیسے زندہ ہوگیا تھا!

بابر خوف اور دہشت سے چیخنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ انور حسین کی نگاہیں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب انداز سے مسکرا رہا تھا پھر اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ بابر نیار نے دیکھا کہ ستارہ اسی دھوئیں کے درمیان آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر انور حسین کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا پھر دونوں بابر کی طرف اشارے کرکے کچھ کہنے لگے۔ بابر ان کی آوازیں تو سُن رہا تھا لیکن گفتگو سمجھ میں نہیں آرہی تھی یا شاید اس وقت اس کا ذہن اتنا ماؤف ہورہا تھا کہ وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ اچانک انور حسین نے اپنے منہ میں ہاتھ ڈالا اور ایک مچلتا ہوا سانپ باہر نکال لیا۔ سانپ کی پھنکار بابر نیار کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ انور حسین نے اس سانپ کو اس کی گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم کو یہ معلوم ہے یہ کون ہے؟" حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بار بابر نیار کو اس کا یہ جملہ سمجھ میں آگیا تھا۔

"ہاں" ستارہ ہنستی ہوئی بولی "یہ تمہارا دوست ہے۔ یہ تمہارے منہ میں رہتا ہے۔"

"ہاں۔ اور جانتی ہو میرا دوست کیا کہہ رہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس ڈھیر سا زہر جمع ہوگیا ہے۔ یہ اپنا زہر کسی کے بدن میں اُتارنا چاہتا ہے۔"

ستارہ نے بابر کی طرف اشارہ کیا "وہ دیکھو۔ تمہارے دوست کا شکار سامنے ہے۔"

دونوں عجیب انداز سے ہنس پڑے۔ انور حسین سانپ کو لیے ہوئے دھیرے دھیرے بابر کے بستر کی طرف بڑھنے لگا۔ بابر نے مچلنے کی کوشش کی۔ چیخنا چاہا لیکن اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو سویرا ہوچکا تھا۔ کھڑکی سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی گردن اُٹھائی۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی دروازہ بھی اندر سے اسی طرح بند تھا جس طرح اس نے رات کو بند کیا تھا تو پھر وہ سب کیا تھا! کیا اس نے کوئی خواب دیکھا تھا؟ لیکن خواب اتنا حقیقی کس طرح ہوسکتا ہے؟

O☆O

خالد عرفان بہت پریشان تھا۔

اسٹوڈیو میں طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ یہ افواہیں ستارہ کے حوالے سے تھیں۔ اس وقت وہ اور ذیشان اسی کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے" عرفان خالد نے ایک گہری سانس لی "وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی لڑکی ہے۔ کھانا کھاتی ہے، پانی پیتی ہے۔"

اس کے باوجود اس کا پس منظر وہی ہے جو تمہیں بتا چکا ہوں۔" ذیشان نے کہا "اب سے برسوں پہلے سمندر اور ستارہ نامی دو تھیٹر کے فنکار تھے۔ جنہوں نے پُراسرار حالات میں خودکشی کرلی تھی۔ میں نے خود سہراب ولا میں ان دونوں کی قبریں دیکھی ہیں اور بقول تمہارے وہ دونوں وہیں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ تم ان دونوں کے بیک گراؤنڈ سے بھی واقف نہیں ہو کہ وہ کون تھے۔ پہلے انہوں نے کہاں کام کیا، کہاں رہتے تھے؟ اس کے علاوہ تم راجا بابو کے بیان کو بھی جھٹلا نہیں سکتے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ستارہ اور انور حسین کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔ وہ انور حسین جو اب سے بیس سال پہلے مرچکا ہے۔"

"خدا کی پناہ! تو کیا ستارہ کوئی انسان نہیں ہے؟" عرفان بوکھلایا ہوا تھا "اگر ایسا ہے تو پھر کتنی عجیب بات ہے کہ میری فلم میں ایک روح کام کررہی ہے اور فلم بھی اسی موضوع پر ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دنیائے فلم کا یہ پہلا موقع ہوگا کہ کسی روح نے اداکاری کی ہوگی" ذیشان مسکرایا "اگر یہ فلم بن گئی تو پوری دنیا

میں ایک دھوم مچ جائے گی۔ کون ایسی فلم کو دیکھنا نہیں چاہے گا جس کی ہیروئن ایک روح ہو۔"

"مذاق مت کرو یار' میں بہت پریشان ہوں اور ہاں' آج صبح اصغر نیار مجھ سے ملا تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ وہی ہماری فلم میں پیسے لگا رہا ہے۔ اس نے ستارہ کو تلاش کرلیا تھا۔ اسے کہیں اغوا کرکے رکھا گیا تھا۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" ذیشان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "یہ تو میرے لیے بالکل نئی خبر ہے۔ اگر وہ لڑکی اغوا ہوسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کوئی روح نہیں بلکہ ایک عام لڑکی ہے۔"

"تم سُنتے تو رہو۔ اصغر نیار کو ستارہ اپنے فارم ہاؤس کے قریب ایک بیرک میں ملی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ جہاں اس کا باپ بابر نیار موجود تھا۔ اس لڑکی کو دیکھتے ہی بابر نیار کی حالت خراب ہوگئی۔ اس نے اصغر سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو فوراً گھر سے باہر نکال دے لیکن اصغر نے اس کی بات نہیں مانی کیونکہ وہ ایک حسن پرست شخص ہے اور ستارہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی ہے۔ اصغر کا خیال تھا کہ وہ ستارہ کو دوسرے دن اپنے ایک ایسے فلیٹ میں منتقل کردے گا جس کے بارے میں اس کا باپ کچھ نہیں جانتا لیکن اسی رات بابر نیار نے اپنے کمرے میں جو کچھ دیکھا اس نے بابر کو بیمار ڈال دیا ہے۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے جو کہانی سُنائی' وہ بہت حیرت انگیز ہے۔"

"وہ کیا!" ذیشان نے چونک کر پوچھا۔

"اس نے اپنے کمرے میں رات کو انور حسین اور ستارہ کو دیکھا تھا" عرفان نے بتایا "یہ ساری کہانی خود اصغر نے مجھے سنائی ہے۔ بابر نے دیکھا کہ انور حسین اس کے کمرے میں موجود تھا اور اس کے پھٹے ہوئے پیٹ سے کیڑے مکوڑے نکل رہے تھے پھر ستارہ بھی اس کے پاس آگئی۔ انور حسین نے اپنے منہ سے ایک سانپ نکالا اور بابر کی طرف بڑھنے لگا لیکن اسی دوران بابر وحشت زدہ ہوکر بے ہوش ہوچکا تھا۔"

"یہ تو عجیب کہانی ہے" ذیشان نے اپنے سر کو جھٹکا دیا "انور حسین یہاں بھی سامنے آگیا۔ اچھا ایک بات بتاؤ' کیا تمہارے پاس اس کہانی کا مسودہ ہے جس پر تم فلم بنا رہے ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ میرے پاس پورا اسکرپٹ موجود ہے" عرفان نے کہا "کیوں؟"

"کیا تم مجھے وہ کہانی پڑھنے کے لیے دے سکتے ہو۔ یقین رکھو وہ کہانی لیک آؤٹ نہیں ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ کہانی ہمیں صحیح نتیجے پر پہنچادے۔ یہ سب میں اس لیے کررہا ہوں کہ تمہیں نقصان سے بچاسکوں۔ فرض کرو اگر کسی اخبار میں یہ خبر آجاتی ہے کہ عرفان خالد کی فلم میں کام کرنے والی ستارہ دراصل ایک روح ہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ تمہاری یہ فلم مکمل ہی نہیں ہوگی۔ کیمرہ مین سے لے کر انجینئر تک فلور چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ معاملہ یہاں تک پہنچے ہمیں اس بھید کا سُراغ لگالینا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ' وہ لڑکی اب کہاں ہے؟ اصغر نے اسے اپنے ساتھ تو نہیں رکھا ہوگا؟"

"یہی تو کمال ہے کہ یہ سب ہونے کے باوجود اصغر نے اسے اپنے فلیٹ میں جگہ دے دی ہے۔ نہ جانے اس نے ایسا کیا جادو کردیا ہے کہ اصغر پوری طرح اس کی گرفت میں آچکا ہے۔ وہ اس کے خلاف کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کے باپ کو وہم کی بیماری ہوگئی ہے۔"

"اچھا چلو' تم مجھے وہ اسکرپٹ دے دو" ذیشان نے کہا' پھر کچھ سوچ کر بولا "اور ہاں وہ گلنار کا کیا مسئلہ ہے؟"

"وہ بھی ایک عجیب صورتِ حال ہے" عرفان نے ایک گہری سانس لی "میں خود اسے دیکھنے گیا تھا۔ اب اس کی حالت بہت بہتر ہوچکی ہے اور وہ بھی ستارہ کی شکار ہے۔ اس کی کہانی بھی بہت عجیب ہے لیکن وہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ تمہارا تعلق ایک اخبار سے ہے۔ تم نے اگر اس کے بارے میں ذرا سا بھی کچھ شائع کردیا تو اس کا مستقبل تباہ ہوجائے گا۔"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا" ذیشان نے اسے یقین دلادیا "تم مجھے ضرور بتاؤ۔ کیونکہ میں اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ تم مجھ پر یقین کرسکتے ہو۔"

"صورتِ حال یہ ہے کہ گلنار ہی نے اس کو اغوا کروایا تھا" عرفان نے بتایا۔

"کیا!" ذیشان پھر حیران رہ گیا تھا "یہ آج تم مجھے کیسی کیسی خبریں سُنا رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ گلنار نے اپنے اس جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ستارہ کسی طرح کچھ دنوں کے لیے غائب ہوجائے تاکہ یہ فلم اس کو مل جائے۔ کیونکہ اس کی کئی فلمیں فلاپ ہوچکی ہیں لیکن ہوا یہ کہ خود گلنار اس کو اغوا کرواکے اتنی وحشت زدہ ہوچکی ہے کہ اس کو ڈاکٹروں کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے ستارہ کو چھپکلیاں کھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بس اس کے بعد سے اس کی حالت خراب ہوگئی۔"

"کمال ہے" ذیشان بڑبڑایا "اب ان سب واقعات کو کیا نام دیا جائے؟"

"لگتا ہے کہ ستارہ کوئی بدروح ہے" عرفان نے کہا "مجھے ایسے حالات سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اسی لیے میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ گلنار نے ستارہ کو کس طرح اغوا کروایا تھا۔ میرا مطلب ہے اس نے کسی کی مدد تو ضرور لی ہوگی؟" ذیشان نے پوچھا۔

"ہاں۔ اس نے دلدار کی مدد حاصل کی تھی" عرفان نے بتایا "تم تو جانتے ہو کہ دلدار کچھ اسی قسم کا آدمی ہے۔ اس کے لیے

اس قسم کی وارداتیں مشکل نہیں ہیں۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں لیکن ستارہ اگر واقعی کوئی بدروح ہی ہے تو پھر دلدار نے اسے اغوا کیسے کرلیا اور یہ بھید دلدار ہی بتا سکتا ہے۔ کیا تم مجھے اس سے ملوا سکتے ہو؟"

"نہیں۔ کیونکہ کئی دنوں سے دلدار کا کوئی پتا نہیں ہے۔ وہ کہیں غائب ہوچکا ہے۔" عرفان نے بتایا۔

○☆○

وہ ایک ویران علاقہ تھا جہاں بابر منیار کی گاڑی رُکی تھی۔

وہاں اِکّا دُکّا مکانات بنے ہوئے تھے لیکن ہر طرف اس طرح کی خاموشی تھی جیسے کوئی رہتا نہ ہو۔ رات ہوچکی تھی لیکن کسی مکان میں روشنی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بابر کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ گاڑی وہی شخص چلا رہا تھا۔ وہ ایک بھاری جبڑے اور سخت گیر چہرے والا انسان تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار تھے۔

"میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ سب تمہارا وہم ہے" اس آدمی نے بابر سے کہا "ہم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرنے آئے ہیں۔"

"نہیں حمید بھائی" بابر دھیرے سے بولا "یہ وہم ہی سہی لیکن ہمیں اپنا اطمینان کرلینا چاہیے۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں آج کل کتنا پریشان ہوں۔"

"اسی لیے میں بھی تمہارے ساتھ آگیا ہوں" حمید نے یہ کہتے ہوئے چاروں طرف نگاہ دوڑائی "کمال ہے۔ یہ علاقہ ابھی تک ویران ہے۔"

دونوں گاڑی سے نیچے آگئے۔ حمید نے گاڑی کی ڈکی سے ایک پھاوڑا نکال لیا تھا۔ دونوں تیز قدموں ایک طرف بڑھ گئے۔ اِکّا دُکّا مکانات کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اندھیرے کے باوجود ان کی رفتار اچھی خاصی تھی۔

"کیا تمہیں وہ جگہ یاد ہے؟" حمید نے چلتے چلتے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک بہت بڑا ٹیلہ آئے گا۔ جس کے پاس ایک درخت تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ درخت اب نہ رہا ہو لیکن وہ ٹیلہ تو ضرور ہوگا" بابر نے جواب دیا۔

دونوں سفر کرتے ہوئے بالآخر ایک اونچے سے ٹیلے کے پاس پہنچ گئے۔ یہی ان کی مطلوبہ جگہ تھی۔ "وہ دیکھو!" بابر نے اشارہ کیا "وہ درخت بھی ہے۔"

اس ٹیلے کے پاس ہی ایک اونچا سا درخت تھا۔ دونوں اس درخت کے پاس پہنچ گئے۔ حمید نے پھاوڑا سنبھال لیا تھا۔ اس نے زمین کھودنی شروع کردی اور ٹھیک اسی وقت ہر طرف روشنیاں جل اُٹھیں۔ یہ روشنیاں چاروں طرف سے اُمڈ آئی تھیں۔ دونوں بوکھلا کر کھڑے رہ گئے۔ روشنیوں نے ان کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف سے پولیس والے اُمڈ پڑے اور ان لوگوں کو گھیر لیا گیا۔

"خود کو قانون کے حوالے کردو" پولیس کا ایک آفیسر آگے آتے ہوئے بولا "تمہارا کھیل ختم ہوچکا ہے۔"

بابر منیار نے بے بس ہوکر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ان پولیس والوں کے ساتھ دلدار بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھادیا۔ اس کے ساتھی حمید کو پہلے ہی گرفتار کرلیا گیا تھا۔

○☆○

وہ بہت ہی ہنگامی پریس کانفرنس تھی۔

اس میں پولیس کے اعلیٰ افسران کے ساتھ ساتھ ستارہ، عرفان خالد، اصغر منیار اور دلدار بھی موجود تھے۔ پولیس کا ایک آفیسر شاہنواز خان اخبار والوں کو صورتِ حال سے آگاہ کررہا تھا۔

"یہ بہت عجیب کہانی ہے" اس نے کہا "یہ لالچ کی کہانی ہے۔ اور ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ انسان اپنی ہوس کی خاطر کتنا نیچے گر سکتا ہے۔ میں گرچہ ایک پولیس آفیسر ہوں لیکن میں خود بھی اس کہانی کا ایک کردار ہوں کیونکہ انور حسین میرا بھی دوست تھا۔

اب سے بیس سال پہلے فلم انڈسٹری میں انور حسین نامی ایک آدمی داخل ہوا۔ جو دوسروں سے بہت مختلف تھا۔ کیونکہ وہ ایک پڑھا لکھا اور بے پناہ دولت مند شخص تھا۔ بس یوں ہی تفریحاً فلم انڈسٹری کی طرف آگیا تھا۔ میں بھی اس زمانے میں انڈسٹری کا چکر لگایا کرتا تھا۔ اس لیے انور حسین سے میری جان پہچان ہوگئی۔ انور حسین انڈسٹری میں پرنس کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کی بیوی بھی تھی اور دو بچے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ اس وقت وہ دونوں بہت چھوٹے تھے۔ بابر منیار اس وقت ایک معمولی درجے کا انسان تھا۔ ایکسٹرا کے طور پر کام کیا کرتا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک سازش کے تحت انور حسین سے دوستی کرلی۔ اس کا ارادہ انور حسین کی دولت حاصل کرنے کا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوگیا۔"

"وہ کس طرح جناب؟" کسی نے سوال کیا۔

"وہی بتا رہا ہوں" شاہنواز نے کہا "انور حسین کو فلم بنانے کا جھانسا دیا گیا۔ ایک فلمی ڈائریکٹر بھی اس کے ساتھ شامل تھا۔ جس کا اب انتقال ہوچکا ہے۔ انور حسین چونکہ اس ڈائریکٹر کی ساکھ سے واقف تھا اس لیے اس نے اس پر بھروسا کرلیا اور اپنی پوری رقم تقریباً آٹھ لاکھ روپے اس کے حوالے کردی۔ آپ اس زمانے کے آٹھ لاکھ کا تصور کرسکتے ہیں۔ بہت بڑی رقم تھی۔ رقم آنے کے بعد بابر منیار نے انور حسین کو راستے سے ہٹانے کی سازش تیار کی اور اسے زہر دے کر ہلاک کردیا۔ اس نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ اس قتل کا اس پر شبہ تک نہیں ہوا۔ صرف ایک آدمی کو تھوڑا سا شک تھا لیکن وہ بھی بے بس تھا۔"

"لیکن انور حسین کی تدفین تو بہت سے لوگوں کے سامنے ہوئی تھی" کسی نے سوال کیا "پھر یہ لوگ اس ویرانے میں کیا کرنے گئے تھے؟"

"بات یہ ہے کہ انور حسین کی تدفین اسی ویرانے میں ہوئی تھی" شاہنواز خان نے بتایا "اور لوگوں کے سامنے جس شخص کو دفن کیا گیا وہ انور حسین نہیں تھا۔ بلکہ ایک ایکسٹرا تھا۔ وہ بے چارہ ایک بے سہارا اور تنہا انسان تھا۔ اگر پولیس پوسٹ مارٹم کرتی تو پتا چل جاتا کہ انور حسین کو زہر دیا گیا ہے۔ اس لیے انور حسین کو تو ویرانے میں دفن کر دیا گیا اور اس ایکسٹرا کی لاش کو انور حسین کی لاش ظاہر کر کے باقاعدہ لوگوں کے سامنے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس زمانے میں انور حسین کے لواحقین میں صرف اس کے دو بچے اور بیوی تھے۔ جنہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ انہیں لاش کی صورت تک نہیں دکھائی گئی تھی۔"

"لیکن پولیس کو یہ کیسے پتا چلا کہ وہ دونوں ویرانے کی طرف جا رہے ہیں؟"

شاہنواز خان نے دلدار کی طرف دیکھا۔ دلدار نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر بتانا شروع کر دیا "بھائیو۔ میں ایک معمولی سا انسان ہوں لیکن احسان فراموش یا بے رحم نہیں ہوں۔ انور صاحب جس وقت انڈسٹری میں آئے اس وقت میری بھی ان سے دوستی ہو گئی۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے میرا بہت خیال کیا تھا۔ ہمیشہ میری مدد کی۔ اسی لیے میں ان کا بہت ادب کرتا۔ وہ ایک ہیرا آدمی تھا پھر میں نے یہ دیکھا کہ بابر منیار سے ان کی دوستی ہو گئی ہے اور بابر منیار انہیں اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔ میں نے ایک دو بار انہیں سمجھانے کی بھی کوشش کی لیکن انہوں نے میری بات پر دھیان نہیں دیا اور بابر منیار نے انہیں برباد کر دیا۔ اس کا مجھے بہت دکھ تھا صاحب، مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بابر منیار نے انہیں زہر دے کر مار دیا ہے لیکن میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔"

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی تھی؟" دلدار سے پوچھا گیا۔

"مجھے اسی ڈائریکٹر نور بھائی نے بتایا تھا" دلدار نے کہا "ایک بار یہ ہوا کہ نور بھائی شراب کے نشے میں بالکل مدہوش گیٹ پر لڑھکا ہوا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر ٹیکسی میں بٹھایا۔ اس نے نشے کے باوجود مجھے پہچان لیا تھا۔ میں اسے گھر تک پہنچانے گیا تھا صاحب۔ اس نے راستے میں مجھے سب کچھ بتا دیا۔ مجھے اس کی بات پر یقین تو تھا لیکن میں کیا کر سکتا تھا پھر بہت دن گزر گئے۔ بابر منیار پیسے والا بن کر اپنے گھر بیٹھ گیا اور اصغر منیار نے اپنا کام شروع کر دیا۔"

"اب اس کے بعد کی کہانی میں سناتی ہوں" ستارہ نے کہا "انور حسین میرے باپ تھے۔ ایک محبت کرنے والے باپ۔ آپ لوگوں نے یہ سن ہی لیا کہ ان کے پاس بہت دولت تھی۔ اس لیے ہم بچپن ہی سے بہت عیش و آرام سے رہتے تھے پھر ان کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور ہم کسی نہ کسی طرح پروان چڑھتے گئے۔ میں اور میرا بھائی جاوید۔ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بالکل ابا کی طرح ہے۔ میرے ابا کو دیکھنے والے یہی کہتے ہیں کہ انور حسین، جاوید کی صورت میں واپس آ گئے ہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے پاس ایک صاحب آئے۔ عجیب حلیہ تھا ان کا۔ انہوں نے میرے گھر میں آ کر کہا کہ وہ ہم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ کوئی بہت ہی ضروری بات ہے۔ ہم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا پھر انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ میرے ابا انور حسین کو زہر دے کر مارا گیا ہے اور مارنے والے کا نام بابر منیار ہے جس کا تعلق بھی فلم انڈسٹری سے تھا اور اب اس کا بیٹا فلمیں بناتا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کے پاس جتنی دولت ہے وہ ہماری ہے۔ انہوں نے اس انداز سے یہ سب کچھ بتایا کہ ہمیں فوراً یقین آ گیا۔ ہم اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کے لیے بے چین ہو گئے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم کیا کریں۔ پھر انہوں نے ہی بتایا کہ انہوں نے ایک عجیب و غریب منصوبہ بنا لیا ہے۔ وہ منصوبہ یہ ہے کہ میں فلم انڈسٹری میں کوئی روح وغیرہ کے طور پر مشہور ہو جاؤں۔ اس سلسلے میں انہوں نے پہلے کام یہ کیا کہ ایک ڈراؤنی فلم کا مسودہ لے کر عرفان صاحب کے پاس پہنچ گئے۔"

"تو کیا سمندر تمہارے ماموں نہیں تھے؟" عرفان خالد نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، لیکن انہوں نے ہمیں اتنی محبت دی کہ ہم انہیں ماموں ہی سمجھنے لگے" ستارہ نے بتایا "ان کا منصوبہ بہت عجیب و غریب تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مجھے اپنے حوالے سے انڈسٹری میں متعارف کروائیں گے پھر آہستہ آہستہ اصغر منیار میری طرف متوجہ ہو جائیں گے اور اس طرح بابر تک پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔ جس نے میرے باپ کا قتل کیا ہے لیکن ہوا یہ کہ مجھے پہلی ہی فلم اصغر منیار کی مل گئی اور میں بابر تک پہنچ گئی۔"

"لیکن بابر سے انتقام کے لیے یہ روحوں وغیرہ کے چکر کی کیا ضرورت تھی؟" پولیس آفیسر نے دریافت کیا۔

"یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آئی" ستارہ نے کہا "لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے بھی اس لیے ساتھ دیا کہ خود مجھے اس کھیل میں لطف آنے لگا تھا اور میں اپنے ابا کا انتقام لینے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے وہی کیا جو انہوں نے کہا تھا۔ انہوں نے ایک سہراب ولا تلاش کیا۔ جس میں دو قبریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک ستارہ نامی کسی لڑکی کی ہے جبکہ دوسری قبر سمندر نام کے کسی شخص کی ہے۔ دونوں ماموں بھانجی تھے۔ سمندر نے خود کو سمندر کہہ کر متعارف کروایا اور میرا نام ستارہ رکھ دیا۔ جبکہ میرا اصل نام انفاس ہے پھر انہوں نے اپنا پتا بھی یہی بتایا کہ ہم سہراب ولا میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اب بڑی ہوشیاری سے میرے لیے بھوت والا ناٹک شروع کیا اور اس سلسلے میں دلدار ہمارے بہت کام آیا۔"

سب لوگ دلدار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جس نے اپنی کہانی شروع کی "انور حسین صاحب سے میری بہت اچھی سلام دعا تھی

جناب۔ اس بھلے آدمی نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ سمندر صاحب نے انڈسٹری کے لوگوں سے ان کے بارے میں پوچھنا شروع کردیا تھا۔ ایک دن میری بھی ان سے ملاقات ہوگئی اور میں نے پتا نہیں کس طرح انہیں یہ بتادیا کہ ان کی موت میں بابر منیار کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ میں بابر منیار کے ڈائریکٹر ساتھی کی زبانی یہ اعتراف پہلے ہی سُن چکا تھا۔ انہوں نے پھر مجھے اعتماد میں لے کر یہ بتادیا کہ ستارہ دراصل انور حسین کی بیٹی ہے اور وہ اپنے باپ کے قاتل کا پتا تلاش کرنے آئی ہے۔ اس دوران یہ اتفاق ہوا کہ گلنار نے مجھے ستارہ کو اغوا کرنے کا کام دے دیا۔ میں نے جب ستارہ اور سمندر سے یہ بات بتادی تو منصوبے کے مطابق ستارہ خود اپنی مرضی سے اغوا ہوگئی اور منصوبے ہی کے مطابق اسے اس جگہ رکھا گیا جو جگہ اصغر اور بابر کے فارم ہاؤس کے بہت قریب تھی اور میں نے گلنار کو اُلٹی سیدھی ایک کہانی سنادی کہ ستارہ اور اس کا ماموں ٹیکسی سے اُتر کر جنگل کی طرف جارہے تھے اور اس کا ماموں اچانک غائب ہوگیا وغیرہ وغیرہ۔"

"لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے ستارہ کو چھپکلیاں کھاتے ہوئے دیکھا ہے" گلنار بول پڑی۔

"وہ ربر کی چھپکلیاں تھیں" ستارہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اب آگے کا کچھ اور حال میں بتاتی ہوں۔ قسمت ہر قدم پر ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ اصغر صاحب مجھے اپنے گھر لے آئے۔ جہاں بابر منیار میرے سامنے آگیا۔ وہی شخص جس نے مجھے تباہ کیا تھا۔ میں نے موقع پاکر اس رات کسی طرح اپنے بھائی کو فون کردیا کہ آج رات اصغر کے گھر آجائے۔ میرا بھائی بھی یہاں موجود ہے۔ وہ آپ لوگوں کو کچھ اور بتا سکتا ہے۔"

ایک خوش شکل نوجوان اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ اس کی توند آگے کو نکلی ہوئی تھی "یہ سارا انتظام سمندر صاحب نے کیا تھا۔ وہ مجھے باقاعدہ ٹریننگ دیا کرتے تھے۔ یہ دیکھیں" اس نے اپنی قمیص اوپر اُٹھادی۔ اس کا پیٹ ننگا ہوگیا تھا۔ "اصل پیٹ کے اوپر یہ ایک نقلی پیٹ ہے۔ پلاسٹک کا بنا ہوا اور اس کے اندر ربڑ کے حرکت کرنے والے کیڑے مکوڑے موجود ہیں۔ جب میں یہ پیٹ کھولتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے واقعی اپنا اصل پیٹ کھول رہا ہوں اور کیڑے مکوڑے باہر نکل گئے ہیں۔ یہ منظر اچھے اچھوں کو دہشت زدہ کردیا کرتا ہے۔ اس رات میں اصغر منیار کے گھر میں خاموشی سے داخل ہوگیا۔ ستارہ نے میرے لیے دروازہ کھول رکھا تھا۔ ہم کسی طرح بابر منیار کے کمرے میں پہنچ گئے۔ جہاں میں نے بابر کو یہ بھیانک منظر دکھایا اور وہ یہ دیکھ کر اتنا دہشت زدہ ہوا کہ ابا کی لاش کی تصدیق کے لیے اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس نے ابا کو دفن کیا تھا۔ کیونکہ مجرم ایسے حالات میں تصدیق ضرور کیا کرتا ہے۔"

"اور شاید تم ہی راجا بابو کو دکھائی دیے تھے" ایک کونے سے سوال کیا گیا۔ وہ ذیشان تھا جو اس دوران خاموشی سے آکر بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں۔ میں ہی دکھائی دیا تھا اور یہ حرکت اس لیے کی گئی تھی کہ ستارہ کو پوری طرح پراسرار سمجھ لیا جائے" اس نوجوان نے جواب دیا۔

"لیکن پولیس وہاں پہلے کس طرح پہنچ گئی جہاں انور حسین کو دفن کیا گیا تھا؟" کسی نے سوال کیا۔

"اس کا جواب میں دے سکتا ہوں" پولیس آفیسر نے کہا "اس شام مجھے ایک فون موصول ہوا۔ اس فون پر مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ کیا میں بیس سال پرانے ایک قتل کے کیس کو حل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور پوچھا کہ تم کس کے قتل کی بات کررہے ہو تو اس نے انور حسین کا نام لیا۔ میں یہ بتاچکا ہوں کہ انور حسین سے میری بھی دوستی تھی اور میں اس کیس کو حل کرنے میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس لیے اپنے آدمیوں کے ساتھ مقررہ مقام پر پہنچ گیا اور اس طرح قاتل گرفتار ہوگیا۔"

"لیکن وہ فون کرنے والا کون تھا؟"

"یہ میں نہیں جانتا کیونکہ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔"

"لیکن اس کہانی کا مرکزی کردار یعنی وہ ماموں کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتی" ستارہ نے جواب دیا "ہماری کہانی کو اس مقام تک پہنچا کر وہ خود نہ جانے کہاں چلے گئے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ انہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔"

○☆○

کہانی بظاہر ختم ہوگئی تھی۔ برسوں پرانا ایک مجرم پولیس کے ہاتھ لگ گیا تھا لیکن ذیشان کے ذہن میں ایک خلش سی تھی۔

وہ ماموں آخر کون تھا۔ اسے بابر منیار کو سزا دلوانے میں کیا دلچسپی تھی؟ اس نے انور حسین کے گھر والوں کا اس سلسلے میں کیوں ساتھ دیا تھا۔ ان ہی سوالوں کے جواب کے لیے وہ ایک دن ستارہ کے پاس پہنچ گیا۔ جو کچھ دیر پہلے ہی شوٹنگ سے گھر واپس آئی تھی۔ عرفان خالد کی رکی ہوئی فلم پھر تکمیل کے مراحل سے گزرنے لگی تھی۔ ستارہ اس کے بارے میں بہت کچھ سن چکی تھی۔ اس لیے اس نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

"میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ آپ ضرور میرے پاس آئیں گے" ستارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے کہ آپ ایک روح ہیں اور روحوں کی چھٹی حس ویسے ہی بہت تیز ہوتی ہے" ذیشان مسکراتے ہوئے بولا "اچھا یہ بتائیں، آپ کے سمندر ماموں کا کوئی پتا چلا؟"

"نہیں۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگئے؟"

"کیا آپ ان کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ آپ کے والد سے ان کا کیا رشتہ تھا؟"

"نہیں۔ یہ سب انہوں نے کبھی نہیں بتایا" ستارہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا "میں نے کئی بار پوچھا بھی تھا لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتے تھے۔"

"کیا انہوں نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ ان کا نام سمندر کیوں ہے؟ میرا مطلب ہے سمندر کے آگے پیچھے تو کچھ ہونا چاہیے۔"

"ہاں۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا تو انہوں نے صرف اتنا جواب دیا کہ ان کی زندگی کا سمندر سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لیے ان کا نام سمندر ہے۔"

"دیکھیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر ان کے بارے میں کوئی بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا" ذیشان نے کہا۔

ستارہ سے کچھ اور معلوم ہونے کی اُمید نہیں تھی۔ اس لیے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ ستارہ سے اجازت لے کر واپس آگیا۔ اس کا ذہن ابھی تک اُلجھا ہوا تھا۔ اس نے سمندر کا لکھا ہوا فلم کا اسکرپٹ پڑھا تھا۔ وہ ایک مکمل اسکرپٹ تھا۔ اس میں کسی قسم کی خامی یا جھول نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی منجھے ہوئے رائٹر نے وہ اسکرپٹ لکھا ہو اور انڈسٹری والوں کا یہ بیان تھا کہ سمندر کے کہنے کے مطابق یہ اس کی پہلی کہانی تھی۔ اس کا پہلا اسکرپٹ تھا۔

بالآخر اسے ایک آدمی یاد آگیا۔ جو اس سلسلے میں اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ وہ کسی زمانے میں فلم انڈسٹری ہی سے وابستہ تھا۔ طاہر علی۔ اس نے فلموں کے لیے کئی کہانیاں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں لیکن گزشتہ پندرہ سولہ برسوں سے وہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ ذیشان نے ایک بار اس کا انٹرویو کیا تھا۔ اس نے عرفان خالد سے سمندر کے لکھے ہوئے مسودے کی فوٹو کاپیاں حاصل کرلی تھیں۔ وہ ان ہی کو لے کر طاہر علی کے پاس پہنچ گیا۔

طاہر علی، ذیشان سے مل کر بہت خوش ہوا تھا "چلو۔ کسی بہانے کسی نے مجھے یاد تو کیا۔ ورنہ میں تو انڈسٹری والوں کی صورت دیکھنے کو ترس گیا ہوں۔ یہ شعبہ ہی ایسا ہے جو ایک بار آؤٹ ہوا اسے ہمیشہ کے لیے آؤٹ کردیا جاتا ہے۔"

"آپ سچ کہتے ہیں۔ واقعی شوبزنس ایسا ہی ہوتا ہے۔ طاہر صاحب، میں اس وقت آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔"

ذیشان نے سمندر کا لکھا ہوا مسودہ اس کے سامنے رکھ دیا "کیا آپ اس تحریر کو پہچانتے ہیں؟"

طاہر علی نے مسودہ اُٹھا کر دیکھا اور فوراً ہی بول پڑا "کیوں نہیں۔ یہ تو بہت جانی پہچانی تحریر ہے اور مجھے اس لیے یاد رہ گئی ہے کہ میرے پاس بھی اس تحریر میں ایک اسکرپٹ موجود ہے۔ ٹھہریں نکال کر لاتا ہوں۔ تلاش کرنے میں دیر لگ جائے گی۔ تم جب تک اخبار وغیرہ پڑھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"بے روزگاری کے مسئلے کا حل میرے پاس ہے" ایک شخص نے اعلان کیا "تمام مردوں کو ایک جزیرے میں اور تمام عورتوں کو دوسرے جزیرے میں بھیج دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ سب لوگ کام میں لگ جائیں گے۔"

"وہ کیا کام کریں گے؟"

"کشتیاں بنانا شروع کردیں گے۔"

○☆○

ایک شاعر اپنے ایک دوست کے پاس گیا اور کہنے لگا "میری زبان بند کرنے کے لیے کچھ لوگ سازش کررہے ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تم بھی اس میں شریک ہوجاؤ۔" دوست نے مشورہ دیا۔

○☆○

ذیشان کی بے قراری بڑھ گئی۔ طاہر علی کا یہ انکشاف بھی حیرت انگیز تھا۔ اس کے پاس اس تحریر میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس تحریر کے مالک کو پہچانتا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ یہاں آتے ہی اس کا کام بن گیا تھا۔ طاہر علی کچھ دیر بعد کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل دبی ہوئی تھی۔ "یہ دیکھو میاں، تحریر ملالو۔ دونوں لیک ہی جیسی ہیں۔"

واقعی دونوں تحریریں ایک ہی شخص کی تھیں۔ کوئی عام شخص بھی دونوں تحریروں کا موازنہ کرکے یہی کہہ سکتا تھا۔

"لیکن یہ تحریر ہے کس کی؟" ذیشان نے دریافت کیا۔

"انور حسین کی" طاہر علی نے بتایا۔

"کیا!" ذیشان چونک اُٹھا تھا "انور حسین کی؟"

"شاید تم انور حسین کو نہیں جانتے ہوگے" طاہر علی نے کہا "اب سے بیس بائیس برس پہلے یہ شخص فلم انڈسٹری میں داخل ہوا تھا۔ بہت ہی خوش شکل، ذہین اور دولت مند انسان تھا۔ اس کے شوق بھی عجیب وغریب تھے۔ وہ بہت اچھی کہانیاں لکھا کرتا لیکن کہانی نگار کے طور پر سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ سمندر کے قلمی نام سے کہانیاں لکھا کرے گا۔ تاکہ لوگ ڈھونڈتے ہی رہ جائیں کہ سمندر کون ہے؟ اس نے یہ مسودہ مجھے پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ واقعی بہت اچھی کہانی ہے۔"

ذیشان حیرت زدہ ہوکر اس کی باتیں سُن رہا تھا۔ سمندر۔۔۔ انور

حسین.... پتا نہیں یہ سب کیا تھا؟ لیکن اس نے طاہر علی پر اپنی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

"تو اب یہ شخص کہاں ہے؟" ذیشان نے پوچھا۔

"اب سے بیس برس پہلے اس کا انتقال ہوگیا ہے" طاہر علی نے بتایا "بہت سی افواہیں سننے میں آئیں کہ شاید اسے قتل کردیا گیا ہے۔ بہرحال' میں نے تو گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ کیا حالات ہوئے ہوں گے لیکن یہ مسودہ تمہیں کہاں سے ملا؟"

"کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ انور حسین نے اپنا قلمی نام سمندر کیوں رکھا تھا؟" ذیشان نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے ایسے نام پر حیرت ہوئی تھی" اس نے بتایا "میں نے اس سے دریافت کیا تھا۔ اس نے یہ بتایا کہ سمندر سے اسے بہت محبت ہے۔ اسی لیے اس نے اپنا نام سمندر رکھا ہے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ ساحل کی طرف بھی لے گیا تھا۔ جہاں ایک پرانے سے مکان میں وہ داخل ہوا اور بہت دیر بعد واپس آگیا۔ وہ مجھے اس مکان کے اندر نہیں لے گیا تھا۔ اس لیے میں باہر کھڑا رہا تھا۔"

"اچھا۔ کیا آپ اس مکان کی نشان دہی کرسکتے ہیں؟"

"میاں' اس بات کو ایک عرصہ ہوچکا ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ مکان اپنی جگہ ہوگا بھی یا نہیں لیکن میں تمہیں اس کا جغرافیہ ضرور بتا سکتا ہوں۔"

"چلیں۔ وہیں بتادیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"اس میں مہربانی کیسی! خیر' کلفٹن کے ساحل سے تم جنوب کی طرف چلتے جاؤ۔ کئی میل کے بعد تمہیں ایک بڑی سی چٹان نظر آئے گی۔ اسے گھونگھے والی چٹان کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس پر ان گنت گھونگھے چمٹے ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ چٹان آج بھی اپنی جگہ موجود ہوگی۔ اسی چٹان سے آگے وہ مکان ہے۔ اس زمانے میں اس علاقے میں وہ اکلوتا مکان تھا۔ آج کی بات میں نہیں بتا سکتا لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ مسودہ کہاں سے ملا؟"

"آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اس حد تک رہنمائی کردی۔" ذیشان نے کہا "اور جہاں تک اس مسودے کا تعلق ہے تو یہ جان لیں کہ یہ مسودہ خود انور حسین نے ہمیں دیا ہے۔"

حیرت سے طاہر علی کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ ذیشان اسے حیران اور پریشان چھوڑ کر اس کے کمرے سے باہر آگیا۔

○☆○

"آپ کو تو جاسوس ہونا چاہیے تھا" ستارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ایک اچھے اخبار والے کو آدھا جاسوس ہی سمجھ لیں" ذیشان مسکرادیا "بات صرف اتنی ہے کہ مجھے اس معاملے سے دلچسپی ہوگئی ہے۔ اور جیسے جیسے میں آگے بڑھتا جارہا ہوں۔ ویسے ویسے حیرت کے دروازے کھلتے جارہے ہیں اور اب تو خود مجھے اتنی دلچسپی ہوگئی ہے کہ میں پیچھے ہٹنا بھی چاہوں تو نہیں ہٹ سکتا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اب اس مکان میں جاکر کھوج لگائیں گے؟" ستارہ نے پوچھا۔

"ہاں' اب میں وہیں جاؤں گا" ذیشان نے بتایا "میں آپ سے یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ کیا آپ کے پاس انور صاحب کی کوئی تحریر محفوظ ہے۔ تاکہ اس کا موازنہ کیا جائے۔"

"نہیں۔ ہمارے پاس ان کی کوئی تحریر نہیں ہے۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا اس وقت ہم بہت چھوٹے تھے۔ ہمیں تو ٹھیک طرح سے ان کی صورت بھی یاد نہیں ہے لیکن وہ ہمارے والد تھے اور ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ انہوں نے یقیناً ہمیں بہت پیار بھی دیا ہوگا لیکن افسوس کہ ہم ان کے پیار کا بدلہ نہیں دے سکے اور ویسے بھی والدین کے احسان کا بدلہ کون دے سکتا ہے؟"

"میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ اس دوران آپ کی والدہ کہاں رہی تھیں؟"

"میری والدہ کا بھی آٹھ برس پہلے انتقال ہوچکا ہے" ستارہ نے کہا "بہرحال ان کے انتقال کے وقت ہم دونوں بھائی بہن اچھے خاصے بڑے ہوچکے تھے۔"

"ٹھیک ہے" ذیشان نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی گردن ہلائی "اب مجھے اجازت دیں۔"

"ذیشان صاحب' میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"میرے ساتھ! کہاں؟"

"جہاں آپ جارہے ہیں" ستارہ نے کہا "اگر آپ اسی مکان کی طرف جارہے ہیں تو اس راز پر میرا بھی حق ہے کیونکہ وہ میرے باپ تھے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر آجائیں' میں وہیں جارہا ہوں۔"

کئی گھنٹوں کی ڈرائیو کے بعد وہ گھونگھے والی چٹان کے پاس پہنچ ہی گئے۔ یہ جگہ آباد ساحل سے بہت فاصلے پر تھی۔ یہاں ہر طرف بے پناہ خاموشی تھی۔ دور دور تک کسی انسان کی صورت بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ صرف سمندر کی لہریں تھیں جو رہ رہ کر اپنی عظمت کا احساس دلاتی رہتیں یا آبی پرندے تھے جو ذرا ذرا سی دیر کے بعد شور مچاتے ہوئے کسی سمت پرواز کرجاتے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور یہ جگہ واقعی ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔

"کتنی خواب ناک جگہ ہے" ستارہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایسا لگتا ہے جیسے صدیوں سے کسی انسان کے قدم یہاں نہ پہنچے ہوں۔"

"واقعی بہت عجیب مقام ہے" ذیشان نے بھی تبصرہ کیا "اب دیکھیں وہ مکان کہاں ملتا ہے' اور خدا جانے ہے بھی یا نہیں؟"

دونوں گھونگھے والی چٹان کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ بالآخر وہ مکان نظر آہی گیا۔ وہ ایک کھنڈر نما زرد رنگ کا چھوٹا سا مکان تھا۔ سمندر کی نمکین آب وہوا نے اس کے در و دیوار کو بُری طرح کمزور کردیا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ مکان کی دہلیز عبور کرکے اندر آگئے۔ ہر طرف ساحل کی چاندنی جیسی ریت پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے اس طرف کوئی نہ آیا ہو۔

پہلے ایک کمرا تھا۔ جس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرا کمرا اور اس کمرے میں ایک ایسی چیز تھی جس نے ان دونوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی وہ ایک قبر تھی۔ بہت شکستہ' اس پر منوں کے حساب سے ریت پڑی ہوئی تھی۔ قبر کے سرہانے ایک کتبہ بھی تھا۔ جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ ذیشان نے جھک کر قبر کے کتبے کی طرف دیکھا پھر اس پر لکھی ہوئی عبارت بہ آواز بلند پڑھنے لگا "حمیدہ بیگم۔ زوجہ انور حسین۔"

"اوہ خدا" ستارہ چیخ اٹھی "یہ کیا۔ حمیدہ بیگم تو میری امّی کا نام تھا۔"

"تو کیا تمہاری امّی کو یہاں دفن کیا گیا تھا؟" ذیشان نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" ستارہ نے انکار میں اپنی گردن ہلادی "ان کی قبر تو کہیں اور ہے۔"

"تو پھر یہ سب کیا ہے؟"

"میں کیا بتا سکتی ہوں۔ میں تو خود آج پہلی بار تمہارے ساتھ آئی ہوں۔"

"یہ تو پتا چل گیا کہ سمندر ہی دراصل انور حسین ہیں اور انور حسین کا سمندر سے کیا تعلق ہے لیکن یہ قبر کس کی ہوسکتی ہے۔ اب یہ راز شاید ہمیشہ راز ہی رہے گا۔"

"شاید بہار خالہ کچھ بتا سکیں" ستارہ نے کہا۔

"کون بہار خالہ؟"

"میری امّی کی خالہ زاد بہن ہیں" ستارہ نے بتایا "حیدر آباد میں رہتی ہیں۔ ہمیں ان کے پاس جانا ہوگا۔"

○☆○

"میرے بچّو! اب جبکہ تم لوگ یہ راز معلوم ہی کرنا چاہتے ہو تو میں بتادیتی ہوں" بہار خالہ نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھیں۔ جن کی بجھتی ہوئی آنکھیں اور ماتھے کی سلوٹیں یہ بتارہی تھیں کہ اس عورت نے بہت گرم و سرد زمانے دیکھے ہوں گے "وہ دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ میرا مطلب ہے سمندر اور انور حسین۔"

"کیا!" دونوں ہی چونک پڑے تھے "سمندر اور انور حسین دونوں الگ الگ تھے؟"

"ہاں۔ بالکل الگ الگ۔ سمندر ایک کہانی نگار تھا لیکن اس کی کہانیاں کہیں شائع نہیں ہوتی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی کسی کہانی پر فلم بنائی جائے۔ اس نے اپنی کہانیوں کے مسودے انور حسین کے حوالے کردیے کیونکہ انور حسین نے اس زمانے میں انڈسٹری میں آنا جانا شروع کردیا تھا۔ انور نے اس کا وہ مسودہ فلم کے کسی آدمی کو دے دیا تھا۔ اس دوران ایک اور کہانی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یعنی محبت کا۔ انور حسین' سمندر کی بہن سے محبت کرنے لگا تھا۔ جس کا نام حمیدہ بیگم تھا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ سمندر بھی اپنی بہن سے بے پناہ محبت کرتا تھا پھر اس نے حمیدہ کی شادی انور سے کردی۔ اس طرح دوستی کا رشتہ اور مضبوط ہوگیا لیکن بدقسمتی سے حمیدہ بیگم کچھ دنوں کے بعد انتقال کرگئی۔ اس کا صدمہ دونوں ہی کو ہوا تھا۔ حمیدہ بیگم کو ساحلِ سمندر پر ایک خاص جگہ بہت پسند تھی۔ وہ اکثر وہاں جایا کرتی تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کو وہیں دفن بھی کردیا گیا تھا۔ دن گزر گئے پھر انور حسین کی حالت دیکھتے ہوئے سمندر ہی نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ انور حسین دوسری شادی کے لیے تیار نہیں تھا لیکن سمندر کے مشورے پر اس نے دوسری شادی کرلی۔ سمندر نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کا نام اس کی مرحومہ بہن حمیدہ بیگم کے نام پر رکھ دے تاکہ وہ جب انور حسین کے گھر آیا کرے تو اسے احساس ہو کہ اس کی بہن زندہ ہے اور انور حسین کے گھر میں ہے۔

اسی دوران دو بچے بھی ہوئے اور انور حسین کو ہلاک کردیا گیا۔ میں یہ سب پڑھ چکی ہوں۔ سمندر کو اپنی بہن کی موت کے بعد دوست کے قتل کا اتنا صدمہ تھا کہ اس نے انتقام لینے کی قسم کھالی اور بچوں کے جوان ہونے کا انتظار کرتا رہا۔"

"آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" ذیشان نے پوچھا۔

"کچھ دنوں پہلے سمندر میرے پاس آیا تھا" بہار خالہ نے بتایا "اس نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے کہ اس نے کس طرح ایک بھیانک کہانی لکھی۔ ستارہ سے ملا' خود کو بچوں کا ماموں کہلوایا اور کس طرح ایک منصوبہ بنا کر اس نے اصل قاتل کو پکڑوادیا۔"

"ایک سوال یہ ہے کہ اس نے انتقام لینے کے لیے اتنا انتظار کیوں کیا؟" ذیشان نے پوچھا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے دوست کی موت کے بعد نیم پاگل ہوکر نہ جانے کہاں کہاں برسوں بھٹکتا رہا تھا۔ اسی عالم میں اس نے وہ کہانی لکھی جس پر آج کل ستارہ کی فلم بنائی جارہی ہے۔ تم نے اگر وہ کہانی پڑھی ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ بالکل وہی کہانی ہے جو اب تک تم سبھوں پر گزر چکی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں" ذیشان نے ایک گہری سانس لی "یہ واقعی وہی کہانی ہے۔"

اب کوئی حل طلب مسئلہ نہیں تھا۔ سب کچھ سامنے آچکا تھا۔ البتہ اب صرف ایک کہانی ایسی تھی جس کی ابتدا اسی وقت سے ہوگئی تھی جب ذیشان اور ستارہ ایک دوسرے سے ملے تھے۔

بدیع الزماں دل نواز لالہ موسوی، محقق جس کا بزدل ہوتا ہے، ایک اور خندہ بہ لب معرکہ آرائی کی روداد کے ساتھ حاضر ہیں۔

اپنی مخصوص شوخیٔ تحریر اور پُرمزاح اندازِ بیان کے ساتھ بزدل کے کردار کو گزشتہ سال احمد اقبال نے متعارف کروایا تھا تو اس کو قارئین کی زبردست پذیرائی ملی تھی۔ وہ ایک نڈر صحافی ہے جو "بزدل" کے قلم سے سچی باتیں لکھتا ہے اور جس کا رابطہ بیک وقت مجرموں کی دُنیا سے بھی ہے اور پولیس کی "کارکردگی" سے بھی۔

پہلی کہانی کی اشاعت سے اب تک ہمارے خوش ذوق قارئین کا پیہم اصرار تھا کہ "بزدل" کا کوئی اور ہنگامہ دار و گیر شاملِ اشاعت کیا جائے لیکن یہ آپ کے قدآور مصنف کی غیر نصابی سرگرمیاں تھیں یا پھر وہ زندگی کے تلخ حقائق میں مزاح کی گنجائش نکالنے میں سرگرداں تھے کہ ایک سال بعد ہم پھر "بزدل" کی "بہادری" کا دوسرا شاہکار پیش کر رہے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ پُرتجسس واقعات، زندہ کرداروں اور ظرافت کے اعلیٰ معیار پر پُوری اُترنے والی اس کہانی کو پڑھتے ہوئے آپ بے ساختہ ہنسنے پر مجبور نہ ہوں تو ہماری تمام ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔

Scanned By: ATAUL MUSTAFA 0333-4585215

اڑ + کار = اڑاکار

(احمد اقبال)

میں شہر میں ایک پُرہجوم بازار کی فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نجومی کے بارے میں جس کے طوطے نے مجھے کوئی گھنٹا بھر پہلے خوش خبری دی تھی کہ اللہ نے چاہا تو تم محنت کرو گے اور کامیاب رہو گے۔ طوطے نے کوئی ذمّے داری قبول نہیں کی تھی۔ اس نے میرا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا لیکن جھگڑا ایک نقطے کا پڑ گیا تھا جس کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ اوپر ہے یا نیچے اور کامیابی محنت کرنے سے ہوگی یا محبت کرنے سے۔ محنت اور محبت کی اس بحث کو ایک شاعر نما شخص نے ختم کیا تھا۔ یہ دلیل دے کر کہ میاں.... محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ کیا سمجھے؟ سوا روپیہ دینے سے پہلے میں نے نجومی کو خبردار کیا تھا کہ وہ پبلک کو کنفیوز نہ کرے اور اوپر والا نقطہ مٹا دے یا نیچے والا ورنہ کسی دن طوطا اندر ہو جائے گا۔

ذاتی طور پر میرا خیال تھا کہ اب محبت کی جاتی ہے۔ فلموں میں ہی نہیں، عملی زندگی میں بھی اس کے لیے ماہرین کے مشورے کو مدِنظر رکھ کے منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے اور خاصے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ میرا اپنا تازہ تجربہ اس کی ایک مثال تھا۔ پہلے دن دو بے ٹریفک تھی اور صرف میں محبت کرتا تھا۔ خاصی محنت کے بعد اب وہ بھی محبت کرنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ وہ منزل ابھی دور تھی جب میں کہہ سکتا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

اچانک کسی نے چلّا کے کہا "بزدل" اور اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کہ یہ میرا نام نہیں اور میرا کوئی بے تکلف دوست بھی سرِعام مجھے یوں نہیں پکار سکتا، میرے قدم اچانک رک گئے اور میں نے گھوم کے اس بدتمیز شخص کو دیکھا جس نے میرا پورا نام بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی لینے کے بجائے مجھے بزدل کہہ کے پکارا تھا۔

وہ گستاخ تو مجھے ہجوم میں نظر نہ آیا مگر میرے اچانک گھوم جانے سے ایک واقعہ پیش آیا اور ایک حادثہ۔

میرے سامنے جو ہکا بکا قسم کا شخص گول، دھندلے شیشوں والی عینک لگائے ناک کی سیدھ میں آ رہا تھا اور جس نے احتیاط پسندی کے باعث یا بیوی کے حکم پر بادل اور دھوپ نہ ہونے کے باوجود چھتری تان رکھی تھی، رکنا بھول گیا۔

عین چھتری کے نیچے اس کو ایک جغادری قسم کے مولانا سے بغل گیر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی جو مخالف سمت سے آ رہے تھے۔ یہ ایک واقعہ تھا۔

حادثہ میرے ساتھ پیش آیا۔ عین میرے عقب میں میرے نقشِ قدم پر اپنی حسین اور جوان دختر نیک اختر، بے پردہ کے ساتھ باڈی گارڈ کی طرح چلنے والی بڑی بی مجھ سے ٹکرا گئیں۔ وہ چلتے پھرتے خیمہ نما برقعے کے اندر روپوش تھیں مگر ان کے حدود اربعہ کی وسعت کا اندازہ باہر سے بھی کیا جا سکتا تھا۔ مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے بھینس نے ریورس گیئر میں مجھے ٹکر مار دی ہے۔

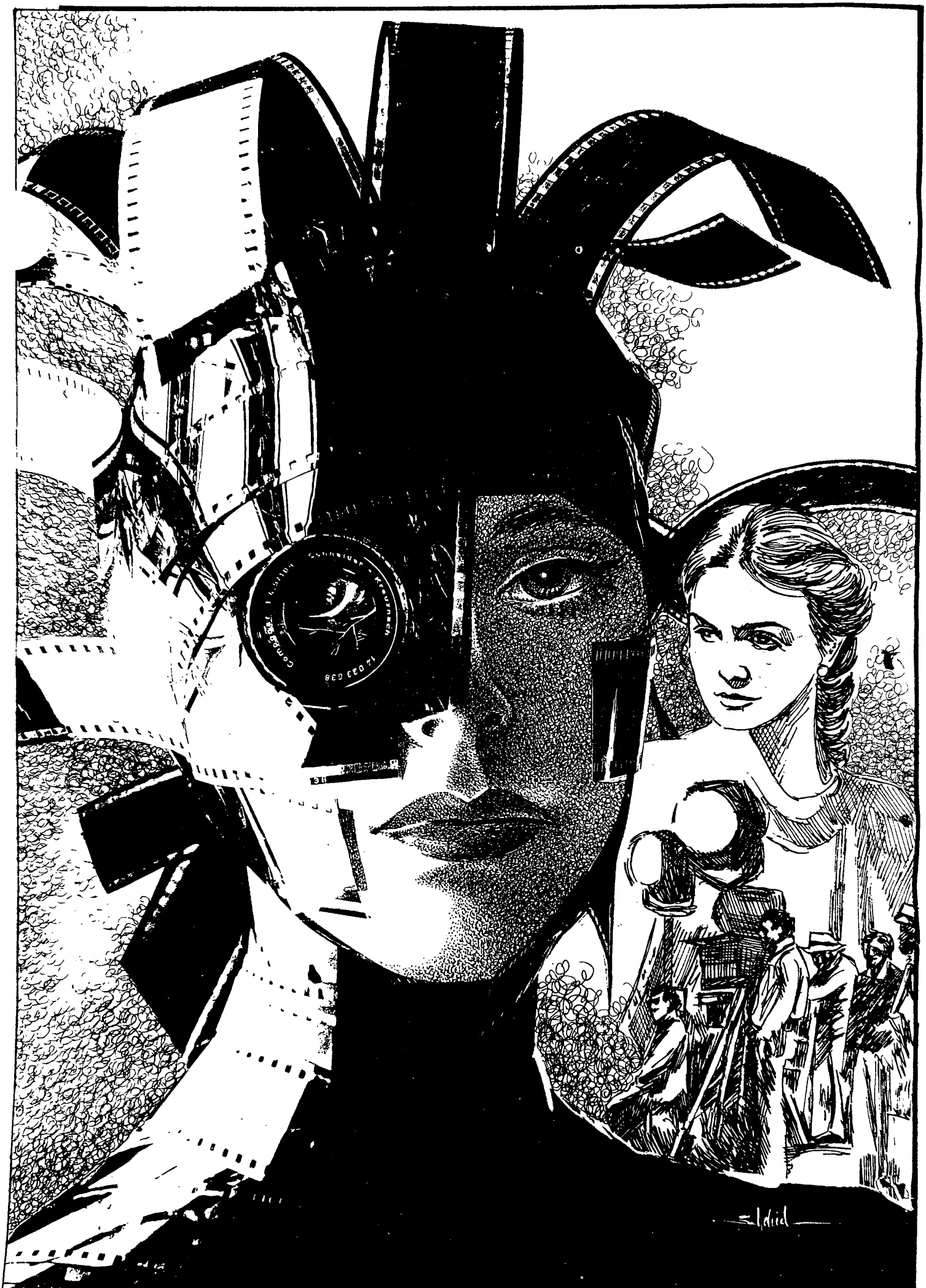

اس سے پہلے کہ میں اچانک رُک جانے پر "سوری" کہتا اور اپنے گھوم جانے کے اسباب کی وضاحت کرتا یا غیر مشروط معافی نامہ داخل کرتا، خیمے کے اندر وہ ٹیپ ریکارڈر چل پڑا جس میں خالص زنانہ لغت کی قدیم وجدید گالیاں تھیں، بے بنیاد الزامات کا طوفان تھا اور کوسنے تھے۔

"ارے موٹے مشٹنڈے۔ ستیاناس ہو تیرا۔ اندھے بیل کی طرح آگے چلتا ہے اور پیچھے دیکھتا ہے حرامی۔ اللہ غارت کرے تیری جوانی کو۔ اتنا ہی زور ہے تو گھر جا کے ماں بہنوں کو ٹکریں مار۔ لفنگے، شہدے۔"

حملہ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی رسوائی کی طرف سے پسینہ آگیا مگر پھر میں نے صورتِ حال کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے حواس کو مجتمع کیا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ میں ایک مشہور صحافی ہوں اور پریکٹس نہیں کرتا تو کیا، وکیل بھی ہوں۔ بزدل میرے نام کا مخفف ضرور ہے مگر میں اپنے آباواجداد کی طرح بہادر اور غیرت مند ہوں۔

بڑی بی کی آواز ان کی جسامت کے مطابق تھی۔ اس کے مقابلے میں پھٹے ڈھول کی آواز کو سُریلا قرار دیا جاسکتا تھا۔ دس پندرہ فارغ سامعین وناظرین فوراً متوجہ ہوگئے۔ ان کے کان بڑی بی کی طرف تھے اور آنکھیں اس حور شمائل پر جس کی باڈی واقعی اس قابل تھی کہ اس کے ساتھ گارڈ ہو۔

میں نے شرافت، معصومیت اور عاجزی سے بھرپور لہجے میں کہا "مجھے واقعی بہت افسوس ہے خالہ" انہیں خالہ کہنا پہلی فاش غلطی تھی تو ان کے کندھے پر ہاتھ رکھنا دوسری۔

وہ اُچھل کے پیچھے ہوگئی "خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا مردود۔ افسوس کے بچے۔ اللہ نہ کرے جو میں تیری خالہ کہلاؤں، منحوس صورت والے لفنگے۔"

یہ اچھی خاصی فلمی سچویشن تھی جس سے کوئی بھی ہیرو فائدہ اُٹھا سکتا تھا چنانچہ ایک لمبا پتلا ہیرو فوراً آگے بڑھ آیا جس کی مونچھیں بھی غصے میں تھر تھر کانپ رہی تھیں "تو نے چھیڑا ہے انہیں بدمعاش۔ تیری تو..."

اس نے میرے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اس کی نازک کلائی پکڑلی "ہیرو بننے کی کوشش مت کرو جھینگر کے بچے۔ تم مجھے جانتے نہیں۔ میں بزدل ہوں۔"

بعد کی ساری خرابی اسی تعارف کا نتیجہ تھی۔ ایک ساتھ بہت سے لوگ دانت نکالنے اور کھی کھی کرنے لگے۔ "ابے بزدل ہے تو بدمعاشی کیوں کرتا ہے؟"

بڑی بی نے بھی چلّا کے کہا "ارے دیکھو اس بے غیرت، جھاڑو پھرے کو۔ کہتا ہے میں بزدل ہوں۔ مرکھنے، بے شرم سانڈ۔ دن دہاڑے ٹکریں مارتا پھرتا ہے پرائی بہنوں بیٹیوں کو..."

پتلے، لمبی مونچھوں والے ہیرو کا ایک اور حمایتی آگے آیا "سالے چوری اور سینہ زوری۔ تیرے جیسے لوفر تھانے میں جا کے ہی سیدھے ہوتے ہیں۔"

میں نے غرا کے کہا "تو پھر سیدھی طرح تھانے چلو میرے ساتھ۔ یہاں کسی نے زبان درازی یا دست درازی کی تو..."

"تو کیا کرے گا بے تو.... بول" ایک گورا چٹا، صحت مند، سچ مچ کا ہیرو بھیڑ کو چیر کر آگے آیا اور اس نے مجھے دھکا دیا "ساری ہیکڑی اسی جگہ نکال دوں گا تیری...."

"شٹ اپ" میں نے دہاڑ کے کہا "تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟"

اس نے پھر مجھے دھکا دیا "کون ہے؟ لاٹ صاحب کا سالا ہے تو یا گورنر ہے.... بول۔"

میرے رویّے اور بڑی بی کی فریاد وفغاں نے لوگوں کو اس حد تک مشتعل کردیا تھا کہ مجھے اپنی صحافت اور وکالت کے پیشے کی غیرت کو خطرہ لاحق نظر آنے لگا۔ میری گوشمالی کے کارِ خیر میں حصہ لینے کے خواہش مندوں کی متفقہ رائے تھی کہ میں ایک آوارہ اور بدکردار شخص ہوں اور معاشرے کی اصلاح کے لیے مجھے درس عبرت بنانا ان کی اخلاقی ذمّے داری ہے۔ کوئی میری سُننے پر آمادہ نہ تھا۔

مجھے ٹھوک بجا کے تھانے پہنچانے کی قرارداد پر عمل درآمد ہونے ہی والا تھا کہ کسی نے گرج کے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا تماشا ہے؟"

اشتعال کے جذبات اور جارحانہ عزائم رکھنے والے ایک دم خاموش ہوگئے۔ شاید زندگی میں پہلی بار انسپکٹر رحیم خاں کی صورت دیکھ کے مجھے حقیقی خوشی حاصل ہوئی تھی۔

وہ پوری وردی میں تھا اور حسبِ عادت ایک ہاتھ سے اس نافرمان پتلون کو سنبھال رہا تھا جو کششِ ثقل کی باعث اس حرام خور کی توند کے گنبد پر سے پھسل کے اس کے قدموں میں گرنا چاہتی تھی۔ اس کا دوسرا ہاتھ اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔

انتہائی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے میں نے انسپکٹر ظالم خاں سے کسی شناسائی کا اظہار اپنے رویّے سے بھی نہیں ہونے دیا۔

"یہ بدمعاش.... انہیں چھیڑ رہا تھا۔" پتلے، لمبے ہیرو نے ایک ہاتھ سے میری اور فریقِ ثانی کی نشاندہی کی۔

اب بڑی بی نے برقعے میں سے فریاد کی اور انسپکٹر رحیم کو بتانے لگی کہ کس طرح میں نے چلتے چلتے اچانک پلٹ کے اپنی بدمعاشی کا مظاہرہ کیا۔ اس بیان سے کچھ یوں لگتا تھا جیسے میں نے ان کا پردہ رکھنے والے خیمے میں داخل ہوکے ریوالور ان کی کنپٹی پر رکھ دیا تھا کہ خیریت چاہتی ہو تو یہ کوہِ نور ہیرا میرے حوالے کردو۔ بس اللہ نے ان کی معصوم بچّی کو بچالیا جو کوہِ نور تھی۔

ایک چشم دید گواہ نے بتایا کہ میں نے معصوم بچّی کا ہاتھ پکڑلیا

تھا اور اس نے مجھے نہ پکڑا ہوتا تو....

دوسرے گواہ نے تائید کی "ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچ رہا تھا تھانے دار صاحب۔ توبہ... توبہ۔"

میں معصوم بچّی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بات کچھ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے بات کا بتنگڑ بنالیا تھا اور صورتِ حال اس کے لیے انتہائی شرم ساری اور جگ ہنسائی کا سبب بن گئی تھی۔ مار پیٹ ہو جاتی تب بھی اس کی بے عزتی تھی اور اب پولیس کے آجانے سے معاملہ مزید بگڑ گیا تھا۔ اپنی بے بسی' ذلت کے احساس اور خوف سے اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

انسپکٹر رحیم خاں نے خوں آشام نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا "تو تم ہو سورما۔ راہ چلتی عورتوں کو کمزور سمجھ کے..."

میں نے منمنا کے کہا "سرجی! میری بھی تو سُنیں..."

"بکو مت! تھانے میں رات بھر سُنیں گے تمہاری۔ تیرہ نمبر کے چھتر سے تو بڑے بڑے طرم خاں بھی طنبورے کی طرح بجنے لگتے ہیں۔ چلو..." اس نے مجھے گردن سے پکڑ کے دھکیلا اور پھر دوسروں سے مخاطب ہوا "کون کون ہے چشم دید گواہ؟ تم آجاؤ... اور تم... شہزادے۔"

گواہ نمبر ایک اور دو وہی تھے جو مجھے معصوم بچّی کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنی طرف کھینچتا ہوا دیکھ چکے تھے۔ اچانک انہیں اندازہ ہوا کہ سوچے سمجھے بغیر نیک کام میں پیش پیش رہنے اور سچ بولنے والے کو تقدیر کیسے تھانے لے جاتی ہے۔

پتلی' لمبی مونچھوں والے پہلے' لمبے ہیرو نے کہا "وہ میں.... آفس سے چھٹی کر کے گھر جا رہا تھا... بچّے انتظار کر رہے ہوں گے۔"

میں نے اس کی کلائی تھام لی "نہیں بیٹے' تم تو مجھے سیدھا کرنے کے لیے تھانے لے جا رہے تھے۔ کُتّے کی دُم ہوں نا میں۔"

"ڈرتے کیوں ہو؟" دوسرے کا ہاتھ رحیم خاں نے پکڑ لیا تھا "جو یہاں بتایا تھا وہی بتا دینا۔ نام پتا لکھوا کے تمہاری چھٹی۔"

دوسرا گواہ جانتا تھا کہ تھانے پہنچ کے چھٹی اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔ اس نے بھی عذر پیش کیا "گواہ تو یہ سب ہیں.... مجھے اسپتال پہنچنا تھا..."

میں نے طنزیہ تمسخر کے ساتھ کہا "کیا روگ لگ گیا ہے اچانک پہلوان۔ تم تو ہیکڑی نکال رہے تھے میری۔"

بیشتر لوگ جو حلقے سے باہر تھے' پولیس کو دیکھتے ہی رفو چکر ہو گئے تھے۔ جو باقی بچے تھے وہ بھی کھسک رہے تھے۔ جاتے جاتے ایک شخص نے افسوس سے کہا "سالا کیسا اکڑ رہا ہے پولیس کو دیکھ کے۔"

دوسرے نے فرار ہوتے ہوئے تائید کی "سب بدمعاشی انہی پولس والوں کی حمایت سے ہوتی ہے بھائی۔"

اب رحیم خاں نے بڑی بی کو مخاطب کیا "چلیں اماں' آپ بھی بیٹھ جائیں گاڑی میں۔ اور تم بھی آؤ بی بی۔"

بڑی بی کی آواز تو پہلے ہی خاموش ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا "ارے ہم کیوں جائیں تھانے۔ ہم نے جرم کیا ہے کوئی۔ اسے لے جاؤ...."

"آپ کا بیان تو ہوگا اماں!" رحیم خاں نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اب ان کی دختر نیک اختر نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی "دیکھیے تھانے دار صاحب! ہمیں کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں لکھانی ہے' ایسی کوئی بات نہیں..."

"بات کیسے نہیں بی بی۔ ان لچے' لفنگوں کے خلاف قانونی کارروائی نہیں ہوتی اسی لیے تو یہ شیر ہو جاتے ہیں" رحیم خاں بولا "تھانے تو چلنا پڑے گا آپ کو میرے ساتھ۔"

اس نے بڑی بی کو غصے سے دیکھا "انہوں نے زیادہ ہنگامہ کر دیا ورنہ دیکھیے نا' بازار میں ٹکر تو ہو جاتی ہے۔"

"لیکن بازار میں ایسے ہنگامہ کرنا بھی تو غلط ہے۔ ٹریفک میں خلل پڑتا ہے۔ اگر بات کچھ نہیں تھی تو پھر قصور آپ کا ہے۔"

بڑی بی نے گھبرا کے کہا "اے لو۔ یہ ہمارا قصور بن گیا۔"

"اور کیا اماں۔ آپ نے اشتعال انگیزی کی" رحیم خاں بولا "اگر یہ بات بڑھ جاتی' مار پیٹ ہوتی' اس کے بھی دو چار حمایتی آجاتے' کوئی نکال لیتا چاقو یا پستول۔ دو چار بندے مر جاتے' چار چھ زخمی ہو جاتے پھر...؟"

بڑی بی ایک دم مصالحت پر آمادہ ہو گئیں "ارے چل جانے دے بیٹا۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ آئندہ نہیں کرے گا۔ صورت سے تو مجھے شریف ماں باپ کی اولاد لگتا ہے۔"

رحیم خاں نے مجھے غور سے دیکھا۔ "مجھے تو نہیں لگتا۔ ہم ویسے بھی صورت دیکھ کر نہیں چھوڑتے۔ بڑے بڑے معصوم صورتوں والے' جیب کترے' ڈاکو اور قاتل ہوتے ہیں۔ یہ بھی بتائے گا چھترول کے بعد..."

منتشر ہو جانے والے پھر قریب آگئے تھے۔ ملزم اور مدعی کے علاوہ دو چشم دید گواہوں کی گرفتاری کے بعد وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگے تھے اور اس تماشے کا ڈراپ سین دیکھنا چاہتے تھے۔ اچانک معاملہ اُلٹا ہو گیا تھا۔ اب ملزم تھانے جانا چاہتا تھا لیکن الزام لگانے والے اور ان کی حمایت میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والے رسی تڑا کے بھاگنے کی فکر میں تھے۔

رحیم خاں کا مقصد مجھے وہاں سے نکالنا تھا مگر اس کے لیے وہ بھی ضابطے کی کارروائی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھا۔ وہ صرف مجھے جیپ میں بٹھا کے لے جاتا تو گویا ایک اور ثبوت فراہم کرتا کہ قانون کے محافظوں اور مجرموں نے مل کر انجمنِ مفادِ باہمی بنا رکھی ہے۔

عمداً رحیم خاں نے اپنی جیپ میں آگے اس لڑکی کو بٹھایا جو

خاموشی سے رسوائی کے اس تماشے پر آنسو بہا رہی تھی چنانچہ پہلے سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ مجھے اس نے پیچھے اس بڑھیا کے ساتھ بٹھادیا جو فساد کی جڑ تھی۔ دونوں مظلوم گواہ میرے سامنے تھے۔

"یا اللہ۔ آج کس منحوس کا منہ دیکھا تھا...." جیپ کے روانہ ہوتے ہی بڑھیا نے آہ بھری "یا علی مشکل کشا....."

میں نے کہا "ابھی سے گھبرا رہی ہو خالہ۔ ابھی تو دیکھنا' تھانے جاکے کیا ہوتا ہے۔ ہم تو روز جوتے کھانے کے عادی ہیں۔ تم اگر پانچ ہزار دے کر چھوٹ جاؤ تو غنیمت جاننا۔ بڑا زبردست رشوت خور ہے یہ تھانے دار۔"

"پانچ ہزار!" بڑی بی پر جیسے بجلی گر پڑی۔

"اور تم بھی بندوبست کرلو اپنا بیٹے" میں نے گواہوں کو مخاطب کیا "دس دس ہزار منگوالو گھر سے۔"

"کیوں؟ ہم نے کیا کیا ہے؟" ایک نے مردہ آواز میں کہا۔

"کچھ کیا ہوتا تو پکڑے کیوں جاتے۔ پکڑے وہی جاتے ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔" میں نے کسی عادی مجرم کی طرح کہا "ہم بھی تو ان کا پیٹ بھرتے ہیں' بھتا لاکے دیتے ہیں' چوری کے مال میں سے حصے بٹاتے ہیں اور مخبری کرتے ہیں۔ ہم انہی کے آدمی ہیں۔"

"لیکن..... میں تو شریف آدمی ہوں" دوسرے گواہ کے حلق میں آواز پھنس گئی۔

"پولیس کے سامنے سب یہی کہتے ہیں۔" میں نے طنز سے کہا "میرے سامنے تو بڑی بدمعاشی دکھا رہے تھے۔"

"میں... میں.... واقعی شریف آدمی ہوں۔ میں نے کبھی ایسا ویسا کوئی کام نہیں کیا۔" پہلا گواہ تقریباً رو پڑا۔

"دیکھ بیٹے! اپنی شرافت کو بچانا ہے نا تو دس ہزار کچھ بھی نہیں" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "ہنسی خوشی دے دوگے تو فائدے میں رہوگے ورنہ یہ انسپکٹر۔ اللہ بچائے دشمنوں کو بھی اس کی مار سے۔ نام تو رحیم خاں ہے مگر ظالم خاں مشہور ہے۔"

"مگر کیا جرم کیا ہے آخر میں نے؟ میں کیوں دس ہزار دوں؟" دوسرے گواہ نے سوچ کے کہا۔

"تمہارا تو باپ بھی دے گا دس ہزار۔ کیا پتا' بیس ہزار پر اڑ جائے ظالم خاں" میں نے کہا "تمہارا جرم ثابت کرنے کے لیے وہ تھانے میں سب کچھ رکھتا ہے۔ ناجائز اسلحہ' ہیروئن کی پڑیاں' شراب کی بوتل اور چوری کا برآمد شدہ مال۔ تم نے ان کا ڈرائنگ روم دیکھا ہے کبھی؟ ہر رات وہاں اچھی خاطر تواضع ہوتی ہے۔ صبح تک سب اعترافِ جرم کرلیتے ہیں۔ خواہ مجرم ہوں یا نہ ہوں۔ عقل مند سودا کرکے چھوٹ جاتے ہیں۔"

دونوں گواہوں کی حالت غیر ہوگئی۔ میں ایک تجربہ کار "مجرم" کی حیثیت سے انہیں جو کچھ بتا رہا تھا وہ اس پر نہ چاہنے کے باوجود یقین کررہے تھے۔

"میرے گھر والے بیس ہزار کا بندوبست نہیں کرسکتے..."

دوسرے نے سرہلایا "دس ہزار بھی مشکل ہیں۔ ناممکن.."

میں نے ہنس کے کہا "نکالنے والے بھینس کے انڈے سے روغن گل نکال لیتے ہیں اور پنجابی کا محاورہ ہے جس کا مطلب کچھ یوں ہوتا ہے۔ کہ بیل کا دودھ نکال سکتے ہیں۔ رات کو وصولی کے وقت یہ تمہارے لواحقین کو بھی بلالیں گے اور ان کے سامنے تمہیں الٹا لٹکا کے تمہاری دھول جھاڑیں گے نا تو تمہارا باپ ہاتھ جوڑے گا اور بھائی منت کرے گا کہ صبح تک کی مہلت دی جائے۔ بعض اوقات یہ کپڑے بھی اُتار دیتے ہیں اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیتے ہیں۔ پھر جب بید کی آواز کے ساتھ آدمی ہوا میں ڈانس کرتا ہے نا' تو ماں اپنی چوڑیاں اُتار دیتی ہے اور بہن جہیز کا زیور نذر کرتی ہے۔ تم نے وہ محاورہ تو سُنا ہوگا۔ جتنا گُڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوگا۔ یہ اسی پر عمل کرتے ہیں۔ جتنی مار لگاؤ اتنے ہی وصول ہوں گے۔"

"میرے باپ کی توبہ..... جو آئندہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاؤں" گواہ نمبر ایک نے کانپتے ہوئے کہا۔

دوسرے گواہ نے بڑھیا کو خوں آشام نظروں سے گھورا "واقعی میں نے بھی بڑی غلطی کی۔ خواہ مخواہ اس بڑھیا کے چکر میں پڑا۔ خود اپنا منحوس چہرہ تو چھپا رکھا تھا۔ اسے سجا بنا کے لیے پھر رہی تھی کسی گاہک کی تلاش میں۔"

اب مدعی اور گواہوں کے درمیان سنگ دشنام اور تیرِ الزام سے ایسی گھمسان کی جنگ چھڑی کہ انسپکٹر رحیم خاں کو جیپ روک کے پیچھے آنا پڑا۔ اس وقت میں سارے ہنگامے سے بے نیاز بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا اور غالب کا یہ مصرع گنگنا رہا تھا۔ جس کو ہو جان و دل عزیز' اس کی گلی میں جائے کیوں۔ تھانے میں مار کھائے کیوں۔

"اب کسی کی آواز سُنی میں نے تو یہیں سڑک پر مرغا بنادوں گا۔" وہ گرج کے اور اپنی بید سیٹ پر مار کے بولا۔

میں نے متانت سے کہا "ایک کڑک مرغی کو تم کیسے مرغا بناؤ گے؟"

"چپ کرو تان سین کی اولاد۔ تمہاری کھال کا بھی طبلہ نہ بنادیا تو نام ظالم خاں نہیں" وہ پھر آگے چلا گیا۔

تھانے پہنچنے تک ہم سب ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے رہے۔ جیپ تھانے کے احاطے میں پہنچی تو عملے نے بے حد مستعدی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ شریف آدمی ہیں" انسپکٹر رحیم خاں نے گواہوں کی جانب اشارہ کیا "انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔"

ظالم خاں کی لغت میں شریف آدمی کا مطلب ہوتا تھا' لاوارث آدمی جو ذاتی اثر و رسوخ نہ رکھتا ہو جس کے خاندان میں دور دور تک وزیر مشیر تو درکنار' ایم پی اے' ڈی ایس پی یا ایس ڈی ایم تک نہیں ملتا۔ جو سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے سوچتن کرتا

ہے۔ رزقِ حلال، شجرۂ نسب اور زندہ ضمیری جیسے متروک اور بے معنی الفاظ کے کھوکھلے سہارے پر اپنی خودی کو بلند رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ عزت دار ہے۔ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

شریف آدمی کہہ کے ظالم خاں نے اپنے ماتحتوں پر واضح کردیا تھا کہ عزت کے نام پر اس کا کس حد تک استحصال ممکن ہے؟ یہ دیکھو اور رپورٹ دو۔ فنکار ماتحت اس کام میں مہارت رکھتے تھے کہ کس الزام کا ہوّا دکھا کے کسے نچوڑا جاسکتا ہے۔ کس حد تک اور کیسے۔ ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا مطلب یہ تھا کہ فی الحال مذاکرات سے کام چلایا جائے۔

جب وہ کسی کو "اپنا بندہ" کہتا تھا تو اس کا مقصد ہوتا تھا کہ اسے روکے رکھو۔ تھانے میں کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے، یہ سب اچھی طرح سمجھاؤ اور دکھادو۔ "غلطی سے" حوالات میں بھی ڈک دو تو کوئی حرج نہیں۔ گھر جانا چاہے تو مجھے پہلے بتاؤ... اور مجھے پوچھے تو کہو انچارج صاحب گشت پر ہیں۔ یہ انسپکٹر رحیم کے جاننے والوں کے جاننے والے، بہت دور کے عزیز، کسی پڑوسی کے دوست وغیرہ ہوتے تھے جو ایس ایچ او سے "واقفیت" کی بنا پر کوئی کام بلا معاوضہ کرانے کی کوشش کرتے تھے۔

تھانے کے اندر کہیں زور و شور سے تفتیش بھی ہو رہی تھی۔ زور ایک فریق کا تھا، شور فریقِ ثانی کا۔ میں یہاں اکثر آتا تھا چنانچہ ان آوازوں کا عادی ہو چکا تھا۔ بڑی بی اور ان کی صاحب زادی کے لیے یہ ماحول بڑا روح فرسا تھا اور ان کا خون خشک ہو رہا تھا۔ انچارج صاحب کا دوست سمجھتے ہوئے ایک کانسٹیبل نے دروازہ کھولتے وقت مجھے بھی سیلوٹ کیا جسے میں نے نظرانداز کردیا۔

"تشریف رکھو" انسپکٹر ظالم خاں نے طنزیہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کے کہا "آپ بھی بیٹھو خالہ۔ خالہ کی بیٹی! تم بھی بیٹھو۔"

میں نے کہا "تم بیٹھنے سے پہلے..."

"چائے کے لیے کہہ دوں؟" ظالم خاں نے میری بات کاٹ دی "کوئی ضرورت نہیں اس کی بزدل صاحب۔ تم حرام کھاتے ہی نہیں۔"

"غصہ بھی حرام ہے مگر میں پی جاتا ہوں" میں نے کرسی پر بیٹھ کے کہا "ایسے ہی چائے بھی پی سکتا ہوں۔"

اب رحیم خاں نے میرے اشارے پر ضابطے کی کارروائی شروع کی "اب بتاؤ خالہ۔"

"اس شیطان کی خالہ کو تم اپنی خالہ کہہ سکتے ہو۔ میں نے کہا تھا تو اس نے مجھے مردود کا خطاب دیا تھا" میں نے کہا۔

"وہ تو خیر ٹھیک تھا" ظالم خاں بولا اور پھر بڑی بی سے مخاطب ہو گیا "کہاں رہتی ہو تم؟ لیکن پہلے اپنا دیدار تو کراؤ، یہ پردہ تو ہٹاؤ رخِ روشن سے۔"

بڑی بی نے گھبرا کے کہا "ہائے بیٹا! یہ ظلم نہ کر۔ اس عمر میں

سعودی عرب میں مقیم پاکستانیوں کے لیے خوش خبری

سعودی عرب میں سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ [illegible] پاکستانی رسائل و اخبارات آسانی سے دستیاب ہیں

الادبیہ پبلشرز نے پا[illegible] رسالہ [illegible] سے انتظام کیا ہے۔ تفصیل جاننے کے لیے الادبیہ [illegible] یا فیکس [illegible] اپنا مکمل پتا بمعہ پوسٹ بکس نمبر اور کوڈ بھیجیں [illegible] میں آپ کے پسندیدہ رسائل و اخبا[illegible] براہ راست بھیج سکتے ہیں

الدار الادبیة لتوزیع الصحف والمجلات [illegible]

الخوبر۔ المکتب الرئیسی: تلفون: ۸۹۵ ۱۳۵۵ ص ب: ۱۵۸ ظہران ۳۱۹۳۲

المملکة العربیة [illegible]

تقسیم کار برانچ [illegible] ریاض۔ تلفون: (۰۱) ۴۷۳۰۱۰۱ فاکس: (۰۱) ۴۷۳۰۱۶۱ ص ب: ۸۷۷۵۴ ریاض ۱۱۶۵۲

جدہ: (۰۲) ۶۷۱ ۵۷۸۸ فاکس: (۰۲) ۶۷۱۲۸۲۷ ص ب: ۴۱۰۷۳ جدہ ۲۱۵۲۱

المدینة: (۰۴) ۸۳۷۰۵۱۱ فاکس: (۰۴) ۸۳۷۰۵۱۱ ص ب: ۱۵۱۸۶

کیوں بے پردہ کرتا ہے مجھے۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

"یہی تو میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ جس منہ سے ایسے پھول جھڑ رہے تھے' وہ دیکھنے کے قابل ہے بھی یا نہیں؟"

میں نے کہا "ظالم خاں! اس شرعی مسئلے پر میں تمہاری خالہ کی حمایت کروں گا۔"

"یار! ایسے کیا پتا' اندر خالہ ہے کہ خالو۔ یا کوئی درمیان کی چیز ہے خالی" ظالم خاں بولا "خالہ خالو اور خالی۔"

خالہ کی لڑکی کے حسنِ بے مثال کو پیکرِ حزن وملال دیکھ کر میرا دل ویسے ہی مجروح ہو رہا تھا۔ جب اس نے اشک بار نظریں اُٹھا کے التجا آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میرے دل کا خون ہو گیا۔ غالب نے چاہا تھا کہ زلف ہوتا تیرے رخسار پہ یا تل ہوتا۔ مجھے اس کی پلکوں پر ٹھہر کے گال پر پھسل جانے والے قطرۂ اشک پر رشک آیا۔

"دیکھیے جی! میں معافی مانگتی ہوں آپ سے ..." اس نے گلوگیر آواز میں کہا "ہمیں جانے دیں' آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

میں اپنی سرِعام بے عزتی کے خیال سے اتنا برہم تھا کہ اس آفت کی پرکالہ بڑھیا کو سزا دیے بغیر نہ جانے دیتا مگر اب یہ ممکن ہی نہ رہا۔ "ظالم خاں! ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ انہیں جیپ میں گھر بھجوادو۔ اپنی والدہ کو سمجھا دینا کہ جو دوسروں کی عزت پر حملہ کرتا ہے' اس کی اپنی عزت بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے...."

"یہ والدہ نہیں ہیں میری" اس نے سر کھجا کے کہا۔

"پھر کون ہیں؟" ظالم خاں نے مشکوک لہجے میں کہا "اور تم...."

"چلو چھوڑو اپنی تفتیش یار" میں نے کہا "جب مجھے کوئی شکایت نہیں ان سے تو بات ختم۔"

انسپکٹر رحیم خاں کے اندر کا تھانے دار تلملا کر رہ گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی ٹوپی کو دھڑ سے میز پر مارا "تم واقعی بزدل ہو۔"

لڑکی نے مجھے دیکھ کر کہا "ایسا مت کہیں۔ جو اپنے ساتھ برائی کرنے والے کو معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں' وہ بزدل نہیں ہوتے۔"

"مگر میں بزدل ہوں" میں نے کہا "میں نے بتانے کی کوشش بھی کی تھی۔ یہ میرا نام ہے۔"

"ہاں جی۔ اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں" رحیم خاں بولا "یہ وہی بزدل صاحب ہیں جو اخبار میں کالم لکھتے ہیں۔ سچی باتیں' بزدل کے قلم سے۔"

"ویسے آپ مجھے میرے پورے نام سے مخاطب کریں۔ بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس آپ کی زبان لڑکھڑا جائے گی۔" میں نے کہا "میرا قطعہ بھی شائع ہوتا ہے ہر روز۔ دلنواز میرا تخلص ہے۔"

خیمے کے اندر بڑی بی کے تاثرات کا تو میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا مگر لڑکی کا ردِّ عمل خاصا حوصلہ افزا رہا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے صرف تشکر کے جذبات تھے' اب ان میں حیرت' دلچسپی اور مسرت کے جذبات بھی شامل ہو گئے تھے۔ "آپ سے یوں ملاقات ہوگی' میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا" اس نے پُرتاسف لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "سچویشن پیدا کرنا تقدیر کا معاملہ ہے۔"

ایک کانسٹیبل چائے کی ٹرے سمیت اندر آگیا۔ جتنی دیر وہ برتن میز پر سجاتا رہا اور کھانے پینے کی چیزیں رکھتا رہا' رحیم خاں اپنی مونچھیں مروڑتا رہا۔ میں اس لڑکی کو دیکھتا رہا جو نظریں جھکائے زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس نے حزن وملال کی کیفیت کو یوں اُتار پھینکا تھا جیسے کوئی میلا ہو جانے والا لباس اُتار کے اُجلے کپڑے پہن لے۔ اس کا اعتماد لوٹ آیا تھا اور اب اس کے لب ہی نہیں' آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ کیا اسے میرا آج صبح شائع ہونے والا قطعہ یاد آرہا ہوگا۔ میں نے سوچا' یا وہ کالم جو میں نے گزشتہ روز لکھا تھا۔ لڑکی باذوق معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اس نے ایک سوال کر کے میری اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا "یہ کالم آپ کس اخبار میں لکھتے ہیں جی۔"

میں نے بھنّا کے کہا "ایک اخبار ہے جی۔ حقیقت ساز۔"

رحیم خان ہنسنے لگا "بھائی میرے' کون پڑھتا ہے ایسے اخبار۔"

"تم جیسے لوگ ضرور پڑھتے ہیں" میں نے کہا "جن کا سارا کچا چٹھا بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی جانتا ہے۔ مگر جو اخبار کو صرف پکوڑے بیچنے کے لیے ردّی میں خریدتا ہو اسے کیا۔ جاہل تو نوشتۂ دیوار بھی نہیں پڑھتے۔"

"میں پڑھتا ہوں" رحیم خاں بولا "مجھے پڑھنا پڑتا ہے کہ آج شہر کی دیوار پر کیا نعرے لکھے ہوئے ہیں۔ کس کو پھانسی دو' کس کو رہا کرو۔"

لڑکی نے کہا "دیکھیے..... میں معافی چاہتی ہوں۔ یہ اخبار میں نے واقعی کبھی نہیں پڑھا مگر میں بزدل صاحب سے واقف ہوں۔ بہت اچھی طرح۔ اور میں جاہل بھی نہیں ہوں۔ میٹرک بھی کر لیتی پرائیویٹ مگر پرچے آؤٹ آف کورس آگئے تھے..."

"ماشاء اللہ' چشم بددور آپ تو بہت عالم فاضل ہیں" میں نے طنز سے کہا "برا نہ مانیں تو ایک سوال ذاتی سا پوچھوں؟"

"اپنے کالم میں لکھیں گے نا" وہ بولی "میں سب کو دکھاؤں گی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے دل ہی دل میں کہا "بی بی' میرا کالم کسی کی ذاتی پبلسٹی کے لیے نہیں ہوتا۔ اتنا شوق ہے تو تصویر کے ساتھ اپنا اشتہار لگوادیں' خود ہی دیکھ لیں گے سب۔ تلاشِ گم شدہ..."

رحیم خاں نے کہا "وکیل صاحب' چائے پئیں اور دفع

ہو جائیں اور مجھے تشریف لے جانے کی اجازت دیں ..... مجھے دنیا میں اور بھی کام ہیں۔"

"اس دنیا میں تم جو کچھ کرتے ہو' دوسری دنیا میں روسیاہی کے لیے کرتے ہو۔" میں نے کہا "اس سے بہتر یہ ہے کہ تم کچھ نہ کرو۔"

لڑکی نے چائے کا کپ رکھ دیا "آپ وکیل بھی ہیں؟"

"آہستہ آہستہ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بزدل صاحب سب کچھ ہیں اور کچھ بھی نہیں ہیں" رحیم خاں بولا۔

میں نے ذہن پر زور دے کر کہا "آپ کی صورت مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے میں نے۔"

"دیکھو یار! یہ طریقہ بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اس قسم کی باتیں کب سے کر رہے ہو تم لیکن ابھی تک لاوارث ہو۔ پھر رہے ہو لنڈورے۔"

"ظالم خاں! خبردار جو اس کے بعد کچھ کہا" میرا پارہ چڑھ گیا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا "بزدل صاحب' سچی باتیں لکھتے ہو تو سُننے کا حوصلہ بھی پیدا کرو۔ میں نیلم کی تو کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ تم گپ لگاؤ' میں چلتا ہوں۔"

بلاشبہ وہ ایک کمینہ شخص تھا اور پولیس کی نوکری نے اسے اذیت پسند بنا دیا تھا۔ وہ ملزموں پر جسمانی تشدد سے اتنا ہی لطف اندوز ہوتا تھا جتنا عام لوگوں کو اپنی زہر افشانی سے ذہنی عذاب میں مبتلا کر کے۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ دن رات چوروں ڈاکوؤں' قاتلوں اور بدمعاشوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ ان کی محبت کا اثر ہے اور کچھ پیشہ ورانہ ضرورت۔ ان کے ساتھ آپ جناب کی زبان میں تو بات نہیں کی جا سکتی۔ عادت پرانی ہو جائے تو آدمی کی فطرت بن جاتی ہے اب وہ مجھے بھی نہیں بخشتا تھا۔ اسکول کے زمانے سے وہ مجھے جانتا تھا اور میں اس کو تمام اختلافات کے باوجود اپنا دوست سمجھتا تھا۔ ہمارے درمیان تعلق کی واحد بنیاد وہ وقت تھا جو ہم ایک ساتھ گزار چکے تھے ورنہ اس کے اور میرے درمیان خیالات' نظریات' عادات و اطوار' مشاغل اور افتادِ طبع کے اعتبار سے زمین آسمان کی دوری تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس نیلم کو میں نے ایک طوفانی اور ہنگامہ خیز محبت کے بعد حاصل کیا تھا' وہ شادی کے بعد صرف اس لیے میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی کہ وہ دولت کے نازونعم کی پروردہ لڑکی مجھے خوش حالی کے اس راستے پر چلانے میں ناکام رہی تھی جس پر باقی دنیا سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ وہ میرے اصول پرستی اور ضمیر پرستی کے نظریات کے ساتھ مفاہمت کرتی تو اسے ساری عمر کرائے کے اس چھوٹے سے فلیٹ میں گزارنی پڑتی جس کے مقابلے میں اس کے باپ کی کوٹھی کا سرونٹ کوارٹر بھی بڑا تھا' اس خستہ تن موٹر سائیکل پر میرے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے بیٹھ کے گھومنا پڑتا جس کی چھال دیکھ کے گمان ہوتا تھا کہ اس میں پٹرول کے بجائے شراب ڈال دی گئی ہے۔ خمارِ عشق ٹوٹا اور لذتِ خواب سحر گئی تو زندگی کا دوسرا رخ جو سنگین حقائق اور تلخ تجربات کا آئینہ دار تھا' پہلی بار اس کے سامنے آیا اور اس کو شدت سے احساس ہونے لگا کہ اس کا باپ ٹھیک کہتا تھا۔ مادی دنیا کے تقاضے خیالی دنیا میں رہنے والے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ شادی کے صرف ایک سال بعد جب میں اپنے پہلے بچے کو قبل از وقت پیدائش اور موت سے بچانے کے لیے مالی مسائل کا حل تلاش نہ کر سکا' خود کو گروی رکھ کے بھی قرض نہ لے سکا اور اس کے فرعون صفت باپ کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے نہ جا سکا تو نیلم مجھے خود غرض' سنگدل اور قاتل جیسے خطابات سے نواز کے ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

میں آج بھی کرائے کے اُسی فلیٹ میں ہوں' اُسی موٹر سائیکل پر گردش میں رہتا ہوں اور بیک وقت وکالت اور صحافت سے شوق کرنے کے باوجود میں نے نام کے سوا کچھ نہیں کمایا۔ نیلم اب ایک کروڑ پتی امپورٹر ایکسپورٹر کی بیوی تھی۔ اس کے شوہر کا تعمیرات کی دنیا میں بڑا نام تھا۔ شاید مجھ سے زیادہ وہ باوردی شوفر کمالیتا ہو گا جو اس کی چمکتی دمکتی ہنڈا اکارڈ چلاتا تھا مگر اس کے باوجود نیلم نے مجھے معاف نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں میری محبت اب نفرت کا کینسر بن کے پھیل رہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں نے محبت کے نام پر اسے فریب دیا' رسوا کیا اور ذہنی و جسمانی عذاب میں مبتلا رکھا۔ وہ سب میرے کمپلکس تھے جن کی وجہ سے میں خود غرض' سنگدل اور قاتل بنا۔ اب وہ مجھ سے انتقام لے رہی تھی اور میں سب کچھ دیکھنے' سمجھنے اور محسوس کرنے کے باوجود نہ کسی سے کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ جوابی کارروائی کر سکتا تھا کیونکہ میں ثابت کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

نیلم کا نام میری کمزوری تھا اور انسپکٹر ظالم خاں میری دکھتی رگ پر انگارہ رکھنے کے لیے صحیح موقع کبھی نہیں گنواتا تھا۔ میں نے بتایا نا کہ وہ ذہنی تشدد کا ماہر تھا لیکن اپنی دانست میں وہ میرا علاج کرتا تھا تاکہ مجھے نیلم کے آسیب سے چھٹکارا مل جائے۔

جب ایک کانسٹیبل چائے کے برتن اُٹھانے کے لیے آیا تو میں چونکا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی "اوہ! معاف کیجئے گا... بہت دیر ہو گئی۔"

"یہ نیلم کون ہے؟" اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "جس کے نام نے آپ کو اتنا مغموم کر دیا۔"

میں نے جھنجھلا کے کہا "محترمہ! غلط خیال ہے آپ کا۔ میں ذرا بھی مغموم نہیں ہوں اور آپ کو میری ذاتی زندگی کے بارے میں سوال کرنے کا حق کس نے دیا ہے..."

"آخر آپ بھی تو مجھ سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتے تھے۔" اس نے بڑی سادگی و عیاری سے کہا۔

لاجواب ہو کے میں نے کانسٹیبل کو ڈانٹا۔ "اتنی دیر سے بیٹھے ہیں ہم' کیا انچارج صاحب بتا کے نہیں گئے تھے کہ انہیں جیپ میں

گھر چھوڑ کر آنا ہے۔"
کانسٹیبل نے سپاٹ لہجے میں کہا "جیپ تو لے گئے ہیں وہ ساتھ۔"
"اچھا کوئی ٹیکسی پکڑ کے لاؤ" میں نے کہا۔
"کہاں جانا ہے؟" کانسٹیبل نے سوال کیا۔
"کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا اور بڑی بی سے مخاطب ہوا جواب اپنے گنبدِ بے در میں گم صم بیٹھی تھیں۔ "کہاں جانا ہے خالہ؟"
"ہم چلے جائیں گے جی' آپ تکلیف نہ کریں" لڑکی نے کہا۔
"مجھے اپنے آفس جانا ہے۔ چندریگر روڈ پر سنی پلازا" میں نے کانسٹیبل سے کہا اور پھر لڑکی سے مخاطب ہو گیا "اگر اس راستے میں آپ کہیں اُترنا چاہیں تو مجھے بتا دیں' مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"
"جانا تو ہمیں بھی اُدھر ہی ہے بیٹا۔ یہ اپنا جنگ اخبار کا دفتر نہیں ہے' وہاں سے راستہ نکلتا ہے ریلوے کوارٹروں کی طرف" بڑی بی نے کہا۔
کانسٹیبل کے جانے کے بعد میں نے کہا "نیلم میری بیوی تھی جو مجھے چھوڑ کے چلی گئی..."
"کیوں؟" اس نے غیر ارادی طور پر سوال کر دیا۔
"اس لیے کہ میں بزدل ہوں" میں نے کہا "میں بس یہی کر سکتا تھا جو کر رہا ہوں یعنی جھک مار سکتا تھا۔ بہادر ہوتا تو سی ایس ایس میں کامیابی کے بعد اسسٹنٹ کمشنر بن جاتا' ڈاکے ڈالتا لوگوں کے حقوق پر' سرکار کے خزانے پر' عوام کی جیبوں پر اور عزتوں پر... خیر... یہ میں نے اس لیے بتا دیا کہ مجھے بھی آپ سے ایک ذاتی سوال کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔"
"میں خود بتا دیتی ہوں اپنے بارے میں۔" وہ بولی "میرا نام تو رضیہ بانو تھا مگر میں نے انارکلی رکھ لیا ہے۔ آپ نے میری تصویر دیکھی ہوگی۔ میں ماڈل بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ابھی ایک ہی اشتہار ملا ہے۔"
میں نے چٹکی بجا کے کہا "رائٹ۔ کسی کنسٹرکشن کمپنی کا اشتہار تھا۔ گلستانِ جوہر کے کسی پلازا کا۔"
اس نے خوش ہو کے کہا "دوسرا ٹی وی کا کمرشل بھی بن گیا ہے۔ آج کل میں چلے گا۔ اس کے بعد..."
"آپ کو ڈراموں میں کاسٹ ہونے کی اُمید ہے۔ کئی پروڈیوسر آپ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں' آپ کو شوق بھی ہے مگر آپ کے گھر والے مخالف ہیں۔ آپ کو یقین ہے کہ چھوٹی اسکرین سے بڑی اسکرین کا راستہ کھل جائے گا... ایک دو فلمساز جو نئے چہرے تلاش کر رہے ہیں..."
وہ منہ کھولے مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "آپ کو معلوم تھا میرے بارے میں..."
"میں ہر رضیہ بانو کے بارے میں جانتا ہوں جو انارکلی بن کے اسی طرح ریلوے کوارٹرز کی دنیا سے روشنیوں اور گلیمر کی دنیا کا راستہ اختیار کرتی ہے تو اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا "چلیں' ٹیکسی آ گئی ہے۔"
میں نے انارکلی کو جنگ کے دفتر کے سامنے سے گزر کر ایک تنگ' چور دروازے میں غائب ہوتے دیکھا جہاں سے ریلوے کا اوور ہیڈ برج شروع ہوتا تھا اور پھر ٹیکسی کے میٹر کو دیکھ کر تو میرا دل ڈوبنے لگا۔
سنی پلازا پر اُتر کے میں نے کہا۔ "تم تو مجھے کیماڑی لے آئے۔"
گنجے ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ "یہ کیماڑی ہے؟"
"کرائے کے حساب سے ہے" میں نے کہا "ٹاور پر سودا کرتے ہو؟"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ زیادہ سے زیادہ ٹاور تک کا کرایہ لے لو۔ کیماڑی تک کا کرایہ تو میں نہیں دوں گا۔" میں نے کہا۔
وہ نیچے اُتر آیا "تمہارا تو باپ بھی دے گا۔"
میں نے کہا "چلو تمہارے والد صاحب کو بُلا کے فیصلہ کرا لیتے ہیں۔ وہ سامنے کھڑے ہیں۔"
سامنے پولیس ہیڈ کوارٹر تھا۔ اور وہاں ایک ٹریفک سارجنٹ ساڑھے سات ہارس پاور کی موٹر سائیکل کے ساتھ کھڑا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ بزدل کو شہر کے بیشتر پولیس والے اس کی سچ باتوں کی وجہ سے جانتے تھے۔ اور پہچانتے اس لیے تھے کہ سب سچ کے دشمن تھے۔ ان میں سے بیشتر میرا قاتل کہلانے کا اعزاز حاصل کرنے کے خواہش مند بھی ہوں گے۔
میرے اشارے پر وہ پہلے چونکا پھر مجبوراً چند قدم آگے آیا۔ مجبوراً اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجبوراً مسکرایا "اب کیا ہو گیا جنابِ عالی؟"
اس کے طنز کو ٹیکسی والے نے تعظیم سمجھا "چلیں سر' جیسی آپ کی مرضی۔"
میں نے کہا "صدر سے ٹاور کا فاصلہ معلوم کرنا تھا۔ کچھ اندازہ ہے؟"
"کل گھر سے فیتہ لے کر آؤں گا تو ناپ کے بتاؤں گا" سارجنٹ بولا۔
ٹیکسی ڈرائیور ابھی گاڑی میں بیٹھا بھی نہیں تھا کہ اچانک اس کا سر لال غبارہ بن گیا۔ اوپر سے پڑنے والی پان کی پیک نے اس کے کپڑے بھی خوں رنگ کر دیے۔
اوپر کی ہر منزل پر درجنوں کھڑکیاں تھیں اور سب کھلی ہوئی تھیں مگر وہ منہ غائب ہو چکا تھا جس نے پیک ارسال کی تھی۔ ڈرائیور کا غصے اور خفت سے بُرا حال تھا کیونکہ میں بھی اس پر ہنس

رہا تھا۔ اس نے پان کی کاشت کرنے والوں سے پان کے امپورٹرز اور پان کھا کے پیک اُگلنے والوں تک سب کو وہ گالیاں دیں جو میں توپ صاحب کو نہیں دے سکتا تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ کسی دن ان کے ستارے گردش میں ہوں تو وہ اس شخص پر پیک کی پچکاری ماریں جو منہ اُٹھائے اوپر ہی دیکھ رہا ہو اور پھر وہ اوپر آ کے ان کو اسی طرح رگڑے جیسے وہ پان، کتھا، چھالیہ، تمباکو اور قوام کے ملغوبے کو منہ ہی منہ میں آدھے گھنٹے تک گھونٹتے تھے۔

سارجنٹ کی سفید وردی بال بال بچ گئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور تو جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے سر صاف کر کے نو دو گیارہ ہو گیا تھا مگر وہ ابھی تک شرلاک ہومز کی طرح اوپر دیکھ رہا تھا۔

"جس دن بھی میں نے اس کو پکڑ لیا نا، یہ بندہ خون اُگلے گا۔ لیکن منہ سے نہیں" سارجنٹ نے عزمِ مصمم کے ساتھ اعلان کیا۔

"یہ کون؟" میں نے انجان بن کے کہا "تمہیں کیا معلوم، یہ کوئی بندہ تھا یا اوپر سے کوئی پرندہ گزرا تھا جس کی خوراک میں صرف سُرخ چیزیں شامل ہوں مثلاً ٹماٹر، شربتِ روح افزا..."

چوتھی منزل پر اپنے آفس میں پہنچ کے میں نے سیدھا توپ صاحب کے کمرے کا رخ کیا۔ تفنگ چنگیزی اس اخبار کے مالک، منیجر اور مدیرِ اعلیٰ سب کچھ تھے۔ یہ ان کا دفتر بھی تھا، گھر بھی اور کلب بھی۔ اخبار ان کا اوڑھنا بچھونا، سب کچھ تھا۔ وقت نے یا عمر نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ آج بھی شیروانی کے ساتھ ترکش ٹوپی لگاتے تھے، وہ پجامہ پہنتے تھے جس کا ہر پائنچہ نصف غرارے کے برابر ہوتا تھا۔ تنگ آ کے لوگوں نے ان پر ہنسنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جو کسی بات کا بُرا ہی نہ مانے اس پر ہنسنے کا فائدہ؟ وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی نوجوانوں سے زیادہ جوان، زندہ دل اور دریا رباش تھے۔

"آؤ میاں بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی" انہوں نے مجھے دیکھتے ہی شفاف سر پر ہاتھ پھیر کے کہا "لو پڑھو۔ پھر نوٹس آ گیا۔"

میں نے نوٹس کو ایک طرف پھینک دیا۔ "توپ صاحب، مجھے معلوم ہے، نوٹس آپ خود جاری کرواتے ہیں، پبلسٹی کے لیے۔ میرے قطعات اور کالم اب کسی پر گراں نہیں گزرتے۔ سب ڈھیٹ ہو گئے ہیں نیچے سے اوپر تک۔ پھر بھی آپ سے کم ہیں۔"

انہوں نے حلق سے ایک بار "کھی" کی آواز نکالی۔ ان کی باقی ہنسی بالکل بے آواز رہی "وہ یار! مجھے معلوم ہے، تم کیوں خفا ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ نیچے تم کھڑے ہو مگر تم پر تو داغ بھی نہیں آیا میرے چاند۔"

میں نے کہا "اس ٹیکسی ڈرائیور نے دیکھ لیا تھا آپ کو پیک تھوکتے ہوئے، وہ آلاتِ قتل لینے گیا ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" وہ انڈا دینے والی مرغی کی طرح کڑکڑائے "میاں! جتنی دیر میں پیک نیچے پہنچتی ہے، ہم یہاں مدیرِ اعلیٰ کی کرسی پر بیٹھ چکے ہوتے ہیں۔"

"توپ صاحب! اس سارجنٹ کے ارادے بھی خطرناک ہیں۔ قسم کھا رہا تھا کہ وہ کسی دن پتا چلا لے گا۔ لہولہان کر دے گا آپ کو۔"

"ہاں ہاں۔ کھڑا رہے سارا دن منہ اوپر کیے۔ سالے کی گردن اکڑ کر ٹوٹ جائے گی، آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ ہم بھی موقع محل دیکھ کے کام کرتے ہیں۔" توپ صاحب نے ایک اور پان منہ میں رکھ لیا۔

"خدا کے لیے توپ صاحب! آپ پڑھے لکھے، مہذب آدمی ہیں۔ اس طرح پیک تھوکنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

"سچ کہتے ہو تم ہمیشہ۔ مگر بزدل صاحب، کبھی آپ نے ہمیں سڑک پر، سیڑھیوں میں یا اسپتال کی دیوار پر پیک تھوکتے دیکھا؟ ٹیکسی سے منہ نکال کے یا فٹ پاتھ پر تھوکتے دیکھا؟ لیکن اوپر سے پیک کا چھڑکاؤ کرنا تو ہم نے لندن میں بھی نہیں چھوڑا تھا۔ یہی تو ایک تفریح رہ گئی ہے ہماری۔ جب ہم تصور کرتے ہیں کہ پیک نے کہاں کس پر گل کاری کی ہوگی اور اس نے کیا کچھ فرمایا ہوگا تو جی خوش ہو جاتا ہے۔"

"آج تو حد ہو گئی۔ اس بے چارے کا سر پہلے ہی صاف تھا، آپ نے لال رنگ پھیر دیا۔"

وہ اب یوں ہنسنے لگے جیسے تنگ منہ کی پانی سے بھری ہوئی بوتل خالی ہوتی ہے "میاں ایمان سے کہو، پھر کیا کہا اس نے؟"

میں نے آہ بھری "کاش میں آپ سے کہہ سکتا توپ صاحب لیکن کسی دن میں آپ کو ٹیپ ضرور سناؤں گا، اگر موقع ملا۔"

"اچھا چھوڑو یہ سب۔ لاؤ قطعہ کہاں ہے؟" توپ صاحب فوراً ہی میز پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ "گزشتہ ہفتے تم نے جو کالم لکھا تھا اس کے جواب میں چار فون آئے تھے۔ میرا مشورہ ہے کہ دو چار دن زرہ بکتر پہن کے گھومو۔ شہر کے نام نہاد پہلوان نورا کشتی کے مسئلے پر بہت چراغ پا ہیں۔"

میں نے کالم جیب سے نکال کر انہیں پیش کیا "اب ہمارے درمیان نیا معاہدہ ہو جانا چاہیے۔ زرہ بکتر اور زندگی کا بیمہ آپ کے ذمے۔ ماہانہ مرہم پٹی الاؤنس پانچ سو روپے، دودھ حلیبی الاؤنس دو سو روپے ماہانہ، جوتے چٹخانے کا الاؤنس تین سو روپے۔"

مگر حسبِ عادت توپ صاحب کالم پڑھنے میں محو تھے اور میری کوئی بات نہیں سُن رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد وہ سر اُٹھا کے کہیں گے "بڑے خسارے میں چل رہا ہے اخبار بزدل صاحب۔ روز سوچتا ہوں، بس آج آخری شمارہ۔ پھر خیال آتا ہے، تمہارا کیا بنے گا۔ وکالت تو تمہاری چلتی نہیں، شادی تمہاری نہیں ہوئی۔ قلاش ہو جاؤ گے تو عشق بھی کتنے دن چلے گا۔ تم بھی کچھ تعاون کرو۔ قطعہ ہی بلا معاوضہ لکھ دیا کرو۔ یا کالم کے ریٹ آدھے کر دو۔"

ظاہر ہے اس کے بعد تنخواہ بڑھوانے کی بات ناممکن ہو جاتی اور ہم ذاتیات پر اُتر آتے تھے۔ بُرا پھر بھی کوئی نہیں مانتا تھا۔ نہ

توپ صاحب نہ میں۔ چنانچہ گاڑی چل رہی تھی اور ان کا اخبار "حقیقت ساز" بھی چل رہا تھا اور میرے اور توپ صاحب کے علاوہ محلّے کے چند اور مجبور افراد کے لیے وسیلۂ روزگار تھا۔

شعبۂ کتابت میں ایک کاتب سو رہا تھا' دوسرا اپنی تقدیر کو رو رہا تھا۔ اداریہ ختم کرتے ہی اسے میرے کالم کی کتابت دے دی گئی تھی۔ نیوز روم میں اس وقت سکون تھا۔ خالی ڈیسک پر بیٹھ کے میں دریائے سخن میں غرق ہوگیا اور جب آدھے گھنٹے بعد نکلا تو قطعہ ہوچکا تھا۔ جیسے ریڈی میڈ مرغی اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے ہر روز ایک انڈا دینے پر مجبور ہے ایسے ہی دلنواز لالہ موسوی بلاناغہ ایک قطعہ کہنے پر مجبور ہے اور ہر ہفتے ایک کالم لکھنا بزدل کی مجبوری ہے۔

قطعہ میں نے تفنگ چنگیزی کے سامنے رکھا۔

اس کے ابّا میری روداد محبت کی غزل
سُن کے بولے "کیوں بے تیرا ختم لیکچر ہوگیا؟"
ایک پسلی' ناک کی ہڈی' کلائی' بائیں ٹانگ
در جواب آں غزل سب ہی فریکچر ہوگیا

حسب معمول وہ پھڑکے اور "کھی" کرکے ہنسنے کے بعد انہوں نے محض تعریف سے مجھے ٹالنے کی کوشش کی۔ از خود ان کا ہاتھ جیب کی طرف نہیں جاتا تھا۔

میں نے کہا "نکالیے سو روپے۔ اور کالم کے پانچ سو بھی۔"

"میاں' ایسی بھی کیا بے مروتی۔ لے لینا۔"

میں نے کہا "آپ تو جانتے ہیں توپ صاحب' اُدھار محبت کی قینچی ہے اور قینچی آلۂ قتل بن سکتی ہے۔"

انہوں نے بادلِ ناخواستہ چھ سو روپے نکالے "یار' تم صحافی' وکیل اور شاعر ہی نہیں' یہودی بھی ہو۔"

میں نے کہا "جی شکریہ۔ اب میں چلتا ہوں۔ کسی کا فون تو نہیں آیا تھا میرے لیے؟"

انہوں نے آہ بھری "آیا تھا اسی بدبخت کا جس کی طرف تم جارہے ہو یہ چھ سو روپے لے کر۔ اُڑادوگے شام تک رئیس زادے بن کر۔"

میں نے بھنّا کے کہا "آپ کو کس پر اعتراض ہے۔ ڈاکٹر صائمہ سے میرے عشق پر یا میرے رئیس ہونے پر۔"

"جاؤ جاؤ' میری طرف سے جہنم میں جاؤ مگر یہ ایک کام ہے تمہاری مرضی کا" انہوں نے ایک کارڈ میری طرف کھسکادیا۔ "یہ ایک ہمارے یارِ غار ہیں۔ فلمسازی کے میدان میں کودے ہیں۔ ہم نے تو بہت سمجھایا تھا کہ میاں گھاس کھا گئے ہو۔ آرٹ فلم بناؤ گے اس ملک میں جہاں سب سے بڑا آرٹ ہے منافقت۔ نہاری اور حلیم میں بڑا فائدہ ہے مگر وہ نہیں مانے۔ اللہ انہیں معاف کرے' شام کو ایک پریس کانفرنس میں فلم کا اعلان کریں گے۔ دو افراد کو مدعو کیا ہے۔"

"معاف کیجئے' مجھے کوئی شوق نہیں۔"

"اعلان بڑے اچھے ہوٹل میں کیا جائے گا۔ بعد میں عشائیہ بھی ہے۔" توپ صاحب نے لفافہ واپس کھینچ لیا "چلو میں کسی اور کو بھیج دوں گا۔"

میں نے لفافہ چھین لیا "اگر یہ بات ہے تو میں بڑے شوق سے جاؤں گا بلکہ ہم.... یعنی میں اور وہ.... خدا حافظ۔"

○☆○

میں نے پھر چلّا کے کہا "آہ۔ میرا سر! ڈاکٹر صائمہ! اگر تم آج شیو کرا کے دیکھو تو میرے سر کی سطح پر تمہیں تیرہ گومڑ نظر آئیں گے۔"

اس نے متاثر ہوئے بغیر کہا "اپنے سر کی حفاظت کرنا تمہارا کام ہے۔"

"حفاظت کیا خاک کروں" میں نے کہا "تم جان بوجھ کے اس ڈیا کو گڑھوں میں سے گزار رہی ہو اور ندی نالوں میں سے۔"

"سر جھکا کے بیٹھو" اس نے مجھے مشورہ دیا۔

"اور کتنا سر جھکاؤں؟ کیا ڈیش بورڈ کے نیچے گھس کے مرغا بن جاؤں؟ پتا نہیں باہر سے دیکھنے والے کیا سمجھ رہے ہوں گے۔ ایسے سر جھکا کے تو مجرم بھی نہیں بیٹھتے پولیس کی گاڑیوں میں۔ میں ایک زر خرید زن مرید نظر آتا ہوں' اس پوز میں کہ سر تسلیم خم ہے۔"

"قصور تمہارے سر کا ہے' میرا نہیں" وہ مسکرانے لگی۔

"پھر کیا کروں' اسے کٹوادوں؟" میں نے بھنّا کے کہا "اچھا لگے گا جب تمہارے ساتھ ایک سر کٹا انسان بیٹھا ہوگا۔"

"پھر کیا میں گاڑی کی چھت کٹوادوں؟"

"پوری چھت نہ سہی' تم اس میں اتنا بڑا سوراخ تو کرا سکتی ہو جس میں سے سر باہر نکال کے میں گاڑی کے اندر سیدھا بیٹھ سکوں۔ آہ' ایک اور گومڑ۔ چودھواں۔"

"یہ اسپیڈ بریکر تھا۔" صائمہ نے مجھے مطلع کیا۔

"یہ ہیڈ بریکر تھا" میں نے سر تھام کے کہا۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں جب بالآخر میں ڈاکٹر صائمہ کی بالکل نئی مگر کھلونے جتنی گاڑی سے برآمد ہوا تو مجھے یقین تھا کہ میں انسان سے زیادہ ایک فلائی مخلوق لگ رہا ہوں۔ میری ٹانگیں بریکٹ جیسی ہوگئی تھیں چنانچہ میری چال کچھ پینگوئن جیسی تھی۔ اور میرے سر کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں سے چودہ سینگ نکلے ہوئے تھے۔ صائمہ نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ڈیڑھ انچ کی کنگھی پیش کرتے ہوئے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں بالکل نارمل نظر آرہا ہوں۔

"مگر مجھے ہینڈسم نظر آنا چاہیے تمہارے ساتھ چلتے ہوئے" میں نے کنگھی شکریے کے ساتھ واپس کی "اللہ نے تمہیں توفیق دی ہے ڈاکٹر صائمہ! تم ایک بڑی گاڑی بھی لے سکتی ہو۔"

"ضرور لوں گی۔ لیکن کسی کمپنی نے ابھی تک زرافے اور

اونٹ جیسی چیزوں کو لانے لے جانے کے لیے..... کوئی گاڑی نہیں بنائی۔"

دوسرے فلور کے ہال میں خاصی گہما گہمی تھی۔ شوبزنس کے چچوں کے بعد سب سے زیادہ تعداد میں میری صحافی برادری کے لوگ تھے۔ ان میں سے ایک چکی داڑھی والے نے دانت نکال کے مجھے آنکھ ماری۔ میں نے اس کے دانت توڑ کے ہتھیلی پر رکھنے یا اسے کانا کرنے کا سوچا مگر اسی وقت بیک وقت تین فوٹوگرافر میری طرف لپکے اور کھٹا کھٹ انہوں نے فلیش چمکا کے صائمہ کی تین تصویریں اُتار لیں' صائمہ نروس ہوگئی۔

میں نے ایک فوٹوگرافر کو پکڑلیا۔ "بیٹے! تم نے اجازت کے بغیر تصویر اُتاری ہے۔ کیوں نہ اجازت کے بغیر میں تمہارے کیمرے سے فلم نکال کے ضائع کروں؟"

"یار بزدل صاحب! ایسی بھی کیا بات ہے" دوسرے نے پھر فلیش چمکایا "ہم اتنی دیر سے انتظار کررہے تھے' ہمیں کیا معلوم تھا....."

تیسرے نے پیچھے ہٹتے ہوئے صائمہ کے چہرے پر فوکس کیا "واقعی۔ کیا زبردست فوٹو جینک فیس ہے۔"

چوتھا اچانک بیچ میں کودا "اِٹ از اے رئیل سرپرائز۔"

(IT IS A REAL SURPRISE)

ایک سینئر فلمی صحافی نے جو میرا دوست بھی تھا' مبارک باد کے انداز میں مصافحہ کیا۔ "فلم انڈسٹری کی اس نئی دریافت کا سہرا تمہارے سر ہے؟"

ایک کونے سے آواز آئی "ہے تو بزدل مگر کیا ہاتھ مارا ہے یار"

میں پریشان ہوگیا "میں واقعی ہاتھ ماردوں گا کسی کے۔"

بھیڑ چال میں اب دوسرے فوٹوگرافر بھی صائمہ کی تصویریں اُتارنے کے مقابلے میں شریک ہوگئے تھے۔ صائمہ کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

ایک انگلش اخبار کے رپورٹر نے کہا "ایک آرٹ مووی کے لیے ان کا چہرہ بہت موزوں ہے مگر یہ اتنی نروس کیوں ہیں؟"

دوسرے نے براہِ راست سوال کیا "خاتون! کیا آپ نے پہلے کسی کیمرے کو فیس نہیں کیا؟"

ساری بات سمجھ میں آتے ہی میں نے چلّا کے کہا "فرینڈز' فوٹو گرافرز اینڈ فولز۔ FRIENDS, FOTOGRAPHERS AND FOOLS تم سب شدید غلط فہمی کے باعث اپنے سوال اور اپنی فلم ضائع کررہے ہو۔ یہ ڈاکٹر صائمہ ہیں اور اپنے کلینک کے سوا انہوں نے کہیں کام کرنے کا سوچا تک نہیں ہے۔ بہتر ہے انتظار جاری رکھو۔"

تاسف اور مایوسی کی بہت سی آوازوں کے ساتھ حملہ آور پسپا ہوئے اور اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے چند اب بھی بے یقینی اور حسد کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں صائمہ کو آگے لے گیا جہاں اتفاق سے ایک میز پر دو افراد کی جگہ خالی تھی۔ باقی دو کرسیوں پر دو بوڑھے اونگھ رہے تھے۔

"معاف کرنا' یہ سمجھے تھے کہ تم ہی اس فلم کی نئی ہیروئن ہو" میں نے اسے بٹھا کے معذرت کی۔

صائمہ اب بھی بدحواس تھی "عجیب لوگ ہیں..."

میں نے کہا "سارا قصور تمہارے اس گولی مار حسن کا ہے..."

ایک بوڑھا چونکا "کس کو گولی ماروں گولی ماریں..."

پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "سر! آپ.... وہ ہیں۔ بزدل؟" وہ ہوٹل کا ویٹر تھا۔

دوسرا بوڑھا طنز سے مسکرایا "یہ آج کل کے چھوکرے سب بزدل ہیں۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔ فرام حقیقت ساز۔ کیا بات ہے؟"

"وہ پروڈیوسر صاحب نے بولا ہے کہ آپ ادھر آجاؤ۔ اسپیشل کلاس میں" ویٹر نے کہا۔

میں نے حقارت سے دونوں بوڑھوں پر نظر ڈالی اور فاتحانہ شان سے اپنے پیشہ ور حاسدوں کو دیکھتا ہوا صائمہ کے ساتھ اس حصے میں چلا گیا جو ڈائس کے دائیں جانب خصوصی مہمانوں کے لیے تھا۔ وہاں کرسیوں کے بجائے صوفے رکھے گئے تھے۔ بائیں جانب کے صوفوں پر فلمی صنعت کے کچھ ناکام اور سیکنڈ ہینڈ لوگ بیٹھے تھے۔ زنانہ صفات کے حامل ہیرو اور مردانہ حسن رکھنے والی ہیروئنیں' چند پروڈیوسر جو اصولاً کشکول لے کر کسی فٹ پاتھ پر بیٹھتے تو مالی طور پر زیادہ خوش حال رہتے۔ ایک دکھی اور مظلوم صورت ولن نے مجھے دیکھ کر ہاتھ بھی ہلایا۔

اسٹیج پر جو درجن بھر تخت شاہی ٹائپ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں' ان میں سے نصف پر وی آئی پی براجمان تھے۔ ایک شخص کو قائل کیا جارہا تھا کہ اس کا شمار وی آئی پی میں نہیں مگر وہ اُٹھنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ تقریباً پانچ فٹ لمبائی اور پونے پانچ فٹ چوڑائی والا ایک شخص فوراً اسٹیج پر سے لڑھک کر میرے پاس آیا۔

"تم کون ہو؟" اس نے مشکوک لہجے میں سوال کیا۔

"میں... میں بزدل ہوں۔"

"کیسا مالک بات کرتا ہے۔ بابا' ہم سالا کون سا بہادر ہے۔"

میں نے کہا "مجھے توپ صاحب' میرا مطلب ہے تفنگ چنگیزی نے بھیجا ہے۔ میں روزنامہ حقیقت ساز کا نمائندہ ہوں" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا' لیکن کوئی نام تو ہووے گا تمہارا؟"

میں نے کہا "بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔"

"کیا..؟ لالہ دلنواز موسیٰ جی۔ کون سا زمانہ..... یار ابھی ہم سیٹھ کو کیا بولے؟" وہ پریشان ہوگیا۔

میں نے کہا "کون سیٹھ؟"

"اپنا سیٹھ' فلمساز' اپن اس کا ایڈوائزر۔ سیٹھ آسک علی ماسوک تم کو بلاتا پڑا ہے" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

سیٹھ عاشق علی معشوق۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' پہلے شاعر تھے اور شامتِ اعمال انہیں کوئے ملامت یعنی شوبزنس کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔ جب ان سے تفصیلی تعارف ہوا تو بہت سے سنسنی خیز انکشافات ہوئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ شاعری میں وہ فیض سے بہت سینئر ہیں لیکن زمانے کی قدر ناشناسی کے باعث انہیں فکرِ معاش میں بہت سے غیر شاعرانہ کام بھی کرنے پڑے چنانچہ انہوں نے ٹرین میں سرمہ بصیرت افروز سے لے کر فٹ پاتھ پر شربتِ وصال تک سب کچھ بیچا مگر دال کہیں نہ گلی۔ ساری بات تقدیر کی ہوتی ہے۔ خدا مہربان تو پھر پہلوان۔ نہ جانے کیسے ان کا پرائز بانڈ نکل آیا اور ایک مخلص دوست کے مشورے پر انہوں نے سٹہ کھیلا۔ ان کا تو کہنا تھا کہ پاکستان ورلڈ کپ صرف اس لیے جیت گیا کہ انہوں نے ایک دس کے بھاؤ پر اپنا سب کچھ لگا رکھا تھا۔ وہ راتوں رات اتنے لکھ پتی ہو گئے کہ دوسرے زیادہ مخلص دوست نے فوراً انہیں فلم بنا کے شہرت' عزت' دولت حاصل کرنے اور بونس میں شہرت کے ہم قافیہ لفظ (واؤ کے ساتھ) کی تسکین کے اسباب پیدا کرنے کا مشورہ دیا جس پر وہ صدقِ دل سے عمل پیرا تھے۔

ڈائس کے پیچھے وہ ہاتھ کمر پر رکھے چھت کو دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ حلیے اور عمر سے وہ تفنگ چنگیزی کے یارِ غار ہی نظر آتے تھے۔ یعنی وہ یار جو ایک دوسرے کو غار میں دھکیل سکتے ہوں۔

"بزدل صاحب!" انہوں نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا "کچھ کیجیے خدا کے لیے ورنہ آج کچھ ہو جائے گا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "جی... میں سمجھا نہیں۔ میں نے کیا نہ کیا تو کیا ہو جائے گا؟"

"سب کچھ ہو جائے گا۔ مثلاً ہمارا استقبال پُر ملال۔ بزدل صاحب! مجھے معلوم ہے' آپ بڑے مشکل کشا ہیں۔ اس مگرمچھ کی اولاد نے بتایا تھا..."

میں پھر بھونچکا رہ گیا "مگرمچھ... عاشق صاحب..."

"اونہوں۔ مرزا معشوق صاحب۔ ہمارا نام کوئی نہیں لیتا۔ تخلص چلتا ہے۔ آپ اسی کے دست راست ہیں نا۔ تفنگ چنگیزی کے؟"

"نہیں مگرمچھ کی اولاد کہنا زیادتی ہے۔"

"کیوں؟ اس کے باپ کا تخلص نہنگ تھا اور نہنگ کسے کہتے ہیں؟ مگرمچھ کو۔" معشوق صاحب بولے "بزدل صاحب' ہم اس وقت ہیروشیما ہیں۔ تباہی سے پہلے کا۔ کچھ دیر میں ایٹم بم گرنے والا ہے' اس کے بعد کچھ نہیں بچے گا۔ ہمارا نام رہ جائے گا کتبے پر۔ بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے۔ کیا کہا؟ یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب۔"

"مرزا معشوق صاحب! آپ ضرور پیے ہوئے ہیں۔ ڈھنگ سے بات کیجیے کہ معاملہ کیا ہے ورنہ میں چلا۔"

انہوں نے ایک دم مجھے پکڑ لیا "بخدا ایسا ظلم مت کیجیے۔ ہم عرض کرتے ہیں۔ آج ہم نے یہ جو اہتمام کیا تھا ایک پریس کانفرنس کا۔ تو ہم اعلان کرنے والے تھے ایک آرٹ مووی کا۔ پاکستان کی پہلی..."

"جو شاید آخری ہوتی" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"مگر پہلی کا آغاز ہی ایسا ہے' انجام خدا جانے۔" معشوق صاحب نے کہا "ہم نے بالکل نئے چہرے متعارف کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہیرو ہماری پہلی بیوی کے دوسرے شوہر۔ معاف کیجیے گا' دوسری بیوی کے پہلے شوہر کا بھانجا تھا۔ نامعقول۔"

"نام تو اچھا تھا" میں نے کہا۔

"بزدل صاحب! آپ مذاق کرتے ہیں' ہماری جان پر بنی ہے۔ اس کا نام تو تھا حبیب التواب صدیقی مگر فلمی نام ہم نے رکھا تھا' دُم دار ستارہ۔"

"جی... دُم دار ستارہ!"

"وہ۔ ہمارا مطلب تھا شہاب... خیر وہ تھا منحوس۔ پانچ ہزار ایڈوانس لے کر چلا گیا دبئی۔" مرزا معشوق صاحب نے فریاد کی۔ "وہاں پلمبر لگ گیا ہے۔ جائے جہنم میں۔ اس کی جگہ ہیرو بمت۔ آپ کو اس لیے بلایا ہے..."

میں نے انکساری سے کہا "ناچیز اگر آپ کے کام آسکے..."

"اونہوں۔ بھئی بات تو پوری سُن لیں ہماری" معشوق صاحب نے گھڑی دیکھ کے کہا "اصل مسئلہ ہے ہیروئن کا' ہیرو کا نہیں۔"

[illegible] نے مایوسی سے کہا "ظاہر ہے میں ہیروئن نہیں بن سکتا۔"

[illegible] زیادہ ظاہر ہے" معشوق صاحب نے مجھے نیچے سے اوپر تک [illegible] لڑکی کو ہم نے منتخب کیا' وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ ہم نے جو اشتہار دیا تھا اس کے جواب میں لاکھوں آگئی تھیں میدان میں۔"

"ضرور وہ میدانِ حشر ہو گا۔" میں نے طنز سے کہا۔

"چلو بھئی سیکڑوں کر لو۔ مطلب تھا' مقابلے پر۔ خیر ہم نے ایک کا انتخاب کر لیا اور اس کے ساتھ معاہدہ بھی ہو گیا۔ اداکاری بھی اچھی خاصی کر لیتی تھی۔ بس ڈانس نہیں آتا تھا۔ تو ہمارے جو مشیر برائے امورِ ظلمیات ہیں....."

"اپن کو بولتا" اسی گول مٹول' گنجے شخص نے مسکرا کے کہا جو مجھے "آسک علی ماسوک" کی خدمت میں گھسیٹ کر لایا تھا۔

"انہوں نے کہا کہ ڈانس ماسٹر سب کر لے گا۔ وہ ہیں نا اپنے مہاراج کتھا چونا خاں..."

"بابا کتھک بولو کتھک۔ بلج کا مالک۔ ابھی مہاراج کتھک

چندن خاں سُنیں گا تو طبلہ ماریں گا تیرے سر میں۔"

"اچھا اچھا۔ بات کرنے دو ہمیں۔ ہمارا مطلب سمجھ لیا تھا بزدل صاحب نے" مرزا معشوق نے خفگی سے کہا "اب تم نے دخل در معقولات کیا تو ہم تمہیں برطرف کردیں گے۔"

میں نے کہا "آپ کی وہ ہیروئن..... کیا نام رکھا تھا آپ نے نور چشم کا؟"

مرزا معشوق نے خاصا بُرا مانا "شہابہ۔ شہاب کے ساتھ شہابہ۔"

"بالکل بہن بھائی لگتے۔ جیسے عزیز اور عزیزہ۔ خیر آپ فوراً اصل مسئلہ بتایئے' وقت کم ہے" میں نے کہا "حاضرین کے صبر کا پیمانہ اگر لبریز ہوگیا تو وہ کرسیاں توڑنے پر اُتر آئیں گے۔"

"دیر تو ہوگئی اور اندھیرا بھی ہوگیا بزدل صاحب۔ وہ اُلو کی پٹھی شہابہ بھی ایڈوانس لے کر غائب ہوگئی۔"

میں نے کہا "ہیرو کے ساتھ دبئی چلی گئی ہوگی۔"

مرزا معشوق نے نفی میں سرہلایا "ہمیں آج مشیر برائے امورِ فلمیات نے بتایا کہ اس کا تو نکاح ہوگیا۔ اس کے والد ماجد بڑے جغادری قسم کے مولانا ہیں۔ وہ ان کی رضا کے بغیر آگئی تھی۔ ظاہر ہے مقدس باپ' اسے لہو ولعب میں غرق ہونے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے۔ اس کا جو مجازی خدا ہے' وہ بھی بڑا خونخوار قسم کا مُلّا ہے جسے دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔ اب شہابہ کا فلموں میں کام کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا ہمارا امریکی صدارتی انتخاب کا امیدوار ہونا۔"

میں نے کہا "مرزا معشوق صاحب' ہیروئن کسی اور کو رکھ لیجئے۔ سائڈ ہیروئن کو ترقی دے کر..."

"ناممکن۔ ہم تو اعلان کرچکے' تصاویر اور پوسٹر چھپوا چکے۔ ڈسٹری بیوٹر تک دیکھ چکے ہیں اور بہت سے پروڈیوسر اس چکر میں بھی تھے کہ اسے ورغلا کے زیادہ معاوضے پر اپنی فلمیں سائن کرالیں۔ وہ تو بس ہم نے اس کا نام پتا سب خفیہ رکھا تھا۔ پوسٹر' تصویریں سب صیغۂ راز میں تھیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "اس کی کوئی تصویر ہے آپ کے پاس؟"

"کیوں نہیں۔ ایک تو ہم نے رونمائی کے لیے بطورِ خاص بنوائی تھی۔ لیکن یہ دیکھیں۔" انہوں نے اندرونی جیب سے ایک پوسٹ کارڈ سائز رنگین تصویر برآمد کی "یہ ہے شہابہ۔ آہ شہابہ اور واہ شہابہ۔"

میں دس منٹ میں تیسری بار بھونچکا رہ گیا اور بہت دیر تک اس تصویر کو ایسے دیکھتا رہا جیسے وہ کسی غیر مرئی مخلوق کی تصویر ہو۔"

"بزدل صاحب! آپ تو خود تصویرِ حیرت بن گئے۔ خدا نخواستہ دل میں ایسا ویسا کوئی خیال ہے تو نکال دیں..... اس کا شوہر....."

میں نے کہا "مرزا معشوق صاحب! میں نے آج ہی دیکھا تھا اسے بلکہ ابھی دو گھنٹے پہلے۔ صدر بازار سے ٹیکسی میں وہ ہمارے ساتھ آئی تھی۔"

"غلط۔ بالکل غلط۔ اسے اب چشم فلک بھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ آفتابِ حسن روپوش ہوگیا ہمیشہ کے لیے کسی شٹل کاک برقعے میں۔" مرزا معشوق نے ایک گہری' ٹھنڈی سانس لی "سنا ہے اس کا شوہر اسے ہنی مون پر پاک پتن شریف لے گیا ہے یا رائے ونڈ۔ ایک ہفتہ ہوگیا۔"

میں نے تصویر کو جیب میں رکھ لیا۔ "مرزا معشوق! میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تمہارے مشیر امورِ فلمیات بکواس فرماتے ہیں۔ فتور ان کی نظر میں ہے یا دماغ میں۔ کچھ دیر پہلے یہ لڑکی بے پردہ صدر سے گزر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک برقع پوش' خالہ قسم کی بھیانک چیز تھی۔"

میں نے اسے مختصراً انارکلی سے ملاقات کا واقعہ سنایا اور پھر اسے بتایا کہ اس لڑکی نے اپنا نام انارکلی بتایا تھا۔ وہ کسی ٹوتھ پیسٹ کی کمرشل فلم میں جلوہ گر ہونے والی ہے اور اسے فلمی دنیا میں قدم رنجہ فرمانے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا مجھے ایوان صدر میں رہنے کا۔

مرزا معشوق کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہے "یہ..... یہ تم سچ کہہ رہے ہو..... تو..... ہم کیا کہیں..... عجب پُراسرار معاملہ ہے۔ اس نے کسی جڑواں بہن کا ذکر بھی نہیں کیا تھا اور یہ بھی ناممکن ہے کہ شہابہ اپنے دوسرے جنم میں تمہارے سامنے آگئی ہو۔ بفرضِ محال کل شہابہ کو اس کی بے حیائی اور مخربِ اخلاق عزائم پر اس کے مجازی خدا نے قتل کردیا ہو....."

میں نے کہا "مرزا معشوق! تم اعلان کرادو کہ ناسازیٔ طبع کی بنا پر مس شہابہ آج نہیں آئیں۔ اس اعلان سے پہلے کھانے پینے کا سامان میزوں پر رکھوا دینا ورنہ بلوہ ہوجائے گا۔ دو چار دن بعد کی تاریخ دے دو۔"

"دو چار دن بعد بھی یہی ہوگا۔ لوگ کھا پی کے اور گالیاں دے کر چلے جائیں گے۔"

"نہیں مرزا معشوق۔ اس وقت تک میں انارکلی کا سُراغ لگالوں گا اور اسے تم پریس کانفرنس میں شہابہ کے نام سے پیش کرسکو گے۔"

"وہ مان جائے گی؟"

"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ گنجا کیا چاہے چار بال" میں نے کہا "انارکلی تو سر کے بل حاضر ہوگی۔ اس کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ وہ اتنی شوقین ہے فلموں میں کام کرنے کی کہ بلا معاوضہ بھی کام کرسکتی ہے۔"

مرزا معشوق پر خوشی سے کپکپی طاری ہوگئی۔ "واقعی' پھر تو سبحان اللہ..... جزاک اللہ۔"

میں نے کہا "تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس پر صرف احسان کریں گے۔ معاوضہ اس کا بھی وہی ہوگا جو شہابہ کے

کنٹریکٹ میں ہے۔"

مرزا معشوق کا چہرہ اُتر گیا "پانچ ہزار کم... جو شبانہ لے گئی تھی۔"

"پانچ ہزار زیادہ..." میں نے اصرار کیا "آپ تو ہیروشیما کی طرح تباہ ہو جاتے اور میں نے مدد نہ کی تو ہو جائیں گے۔ ذرا سوچیں، آپ نے پبلسٹی پر کتنا خرچ کر دیا ہے۔ تصویریں، پوسٹر سب تیار ہیں۔"

"چلیے ہمیں منظور ہے آپ کی خاطر۔ بزدل صاحب! آپ فرشتہ ہیں۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ میں انسان ہوں اور ہر انسان کی کچھ مادی ضروریات ہوتی ہیں جن کی تکمیل پیسے کے بغیر نہیں ہوتی۔ میرا کمیشن، حق محنت، مشکل کشائی کا معاوضہ۔ کچھ بھی کہہ لیں آپ۔ پچیس ہزار ہے۔"

مرزا معشوق نے اپنے مشیر امورِ ظلمیات کی طرف یوں ہاتھ بڑھایا جیسے اس سے نسخہ مانگ رہے ہوں۔ "بزدل صاحب! آپ کے بارے میں ہماری رائے بدل گئی ہے۔ آپ بزدل نہیں، ڈھیٹ ہیں خاصے۔"

"میں رائے کی پروا نہیں کرتا۔ آپ مجھے نقد دیں گے یا چیک۔" میں نے کہا "میرا مطالبہ آپ کو قبول ہے؟"

مرزا معشوق نے اپنے مشیر امورِ ظلمیات کی طرف دیکھا اور سر یوں اقرار میں ہلایا جیسے نکاح کے وقت قاضی کے جواب میں دولہا ہلاتا ہے۔ "قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔" انہوں نے سر کے بال نوچتے ہوئے کہا۔

پریس کانفرنس کے شرکا کے ساتھ ڈنر تناول فرما کے میں باہر نکلا تو میری جیب میں پچیس ہزار نقد تھے۔ چنانچہ میں بہت اونچی فضا میں پرواز کر رہا تھا۔

میں نے صائمہ کی چوہے دانی جیسی کار کو لات مار کے کہا "ہم اس میں پھنسیں گے۔ کیا ہم چوہے ہیں؟"

"آپ گدھے ہیں۔" صائمہ نے بُرا مان کے کہا "مگر دولتی جھاڑنے کے لیے کیا میری ہی کار ہے۔ دیکھو، اچھا خاصا ڈینٹ پڑ گیا ہے۔ چلو بیٹھو۔"

اس کے تیور دیکھ کے میں نے خاموشی سے تعمیل کی مگر ہمیشہ کی طرح اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میرا سر دروازے سے ٹکرایا۔

"میرا خیال تھا کہ تم بلیک میلر نہیں ہو۔" صائمہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے میری طرف نہیں دیکھا۔

"آپ کا خیال شریف بالکل ٹھیک تھا۔"

"تم نے بلیک میل کر کے پچیس ہزار لیے ہیں، فائدہ اُٹھایا ہے کسی کی مجبوری سے۔"

"میں نے آسک علی ماسوک کی وہ مدد کی ہے جو کبھی امریکا نے پاکستان کی آڑے وقت میں نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "وہ تباہ ہو جاتا، اگر میں اسے کچھ نہ بتاتا۔ آج مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ تم کیسی اناڑی ڈاکٹر ہو۔"

"اس بات کا ڈاکٹری سے کیا تعلق؟" صائمہ نے تنک کر کہا۔

"جب تم ایک کارِ خیر کو بلیک میلنگ کہہ سکتی ہو تو ظاہر ہے، تشخیص بھی ایسی ہی کرتی ہو گی۔ دردِ دل کو دردِ جگر سمجھ لیتی ہو گی۔ جیسا کہ زیرِ علاج مریض کے کیس میں ہوا۔"

"کون مریض؟"

"میرا سر پہلے سے جھکا ہوا نہ ہوتا اور جگہ ہوتی تو میں سینے پر ہاتھ رکھ کے کہتا کہ یہ ناچیز بزدل جو سر نہیں اُٹھا سکتا، تمہارے سامنے ہے۔"

"تم کو جب کوئی بات نہیں ملتی تو میری کار کا مذاق اُڑانے لگتے ہو۔ حالانکہ بالکل نئے ماڈل کی کار ہے۔ کیا ٹریکٹر خرید لوں تمہاری خاطر؟"

"تمہیں میری تکلیف کا اظہار بھی بُرا لگتا ہے۔ دیکھو، نہ میں پیر پھیلا سکتا ہوں، نہ سیدھا بیٹھ سکتا ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"میری کتنی بدنامی ہو رہی ہے تمہاری وجہ سے۔ ہوسٹل میں دوسری ڈاکٹرز پوچھتی ہیں یہ آج کل ٹی پی کیوں لیے پھرتی ہو اپنے ساتھ۔"

"ٹی پی؟" میں نے جز بز ہو کر کہا۔

"ٹیلی فون پول۔"

میں نے غصے کو جھوٹی مسکراہٹ سے دبا کے کہا "ان سے کہیں کہ وہ ٹی پی نہیں... اے پی ہے۔ الیکٹرک پول۔ جس میں ایک لاکھ وولٹ کرنٹ ہے۔ جس میں ہمت ہے اس پر چڑھ کے دکھائے۔"

حقیقت یہ ہے کہ میں نے اسی وقت ڈاکٹر صائمہ کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے مجھے آفس کے سامنے اُتارنے کے لیے گاڑی روکی تو میں نے اوپر دیکھا اور مجھے ایک اچھوتا خیال آیا۔

میں نے کہا "صائمہ ڈیر! کار کو تھوڑا سا آگے کر لو۔ ذرا اس طرف۔ ہاں بالکل ٹھیک۔"

"یہاں کیا ہے؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

میں نے مسکرا کے کہا۔ "ابھی تو کچھ نہیں۔ تمہاری بے داغ، سفید مُنّی سی کار کیسی جگمگ کر رہی ہے۔ اسٹریٹ پول کی ساری روشنی اس کے بونٹ کی سطح سے یوں منعکس ہو رہی ہے جیسے قطب شمالی کی برف پر چاندنی۔"

اس نے کہا "فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ چلو اُترو۔"

میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا "بس تھوڑی دیر اور رُک جاؤ۔ میری خاطر۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "آخر کیا بات ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ تم سے وہ بات کہہ دوں جس کو سُننے کے

لیے تمہارے کان ترس رہے ہیں مگر میرے جذبات کا سمندر الفاظ کے کوزے میں نہیں سما رہا ہے۔ کیا خیال ہے' کوزے کے بجائے مٹکا لے لوں؟"

"کہیں اندر تم نے چھپ کر پی تو نہیں لی تھی؟" صائمہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ "جب تم مجھے چھوڑ کے گئے تھے....."

"آسک علی ماسوک کے ساتھ۔" میں نے مسکرا کے کہا "اس خبیث نے تو ایک کپ چائے کو نہیں پوچھا۔ اس کا بس چلتا تو زہر کا وہی پیالہ مجھے پلا دیتا جو سقراط کو دیا گیا تھا۔ میں کسی سقراط بقراط سے کم ہوں۔"

چھپاک سے توپ صاحب کی ارسال کردہ پیک سفید بونٹ پر یوں پڑی کہ میرا دل خوش ہو گیا۔ میں نے کار کو بالکل ٹھیک نشانے پر کھڑا کیا تھا۔ صائمہ کا صدمے سے بُرا حال ہو گیا۔

"یہ..... یہ کیا..... کون بدتمیز ہے؟" وہ تلملا کے نیچے اُتری۔

میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "تم نے مجھے بلیک میلر کہا تھا اور ٹیلی فون پول کہا تھا۔ یہ اسی کی سزا ہے لڑکی۔ اللہ کے گھر دیر ہے' اندھیر نہیں ہے۔"

صائمہ نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور میری طرف دیکھے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے اس کے چہرے کی آخری جھلک دیکھی تو وہ اتنا ہی سُرخ ہو رہا تھا جتنا پان کی پیک سے کار کا بونٹ ہو گیا تھا۔ میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے توپ صاحب کی کھڑکی سے منہ نکال کے سڑک پر پیک اُگل دینے کی بُری عادت اچھی لگی۔

اوپر اخبار کے دفتر میں بڑی گہما گہمی تھی۔ چند پارٹ ٹائم کاتب بھی مصروف تھے۔ توپ صاحب خود پروف ریڈنگ کر رہے تھے اور قابلِ اشاعت مواد کاپی جوڑنے والوں کے سپرد کرتے جا رہے تھے۔ خبریں "کریڈ" سے چھانٹی جا رہی تھیں دیگر اخبارات سے لفٹ کی جا رہی تھیں اور بنائی جا رہی تھیں۔ ٹیلی فون بار بار بجتا تھا اور کوئی نمائندۂ خصوصی کو گرما گرم' مسالے دار اسٹوری لکھواتا تھا جسے سُن کر تفنگ چنگیزی مدیرِ اعلیٰ روزنامہ حقیقت ساز' یا توبہ آواز بلند کہتے تھے۔ "لاحول ولا قوۃ۔" اور ریسیور کو کریڈل پر دے مارتے تھے یا زور سے "کھی" کر کے ہنستے تھے۔ دوسری صورت میں خبر فوراً اشاعت کے لیے منظور ہو جاتی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی انہوں نے چہک کر کہا "آؤ بزدل مجنوں۔ لگتا ہے لیلیٰ نے کچھ مناسب سلوک نہیں کیا آج۔ آخر کیا ہوا؟ ناقۂ لیلیٰ چڑھ گیا تم پر یا سگِ لیلیٰ نے کاٹ لیا؟" وہ کھی کر کے بغیر آواز کے ہنسے۔

میں نے کہا۔ "توپ صاحب! ابھی ابھی آپ نے جو پیک تھوکی تھی وہ ڈاکٹر صائمہ کی کار پر گری۔ وہ گئی ہے رپورٹ درج کرانے کیونکہ میں اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے بتایا اسے کہ یہ حرکت آپ کی ہے۔"

"چلو اچھا کیا۔" وہ خوش ہوئے۔ "اب تم یوں کرو کہ خود بھی چلے جاؤ تھانے۔ فون آیا تھا تمہارے یار تھانیدار کا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہہ رہا تھا' اس ٹیلی فون کے کھمبے کو فوراً بھیج دو۔ آج ہی تھانے میں اسے پھانسی دینی ہے۔ خود اپنے ہاتھوں سے۔"

میں اُچھلا۔ "اس نے بھی مجھے ٹیلی فون پول کہا۔ ظالم خاں نے۔ اس کی تو ایسی تیسی۔"

"ارے میاں گھوڑے' کہاں دوڑے۔ یہ تو بتاتے جاؤ کہ اپنے مرزا معشوق کی فلم کا مہورت کیسا رہا؟"

میں رُک گیا۔ "بڑا لطف آیا۔ ہیرو بھاگ گیا دبئی اور بن گیا پلمبر کہ نوکری تو پکی ہے اور رسک کوئی نہیں۔ کل ہیروئن نے کر لیا نکاح ایک مولوی صاحب سے۔ قیدِ شریعت میں تحفظ تو ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں مذاق کر رہا ہوں میں۔ فون کر کے پوچھ لیں اس سے۔"

توپ صاحب میری صورت دیکھتے رہے۔ "لگتا تو یہی ہے کہ تم سچ بول رہے ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو لکھوا دو خبر۔"

میں نے کہا "خبر تو صرف اتنی ہے کہ فلمساز' ہدایت کار مرزا عاشق علی معشوق نے اپنی پہلی آرٹ فلم کے بارے میں اعلان کو مؤخر کر دیا ہے اور پریس کانفرنس کے لیے نئی تاریخ کا اعلان بہت جلد کیا جائے گا۔"

"اور کچھ کہا مرزا معشوق نے؟ اپنا لنگوٹیا ہے۔"

"ہاں۔ انہوں نے آپ کو مگرمچھ کی اولاد کہا تھا۔ مذاق میں نہیں۔ اس نے بتایا کہ آپ کے والدِ بزرگوار "تنگ" تخلص فرماتے تھے اور فارسی میں تنگ کہتے ہیں مگرمچھ کو۔" میں نے کہا "تفنگ چنگیزی ولد تنگ چنگیزی۔ کیا بات ہے!"

توپ صاحب جواب میں عاشق علی معشوق کے بارے میں ایسے ہی شرمناک انکشافات کرنا چاہتے تھے مگر میں بھاگ لیا۔ اس وقت ظالم خاں کا مجھے یاد کرنا خلافِ معمول تھا۔ اس سے ملنے کے بعد میں جلد از جلد گھوڑے بیچ کے سو جانا چاہتا تھا۔

عموماً تھانوں میں تفتیش آدھی رات کے بعد کی جاتی ہے لیکن میں ظالم خاں سے ملنے پہنچا تو تفتیش کا عمل پورے زور و شور کے ساتھ جاری تھا۔ زور پولیس کا تھا اور شور ملزم کا۔ ظالم خاں اس سارے ہنگامے سے بے نیاز اپنے کمرے میں سکون سے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کے کہا "ظالم خاں' یہ کیا ہو رہا ہے آخر؟"

اس نے کہا "ظلم۔ جو ابھی تم پر بھی ہو گا۔ اسی طرح۔ لیکن تم میرا مشورہ مانو اور اعترافِ جرم کر لو رضاکارانہ طور پر تو میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تختۂ دار سے؟"

"نہیں۔ پھانسی تو ہوگی تمہیں۔ تفتیش کے مقابلے میں پھانسی تو کچھ بھی نہیں بزدل صاحب۔" وہ بولا۔

"میں نے ایک فور اسٹار ہوٹل میں ڈنر کیا ہے ڈاکٹر صائمہ کے ساتھ اور پچیس ہزار کمائے ہیں۔ آج اتنا مبارک دن ہے۔ آج تم کچھ نہیں کرسکتے۔"

اس نے حسد سے پوچھا "یہ ڈاکٹر صائمہ کون ہے؟ کوئی ذہنی امراض کی ماہر..."

"وہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔ سرکاری ہسپتال میں ہے۔"

"پھر وہ تمہارا پوسٹ مارٹم بھی کرے گی۔" ظالم خاں نے میز کی دراز میں سے ایک کاغذ نکالا' اس کی ہر تہ کو کھولا اور میرے سامنے پھیلا دیا۔

میں نے حیرانی سے کہا "یہ پوسٹر تمہیں کس نے دیا؟"

"پوسٹر کو مت دیکھو۔ اس لڑکی پر غور کرو جو اس فلم کی ہیروئن تھی۔" ظالم خاں بولا "اس کا نام شہابہ تھا۔"

"بالکل ٹھیک۔ لیکن اب یہ اس فلم کی ہیروئن نہیں رہی۔"

"بالکل ٹھیک۔" ظالم خاں نے میری نقل اُتاری۔ "ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ یہ قتل ہوچکی ہے۔"

میں اُچھل پڑا۔ "کیا اسے... قتل کردیا مولوی نے..."

"مولوی؟" ظالم خاں کی نظریں مجھ پر جم گئیں "کون مولوی؟"

"اس کا شوہر اور کون۔ تمہیں نہیں معلوم؟"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم لیکن تمہیں بہت کچھ معلوم ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ شرافت سے بتادو۔ بعد میں مت کہنا کہ دوستی کا لحاظ نہیں کیا۔ فرض اور محبت کی جنگ ہو تو..."

"پیسہ جیت جاتا ہے" میں نے کہا "مجھے معلوم ہے مگر ظالم خاں' یہ پوسٹر تو ایک ٹاپ سیکرٹ دستاویز تھی۔ یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟ ابھی تو پریس یا پبلک کو بھی نہ اس آرٹ فلم کے بارے میں کچھ معلوم ہے' نہ اس کی ہیروئن کے بارے میں اور نہ ہیرو کے بارے میں جس نے دبئی میں پلمبر بن جانے کو ترجیح دی۔ دبئی جانے کا کرایہ اسے ہدایت کار عاشق علی معشوق نے دے دیا تھا۔"

"میرا دماغ خراب مت کرو۔" ظالم خاں نے گرج کے کہا۔

"کاش میں ایسا کرسکتا مگر جو چیز پیدائشی طور پر اتنی خراب ہو..... خیر تم ایسا کرو کہ چائے منگواؤ اور انگریزوں کی طرح ہم بات کریں گے۔ اوور اے کپ آف ٹی"

"تم زیرِ تفتیش ملزم ہو۔" ظالم خاں نے میز بجا کے کہا "بلا معاوضہ کسی رعایت کی اُمید مت رکھو۔"

"آج کل ریٹ کیا چل رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"چھترول سے بچنے کے دو ہزار فی رات۔ حوالات کے باہر سونے کے ہزار روپے فی رات۔ چارپائی ہماری۔ گھر سے کھانا منگوانے کے پانچ سو یومیہ۔ ایک بار ملاقات کے سو روپے۔ سگریٹ' چائے پانی وغیرہ کی سہولت سو روپے یومیہ۔ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ چائے پینی ہے تو سو روپے نکالو۔"

"یہ ریٹ کس نے مقرر کیے ہیں؟ پرائس کنٹرول کمیٹی نے جو کبھی رمضان میں قیمت پر کنٹرول نہیں کرسکی۔"

"یہ خود میں نے کیا۔ پبلک انٹرسٹ یعنی مفادِ عامہ میں۔ ماتحت بہت زیادہ وصول کرلیتے تھے بعض اوقات۔" ظالم خاں نے کہا "اب چلو۔"

"کہاں چلوں؟ جیل خانے یا پھانسی گھاٹ۔"

"قاتل۔ مقتول' آلۂ قتل۔ یہ سب کیا تمہارا باپ دیکھے گا!" انسپکٹر رحیم خاں عرف ظالم خاں نے دہاڑ کے کہا "تم نے پوسٹر دیکھا تھا؟"

"ہاں۔ تم یہ تصویر دیکھو" میں نے جیب میں سے شہابہ کی تصویر نکال کے اسے دکھائی۔

اس نے سرہلایا "بالکل یہی ہے۔ تم نے غور کیا تھا کہ پوسٹر کس پریس کا چھپا ہوا تھا؟ پھر دیکھ لو۔"

میں نے دوسری بار اس بے حد رنگین اور پُرکشش پوسٹر کو ملاحظہ کیا جس پر شہابہ کی سحر آفریں صورت کے بعد سب سے نمایاں فلمساز عاشق علی معشوق کا نام تھا۔ اس کے ایک حصے میں کسی فلم اسٹوڈیو کی منظر کشی بڑے شوخ رنگوں میں کی گئی تھی۔ کیمرے' لائٹس' فلم اسٹرپ۔ غالباً آرٹ مووی کا موضوع بھی فلم نگری تھی۔

"میں مصور کو جانتا ہوں" میں نے کہا۔

"یہ بھی جانتے ہو کہ کہاں رہتا ہے؟" ظالم خاں نے پوسٹر سمیٹ کر واپس دراز میں رکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا "چلو اسے گرفتار کرلیں۔"

میں نے جیپ میں بیٹھنے کے بعد کہا "یار ظالم خاں! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اور تفتیش کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ جو شہابہ کے نام یا صورت سے بھی واقف ہو' اسے گرفتار کرلو۔ مصور نے کیا قصور کیا ہے آخر؟ ایسے تو سب پکڑے جاسکتے ہیں۔ آرٹ پیپر کس نے فراہم کیا' چار کلر میں اسکیچنگ کس نے کی' فلم کس نے بنائی' ماؤنٹنگ کس نے کی' مشین مین کون تھا۔"

ظالم خاں نے خوش ہوکے کہا "ویری گڈ۔ اور بتاؤ کس کس کو پکڑا جاسکتا ہے۔ پندرہ بیس بندے ہوں تو ایک مجرم ضرور ثابت ہوتا ہے۔ باقی نذر نذرانہ دے کر عزت سے واپس گھر لوٹ جاتے ہیں۔"

"مصور میرا جاننے والا ہے۔ شہید نام ہے اس کا۔"

"شہید؟ میں شاہد سمجھا تھا۔ آخر یہ مصوروں کو اتنا شوق کیوں ہوتا ہے ہر تصویر کے نیچے اپنا نام لکھنے کا؟"

"تمہیں شوق نہیں ہے اپنی ہر اولاد کے ساتھ اپنا نام لگانے کا؟ عابد رحیم' زاہد رحیم' مدیحہ رحیم' صبیحہ رحیم۔ تم نے تو حد کردی

ہے۔ بیوی کا نام تھا رحیمہ' اب وہ رحیمہ رحیم ہے..."

"اولاد کی شناخت باپ کے نام سے ہوتی ہے اور بیوی خواہ برطانیہ کی وزیر اعظم ہو' مارگریٹ تھیچر کہلائے گی۔"

میں نے کہا "مصوری کو تم سمجھ لو شریکِ حیات۔ تو ہر تصویر مصور کی تخلیق ہوتی ہے' اس کی شناخت۔ پھر وہ اپنا نام کیوں نہ لکھے؟"

"وہ پکڑا بھی تو راسی سے جاتا ہے..."

"خبردار جو اس سے گستاخی کی۔ وہ ویسے بھی باریش ہے چنانچہ قابلِ احترام ہے۔" میں نے کہا "اس سے جو پوچھنا ہے' میں پوچھوں گا۔"

اچانک میری نیند غائب ہوگئی تھی۔ ظالم خاں نے مجھ سے پورے سو روپے وصول کیے اور راستے میں ایک جگہ جیپ روک کے مجھے ایرانی ہوٹل کی ڈبل دودھ پتی والی کڑک چائے پلائی۔ اخلاقاً اس نے سو کا نوٹ دینے کی کوشش کی تو مالکِ ہوٹل ہذا پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس نے مؤدبانہ معذرت کی۔ ظالم خاں نے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"یہ مت کہنا کہ میں نے چائے کے پیسے دینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی" اس نے پھر جیپ اسٹارٹ کی۔

"آج وہ تم سے ایک کپ چائے کے پیسے لیتا ایس ایچ او صاحب تو کل کیا ہوتا؟ ہے تو یہ سب تمہارا ہی علاقہ۔" میں نے کہا۔

ممتاز منزل کے قریب ہم نے چوتھی منزل کے ایک فلیٹ کی گھنٹی بجائی اور بار بار بجائی مگر کوئی بھی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ اندر لائٹ جل رہی تھی اور ٹی وی بھی چل رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو گیا۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے اس کی۔"

"پھر ٹی وی نہیں بیوی دیکھتے دیکھتے سو گیا ہوگا" ظالم خاں نے دروازے پر لات ماری "یہ ہے مردوں کو جگانے کا صحیح طریقہ۔"

شہید آنکھیں ملتا نمودار ہوا۔ وہ پولیس کو دیکھ کر بدکا اور اس کی نیند ایسے غائب ہوگئی جیسے کسی بھی شریف آدمی کی ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے مجھے دیکھا اور اس کی پریشانی کچھ کم ہوئی "کیا بات ہے بھائی جی؟ آپ اس وقت' خیر تو ہے؟"

میں نے کہا "یار شہید! تمہیں کچھ یاد ہے' تم نے چار کلر میں کوئی پوسٹر بنایا تھا۔ زیادہ پرانی بات نہیں۔ ایک آرٹ مووی کا..."

"ہاں جی۔ وہ اپنے عاشق معشوق صاحب فلم بنا رہے ہیں نا' کیا نام ہے اس کا جس کی ہیروئن وہ ہے۔ شہابہ..."

"بالکل ٹھیک۔ وہ پوسٹر کس نے چھاپا ہے؟"

شہید نے داڑھی کھجا کے کہا "بے درد پریس والوں نے۔"

معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انسپکٹر رحیم خاں نے کہا "تم بیدرد پریس کے کسی بندے کو جانتے ہو؟"

میں نے کہا "ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے دوست ہیں انسپکٹر رحیم خاں۔"

"پر بھائی جی' خیر تو ہے نا.... مروانہ دینا دوستی میں" شہید پر رقت طاری ہونے لگی۔ "کیا پوسٹر بنانا بھی جرم ہوگیا ہے اب؟"

"نہیں یار۔ یہ کیس کچھ اور ہے" میں نے کہا۔

"بیدرد پریس کے دو تین بندوں سے میری واقفیت ہے۔ سب کے نام پتے بتا دیتا ہوں میں لیکن بھائی جی' یہ مت بتانا انہیں کہ میں نے پولیس کو بھیجا ہے" شہید نے منت کے انداز میں کہا۔

جب رحیم خاں نے نام پتے لکھ لیے تو میں نے کہا "یار شہید! تم کو شرم آنی چاہیے۔ شادی کے بعد میں پہلی بار کسی کے ساتھ تمہارے گھر آیا ہوں' تم نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔"

"وہ.... بھائی جی' دراصل میری دو بیٹی۔"

"ابھی سے اتنا ڈرتے ہو۔ افسوس!" میں نے کہا "نئی دلہن پہلے اُلو بناتی ہے ناز نخرے سے۔ پھر کولہو کا بیل بنا دیتی ہے اور بندہ ہو تم جیسا تو کھوتا۔ لوگ اولاد کو کہتے ہیں کھوتے دا پتر۔ جاؤ سو جاؤ۔"

نیچے آتے ہوئے انسپکٹر ظالم خاں نے مجھ سے ہاتھ ملایا "مبارک ہو بزدل صاحب۔ آپ پھانسی سے بچ گئے۔"

"کیا مطلب! تفتیش مکمل ہوگئی؟"

"مکمل ہی سمجھیں۔ یہ جو نام پتے دیے ہیں نا تمہارے اس دوست نے' ان میں ایک بندہ ہے کام کا" ظالم خاں بولا "ابھی پتا لگ جائے گا۔"

اچانک میں نے کہا "ظالم خاں! کیا واردات تمہارے علاقے میں ہوئی ہے؟"

"نہیں۔ یہ میں نے کب کہا" وہ معصوم بن گیا۔

"تو پھر تم کیوں تفتیش کرتے پھر رہے ہو؟" میں نے بگڑ کے کہا "اپنے ساتھ میری بھی نیند حرام کی۔"

"وہ یار! واردات ہوئی ہے میرے سالے کے علاقے میں اور میرا سالا سفارشی ہے" ظالم خان نے اعتراف کیا "اس قابل نہیں کہ کانسٹیبل بنے مگر وہ پولیس ٹریننگ کالج سے اے ایس آئی بن گیا۔ میرا کوئی قصور نہیں اس میں۔ پھر اتفاق سے ایس ایچ او ہوگیا لائن حاضر اور آج کل وہ انچارج لگا ہوا ہے۔ سب انسپکٹر ہے کچا۔"

"اور تمہاری گھر والی کا دباؤ ہے کہ اس کیس میں تم اس کی مدد کرو تاکہ وہ سب انسپکٹر تو پکا ہو جائے۔ ہے نا یہی بات؟" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے اپنی توند کے گنبد پر سے پھسلنے والی پتلون کو سنبھالا "تم بزدل ہو اس لیے تم نے ابھی تک پھر شادی نہیں کی ورنہ معلوم ہو جاتا کہ ساری خدائی ایک طرف اور جورو کا بھائی ایک طرف۔

سب کرنا پڑتا ہے بیٹے۔"

"گویا باہر ہی ظالم ہو' اندر اتنے ہی مظلوم جتنے سب شوہر ہوتے ہیں" میں نے ہمدردی سے کہا "ویسے یہ واردات کہاں ہوئی تھی؟"

"اورنگی کے علاقے میں" ظالم خاں بولا "کل۔"

"قاتل نے جرم کا اعتراف کرلیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم نے اعتراف کرالیا ہے اس سے بزورِ بازو یا..."

"مولوی بڑا سخت جان ہے۔ ساری رات چھترول کی' سارے طریقے آزما لیے مگر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ نعرے لگاتا ہے اللہ ہو' اللہ ہو یا بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آتے ہی پھر وہی رٹ۔ قتل میں نے نہیں کیا اس فاحشہ کو۔ مجھے موقع ملتا تو یہ کارِ خیر میں ضرور کرتا لیکن افسوس کہ مجھ سے پہلے کوئی بدبخت اس کا کام تمام کرگیا۔ اس نے مجھے اس سعادت سے محروم کیا۔ میں اس کی خاطر پھانسی نہیں چڑھ سکتا۔ ہاں میں نے مارا ہوتا اس بدچلن عورت کو تو میں خود تھانے میں حاضر ہوکے اعتراف کرتا۔ ہنسی خوشی تختۂ دار تک جاتا۔"

میں نے کہا "پھر اس کو کیوں کوٹ رہے ہو یار؟ مولوی جھوٹ نہیں بول رہا۔ قاتل کوئی اور ہوگا۔"

"اور کون؟"

"یہ معلوم کرنا پولیس کا کام ہے۔ مجھے میرے غریب خانے پر اُتار دو۔" میں نے جماہی لے کر کہا۔

"آج تو تم غریب نہیں ہو۔" ظالم خاں بولا "میرے سالے سے نہیں ملوگے؟ میں اُدھر ہی جارہا ہوں۔"

"گن پوائنٹ پر تم مجھے ضرور لے جاسکتے ہو" میں نے کہا "ورنہ بہ رضا و رغبت کسی تھانے دار کے سالے سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... وہ بھی آدھی رات کے وقت۔"

"تم بھول رہے ہو کہ اس کیس میں تمہارا نام بھی مشتبہ افراد میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ تم سرِعام مقتولہ سے ملے تھے اور اس کے گواہ بھی بہت ہیں کہ میں نے تمہیں بچالیا ورنہ تم پر حدود آرڈیننس کی متعدد دفعات کا اطلاق ہوتا تھا۔" اس نے جیپ کا رخ میرے فلیٹ کی طرف موڑلیا۔

"تم نے بڑا اچھا موقع ہاتھ سے گنوادیا۔ محض مروت میں۔"

"میں اس وقت بھی تم کو حوالات میں ڈک سکتا ہوں کیونکہ قتل کے اس کیس میں تم سے مفید معلومات اُگلوائی جاسکتی ہیں۔"

"کیا خیال ہے' یہ خبر لگوادوں؟ قتل کے دوسرے روز مقتولہ کی ایک صحافی سے ملاقات" میں اپنے فلیٹ کے سامنے جیپ سے اُتر گیا۔

"کل تک سب پتا چل جائے گا۔"

"ظالم خاں! کیا تم اتفاقات کے قائل ہو؟ میرا مطلب ہے فلمی قسم کے اتفاقات؟" میں نے ایک لمحے کے لیے رُک کے پوچھا۔

اس نے سرہلایا "رضیہ بانو عرف انارکلی اور شبانہ' دونوں کی صورت شکل' رنگ و روپ ایک۔ جڑواں بہنوں کی طرح۔ دونوں کا شوق ایک یعنی فلم۔ کیا یہ فلمی اتفاق نہیں ہے بزدل صاحب؟ مگر یہ بڑا گمبھیر مسئلہ بن گیا ہے۔ ظاہر ہے ایک ہی لڑکی بیک وقت زندہ اور مردہ۔ ایک مولوی کی منکوحہ اور ایک تمہاری خالہ کی بیٹی نہیں ہوسکتی۔ تم نے کہاں ڈراپ کیا تھا اس شیطان کی خالہ کو؟"

میں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا "یہ ایک راز ہے جو میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

"تمہارے دفن ہونے تک" ظالم خاں نے جیپ اسٹارٹ کی۔

"نہیں۔ اس سے پہلے بلکہ تمہاری تاریخِ وفات سے بھی پہلے دنیا حقیقت کو میری نظر سے دیکھ سکے گی۔ ابھی تو میں بھی دنیا کو نہیں دیکھ سکتا' نیند سے میری آنکھیں بند ہورہی ہیں اس لیے شب بخیر۔"

○☆○

ایک خوش گوار صبح کے آغاز کے بارے میں تصورات کی کوئی حد نہیں۔ ایک گھوڑے کے تاثرات یقیناً ایک کوچبان کی خواہشات کے برعکس ہوں گے۔ آوازِ اذاں پر لبیک کہنے والوں سے بیڈ ٹی سے آنکھیں کھولنے والوں تک اور ظالم خاں سے بزدل تک ہر شخص خوش گوار آغاز کا مفہوم جدا رکھتا ہے۔

اوّل تو میری صبح ہی دوپہر کے قریب ہوتی تھی۔ جب بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے تھے تو آنکھ خود کھل جاتی تھی چنانچہ میرے نزدیک زندگی کی مثالی صبح کا آغاز یوں ہوسکتا تھا کہ کوئی مہ لقا اپنے دستِ حنائی سے میرے بالوں (یا گالوں) کو کھینچے اور میں حسن کی جلوہ گاہِ لب و رخسار میں پھیلی ہوئی پیار بھری مسکراہٹ کی چاندنی میں آنکھیں کھول کے دیکھوں تو وہ اپنی مترنم آواز میں کہے۔ "اللہ اب اُٹھ بھی جایئے۔ ہم کب سے ناشتا لیے بیٹھے ہیں۔" اور مجھے بیڈ کے قریب ٹرالی پر سے خستہ گرم توس' تلے ہوئے انڈے اور بھاپ دیتی کافی کی دلنواز مہک محسوس ہو۔

مگر خواب ہنوز خواب تھے۔ نیلم کے ساتھ ازدواجی زندگی کا ایک سال تلخ یادوں کا وہ عذاب تھا جسے میں نے اپنے حافظے سے بھی کھرچ ڈالا تھا مگر مندمل ہوجانے والے زخموں کے نشان میں کیسے مٹاتا۔ اب میں آنکھیں کھولنے کے بعد آدھا گھنٹا کاہلی سے پڑا سوچتا رہتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شیو کرنی چاہیے یا نہیں۔ تھوڑی بہت بڑھی ہوئی داڑھی بھی اچھی لگتی ہے۔ اور بقول توپ صاحب' ایک صحافی کو کسی سلیز مین کی طرح صاف ستھرا اور دھلا دھلایا نظر نہیں آنا چاہیے۔ مجھے نہانے یا نہ نہانے کے بارے میں بھی سوچنا پڑتا تھا اور عموماً فیصلہ اگلے دن پر مؤخر ہوجاتا تھا۔ جمعے کے جمعے نہانا بہرحال ضروری ہوجاتا تھا۔ اس کے بغیر میں جمعے کی

نماز کے لیے نہیں جاسکتا تھا۔ خدا سے گزشتہ ہفتے کی ہر کوتاہی پر ڈھٹائی سے پھر معافی مانگنا اور اپنے گناہوں پر صدقِ دل سے بار بار توبہ کرنا ایک عادت سی بن چکی تھی۔

میرا فلیٹ جسے میں غریب خانہ کہتا تھا' درحقیقت کباڑ خانہ تھا جس میں بعض اوقات ڈھونڈنے والوں کو میں بھی نہیں ملتا تھا۔ بہت سے سگھڑ اور سلیقہ شعار دوستوں نے مجھے بارہا شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی مگر کتے کی دُم کو سیدھا کرنے والا خود ٹیڑھا ہوجاتا ہے۔

رات میں زیادہ دیر سے نہیں سویا تھا۔ عام طور پر میں ایک دو بجے تک لیٹتا تھا۔ ویلیم کی ایک گولی اور کوئی دلچسپ کتاب آدھے گھنٹے میں مجھے نیند کی وادی میں دھکیل دیتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ لائٹ عموماً جلتی رہ جاتی تھی اور صبح مجھے ٹی وی کا روشن اسکرین پلکیں جھپکاتا ملتا تھا۔ لیکن اس روز میری صبح نہایت نامعقول طریقے پر ہوئی۔

پہلے میں ایک خواب دیکھتا رہا کہ میرے دائیں بائیں بم پھٹ رہے ہیں اور توپوں کے گولے دنادن گر رہے ہیں مگر میں میدانِ جنگ سے مسکراتا' سیٹی بجاتا گزر رہا ہوں۔ ہوش میں آنے تک مجھے اندازہ ہوگیا کہ حقیقت کچھ اور ہے۔ کوئی دروازے پر لاتیں مار رہا تھا یا شاید ہتھوڑے۔

میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے آٹھ بجے تھے۔ یہ میرا کوئی دوست نہیں ہوسکتا تھا۔ میرے تو قرض خواہ بھی بارہ بجے سے پہلے تقاضا کرنے نہیں آتے تھے۔ ان میں مالکِ مکان' دودھ والا اور مجھے ناشتا فراہم کرنے والا ہوٹل کا مالک شامل تھے۔

مجبوراً میں اٹھ کے دروازے تک گیا اور کنڈی کھولتے ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہوگئے اور میں ہڑبڑا کے واپس بھاگا۔ اپنے لباسِ شب خوابی یعنی نیکر اور بنیان میں صائمہ کے سامنے جلوہ نمائی نے مجھے پانی پانی کردیا تھا۔

"تم..... اس وقت! یہاں؟ حد کردی تم نے بھی!" میں نے نیکر پر پجامہ اور بنیان پر قمیص پہنتے ہوئے اور ہکلاتے ہوئے کہا۔

صائمہ نے میری خلعتِ فاخرہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ اس کباڑ خانے کو زیادہ غور سے دیکھ رہی تھی جس میں بہت سی اوٹ پٹانگ چیزوں کے درمیان میں بھی پڑا رہتا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

"دیکھ رہی ہوں کہ یہ گھر ہے یا..."

"یہ کباڑ خانہ ہے۔ میں پہلے ہی بتا چکا تھا اور مجھے یہاں ایسے ہی رہنا پسند ہے۔ تمہیں ناپسند ہے تو میں کچھ نہیں کرسکتا اور تمہیں بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ خبردار! جو مجھے شرمندہ کرنے کے لیے یہاں اپنے سلیقے کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میلے کپڑوں کے نیچے ایک کرسی ہے' اس پر بیٹھ سکتی ہو تم اگر چاہو۔ ورنہ کھڑی رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ صبح دم وہ بہت نکھری ہوئی اور گل نودمیدہ کی طرح تروتازہ لگ رہی تھی۔ وہ میک اپ بہت کم کرتی تھی۔ ہونٹوں پر لباس کے رنگ سے میچ کرتی ہوئی لپ اسٹک کے سوا مجھے اس کے چہرے پر آرائشِ جمال کا کوئی اہتمام کبھی نظر نہیں آیا۔ پھر بھی اس کے چہرے کی جلد میں حیرت انگیز شگفتگی اور ملاحت تھی۔ یہ کسی بہت اچھے ہیئر کنڈیشنر کا کمال تھا یا قدرتی بات تھی کہ اس کے بال مسلسل پھسلتے رہتے تھے اور انہیں ایک ہاتھ سے پیچھے کرتے رہنا جو پہلے ایک ادا ہوگی' اب ایک عادت بن چکی تھی۔

وہ ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں تھی جس پر رنگ برنگے' ننھے منے شوخ دائرے بکھرے ہوئے تھے۔ خلافِ معمول وہ اس وقت سفید کوٹ میں نہیں تھی اور نہ اس کے گلے میں یا ہاتھ میں دل کی دھڑکن سننے والا آلہ تھا جسے میں دل کا ہیڈ فون کہتا تھا۔ اسٹیتھسکوپ مشکل لفظ تھا۔

"میں نے شاید وقت سے بہت پہلے اٹھادیا تمہیں؟"

میں چونکا "یہ بھی بتادیں کہ کیوں اٹھادیا؟"

وہ مسکرائی "بس ایسے ہی۔ آج چھٹی تھی نا۔"

میں نے سر کھجایا "چھٹی۔ رائٹ۔ یومِ اقبال ہے آج۔ تم نے ناشتا تو کرلیا ہوگا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ساتھ ہی کرلیں گے۔ پہلے تم نہا دھولو۔"

"نہالوں؟ اوکے" میں نے تولیہ اٹھا کے باتھ روم کی جانب دوڑ لگائی۔ "میں یوں گیا اور یوں آیا جیسے اکثر ہمارے اوپننگ بیٹسمین جاتے ہیں اور آتے ہیں۔"

اچانک مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میری زندگی کی ایک مثالی صبح طلوع ہوچکی ہے اور خوش گواردن کے آغاز کے خواب کی تعبیر بالکل نئے انداز میں سامنے آئی ہے۔ میرا دل ایک پرانی' گم گشتہ جنت کے تصور سے ملنے والی سنسنی خیز مسرت سے معمور ہوگیا تھا چنانچہ میں سردی سے کانپنے کے باوجود گانے لگا۔ اس شخص کی طرح جسے گاتے ہوئے بجلی کے جھٹکے لگ رہے ہوں۔ "ارے وہ آئیں..... گھر میں ہمارے..... خدا کی قدرت..... ہے..... نمونیہ سے مریں ہم..... تو ہم پہ..... لعنت ہے..... ابھی وہ آئیں۔"

باہر سے مجھے صائمہ کے کھلکھلا کے ہنسنے کی آواز بھی اچھی لگی "فکر مت کرو' مجھے نمونیہ کا علاج آتا ہے۔ جلدی سے نہالو۔"

"جلدی کیا کروں عرض..... ہاتھ پاؤں تو سُن ہو رہے ہیں" میں نے اندر ہی سے چلّا کے کہا "مردار یا صبح صبح بزدل نہ ہوتا تو صاف انکار کردیتا۔"

جیسا کہ مجھے اُمید تھی' زنانہ ناولوں کی رومان آفریں ہیروئن کی طرح اس نے پندرہ منٹ میں کباڑ خانے کی حالت بدل ڈالی تھی اور ثابت کردیا تھا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی سگھڑ اور سلیقے میں کسی

نیک پروین سے کم نہیں ہوتی۔ اس نے الماری سے صاف چادر نکال کے بستر پر بچھادی تھی' کتابیں اور رسالے سمیٹ کر قرینے سے ریک میں سجادیے تھے۔ میلے کپڑے اسٹور میں ڈال دیے تھے اور پندرہ منٹ میں اتنے کام کرڈالے تھے کہ کمرے کی حالت بدل گئی تھی۔

"آخر یہ تم سب لڑکیوں کو ایک ہی بیماری کیوں ہوتی ہے؟ نظم وضبط' قاعدے قرینے' سلیقے اور سگھڑپن کی زنجیروں سے آدمی کی اچھی بھلی' آزاد زندگی کو پابند کرنے کی" میں نے بال بناتے ہوئے کہا "کل یہ سب پھر ایسا ہی ہوگا جیسا تم نے دیکھا تھا۔"

"تمہیں یہ اچھا نہیں لگا؟"

"قطعی نہیں۔ میں کسی شوکیس میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ میرا گھر ہی تو وہ جگہ ہے جہاں مجھے آزادی حاصل ہے جوتے فریج میں رکھنے کی اور پتلون کو پنکھے پر ٹانگنے کی' کچن میں نہانے کی یا باتھ روم میں پلاؤ پکانے کی۔ کوئی ظالم سماج کا ٹھیکے دار یا قانون کا رکھوالا مجھے اس کمرے سے باہر تو من مانی کرنے سے روک سکتا ہے مگر اس فلیٹ کے اندر میری حکومت ہے۔"

"میں نہ قانون کی محافظ ہوں اور نہ ظالم سماج کی ٹھیکے دار۔"

میں نے بھنا کے کہا "پھر تمہیں کس نے دیا ہے یہ حق..."

"کیا! کس نے دیا ہے یہ حق؟" صائمہ کا رنگ اُڑ گیا اور چند سیکنڈ میں خفت اور تذلیل کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف مڑی۔

اپنی غلطی کا احساس مجھے زبان سے ایک غلط بات کے نکلتے ہی ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے یہ حق اسے میں نے دیا تھا۔ یہ احساس دلا کے کہ میں نے اپنی زندگی پر اس کے اختیار کو تسلیم کرکے' کسی رسمی اظہارِ محبت کے بغیر اس کے ساتھ تمام عمر کا پیمانِ وفا باندھ لیا تھا اور اس نے خاموشی سے زندگی کے سفر میں میری شراکت قبول کرلی تھی۔ اس کی آنکھوں کو مستقبل کے سارے خواب میں نے دیے تھے' ان میں اُمیدوں کے سب رنگ میں نے بھرے تھے اور ان رنگوں میں محبت کا اُجلا پن میں نے ڈالا تھا۔ اب میں ہی اس سے پوچھ رہا تھا کہ اسے یہ حق کس نے دیا؟

میں اس کے پیچھے لپکا "صائمہ! اے لڑکی' پلیز... میری بات تو سنو..."

وہ رُکے بغیر چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا' وہ رو رہی ہے اور کسی روتی ہوئی لڑکی کے پیچھے ایک آدمی کا دوڑنا یقیناً ایک مضحکہ خیز منظر پیش کرتا ہے مگر اس وقت مجھے کسی کا بھی خیال نہیں تھا۔

میں نے آدھے زینے میں اسے جالیا "بہری ہوگئی ہو کیا؟"

"ہاں۔ اندھی بہری ہوگئی ہوں اب میں۔ نہ میں تمہاری کوئی بات سنوں گی' نہ تمہاری صورت دیکھوں گی۔ چھوڑو مجھے' لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"لوگ جائیں بھاڑ میں۔ میں تمہیں اُٹھا کے واپس لے جاؤں گا" میں نے کہا مگر وہ میری دھمکی سے بھی متاثر نہیں ہوئی۔ میں نے لباس تو بدل لیا تھا مگر اپنا کمرا کھلا چھوڑ آیا تھا۔ خیر... اللہ مالک ہے' سب کو ہی معلوم ہے کہ یہاں ایک کنگلا صحافی رہتا ہے جس کے پاس کھوکھلی عزت ہے یا بے مصرف قانون کی ڈگری۔

بڑی عجلت میں کار میں بیٹھنے کی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا ہاتھ خاصی آواز کے ساتھ دروازے سے ٹکرایا۔ عورت کی نا میں ہاں ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت صائمہ نے یوں دیا کہ بے حد ناراض ہونے کے باوجود میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ سچ مچ ناراض ہوتی تو زوم سے نکل جاتی اور میں احمقوں کی طرح "کارواں نکل گیا غبار دیکھتے رہے" کی تصویر بنا کھڑا رہ جاتا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے مگر وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"دیکھو صائمہ! تم نے غلط سمجھا۔"

"میں نے غلط سمجھا!" وہ پٹاخے کی طرح پھٹ گئی "تم نے جو کہا وہ غلط نہیں تھا؟"

"میں نے جھک ماری تھی' بکواس فرمائی تھی۔ میری توبہ' میرے باپ کی توبہ۔ مجھے معاف کردو۔ دیکھو' میرا سر شرم سے جھکا ہوا ہے۔ میں ہاتھ بھی جوڑ سکتا ہوں اور اتنا ڈھیٹ ہوں کہ ناک سے لکیریں بھی نکال سکتا ہوں۔ بالکل ایسی ہی جیسی کہ آنسوؤں نے تمہارے گالوں پر بنادی ہیں۔"

وہ ہنس پڑی "شرم تو نہیں آتی۔"

میں نے سکون کا سانس لیا "آنے لگے گی آہستہ آہستہ۔ تم بھی تو آج پہلی بار آئی تھیں۔ ویسے بھوکا آدمی کچھ نہیں کرسکتا۔ نہ عشق' نہ شاعری اور نہ بکواس۔ بتاؤ ناشتا کہاں کرنا ہے؟"

اس نے بہت سی گاڑیوں کے ساتھ گاڑی روک لی "پوری چھولے کھائیں گے یہاں۔ تمہیں پسند ہیں؟"

"پسند! جب تم مجھے پسند ہو تو پھر وہ سب پسند ہے جو تمہیں پسند ہے مگر... ڈوب مرنے کا مقام ہوگا میرے لیے جب ادائیگی تم کروگی اور ہارٹ فیل اس وقت ہوگا جب واپسی پر مجھے پچیس ہزار کی رقم نہیں ملے گی۔ میں تو دروازہ تک بند کرکے نہیں آیا۔"

صائمہ نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی "تمہارے تکیے کے نیچے تھے۔ ایک سو کم ہیں۔"

"تھینکس گاڈ۔ ڈاکٹر صائمہ! میرا جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں مگر یہ ہے بہت مشکل۔ ہزار بار روڈ رولر پھر چکا ہے اس سڑک پر۔ تم واقعی اتنی اچھی ہو' اتنی اچھی ہو کہ میرا جی چاہتا ہے' پوری چھولوں سے پہلے تمہیں کھا جاؤں۔"

"لچھے دار باتوں کے تو ماہر ہو تم" وہ شرما کے بولی "نیلم پر تمہاری باتوں کا جادو کیوں نہیں چلا تھا؟"

میرا دل دھک سے رہ گیا "تم... تمہیں معلوم ہے..."

وہ مسکرائی "تم نے تو نہیں بتایا کبھی لیکن مجھے معلوم ہوگیا تھا۔

بہت پہلے ہی۔"

ہم کچھ دیر خاموشی سے پوری چھولے کھاتے رہے "میں تمہیں سب بتانے والا تھا" میں نے کچھ کھوکھلے لہجے میں کہا اور مزید شرمندہ ہوا۔

"اب چائے پئیں گے کہیں۔" اس نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کیے اور گاڑی پھر اسٹارٹ کی۔ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے چائے پیتے ہوئے میں نے اسے وہ سب بتادیا جو سچ تھا اور سچ سے زیادہ تلخ تھا۔ ان سب باتوں کو دُہرا کے میں بہت افسردہ ہوگیا تھا۔ ایک خوب صورت صبح کے اُجالے میں میرے تاریک ماضی کا آسیب اُتر آیا تھا۔

صائمہ نے کہا "چلو چھوڑو۔ بھول جاؤ پرانی باتیں۔ زندگی کے حادثات سے ہی زندگی عبارت ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تم نے کچھ بھی نہیں گنوایا۔"

میں دنگ رہ گیا "یہ تم کہہ رہی ہو! کاش یہ بات تم نے اس ریسٹورنٹ میں نہیں، میرے فلیٹ میں کہی ہوتی۔"

وہ ہنسی "پھر کیا ہوتا؟"

"میں تمہارا منہ چوم لیتا۔ محاورے کے مطابق نہیں، عملاً" میں نے کہا "یہ بتاؤ، کبھی نہ جانے کے لیے کب آرہی ہو؟"

اس کا چہرہ حیا سے آتشیں ہوگیا تھا "میری کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے میں ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ والد کا انتقال ہوچکا ہے۔ والدہ کی اور ایک چھوٹی بہن کی ذمے داری مجھ پر ہے۔"

"یہ ذمے داری...."

"نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ جب تک میری چھوٹی بہن پڑھ لکھ کے فارغ نہیں ہوتی یا اس کی شادی نہیں ہوجاتی، میں شادی نہیں کروں گی۔"

"کون سی جماعت میں پڑھ رہی ہے تمہاری بہن؟"

"میٹرک میں" صائمہ نے کہا "اس کا بھی ارادہ ڈاکٹر بننے کا ہے۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ڈاکٹر صائمہ! موقع ملا تو میں تمہاری چھوٹی بہن کو سمجھاؤں گا کہ یہ سب فضول ہے۔ ڈاکٹر بننا۔ سب لڑکیاں کیسے ڈاکٹر بن سکتی ہیں اور ڈاکٹر بن کے کریں گی بھی کیا؟ اتنے بیمار کہاں سے آئیں گے؟ پہلے ایک انار سو بیمار ہوتے تھے، اب سو انار اور ایک بیمار والی صورتِ حال ہے۔"

باہر آکے اس نے کہا "آج کا اخبار دیکھا تم نے؟"

میں نے کہا "حلوائی سے پوچھتی ہو مٹھائی دیکھی ویسے ہوا کیا ہے ایسا کہ...."

اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے پچھلی سیٹ سے اخبار اُٹھا کے مجھے پکڑادیا "مولوی نعمت اللہ نے اپنی نوبیاہتا دلہن کو قتل کردیا ہے۔ تصویر ہے دونوں کی۔"

میں نے اخبار کھول کے دیکھا۔ مولوی نعمت اللہ دُبلا پتلا اور لمبا، جوان آدمی تھا جس کی ریش سیاہ یقیناً اس کے چہرے پر بجتی تھی۔ وہ ذہین آدمی نظر آتا تھا اور پڑھا لکھا بھی۔ اس کی تصویر کے ساتھ ہی مقتولہ کی تصویر تھی۔ ایک تصویر اس وقت کی تھی جب وہ دلہن بنی تھی اور دوسری ایک خون آلود لاش کی جو فرش پر عجیب، بے ہنگم طریقے پر پڑی تھی۔ اگر ایک تصویر میری جیب میں بھی نہ ہوتی اور مجھے گزشتہ روز کے واقعات کا علم نہ ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ وہ رضیہ بانو عرف انارکلی کے سوا کوئی نہیں مگر اخبار میں اس کا نام تاج بی بی دیا ہوا تھا۔ عاشق علی معشوق اس کا نام شبانہ نہ رکھتا تو کیا کرتا؟

میں نے جیب میں سے تاج بی بی کی وہ تصویر نکالی جو میرے مصور دوست شہید نے پوسٹر پر بھی بنائی تھی اور پریس کانفرنس کے موقعے پر ایسی ہی بہت بڑی تصویر کی رونمائی عین وقت پر مؤخر ہوگئی تھی جو کینوس پر بنائی گئی تھی۔

صائمہ تصویر میرے ہاتھ میں دیکھ کے سخت حیران ہوئی "تم..... جانتے تھے اس کو پہلے سے؟"

میں نے کہا "میں خدا کی قدرت دیکھ رہا ہوں۔ کوئی فرق ہے اس تصویر میں اور مقتولہ کی تصویر میں؟"

"نہیں۔ صرف لباس کا فرق ہے۔ اس میں یہ دلہن بنی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "یہ مقتولہ نہیں ہے۔ اس کا نام رضیہ بانو عرف انارکلی ہے۔"

صائمہ نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "تم مذاق کررہے ہو؟"

میں نے ایک آہ بھری "نہیں صائمہ۔ یہ حقیقت ہے۔ ان دونوں کے درمیان ناقابلِ یقین مشابہت ہی نے تو سارے مسئلے پیدا کیے ہیں میرے لیے۔"

"تمہارے لیے کیوں؟" صائمہ کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔

"گھر چلو، تمہیں سب بتادیتا ہوں۔"

"اونہوں۔ کلفٹن چلتے ہیں۔ سی ویو پر واک کریں گے۔"

"اوکے۔ مگر میں اپنے فلیٹ کا دروازہ تو بند کردوں۔ سارا دن چوپٹ کھلا پڑا رہا تو کوئی غریب کا منجی بستر ابھی لے جائے گا۔"

میں نے تفصیلات پر سرسری نظر ڈالی۔ خبر میں شبانہ کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ تاج بی بی کی شادی مولوی نعمت اللہ سے صرف ایک ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ گزشتہ روز وہ اچانک گھر پہنچا تو اس نے اپنی بیوی کے ہاتھ میں ایک پوسٹر دیکھا جس پر تاج بی بی کی انتہائی معیوب اور قابلِ اعتراض تصویر تھی۔ اس نے تاج بی بی سے اس کے بارے میں پوچھا مگر تاج بی بی نے کچھ بتانے سے انکار کردیا۔ مولوی نعمت اللہ نے مشتعل ہوکے اسے بہت بے رحمی کے ساتھ مارا مگر تاج بی بی نے کچھ قبول نہیں کیا اور ضد رہی کہ یہ اس کی تصویر نہیں ہے۔ اس نے بیوی کو کمرے میں بند کرکے تالا لگایا اور

اپنے کسی دوست سے مشورہ کرنے گیا کہ ایسی صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ تاج بی بی کو قتل کردینا چاہیے یا اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دینا چاہیے۔ ملزم نے اعتراف کیا ہے کہ وہ تاج بی بی کے باپ سے بھی ملا تھا اور اسے آلۂ قتل خود تاج بی بی کے باپ نے فراہم کیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے کہ تم کو یقین ہے تو اس بے حیا کو واپس میرے گھر مت بھیجو۔ برائی تمہارے گھر میں ہے تو اسے خود ختم کردو۔ ملزم کو ارتکابِ جرم کے کچھ ہی دیر بعد پولیس نے جائے واردات سے آلۂ قتل کے ساتھ گرفتار کرلیا۔ حالات وواقعات کی تمام شہادت خلاف ہونے کے باوجود ابھی تک ملزم نے اعترافِ جرم نہیں کیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ تاج بی بی کو کسی نے پہلے ہی قتل کردیا تھا۔ جب وہ تالا کھول کے کمرے میں گیا تو وہ مرچکی تھی۔ وہ پولیس کے سامنے کوئی پوسٹر پیش کرنے سے قاصر رہا اور یہ وضاحت بھی نہیں کرسکا کہ جب واپسی پر اس نے اپنے لگائے ہوئے تالے کو باہر موجود پایا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تاج بی بی کا قتل کسی اور نے کیا ہو۔

گاڑی رُکی تو میں نے اخبار لپیٹ کر رکھ دیا "مارے گئے مرزا عاشق علی معشوق۔"

"کون؟" صائمہ ہنسی۔

"ابھی آکے بتاتا ہوں۔" میں نے کہا "دروازہ مقفل کرآؤں پہلے۔"

دوپہر کے وقت کلفٹن بیچ پر ہم جیسے آوارہ گردوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ زیادہ تفریح کرنے والے شام کے وقت آتے تھے تو ساحل پر میلوں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کار چلاتے ہوئے آخری حصے تک لے گئی جہاں سمندر کو سڑک سے جدا کرنے والی دیوار ختم ہوجاتی تھی۔ ریت کے نشیبی راستے کو عبور کرکے ہم عین اس مقام تک آگئے جہاں تک لہریں تھیں۔ بہت سے من چلے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں کار چلاکے سمندر میں گاڑی چلانے کی سنسنی خیز مسرت حاصل کررہے تھے۔ ان میں بیشتر خواتین تھیں۔ جب کوئی بڑی لہر آتی تھی تو وہ خوف اور خوشی سے چیخ مار کے اسٹیئرنگ کو خشکی کی طرف موڑلیتی تھیں۔ مرد ان کا مذاق اُڑاتے تھے اور بچے ہنستے تھے۔ لہر واپس ہوجاتی تھی اور وہ گاڑی کو پھر پانی میں لے آتی تھیں۔

میں نے کہا "تم بھی چلو پانی میں۔"

اس نے گھبرا کے کہا "نہ بابا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ ویسے ہی ننھی منی سی گاڑی ہے میری، کوئی لہر بہالے گئی تو..."

"تو کیا۔ ہم جو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

"میں نہیں چلاتی، تم چلاؤ گے؟"

"اچھا ہٹو" میں نے کہا اور خود باہر نکل کے ڈرائیونگ سیٹ پر جابیٹھا۔ کلچ اور ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھنے کے لیے مجھے گھٹنے کے پاس سے ٹانگوں کو موڑنا پڑا۔ اس سے میرے گھٹنے ڈیش بورڈ کی نچلی سطح سے ٹکرانے لگے۔ میں اتنا آگے جھک کر بیٹھنے پر مجبور تھا کہ اسٹیئرنگ تقریباً میرے سینے کو چھو رہا تھا۔

"جاپانی زیادہ لمبے قد کے نہیں ہوتے" میں نے کہا "مگر انہیں یہ تو سوچنا چاہیے کہ ہم عالم چنا کی قوم ہیں۔"

صائمہ بہت خوش تھی کیونکہ پہلی بار میں وہی گاڑی چلا رہا تھا جس کو میں ڈبیا کہتا تھا۔ شہر سے کلفٹن آتے آتے میں نے اسے گزشتہ روز رضیہ عرف انارکلی سے ہونے والی حادثاتی ملاقات کا احوال ایسے سنایا تھا کہ ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہوگیا تھا۔ اب میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات بتائے جب وہ غصے میں اپنی گاڑی کو ایسے دوڑا کے لے گئی تھی جیسے کبھی ہمارے اسلاف بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑاتے ہوں گے۔

"غصے کی بات تو تھی۔ حد ہوتی ہے کوئی بدتمیزی کی۔ ذرا خیال نہیں کہ نیچے سڑک ہے۔ پتا نہیں آپ خون کس پر تھوک رہے ہیں۔ جاہل گنوار، پان چرنا اتنا ضروری ہے تو اگال دان پاس رکھو۔ ساری گاڑی کا ستیاناس کردیا۔ وہ تو اچھا ہوا رات تھی۔ دن میں لوگ نہ جانے کیا سمجھتے کہ کس کا خون ہے" وہ پھر غصے میں بھر گئی۔

"مجھے معلوم ہوجائے نا..."

"تو تم کیا کروگی؟" میں نے معصومیت سے سوال کیا۔

"منہ نوچ لوں گی اس کمینے کا۔ اس کی صورت پر پکا کالا رنگ کرادوں گی۔ اینا مل بلکہ تارکول۔ رگڑ رگڑ کے دھوتا رہے۔ میں نے اتنا صاف کیا پھر بھی دیکھو، داغ گیا نہیں۔"

توپ صاحب کی شان میں صائمہ کی قصیدہ خوانی سے میرا دل باغ باغ ہورہا تھا لیکن راز داری کے ایک اخلاقی معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے میں خاموش رہنے پر مجبور تھا۔

میں نے کہا "خیر چھوڑو اس کا ذکر۔ تمہارے جاتے ہی میں اوپر پہنچا تو مجھے ظالم خاں کا پیغام ملا۔"

صائمہ سنتی رہی۔ میں گاڑی کو دو میل تک لے گیا۔ آگے لوگوں کا ہجوم زیادہ تھا۔ میں نے کار کو نصف دائرے میں گھمایا تو صائمہ نے واجبی سی چیخ ماری کیونکہ گاڑی ایک فٹ گہرے پانی میں گھوم کے آئی تھی۔ سامنے سے آنے والی کار میں بیٹھی ہوئی شوخ وشنگ اور طرح دار لڑکی نے صائمہ کو دیکھ کے ہاتھ ہلایا پھر اس کے ساتھ ڈرائیونگ کرنے والے، سرخ اسپورٹس جیکٹ میں ملبوس نوجوان نے۔

"یہ تمہارے جاننے والے تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دونوں کولیگ ہیں میرے۔ اسپتال میں ساتھ ہی ہوتے ہیں" صائمہ نروس نظر آنے لگی "کل میری شامت....."

"ڈرتی کیوں ہو۔ یہ بھی تو پھر رہے ہیں یہاں۔"

"یہ تو ہیں ڈھیٹ... اور بے شرم۔"

"انہی کے نقشِ قدم پر چلو عزیزہ۔ جس نے کی شرم، اس کے پھوٹے کرم۔"

"یہ تاج بی بی اور انار کلی۔ کیا یہ سگی بہنیں ہیں؟"
"تمہارا مطلب ہے جڑواں؟"
"ہاں۔ ہم شکل جڑواں بچے ہوتے ہیں۔"
میں نے کہا "اگر ایسی بات ہوتی تو پولیس کو معلوم ہو جاتی۔ یہ غالباً اتفاق ہے۔"
اس نے مجھ سے اتفاق کیا "ایسا ہوتا ہے۔ میرا ایک کزن ہے۔ سو فیصد جہانگیر خان۔ نام بھی اس کا جہانگیر خان ہے۔ پشاور ٹی وی کے ڈراموں میں حصہ لیتا ہے۔"
"تم پر ضرور مرتا ہوگا" میں نے حسد سے کہا "اس کا حق ہے۔"
"ایسی کوئی بات نہیں" صائمہ نے احتجاج کیا "اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں۔ وہ کسی اور پر مرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ کون ہے۔"
"بچ گیا میرے ہاتھوں قتل ہونے سے" میں نے کہا "کیا خیال ہے' واپس چل کے پہلے تو کریں لنچ پھر انار کلی کو تلاش کریں۔"
"تم نے تین دن میں اسے تلاش نہ کیا تو آسک علی ماسوک کا کیا بنے گا؟"
"تمہیں اس کی فکر ہے۔ مجھے یہ پچیس ہزار روپے واپس کرنے پڑیں گے" میں نے کہا "اتنی بڑی دولت ہاتھ سے نکل جائے گی ہاتھ میں آکے۔ کچھ کرو ڈاکٹر صائمہ" میں کار کو ڈرائیو وے پر لے آیا۔
"میں کیا کروں؟" وہ ہنسی۔
"میرا خیال ہے کہ یہ کام تم زیادہ آسانی سے کر سکتی ہو۔ میرے لیے جو رسک ہے اس میں وہ تمہارے لیے نہیں ہے" میں نے کار سے اُتر کے صائمہ کی جگہ خالی کر دی "سنبھالو اپنی ڈیا کو۔ میری گردن اکڑ گئی ہے اور ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔ اٹھاسی کا ہندسہ بنائے بیٹھا تھا۔"
"تمہارے لیے کیا رسک ہے جو میرے لیے نہیں؟" صائمہ بولی۔
میں نے سر کو بچاتے ہوئے خود کو صائمہ کی جگہ فٹ کیا "دیکھو نا اگر میں انار کلی کی یہ تصویر لے کر اس بستی کے گلی کوچوں میں ہر ایک سے اس کے گھر کا پتا پوچھتا رہا تو کیا لوگ یہ سمجھیں گے کہ شہزادہ سلیم کی روح بھٹک رہی ہے؟ نہیں۔ لوگ تو بہت ماریں گے کہ مجنوں کی اولاد' آخر تو ہے کون اس انار کلی کا اور کیوں پوچھ رہا ہے اسے؟ نہ گھر کا پتا' نہ باپ کا نام معلوم۔"
"یہ سوال تو مجھ سے بھی کیا جا سکتا ہے؟" صائمہ نے گاڑی دوڑاتے ہوئے اور چیونگم چباتے ہوئے کہا "لو جگالی کرو۔"
میں نے چیونگم منہ میں رکھ لی اور کہا "یہ یاں یوں ہے..."
"کیا! یہ کون سی بولی ہے؟"
"چیونگم کھاتے ہوئے بات ایسے ہی نکلتی ہے منہ سے۔ آخر میں بھی تو سمجھ رہا ہوں تمہاری بات" میں نے کہا "رسک تمہارے لیے یوں نہیں ہے نور چشم..."
"یہ کیا بے ہودگی ہے!"
"بے ہودگی! بھئی نور چشم کا مطلب ہے آنکھوں کا نور جو تم ہو بلکہ دل کا سرور بھی ہو۔ تمہاری کوئی ایسی سہیلی ہے جو اس کارِ خیر میں تمہاری مدد کے لیے تیار ہو جائے۔ غیر مشروط طور پر۔"
"غیر مشروط کیوں؟ پچیس ہزار جائیں تمہاری جیب میں' جھک ہم ماریں۔"
"اوکے۔ رات کا ڈنر جہاں تم کہو۔ فوراً سٹارٹ..."
"فائیو اسٹار" صائمہ نے قطعی لہجے میں کہا "ویسے تو فنٹی فنٹی پر بھی بات ہو سکتی تھی مگر تم کو بلیک میل کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ہزار تو نکالو۔"
میں نے مری ہوئی آواز میں کہا "کل سو حرام گئے آج ہزار۔ کل شاید دس ہزار نکل جائیں گے۔ پرسوں بزدل بیٹا پھر کنگال۔"
"لاؤ تصویر مجھے دو" صائمہ نے کہا۔
"تصویر لے لو مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں پلان کیا ہے؟ کیسے ہوگا یہ کام؟" میں نے کہا۔
"یہ کیا مشکل کام ہے۔" صائمہ نے کہا "میں اور میری سہیلی گھر گھر جا کے پوچھ لیں گے۔ عورتوں کی بات عورتوں سے کی جا سکتی ہے۔ یہ لڑکی مجھے شوقین مزاج لگتی ہے۔ تمہاری خالہ زاد۔ وہ خود سامنے نہ آئی تب بھی اس کے جاننے والے بہت ہوں گے۔ بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ خواتین کو اس کی تصویر بھی دکھائی جا سکتی ہے۔"
"کیا کہو گی؟ اگر کسی نے پوچھا کہ..."
"میں کچھ بھی کہہ سکتی ہوں۔ ایک اشتہاری کمپنی سے آئی ہوں یا یہ کہ ہم سروے کر رہے ہیں گھر گھر جا کے۔ آپ صابن کون سا استعمال کرتے ہیں' ٹوتھ پیسٹ کون سا... خواتین آتی رہتی ہیں گھروں پر۔"
"ویری گڈ۔ ڈاکٹر صائمہ۔ لنچ کے بعد تم مجھے چھوڑ دو تھانے میں اور اپنی سہیلی کے ساتھ نکل جاؤ۔"
"آج چھٹی ہے۔ کیا پتا وہ بھی میری طرح نکلی ہوئی ہو۔"
"تسخیر دو عالم پر! خیر' وہ مل جائے تو اچھا' نہ ملے تو کل سہی مگر رات کو مجھے فون ضرور کر دینا۔ حقیقت ساز کے دفتر میں' آٹھ بجے تک۔ ڈنر پھر کل ہوگا۔"
"اچھا!" وہ تنک کر بولی "آج رات میں بھوکی سو جاؤں۔ کنجوس۔"
"کیا تمہارے میس کا کھانا بہت خراب ہوتا ہے؟" میں نے ہمدردی سے کہا "ہر روز تو میں تمہارے اعزاز میں عشائیہ نہیں دے سکتا۔"
"اس وقت میں بروسٹ کھاؤں گی یا برگر اور تمہیں بھی

کھلاؤں گی۔" اس نے گاڑی ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔

"فکر مت کرو۔" میں نے اسے دلاسہ دیا "جمعے کی شام کے لیے ہم صحافی کبھی پریشان نہیں ہوتے۔ سوچنا پڑتا ہے کہ ڈنر کہاں کیا جائے۔ ساری تقریبات کے دعوت نامے ہوتے ہیں۔ مینو معلوم کرکے جاتے ہیں۔"

صائمہ نے مجھے پولیس اسٹیشن کے سامنے ڈراپ کیا تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے اور حسبِ عادت میں قیلولے کی ضرورت محسوس کررہا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے مجھے پہچان کے سلام کیا اور اطلاع دی کہ انچارج صاحب تو گشت پر ہیں۔

"مٹر گشت پر" میں نے تصحیح کی "میں بیٹھتا ہوں کمرے میں اور انتظار کرتا ہوں ان کی مراجعت کا۔ اللہ انہیں خیر سے واپس لائے۔ صحیح سالم۔"

کانسٹیبل نے میری بات کا بُرا نہیں مانا مگر انچارج صاحب کے کمرے میں میرے دو کرسیوں کو ملا کے استراحت فرمانے کا بُرا مانا۔ میں نے اس کے بُرا ماننے کا بُرا نہیں مانا۔ میری آنکھ لگی ہی تھی کہ ظالم خاں وارد ہوگیا۔

اس نے میری پسلی میں اپنی چھڑی چبھوئی "یہ کیا ہورہا ہے؟"

میں چونک کے اُٹھا "قیلولہ ہورہا ہے اور کیا۔ مٹر گشت سے تو بہتر ہے۔"

وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اچھا اب اپنے گھر پہنچے کرو اور ایسے مت بیٹھو جیسے تم اپنے سابق سسر کے سامنے بیٹھتے تھے۔"

"کل رات تم نے جو سو روپے لیے تھے' اس میں سے اب میرے لیے چائے منگواؤ۔"

"چائے آرہی ہے۔ چائے پی کے میرے ساتھ چلوگے؟"

"کہاں؟" میں نے اسے آنکھ ماری۔

"آنکھ مت مارو۔ میں مجرے کی بات نہیں کررہا تھا۔ ہم نے قاتل کو پکڑلیا ہے" ظالم خاں بولا "ہم کا مطلب ہے' میری جورو کے بھائی نے۔"

"چٹ پٹی خبر بنتی ہے؟"

"خبر تو تمہارا باپ بھی بنائے گا" ظالم خاں نے بید سے میز کو بجا کے کہا "اس پر میرے سالے کی کنفرمیشن کا انحصار ہے۔ میری بیوی نے تمہارے لیے پیغام دیا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تمہاری بیوی نے؟ مگر میں اس کا رشتہ کیسے منظور کرسکتا ہوں' ابھی تو وہ بیوہ بھی نہیں ہوئی۔"

"بکو مت! وہ بھابی ہے تمہاری جس کے بارے میں وہ گانا مشہور ہے کہ پیاری بھابی' بھابی نہیں تو میری ماں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ بزدل صاحب پہلے صفحے پر سُرخی لگوادیں ہر اخبار میں۔"

"تم سے بھی زیادہ جاہل ہے تمہاری بیوی تو۔" میں نے افسوس سے سرہلایا "یہ کوئی انٹرنیشنل نیوز ہے... سرخی لگوادیں۔"

"یار... واقعی سُرخی نہیں لگ سکتی؟ پہلے صفحے پر نہ سہی اندر۔" ظالم خاں سوچ میں پڑگیا "دو چار ہزار کی رشوت لے لو۔"

"اوّل تو رشوت کے مال میں سے رشوت لینا ایسا ہی ہے جیسے گناہ کی خاطر گناہ کرنا' مردار کھانا اور سور کھانا۔ دوسری بات یہ کہ آج تک کسی قاتل کی گرفتاری کی خبر کسی اخبار کی سُرخی نہیں بنی مگر تمہاری مجبوری کو دیکھتے ہوئے اور تم پر ترس کھاتے ہوئے میں خبر ایسی بنادوں گا کہ تمہارا سالا پکا تھانے دار ہوجائے گا۔ اللہ اس بُرائی میں مددگار بننے پر مجھے معاف کرے۔"

"سب اخباروں میں ذرا نمایاں ہو۔"

"سب میں ہوگی یار مگر دو سو روپے لگیں گے" میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔

اس نے بادلِ ناخواستہ دو نوٹ نکالے "اپنے سو کے ساتھ میرے سو بھی لے رہے ہو نا؟"

میں نے کہا "میں کیا کروں' پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے۔ ہزار کا نوٹ ہوتا تو اپنے ساتھ ہزار لاتا۔ خیر یہ بتاؤ' تم نے قاتل کو کیسے پکڑا؟"

"جیسے پہلے قاتل کو پکڑا تھا۔ گھر سے اُٹھالیا۔"

"گویا اب تمہاری تحویل میں دو قاتل ہیں۔ اچھی کارکردگی ہے۔"

"خاک کارکردگی ہے!" وہ بولا "اعترافِ جرم ابھی تک تو کسی نے کیا نہیں ہے۔"

"اس موقعے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے جو سابق روس کے سابق وزیراعظم خروشیف سے منسوب تھا۔ صدرِ امریکا نے روس کا دورہ کیا اور سب خیریت رہی۔ بس ایک دن اچانک ان کی کلائی کی گھڑی کھوگئی جو ان کو بہت عزیز تھی۔ معلوم نہیں کیوں' وہاں تو کُتّے بھی انسانوں کو بہت عزیز ہوتے ہیں۔ صدر امریکا نے وزیراعظم خروشیف سے کہا اور انہوں نے تحقیقات کا حکم دیا۔ اعلیٰ سطح پر۔ گھڑی کچھ دیر بعد صدر امریکا کے ذاتی اسباب میں ہی مل گئی اور انہوں نے کلائی پر باندھ کے سارا دن سرکاری مصروفیات میں گزارا۔ شام کو خروشیف نے کہا کہ جناب صدر ہم پوری کوشش کررہے ہیں کہ آپ کی گھڑی مل جائے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو صبح ہی مل گئی تھی۔ سوری! میں آپ کو بتانا بھول گیا۔ خروشیف نے سخت بُرا مان کے کہا کہ گھڑی کی تو کوئی بات نہیں مگر وہ جو پانچ افراد چوری کے جرم میں اعتراف کرچکے ہیں' ان کا ہم کیا کریں؟"

ظالم خاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نمودار نہیں ہوئی۔

"پھر؟ کیا مشورہ دیا صدر امریکا نے؟"

"افسوس کہ نہ اب وہ صدر امریکا ہیں' نہ خروشیف ورنہ پوچھ کے بتاتا" میں نے بھنّا کے کہا "لطیفہ سنانے کا مقصد یہ تھا کہ تم بھی ایک قتل کے جرم کا اعتراف پانچ افراد سے کراسکتے ہو۔ پھر یہ کیا..."

"زمانہ بدل گیا ہے۔ بزدل بھی بڑے نڈر ہوگئے ہیں" اس نے

گویا مجھ پر طنز کیا "نئے چور ہماری تفتیش کے پرانے طریقوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ایک زمانہ تھا کہ شرفا' پولیس کو دروازے پر دیکھتے ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے اور فوراً اعترافِ جرم کر لیتے تھے۔ جیسے تار موصول ہوتے ہی خواتین رونے پیٹنے لگتی تھیں۔"

میں نے کہا "اس کو کہتے ہیں بے اثری یا IMMUNITY۔ چوتھائی صدی سے انسدادِ ملیریا والے ڈی ڈی ٹی چھڑک رہے ہیں اور اس عرصے میں مچھروں کی وہ نسل آگئی ہے جس میں ڈی ڈی ٹی کے خلاف قوت مدافعت ہے اسے تو ٹانک سمجھتے ہیں وہ۔ ایسا ہی کچھ تمہارے مجرموں کے ساتھ ہوا۔ ان میں چھترول وغیرہ سے IMMUNITY پیدا ہوگئی ہے۔ جدید نفسیاتی طریقے یا سراغ رسی وغیرہ جو ذہانت سے کی جاتی ہے' ابھی صرف ٹی وی کی فلموں تک محدود ہے۔ ہمارے تھانے اٹھارویں صدی کی ٹیکنالوجی پر چل رہے ہیں۔"

"چلو اٹھو۔ بہت سن لی تمہاری بک بک میں نے" ظالم خاں چڑ کے بولا "تم بڑے سقراط بقراط ہو نا۔ تم اپنی ذہانت سے اعترافِ جرم کرا کے دکھاؤ۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "تمہیں تو اس کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ میرا کام کچھ اور ہے مگر تم شرط لگاؤ۔"

"چلو ملاؤ ہاتھ۔ دس ہزار تمہارے اگر تم نے اعترافِ جرم کر لیا ورنہ میرے۔ مال تو ہے تمہارے پاس؟"

میں نے مردہ آواز میں کہا "میں نے تو بتا دیا تھا صائمہ کو۔ پہلے سو گئے' پھر ہزار' اگلی بار دس ہزار جائیں گے۔"

ظالم خاں بہت خوش ہوا "انشاء اللہ۔"

اس کی جیپ میں ہم نے ایک طویل فاصلہ طے کیا اور پون گھنٹے بعد جیپ اس تھانے کے احاطے میں جا رکی جہاں تھانے دار کا سالا تھانیدار تھا۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ اس کا نام کھوکھر تھا۔ حق نواز کھوکھر۔

"آپ سے غائبانہ تعارف تھا۔" وہ مصافحہ کر کے بولا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ نہ اس کے رویے میں کوئی بات تھانے داروں جیسی تھی' نہ تھانے دار کے سالوں جیسی۔ وہ خوش اخلاق اور مہذب نوجوان ذہین بھی نظر آتا تھا۔ "کسی حد تک میں بھی متعارف تھا۔"

"اجی چھوڑیں بزدل صاحب! آپ کا ہم سے کیا مقابلہ۔ آپ کا ایک کالم ہی بہت ہوتا ہے۔ میں تو قطعہ بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ کے لاکھوں مداحوں میں کیا حیثیت ہے ہماری" وہ خوش دلی سے مسکرایا "ہم بدنام لوگ ہیں۔ حرام خور' رشوت خور' مجرموں کی سرپرستی کرنے والے..."

"انہی جیسے لوگوں کے طفیل ملی ہے یہ شہرت" ظالم خاں طنز کرتے ہوئے بولا۔

بادلِ ناخواستہ میں نے کہا "کسی بھی محکمے میں سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔ افسرانِ اعلیٰ بھی مانتے ہیں کہ کچھ کالی بھیڑیں ہیں۔ یہ نہیں بتاتے کہ سفید بھی کوئی ہے یا نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ سب مجھے ظالم خاں نے بتایا ہے۔"

"ظالم خاں کون؟" اس کے سالے نے حیرانی سے کہا۔

"وہ دراصل..... تمہارے جیجا جی کا نام تو رحیم خاں ہے مگر میں ان کو ظالم خاں کہتا ہوں۔ دوستی میں۔"

"موقع محل دیکھے بغیر" رحیم خاں نے میز پر مکا مار کے کہا "یہ دوستی ہے؟"

رحیم خان کا سالا ہنسنے لگا پھر اس نے ایک کانسٹیبل کو بلا کے چائے کا آرڈر دیا۔

"سنا ہے دو قاتل پکڑ رکھے ہیں تم نے۔ کیا انہوں نے آدھا آدھا قتل کیا تھا تاج بی بی کو یا کوئی پی ایم اے بنا رکھی ہے؟"

"پی ایم اے؟ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن؟" کھوکھر بولا۔

"پرائیویٹ مرڈرز ایسوسی ایشن۔" میں نے کہا۔

کھوکھر مسکرایا۔ "یہ بات نہیں۔ دراصل ان دونوں کے خلاف قتل کے واضح ثبوت اور شواہد ہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک نے قتل یقیناً کیا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ایسے موقعے پر ٹاس کر لینا چاہیے کہ پھندا کس کے گلے میں فٹ کیا جائے۔" میں نے کہا۔ "کیوں ظالم خاں؟"

"ٹاس ہونا چاہیے تمہارے اور مولوی کے درمیان۔" اس نے کہا۔

"اچھا کھوکھر صاحب! کیا یہ ممکن ہے کہ میں ان مبینہ قاتلوں سے مل سکوں اور کچھ پوچھ سکوں؟ یہ دخل در معقولات تو نہیں ہوگا؟"

"قطعی نہیں' مگر یہ سب اخبار میں آیا تو میری شامت آجائے گی۔ یہ سب آف دی ریکارڈ ہوگا۔" کھوکھر نے کہا۔

"بالکل آف دی ریکارڈ۔" میں نے وعدہ کیا۔

ایک جلاد صورت ہیڈ کانسٹیبل نے پہلے مولوی نعمت اللہ کو دست و پا بستہ حاضر کیا۔ مولوی کی صحت پہلے بھی قابلِ رشک نہیں تھی۔ "تفتیش" نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' چہرے پر اور آنکھوں کے گرد نیل تھے اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔

"مُلّا جی! یہ بڑے مشہور صحافی ہیں۔" کھوکھر نے کہا۔ "تم سے ملنے آئے ہیں۔ انہیں بتا دو جو بتانا ہے۔"

"میں کیا بتاؤں۔ کیا انہیں نظر نہیں آتا۔" اس پر رقت طاری ہوگئی پھر وہ بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔

میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "مولانا! آپ نے تاج بی بی کو قتل نہیں کیا تو پھر کس نے کیا؟ پولیس تفتیش تو کرے گی۔"

"یہی طریقہ رہ گیا ہے تفتیش کا؟ الٹا لٹکا دو' ننگا کر کے ذبح کیے

ہوئے بکرے کی طرح اور اس کی کھال کھینچ لو۔ بجلی کے جھٹکے دے دے کر اس کو نامرد کردو۔ بلیڈ سے کٹ لگا کے اور سگریٹ سے جلا کے نمک کا پانی چھڑکو اس پر۔ مرچوں کی دھونی دو۔ یہ سب آزمائش ہے میرے صبر اور حوصلے کی۔ خدا اپنے نیک بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ یہ جو چاہیں کرلیں' میں اس جرم کا اعتراف مرکے بھی نہیں کروں گا جو میں نے نہیں کیا۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔"

کسی نے اس کی فریاد وفغاں کے دوران کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ ایک بار وہ دل کی بھڑاس نکال لے۔ پولیس کے یہ سب طریقہ ہائے تفتیش میرے لیے نئے نہیں تھے۔ ہر رات تھانوں میں اس سے کہیں زیادہ لرزہ خیز تشدّد کے مناظر دیکھے جاسکتے تھے مگر انہیں عام' شریف آدمی دیکھ لے تو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوجائے۔ وہ مہینوں نیند میں ڈرتا رہے۔ لیکن اس عمل میں شریک پولیس والے کسی احساس کے بغیر سب کچھ کرتے تھے اور جب تھک جاتے تھے تو اپنا کام کسی اور کو سونپ کے آرام سے سو بھی جاتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اس قسم کا تشدّد کرنے والے خطرناک ذہنی مریض ہوتے ہیں یا بنادیے جاتے ہیں۔

"آپ ایک صحافی ہیں۔ اللہ نے طاقت دی ہے آپ کے قلم کو۔ اس قلم سے جہاد کریں۔ ظلم کے خلاف" مولوی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"میں ضرور لکھوں گا" میں نے کہا "لیکن پہلے آپ مجھے صاف صاف بتائیں کہ آپ تاج بی بی کو کیوں قتل کرنا چاہتے تھے؟"

"اس لیے کہ وہ ایک بدکردار' آوارہ مزاج عورت تھی۔"

میں نے کہا "آپ نے یہ فیصلہ کیسے کیا؟"

"ایک فلمی پوسٹر پر اس کی تصویر دیکھ کر۔ اسے فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ بے حیائی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "صرف ایک ہفتہ قبل آپ نے اسے بطور منکوحہ قبول کیا تھا۔ کیا اس وقت آپ کو یہ معلوم نہیں تھا؟"

"معلوم ہوتا تو میں اس پر سو ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا۔ باعفت اور پاکیزہ لڑکیاں بہت ہیں الحمدللہ۔"

"اس کا انتخاب کس نے کیا تھا؟"

"اللہ معاف کرے ہمارے ابا کو' یہ غلطی ان سے سرزد ہوئی لیکن ان کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ مولوی قادر بخش جیسے دین دار اور متقی شخص کی بیٹی کے بارے میں وہ کیسے سوچ سکتے تھے..."

"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ خود تاج بی بی کے باپ کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ مولوی قادر بخش کو" میں نے کہا۔

"اسے کیسے معلوم ہوتا۔ بے چارہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا تھا۔ رات تک کام کرتا تھا۔ وہ درزی تھا۔ صدر کو آپریٹو مارکیٹ کے اندر ایک دکان پر ملازمت کرتا ہے" مولوی نعمت اللہ نے کہا۔

"اس کی ماں' بہن بھائی' کسی کو بھی علم نہیں تھا تاج بی بی کے شوق اور اس کی مصروفیات کا۔"

"بھائی تو ہے نہیں۔ بہن چھوٹی تھی۔ ماں نے غالباً چھپایا یا تاج بی بی نے اسے پتا نہیں چلنے دیا۔"

اب کھوکھر نے مداخلت کی "گھر والوں کا کہنا یہی ہے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہم نے مولوی قادر بخش کو بھی پکڑا ہے۔ اعانتِ مجرمانہ کے الزام میں۔ ریوالور اسی نے کہیں سے لاکے دیا تھا اپنے داماد کو۔ اس نے کہا تھا کہ تمہیں شک ہے میری پاک دامن' باحیا بیٹی پر تو جاؤ' اسے ختم کردو۔ اب وہ تمہاری عزت ہے۔"

"شاید اسے یقین ہوگا کہ یہ ناممکن ہے۔ تاج بی بی خود کو بے گناہ ثابت کردے گی۔ قتل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" ظالم خان نے کہا۔

میں نے مولوی نعمت اللہ کو غور سے دیکھا "تمہیں یقین ہے کہ اس فلمی پوسٹر پر تاج بی بی کی تصویر تھی؟"

"میں حلف اُٹھا سکتا ہوں..."

"نا۔ حلف مت اُٹھاؤ ابھی" میں نے کہا "آدمی کی نظر کو دھوکا بھی ہوجاتا ہے۔"

میں نے ظالم خان کی طرف دیکھا "کہاں ہے وہ پوسٹر؟"

کھوکھر نے اپنی دراز میں سے پوسٹر برآمد کیا "یہ لیجیے۔"

میں نے پوسٹر کھول کے مولوی کے سامنے پھیلادیا "یہی وہ فلمی پوسٹر ہے نا؟"

مولوی نے ایک بار دیکھ کے نظر جھکالی۔

میں نے کہا "اور تمہارے یقین کے مطابق یہ تاج بی بی ہے۔ تم حلف اُٹھانے کو تیار تھے؟"

مولوی کی نظروں میں اُلجھن کے آثار پیدا ہوئے "ہاں جی۔ اس کے باپ کو بلوالیں بے شک۔"

میں نے کہا "گولی مارو باپ کو۔ تم بتاؤ' تمہیں شک تو نہیں ہے نا کہ یہ کوئی اور بھی ہوسکتی ہے؟"

"ایک فیصد شک کی گنجائش نہیں۔"

میں نے پوسٹر کو ایک طرف رکھ دیا "یہی بات سمجھانا چاہتا تھا میں تمہیں۔ مولوی نعمت اللہ! آدمی کا خیال یا اس کے حواس خمسہ کس حد تک ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں' اس کے کان غلط سن سکتے ہیں یا سنی ہوئی بات سے غلط مطلب اخذ کرسکتے ہیں' اس کی آنکھوں پر کبھی جہالت کا تو کبھی تعصب کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ رسی کو سانپ سمجھ بیٹھتا ہے اور دہشت سے مرجاتا ہے۔ ہم خطاکار انسانوں کو یقین کی اس منزل تک رسائی کا دعویٰ کرنا ہی نہیں چاہیے جہاں

اولیا اور قطب، صوفیا اور مشائخ نہ پہنچے۔"

وہ گم صم مجھے دیکھتا رہا "تمہارا مطلب ہے...."

"ہاں۔ وہ تاج بی بی بالکل بے گناہ تھی جسے تم نے قتل کردیا۔ گناہ گار مان کے۔"

"میں نے نہیں مارا اسے۔"

"تم نے اسے گناہگار جانا، اس کے قتل کا ارادہ کیا۔ موقع ملتا تو تم ایک گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے اور اسے کارِ خیر مانتے۔ ایک عورت پر جو شریکِ حیات بھی ہو اور پاک دامن ہو، بے حیائی اور فحاشی کا الزام لگانے سے بڑا کوئی گناہ ہے؟ ایک انسان کے بلا جواز قتل سے بڑا کوئی جرم ہے؟ جس نے بھی یہ کیا..."

"مگر کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" وہ چلّایا۔

میں نے جیب میں سے رضیہ عرف انارکلی کی تصویر نکالی "یہ دیکھو، یہ تاج بی بی نہیں ہے۔ غور سے دیکھو، یہ رضیہ بانو ہے۔"

میں نے تصویر اسے تھمادی۔ وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا "جھوٹ..... یہ جھوٹ ہے، کوئی چال ہے۔"

میں نے کہا "اسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔ بہت جلد یہ ٹوتھ پیسٹ کے ایک اشتہار میں ٹی وی پر نظر آئے گی۔ تاج بی بی تو مرگئی مگر رضیہ بانو زندہ ہے۔ اس کا فلمی نام انارکلی ہے اور یہ سٹی اسٹیشن کے پیچھے ریلوے کوارٹرز میں رہتی ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔" مولوی چیخنے لگا۔ "تصویر میں دھوکا ہے۔"

"اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوگے" میں نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے لی "اب جاؤ، سوچو اس عورت کے بارے میں جسے تم شرع کے مطابق نکاح میں قبول کرکے اپنے گھر لائے تھے۔"

مولوی پر ایک دم جنون کا دورہ پڑگیا، وہ چلّانے لگا "تم سب شیطان ہو۔ جھوٹے، مکار، فریبی ہو۔ تم سب نے مل کے یہ سازش کی ہے۔"

"توبہ استغفار کرو مولوی نعمت اللہ۔" حق نواز کھوکھر نے اشارہ کیا اور اسے اپنے ہمراہ لانے والے اسے گھسیٹ کر لے گئے۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کھوکھر کے جیجاجی نے کہا "تم بڑے حرامی ہو بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔"

کھوکھر نے کہا "یہ جھوٹ تھا؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا "بلاشبہ یہ تصویر تاج بی بی کی ہے۔ اسے واقعی شوق تھا فلموں میں کام کرنے کا اور اس کے گھر والوں کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر کیا اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ بدکردار اور بدچلن تھی، آوارہ تھی، فاحشہ تھی اور اس لیے واجب القتل تھی؟ چار عادل گواہ ہونے چاہئیں از روئے شرع کسی کی بدچلنی ثابت کرنے والے۔ کسی نے ایک بھی گواہ مانگا؟ مولوی نعمت اللہ نے جو اس کا شوہر تھا یا مولوی قادر بخش نے جو اس کا باپ تھا، کس دلیل پر انہوں نے خود ہی مدعی، خود ہی قاضی اور خود ہی جلاد بن کے ایک عورت پر اتنا بڑا جرم ثابت کیا اور اسے سزا دینے کے فیصلے پر عمل درآمد پر تُل گئے؟"

ظالم خاں نے کہا "ایسی لڑکیاں اور کیسی ہوتی ہیں یار؟"

"الزام لگانا تو بہت آسان ہے۔" میں نے تلخی سے کہا "لیکن ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ثبوت چاہئے، شہادت چاہئے۔ میں نے یہ جھوٹ اس لیے بولا کہ مولوی نعمت اللہ اور مولوی قادر بخش کو احساسِ ندامت اور پشیمانی سے نجات مل جائے۔ دکھ اور تاسف کے عذاب سے گزرجانے کے بعد انہیں یہ سکون حاصل ہوجائے کہ تاج بی بی بے گناہ تھی اور اس کے بارے میں غلط سوچ کے گناہگار وہ خود ہوئے۔ یہ آزارِ گناہ انہیں تماشائے عبرت بنادے اور آئندہ کسی پر سوچے سمجھے بغیر فحاشی کا الزام لگانے والے تاج بی بی کیس کو یاد رکھیں۔"

"ابھی تم بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ تاج بی بی کا قاتل اس کا شوہر نہیں ہوسکتا۔" ظالم خاں بولا۔

"ہاں، میرا یقین ابھی کامل نہیں ہے۔ دوسرا قاتل کون ہے؟"

"وہ ایک نوجوان ہے۔ اسی محلے میں رہتا ہے اور اس پریس میں کام کرتا ہے جہاں عاشق علی معشوق صاحب کی آرٹ فلم "خواب اور سراب" کے یہ پوسٹر چھپے تھے۔" کھوکھر نے کہا۔ "غالباً وہی ایک پوسٹر نکال کے لے گیا اور اس نے تاج بی بی کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اعتراف کرلیا ہے کہ وہ تاج بی بی ...میں دلچسپی لیتا تھا۔"

"صرف دلچسپی؟"

"اس سے زیادہ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ غریب بھی تھا اور اس کی آوارہ مزاجی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔" کھوکھر نے کہا "اس نے اپنی ماں کو مجبور کیا کہ وہ تاج بی بی کا رشتہ مانگنے جائے لیکن حسبِ توقع مولوی قادر بخش نے صاف کہا کہ وہ اپنی بیٹی کا دشمن نہیں ہے۔ اسے وہ کنویں میں دھکا دے سکتا ہے مگر یہ رشتہ قبول نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد بظاہر وہ مایوس ہوگیا تھا مگر اس پوسٹر کو دیکھ کر شاید اسے یہ خیال آیا کہ وہ تاج بی بی کو مجبور کرسکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے تاج بی بی کے باپ کو بھی بلیک میل کرنا چاہا ہو؟" میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے۔ تاج بی بی کے باپ نے پریشانی سے بچنے کا آسان حل یہ نکالا کہ فوراً اس کا نکاح کردیا۔ لڑکا غالباً پہلے سے اس کی نظر میں تھا۔ ایک طرح سے اس نے اپنی بلا ٹالی۔ اپنی عزت کے معاملے کو شوہر کی عزت کا مسئلہ بنادیا۔" کھوکھر نے کہا "اس لڑکے کو بلواؤں؟"

"بلالو۔ تھوڑا سا ڈراما اس کے ساتھ بھی ہوجائے۔ اگر وہ قاتل ہے تو اسے سزائے موت سے پہلے ایک بے گناہ کو قتل کرنے

کے احساس کا آزار بھی تو ملے۔" میں نے کہا۔
کھوکھر نے گھنٹی بجائی۔ "وہ بڑی ڈھیٹ چیز ہے۔"
میں نے کہا "ایک منٹ' کیا تم نے ان دونوں کو ایک ہی جگہ بند کر رکھا ہے؟"
"ظاہر ہے۔ حوالات تو ایک ہی ہے۔"
"اوئے کیا نام ہے اس لڑکے کا؟"
"گلفام..." کھوکھر نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا "صورت دیکھ کر تمہیں بہت سے محاورے یاد آئیں گے۔ پڑھے نہ لکھے' نام محمد فاضل' برعکس نہند نام زنگی کافور"
"اتنی دور کی مثال کیوں دیتے ہو۔ یہ تمہارے جیجا جی بیٹھے ہیں سامنے۔ نام ہے رحیم خاں۔ ہونا چاہئے تھا ظالم خاں۔" میں نے کہا۔
"اپنی مثال بھی دے سکتے تھے تم۔" ظالم خاں بولا "بزدل نہیں' تمہارا نام تو ہونا چاہئے تھا تیس مار خاں' پاٹے خاں' یا پھنے خاں۔"
میں نے مسکرا کے کہا "اچھا دیکھو' اس لڑکے گلفام کے سامنے کوئی بات مت کرنا۔ میرا مطلب ہے انارکلی کی۔ اور بعد میں اسے مولوی نعمت سے مت ملنے دینا۔"
حوالدار نے قاتل نمبر دو کو پیش کیا۔ وہ بلاشبہ اپنے نام کو رسوا کر رہا تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ سیہ بختی نے اسے زیادہ مکروہ بنا دیا تھا۔ بدصورتی اور بدباطنی کا اخراج قدرتی طور پر نفرت کا ردِّ عمل پیدا کرتا ہے۔ اس کی صحت کچھ سختیٔ حالات اور کچھ عادات کے باعث افسوسناک حد تک خراب تھی مگر جوانی دیوانی کے زعم میں وہ مدقوق نظر آنے والے سینے کو رستمِ دوراں کی طرح نکال کے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بال مائیکل جیکسن اسٹائل میں شانوں تک پہنچتے تھے۔ پولیس کے لیے یقیناً اس کے سر کو گرفت میں لینا آسان تھا۔
"شہزادہ گلفام تم چاہتے تھے تاج بی بی کو۔ اب کیا اس کے لیے تاج محل بنواؤ گے؟" میں نے کہا۔
"پہلے تو ہم اس کا مزار بنوائیں گے جہاں شہر کے سارے عاشق ہر سال محبت کا عرس منائیں۔" کھوکھر نے کہا "زندہ دفن کریں گے اسے۔"
اس نے عیّاری سے کہا "بادشاہ ہو آپ.... سب کچھ کر سکتے ہیں۔"
"دیکھو' یہ صحافی ہیں۔ بڑے مشہور۔" کھوکھر نے کہا۔ "یہ وکیل بھی ہیں۔ تمہارا کیس لے سکتے ہیں۔ انہیں سب بتا دو۔"
"اور کیا بتاؤں جی' جو بتانا تھا بتا چکا۔"
میں نے کہا "فلمیں بہت دیکھتے ہو؟"
"سب ہی دیکھتے ہیں جی۔"
"پریس میں کیا کرتے ہو۔ مشین مین ہو؟" میں نے کہا۔
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "انہوں نے بہت مارا ہے مجھے جناب۔ آپ اخبار میں لکھیں' تھانوں میں کیا ہوتا ہے۔" وہ رونے لگا۔
"ضرور لکھوں گا۔" میں نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے پریس میں چھپنے والا پوسٹر کیوں نکالا تھا؟"
"غلطی ہو گئی تھی جناب۔"
"وہ پوسٹر تم نے کس کو دکھایا تھا؟ تاج بی بی کو یا اس کے باپ کو؟" میں نے کہا۔
"دونوں.... دونوں کو...."
"کیا اس کے باپ نے یقین کر لیا تھا کہ تصویر تاج بی بی کی ہے؟"
"نہیں جی۔ وہ تو چلانے لگا' گالیاں دینے لگا مجھے کہ میری بیٹی کا نام شہابہ نہیں ہے۔ وہ کسی فلم کی ہیروئن کیسے ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ فلم "خواب اور سراب" کے پروڈیوسر سے پوچھو' کیا نام ہے جی ان کا' عاشق معشوق۔ کچھ ایسا ہی ہے۔ مگر اس کا باپ تو مجھے مارنے لگا کہ مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی بیٹی کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ دفعہ ہو جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"
"پھر تم ڈر گئے۔ کیا وہ سچ مچ گولی مار دیتا تمہیں۔ اس کے پاس ریوالور تھا؟"
"پتا نہیں جی۔ ریوالور یا ٹی ٹی تو کسی کے پاس بھی ہو سکتا ہے آج کل۔ ہر جگہ مل جاتا ہے۔"
"پھر تو تمہارے پاس بھی ہو گا؟"
"وہ چونکا۔ "میرے پاس.... نہیں جی.... میرا کیا کام۔"
"تم جوان آدمی ہو' بہت کچھ کر سکتے تھے۔ ایک لمبا ہاتھ مارتے کسی بینک میں یا...."
"میں محنت کر کے کماتا ہوں جی۔ جہاں میں ہوں تین سال سے' وہاں روز لاکھوں آتے تھے۔ میز کی دراز میں ہوتے تھے۔ مالک جب بینک میں جمع کرنے جاتے تھے تو مجھے ساتھ رکھتے تھے۔ کئی بار میں رات کو ان کے ساتھ گھر گیا تو گاڑی میں لاکھوں ہوتے تھے اور ریوالور پڑا ہوتا تھا اس دراز میں۔ میرے سامنے۔"
"یعنی گلووز کمپارٹمنٹ میں۔" میں نے کہا "شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس؟"
"ہے جی۔ میری عمر بائیس سال ہے۔"
"ڈرائیونگ لائسنس؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "اپنے پاس تو سائیکل بھی نہیں ہے جی۔"
"پاسپورٹ تو ہو گا؟"
اس نے اقرار میں سر ہلا دیا پھر شاید اسے غلطی کا احساس ہوا۔
میں نے کہا "شہزادہ گلفام! تم نے تاج بی بی سے کیا کہا تھا؟ میرے ساتھ چلو' مجھ سے شادی کر لو' ہم باہر نکل جائیں گے' کہیں

بھی۔ تمہارے لیے بھی پاسپورٹ میں بنوالوں گا۔ وہ ایک شوقین مزاج لڑکی تھی۔ شاید کسی مولوی کے ساتھ نکاح اس کی مرضی کے خلاف تھا۔ اس کو احساس ہوگا کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا۔ وہ آزاد فضاؤں میں پرواز کی خواہش مند تھی مگر اس کے ساتھ یہ ہوا۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ مولوی صاحب نے اس کو راتوں رات نکاح کی زنجیر میں باندھ کے ایک انتہائی مذہبی خیالات رکھنے والے شخص کے حوالے کردیا۔ وہ زنجیریں توڑنا چاہتی ہوگی۔ جبر کا یہ ردِّعمل فطری سی بات ہے۔ تم نے بروقت جال پھیلایا۔"

"نہیں جی۔ یہ سب آپ کہہ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے بھی کہا تھا تاج بی بی سے۔ مجھے معلوم ہے۔"

"میں اسے کہاں لے جاسکتا تھا جی۔"

"شاید تم نے کہا ہوگا کہ ہم لاہور چلے جائیں گے یا بمبئی اور اس احمق لڑکی نے یقین کرلیا ہوگا۔ مسئلہ ہوگا پیسے کا تو ضرورت ہی ایجاد کی ماں ہے۔ اچانک شیطان نے تمہیں سب سمجھادیا ہوگا کہ بے وقوف' پیسہ ہی نہیں' تاج بی بی بھی تمہاری دسترس میں ہے۔ تم اعتبار قائم کرچکے ہو۔ سب مواقع تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ کسی بھی دن گلووز کمپارٹمنٹ سے ریوالور نکالو اور سیٹھ کی چھٹی کردو۔ بینک جاتے وقت تو شاید رش ہوگا۔ کسی روز جب وہ رات کو زیادہ نقد رقم لے کر گھر لوٹے....."

"یہ.... یہ جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔ الزام ہے جی۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم نے تاج بی بی سے کہا ہوگا کہ پیسے کی فکر مت کر۔ لاکھوں قربان کرسکتا ہوں میں تجھ پر۔ میں تو خود فلم بنا سکتا ہوں اور تجھے ہیروئن.... اور عین ممکن ہے اس نے تم کو اپنی رہائی کا وسیلہ بنانے کی خاطر تمہاری بات مان لی ہو۔ اس جیسی لڑکی تم پر فریفتہ تو ہونے سے رہی۔ کیا تم نے اسے موقعے کا انتظار کرنے کو کہا تھا اور یہ سمجھایا تھا کہ مولوی' شبابہ کے بارے میں پوچھے یا فلم "خواب اور سراب" کے پوسٹر کی بات کرے تو صاف مکرجانا۔ کہہ دینا یہ کوئی اور ہے جس کی صورت مجھ سے ملتی ہے۔ اور اس نے یہی کہا۔"

"نہیں جی۔ میں نے کچھ نہیں بتایا تھا.... کچھ نہیں کہا تھا۔" وہ چلّانے لگا۔

میں نے اندھیرے میں ایک اور تیر چلایا۔ "تم نے حال ہی میں اپنے لیے اور تاج بی بی کے لیے جعلی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے کے لیے بات کی تھی۔"

میں بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اگر میری بات غلط ہوتی تو اس کا فوری ردِّعمل احتجاجی حیرت کا ہوتا مگر اس نے میری بات خوف آمیز دلچسپی سے سُنی۔ اس مجرم کی طرح جو اپنے خلاف صحیح الزامات پر مبنی فردِ جرم سننے کے بعد طے کرتا ہے کہ اس کو وکیل نے ہر الزام کی صحت سے انکار کرنے کو کہا تھا۔ اسے چند سیکنڈ کی تاخیر سے یہ خیال آیا کہ میری بات بلف بھی ہوسکتی ہے۔ ردِّعمل کے اسی دانستہ تاخیری حربے نے اس کا پول کھول دیا۔

اس نے پھر شور مچایا "آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں جی۔ کسی بھی ثبوت کے بغیر...."

میں نے کہا "ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے بیٹا۔ میں اس شہر کے ہر ایجنٹ کو جانتا ہوں اور وہ مجھے جانتے ہیں۔ کسٹم سے سامان کلیئر کرانے والے' ڈرائیونگ لائسنس دلوانے والے' موٹر ٹیکس معاف کروانے سے جعلی رجسٹریشن کرانے والوں تک سب سے میری شناسائی ہے اور یہ تو محض اتفاق ہے کہ تم نے جس سے معاملہ کیا تھا اس نے تمہارا نام لیے بغیر لیلیٰ مجنوں کی ایک کہانی مجھے پہلے ہی سُنادی تھی۔ بعد میں اس نے تصدیق کردی کہ مجنوں تم تھے اور لیلیٰ' مقتول تاج بی بی۔ تمہاری اس سے ملاقات عدالت میں ہوگی جب وہ تمہارے خلاف گواہی دے گا۔"

میں نے اتنے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا کہ وہ بائیس سال کا' بے وقوف اور جاہل لڑکا جس نے ابھی تک جرائم کی دنیا کو دور سے ٹی وی یا سینما اسکرین پر ہی دیکھا تھا' نروس ہوگیا اور اگرچہ اس نے زبان سے انکار جاری رکھا مگر اس کے لہجے کا کھوکھلا پن چھپا نہ رہ سکا۔ جب پولیس اسے لے گئی تو وہ پہلے کی نسبت بہت زیادہ متفکر تھا۔

میں نے تعریف طلب نظروں سے ظالم خاں کو دیکھا۔ "کیسی رہی؟"

ظالم خاں کا رشک یا حسد سے کباب ہونا فطری امر تھا۔ "اس نے اعترافِ جرم نہیں کیا۔ تم شرط ہار گئے ہو۔"

"شرط؟ آپ لوگ شرط لگا کے آئے تھے۔" کھوکھر ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "انسپکٹر رحیم خاں' شرط میں مدت کا ذکر نہیں تھا۔ میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ میں پہلی ملاقات میں ہی جرم کا اعتراف کرالوں گا۔ ایسا تو شرلاک ہومز بھی نہیں کرسکتا تھا۔"

"ایسے تو تم ایک مہینہ بھی گزار دوگے' ایک سال بھی۔ شرط ہارنے سے ڈرتے ہو بزدل۔"

میں نے کہا "چلو میں تم کو چوبیس گھنٹے دیتا ہوں۔"

"تم چوبیس گھنٹے میں نہیں' اڑتالیس گھنٹے میں کچھ کرکے دکھادو۔" وہ طیش میں آگیا "دس ہزار کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"میرے لیے ہے۔" میں نے کہا "قطعے اور کالم لکھ کے میں گھر نہیں بنا سکتا اور بنالوں تو بسا نہیں سکتا۔ جُوا کھیلنے میں وہ بھی ہار جانے کا خطرہ ہے جو میں کما چکا ہوں۔ ڈاکا ڈالنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔"

"پھر کیا کروگے؟" ظالم خاں طنز سے مسکرایا۔

"یہی جو میں کررہا ہوں۔ میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔ اڑتالیس گھنٹے کی مہلت پرسوں اسی وقت ختم ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" ظالم خاں نے پھر مجھ سے ہاتھ ملالیا۔

کھوکھر دلچسپی سے سُنتا رہا۔ "کوئی ہارے کوئی جیتے، بھلا تو میرا ہوگا، کریڈٹ تو مجھے ملے گا۔"

میں نے اخلاقاً اس سے نہیں کہا کہ تھانیدار کی جورو کے بھائی، ظالم خاں یہ دس ہزار کا جوا آخر کس کے لیے کھیل رہا ہے۔ جب تمہاری کنفرمیشن ہو جائے تو اس کا نہیں، میرا شکریہ ادا کرنا۔

میں نے کہا "مولوی کو چھوڑ دو۔"

"چھوڑ دوں؟" کھوکھر پریشان ہو گیا۔

"وہ بھاگ کے کہاں جا سکتا ہے۔" میں نے کہا "تم چاہو تو اس کی نگرانی بھی کر سکتے ہو۔"

"اتنی نفری کہاں ہے میرے پاس۔ مگر خیر... فی الحال میں آپ کے کہنے پر مولوی کو چھوڑ رہا ہوں۔ بڑا رسک ہے اس میں کیونکہ ایف آئی آر میں اس کا نام ہے اور میں....."

رحیم خاں نے اس کی بات سمجھ لی "تم اسے منتقل کر دو میرے تھانے میں۔"

میں نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرا مقصد تو مولوی کو اور شہزادہ گلفام کو ایک دوسرے سے جدا رکھنا تھا۔ کہیں رقابت میں دوسرا قتل نہ ہو جائے۔"

جب ہم واپس لوٹے تو ہمارے ساتھ مولوی بھی تھا جس کو ہتھکڑی لگا کے پیچھے بٹھایا گیا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے ہتھکڑی کا دوسرا حصہ اپنی پیٹی سے جوڑ رکھا تھا اور دوسرا کانسٹیبل نمائشی قسم کی رائفل کے ساتھ ملزم کے دوسری جانب بیٹھا۔ وہ مسلح ضرور نظر آتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑنے پر اس کی رائفل میں برسوں سے پھنسی ہوئی گولی نکلنے سے صاف انکار کر دے گی۔

"تم نے فاؤل کھیلا۔" ظالم خاں نے راستے میں کہا۔

"تم بہت فیئر کھیلتے ہو۔" میں نے کہا۔

"بابا ہم تو پولیس والے ہیں۔ تم ہو ایک معزز، نیک نام صحافی اور وکیل۔"

"ہیں تو ایک ہی حمام میں۔" میں نے کہا "اس معاشرے میں آخر فرشتہ کون ہے ظالم خاں؟ ہم انسان ہی بن جاتے تو یہ سب خرابی کیوں ہوتی۔"

ظالم خاں مسکرایا۔ "گویا تم مانتے ہو کہ فرق صرف نام کا ہے۔ کام تمہارا بھی وہی ہے جو ہمارا۔"

"نہیں ظالم خاں۔ فرق نیت کا بھی ہے۔" میں نے کہا "تم بے گناہوں کو مجرم بنا سکتے ہو۔ میں صرف مجرم کو مجرم ثابت کرنے میں تمہاری مدد کر رہا ہوں اور کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اُٹھا رہا ہوں۔ میں نے عاشق علی معشوق کی مدد کا وعدہ کر کے پچیس ہزار کمائے۔ وہ کوئی غریب آدمی نہیں ہے۔ وہ دس گنا کما بھی لے گا۔ تم اپنے سالے کو پکا تھانیدار بنوانا چاہتے ہو اور میرے دوست ہو اس لیے میں تمہاری مدد کر رہا ہوں۔"

"مدد....." ظالم خاں نے طنز سے کہا

"ہاں مدد۔ تمہارا سالا اور تم مل کے کتنا کماتے ہو، مجھے معلوم ہے۔ لوٹ کے اس مال میں سے کچھ وصول کر لینا کوئی آسان کام ہے؟ چوروں اور ڈاکوؤں سے مال چھیننا عین بہادری ہے اور مال غنیمت حلال ہوتا ہے۔"

○☆○

توپ صاحب نے شتر مرغ کی طرح گردن لمبی کر کے باہر اِدھر اُدھر دیکھا اور پیک اُگل کے غڑاپ سے اندر لوٹ آئے۔

"میاں بزدل! بڑی خیر کی آج خدا نے۔" انہوں نے منہ صاف کر کے کہا "ایک غول بیابانی جان کو آ گیا تھا۔ اندازہ کرو کیسے کیسے عمر رسیدہ اور معزز نظر آنے والے لوگ کہاں دوڑ رہے تھے۔"

"ریس کورس میں یا ٹرین کی چھت پر؟" میں نے کہا۔

"او نہوں۔ پتنگ لوٹنے کے لیے سڑک پر۔ اتنی ٹریفک کے بیچ میں۔" توپ صاحب بولے "منہ اوپر اُٹھائے بھاگ رہے تھے۔ ایک فرد کھڑی ہوئی بس سے ٹکرا گیا تھا۔ بس کا کچھ نہیں بگڑا۔ دوسرا ایک خوانچے پر چڑھ گیا تھا۔ وہ ایک بزرگوار بیٹھے ہیں نا اوجھڑی والے۔ ان کے ساتھ کیا بیتا ہے وہ پہلوان....."

"آج کل گاجر کا حلوہ لگاتا ہے۔"

"ہاں۔ بس اس کے تھال پر چڑھ گیا تھا۔ اب تماشا ذرا دلچسپ تھا۔ بے خیالی میں ہم نے اخراج فرما دیا۔ لعاب دہن کا یہ خیال ہی نہ رہا کہ پتنگ لوٹنے والے اوپر ہی دیکھ رہے ہیں۔"

"اچھا۔ پھر وہ سب اوپر آ گئے؟"

"ہاں مگر اندازہ ہم نے بھی کر لیا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ہم نے اپنی جگہ بٹھا دیا اپنے کاتب غلام رسول کو۔ ایک تو ماشاءاللہ وہ حق دار ہے اور گالیاں اچھی دیتا ہے پھر پان تو اس کے خاندان میں کسی نے نہیں کھایا۔ ہم خود تشریف لے گئے سامنے چوہدری صاحب سے ملنے۔ وہ غول بیابانی اندر آیا تو غلام رسول ان پر چڑھ دوڑا۔ پورے بتیس دانت دکھا کے بولا کہ کون..... کھاتا ہے یہاں پان..... کس نے دیکھا تھا، ذرا سامنے آئے۔ بس میاں، وہ اُلٹے پاؤں بھاگے۔"

"یہ جو آپ اتنی ڈھٹائی سے جی رہے ہیں توپ صاحب، یہ آپ کے جاں نثاروں کا کمال ہے۔" میں نے میز پر طبلہ بجاتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا "انعام و اکرام سے نوازا آپ نے غلام رسول کو؟ کوئی صدقہ دیا جان کا، مال کی صورت میں؟"

توپ صاحب نے سو کا ایک نوٹ شیروانی کے اندر سے برآمد کیا۔ "صدقہ ابھی لو۔ یہ بتاؤ، تم پیدل ہو یا اسی مظلوم مخلوق پر سوار ہو کے آئے ہو جسے تم موٹر سائیکل قرار دیتے ہو؟"

"ورنہ وہ کیا چیز ہے؟" میں نے کہا۔

"دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اسے پھٹپھٹی کہا جاتا تھا برخوردار۔" انہوں نے سو کے نوٹ کو لہرا کے کہا "اگر تم ہمت کرو تو برنس روڈ تک دوڑ لگاؤ اور ٹماٹر لے آؤ۔ وہی مغز، نلی اور تڑکے

والی۔ سب برادرانِ اسلام نیاز کا کھانا سمجھ کے کھالیں گے۔"

"آپ کو میں فارغ نظر آرہا ہوں لیکن درحقیقت مجھے انتظار ہے کسی کے فون کا۔"

توپ صاحب نے نوٹ کو احتیاط سے پھر شیروانی میں دفن کر دیا۔ "اب سمجھا' میں تمہاری اس بے قراری کا مطلب۔ اتنی دیر سے جو تم طبلہ بجا رہے تھے میری میز پر لیکن میاں مجنوں۔ خبریں آنے کا وقت ہے۔ اپنی لیلیٰ سے شارٹ ہینڈ میں مذاکرات کرنا۔ سمجھے!"

اسی وقت گھنٹی بجی اور میں نے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریسیور اُٹھالیا۔ "جی میں بزدل ہوں۔"

"ماشاءاللہ! یہ اعتراف کرنے کی ہمت تو ہے۔" صائمہ بولی۔ "میں نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے کہ کیا میں کھانا میس میں کھالوں؟ آلو گوشت اور چنے کی دال۔"

"اس کا مطلب ہے کام نہیں ہوا۔" میں نے کہا "ورنہ تم حکم صادر فرماتیں کہ شیرٹن یا آواری ٹاور پہنچ جاؤ۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے آپ۔ دراصل میری سہیلی کی ایمرجنسی میں ڈیوٹی لگ گئی۔ کل کوشش کریں گے۔ مجھے یقین ہے....."

"دیکھو صائمہ! مجھے بات کرنے کی اجازت نہیں۔ میرے اور تمہارے درمیان ظالم سماج حائل ہے۔ جی تو چاہتا ہے' ساری رات تمہاری مترنم آواز سنتا رہوں۔"

"میں ساری رات اس پی سی او میں کھڑی نہیں رہ سکتی۔"

"اچھا۔ پھر آواری ٹاور آجاؤ۔" میں نے کہا "بلکہ مجھے بھی لے جاؤ اپنے ساتھ۔"

"کیا مطلب' میں لے جاؤں؟"

"دعوت نامہ ہے بھئی۔ مسٹر اینڈ مسز بی زیڈ دلنواز کے لیے۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"بڑا دل دکھایا اس وقت تم نے۔ ہمیں ظالم سماج قرار دے کر۔" توپ صاحب نے شکوہ کیا۔ "بہت عشق کیے تھے ہم نے بھی جوانی میں۔"

"شادی پھر بھی نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسے۔ "اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل۔ شادی ہو جائے تو پھر عشق کہاں رہتا ہے۔ وہ کیا ہے کہ عاشقی قیدِ شریعت میں جب آجاتی ہے۔"

میں نے دوسرا مصرعہ پڑھ دیا۔ "جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے۔ یہ پرانا شعر ہے۔ اب خاندانی منصوبہ بندی کا دور ہے۔ خدا حافظ۔"

نیچے اُتر کے میں اپنی قدیم مگر وفادار موٹر سائیکل پر یوں بیٹھ گیا جیسے خزاں رسیدہ شاخ پر بیٹھ کے بلبل انتظارِ بہار کرے۔ بلبل کے بارے میں غالباً آج بھی مذکر اور مؤنث کا کنفیوژن ہے۔ کوئی بلبل کے گھر والے کو بلبلا تسلیم نہیں کرتا۔

گاڑی کو روکتے روکتے صائمہ نے موٹر سائیکل کو ٹچ کر دیا مگر یہ صدمہ بھی اس عفیفہ کے لیے بہت تھا۔ وہ گری تو میں بھی گرا۔

صائمہ نے کہا "سوری۔ چوٹ تو نہیں آئی؟"

میں نے کپڑے جھاڑ کے اٹھتے ہوئے کہا "میری کوئی بات نہیں لیکن تم نے آثارِ قدیمہ کو تباہ کرنے کی جو کوشش کی وہ قابلِ مذمت ہے مسز بی زیڈ دلنواز۔"

"یہ منہ اور مسور کی دال۔" صائمہ ہنسی۔

"اگر تم خود کو مسور کی دال سمجھتی ہو تو میرے ساتھ جانے کے لیے تم کو یہی منہ قبول کرنا پڑے گا۔" میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا۔

اسی وقت پیچھے سے کسی نے ہنس کے کہا "ہیلو۔"

میں نے چونک کے پیچھے دیکھا "آپ کی تعریف؟"

"یہ میری سہیلی نوشی ہے جو کل آپ کا کام کرے گی۔ ظاہر ہے آج یہ ہمارے ساتھ جائے گی۔"

"ڈاکٹر صائمہ! اسلام میں چار کی اجازت ہے مگر اس کارڈ پر ایک بیوی لانے کی اجازت تھی۔ میری کتنی بدنامی ہوگی دو کے ساتھ۔"

"مجھے معلوم ہے تمہاری کتنی عزت ہے شہر میں۔" صائمہ نے گاڑی دوڑاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات ذو معنی تھی۔ اس کا یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا تھا کہ ایک صحافی کی حیثیت سے میری اتنی "تری" ہے کہ مجھے کون روکے گا اور یہ بھی کہ جب عزت ہی نہیں تو بے عزتی کیسی۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ڈنر میں ہر ایرا غیرا جانے کی ہمت بھی نہیں کرتا۔ چنانچہ وہاں کسی معزز مہمان سے کوئی بھی دعوت نامہ دکھانے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ دو معزز خواتین کے ساتھ بزدل کے لیے بھی دربان نے احترام کے ساتھ سر خم کر کے گیٹ کھول دیا۔ میں اور میرے ہم پیشہ' مفت خوری کے عادی صحافی ان معاملات کے اسرار و رموز کو خوب جانتے تھے۔

شہر میں نام نہاد فلاحی تنظیموں کی وہ افراط تھی کہ اب کسی کو نئی تنظیم بنانے کے لیے نام ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ ہر تقریب محض پبلسٹی یا پی آر کا بہانہ ہوتی تھی اور اس کے لیے صحافی برادری کا تعاون شرطِ اوّل تھی۔ تنظیم فلاحِ جو بہبودِ مریضانِ دردِ سر۔ انجمن سابق اہالیانِ زنداں۔ ادارۂ آبادکاری خرانِ لاوارث۔ اور مہمانِ خصوصی بھی اب خود لاوارث ہی تھے۔ ایک سابق وزیر جو اس اُمید پر جی رہے تھے کہ پہلی بار تدبیر کام آئی تھی' شاید اگلی بار تقدیر سے وزارت مل جائے۔

عین تقریر کے وسط میں کسی نے میرے قریب آکے میرے کان میں کہا "آپ بزدل ہیں؟"

میں نے پلٹ کے کہا "تم کو کیا بہت بہادر نظر آتا ہوں؟"

وہ ایک ویٹر تھا۔ "آپ کا ٹیلی فون ہے سر۔"

میں "ابھی آیا" کہہ کے گیا اور لاؤنج میں رکھے ہوئے ریسیور کو اُٹھالیا۔ "جی میں بزدل؟"

"میاں' بزدل نہیں تم بھلکڑ ہو۔ عذابِ جاں ہو۔" توپ صاحب نے بولنا شروع کیا۔ "تمہارا یہ عشق ہمارا خانہ خراب کرے گا برخوردار۔ جاتے وقت قطعہ کیوں دے کر نہیں گئے؟"

میں نے کہا "توپ صاحب! بھول چوک انسان سے ہوتی ہے۔ آپ اسی لیے کبھی نہیں بھولتے۔ اب لکھ لیں۔"

کھانے کی میز تھی کہ تھا میدان حشر کا
بریانی اور قورمے کی کیا لوٹ مار تھی
معدے بھرے تو خوش نظر آنے لگے عزیز
ورنہ سبھی کے چہروں پر اللہ کی مار تھی

توپ صاحب کڑکڑائے۔ "احوال واقعی رقم کردیا ہے گویا۔ وہاں بھی تو یہی منظر ہوگا۔"

میں نے ریسیور رکھا اور واپس آیا تو چوتھی کرسی پر ہٹلر جیسی مونچھوں اور اسٹالن جیسے بالوں والے ایک شخص کو دیکھ کے حیران ہوا۔

"میں امجد علی ہوں۔" اس نے ہاتھ ملا کے کہا "عجیب اتفاق ہے کہ آپ سے یہاں ملاقات ہوگئی۔ کل سے میں آپ کی تلاش میں تھا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کیا آپ ایف آئی اے کے آدمی ہیں؟ میں نے تو کل سے کوئی جرم نہیں کیا۔"

وہ مسکرایا۔ "میں فنانسر ہوں فلم "خواب اور سراب" کا۔"

"آئی سی۔ فنانسر آپ ہیں تو سیٹھ عاشق علی معشوق کیا ہیں؟" میں نے کہا۔

"انہیں آپ کیا سمجھتے ہیں؟"

میں نے کہا "میرے سمجھنے کی بات نہیں۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ فلم کے پروڈیوسر' ڈائریکٹر سب کچھ ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں خواتین سے معذرت چاہتا ہوں۔" اس نے انگریزی میں کہا "کہ غلط وقت پر اور شاید غلط جگہ ایک کاروباری بات شروع کردی۔"

"اب تک یہ اپنی گفتگو سے مجھے بور کررہی تھیں۔ لپ اسٹک اور نیل پالش کے شیڈز اور کپڑوں کے پرنٹس کے بارے میں میری معلومات صفر ہیں۔" میں نے کہا۔ "انہیں بور کرکے مجھے خوشی ہوگی۔"

صائمہ اور نوشی نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر اپنی باتوں میں لگ گئیں۔

امجد نے کہا "اصل بات یہ ہے کہ میں فلم وغیرہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں تو سولہ سال سے لندن میں ہوں۔ برٹش نیشنلٹی بھی ہے میری۔ عاشق علی معشوق ایک مشاعرے میں آئے تھے تو انہوں نے پروپوز کیا تھا کہ انڈیا کی طرح پاکستان میں آرٹ فلم بننی چاہئے اور اس وقت میرے جذبات حبُ الوطنی نے ایسا جوش مارا کہ میں نے سرمایہ فراہم کرنے کی ہامی بھرلی کیونکہ عاشق علی معشوق نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ فلم کے ہر شعبے میں حرفِ آخر ہیں اور فلمی صنعت میں ان کا تجربہ۔ خیر... حقیقت آپ جانتے ہوں گے۔"

"لیکن آپ پر حقیقت کا انکشاف دیر سے ہوا؟"

"بالکل! میں نے انہیں ورکنگ پارٹنر بنایا' خود سلیپنگ پارٹنر بن گیا۔ میں اس لائن میں آنا بھی نہیں چاہتا تھا اور مجھے جانتا بھی کون ہے۔"

"جانتا تو عاشق علی معشوق کو بھی کوئی نہیں۔"

"اس کے باوجود انہوں نے کوشش کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی نیت خراب تھی یا وہ مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ تعلق نہ ہونے کے باوجود انہوں نے ایک اچھی ٹیم بنالی' ایک اچھی کہانی لکھوالی۔ اسکرین پلے بھی دیکھا ہے میں نے... اب رہ گئے فنی شعبے سے تعلق رکھنے والے۔ فوٹوگرافر' ایڈیٹر وغیرہ۔ سب مل جاتے ہیں۔ بس ہیرو اور ہیروئن کے انتخاب میں گڑبڑ ہوگئی۔ آپ نے دیکھا' اس دن عین وقت پر کیا ہوا تھا؟ ہیرو کے لیے تو میں نے سوچا ہے کہ ایاز نائیک سے بات کرلوں لیکن ہیروئن کا مسئلہ ہے۔"

میں نے پرسکون اور پراعتماد رہتے ہوئے کہا "کیا مسئلہ ہے؟"

"اس دن تو علالت کا بہانہ کرکے ٹال دیا تھا۔ اب عاشق علی نے پریس کانفرنس کی نئی تاریخ دی ہے اور آپ بضد ہیں کہ ہیروئن کو پیش کردیں گے۔"

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔"

"لیکن کیسے؟ میرا مطلب ہے کیا وہ پھر زندہ ہوگئی؟" امجد نے بوکھلا کے کہا۔

"فرض کیجئے وہ مری ہی نہ ہو۔"

"یہ میں کیسے فرض کرلوں۔ اخبار نہیں دیکھا آپ نے؟"

"آپ حلوائی سے پوچھ رہے ہیں کہ مٹھائی دیکھی ہے؟" میں نے وہی بات دُہرائی جو صائمہ سے کہی تھی۔ "امجد صاحب آپ اب تک خاموش تماشائی تھے۔ میرا مشورہ ہے کہ خاموش رہ کے تماشا دیکھیں۔"

"تاکہ پھر لوگ میرا تماشا دیکھیں۔ نو سر۔ اگر آپ نے مجھے مطمئن نہ کیا تو میں اپنے طور پر ایک پریس کانفرنس بلا کے اعلان کردوں گا کہ میں اس آرٹ مووی کے لیے نئی لڑکی کو سائن کررہا ہوں۔ اور مجھے وہ لڑکی حفیظ فاطمہ بہت موزوں نظر آتی ہے۔ پاکستانی شبانہ اعظمی ہے وہ۔ "فنکار گلی" میں اس کی صلاحیت....."

میں نے کہا "اگر آپ خاموش رہنے کا وعدہ کریں تو میں آپ کو شریکِ راز کرسکتا ہوں۔ اگر میں نے مقتول ہیروئن کو سب کے سامنے پیش کردیا تو آپ سوچئے یہ پبلسٹی کے لیے کتنا بڑا دھماکا ہوگا۔ آپ ایک لاکھ خرچ کرکے بھی پبلک کو اتنا چونکانے میں ناکام رہیں

گے جتنا....."

"میں نے سنا ہے، تم نے عاشق علی معشوق سے پچیس ہزار لیے تھے؟"

"بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔"

"یعنی اس کے قتل کی خبر ایک ڈراما ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ قتل کی خبر کسی ایک اخبار نے نہیں دی۔ آپ پولیس سے بھی معلوم کرسکتے ہیں۔"

اس نے میز پر مُکّا مارا۔ "میں پچاس ہزار دوں گا تمہیں لیکن یہ فراڈ ہوا تو....."

"میں ایک لاکھ دوں گا۔" میں نے بھی میز پر مُکّا مارا۔

"ایک لاکھ سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں جیل میں سڑوا دوں گا تمہیں۔" اس نے غصے سے کہا۔

"مجھے دھمکی مت دو۔ میں آدمی کی جڑوں میں بیٹھ جاتا ہوں۔ سب معلوم کرلوں گا کہ سولہ سال پہلے تم لندن کیوں گئے تھے، وہاں کیا کرتے ہو اور اب یہاں کیوں آئے ہو۔ یہ بلیک منی ہے کہ ڈرگ منی....."

اس کا رویّہ اور رنگ ایسا بدلا کہ گرگٹ بھی دیکھتا تو شرما جاتا۔

"اوکے اوکے۔" اس نے ہر طرف سے گھورنے والوں کی نظروں سے گھبرا کے سرگوشی میں کہا "ڈونٹ شاؤٹ۔ اگر اتنا اعتماد ہے تمہیں تو پھر..... ٹھیک ہے..... میرا بہت سرمایہ پھنس گیا ہے اس کھیل میں۔ میں واقعی پچاس ہزار دوں گا تمہیں۔"

"میں بھی مذاق نہیں کررہا تھا۔ میں ایک لاکھ دوں گا۔ نقد۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔

اس نے ہاتھ ہلایا اور معذرت کرکے اُٹھ گیا۔ "میں کسی اور کے ساتھ ہوں۔ سوری اگین لیڈیز۔ آپ کا موڈ خراب ہوا۔"

"کاش میں بتا سکتا کہ میرا موڈ اچانک کتنا اچھا ہوگیا ہے۔" میں نے اس کے جاتے ہی کہا۔ "ڈاکٹر صائمہ! کیا اب میں یہ ہوٹل خرید سکتا ہوں۔ معلوم نہیں اچانک تقدیر مجھ پر کیوں اتنی مہربان ہوگئی ہے۔ ذرا میں ٹوٹل کرلوں۔ چھبیس اور دس چھتیس۔ اور پچاس چھیاسی ہزار۔ اف! اتنی دولت ہو تو معلوم ہے ہم مسلمان کیا کرتے ہیں؟"

"کیا کرتے ہیں؟" نوشی نے کہا۔

"دوسری شادی۔" میں نے کہا۔

"پھر کرتے کیوں نہیں؟" صائمہ نے آنکھیں نکال کے کہا۔

"حد کرتی ہو تم بھی۔ پہلی تو ہوجائے۔" میں نے کہا "چلو کھانا شروع ہوگیا۔ تقریریں ختم۔"

اس رات میں نے بڑے اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ بیشتر خوابوں کا تعلق چھیاسی سے تھا۔ میں نے ایک ماہر تعمیرات کو حکم دیا کہ میرے لیے چھیاسی ایکڑ پر محل تعمیر کیا جائے جس میں چھیاسی بیڈروم ہوں۔ دوسرے خواب میں، میں نے صائمہ کو منہ دکھائی میں چھیاسی تولے سونے کا نیکلس پہنادیا اور وہ دھڑام سے گری۔ تیسرے میں مجھے ایک مرقد نظر آیا جس پر سات سو چھیاسی کے بعد لکھا تھا "بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔ وفات العمر چھیاسی سال۔"

اس کے بعد میں اٹھا تو کالم لکھنے بیٹھا مگر دماغ میں خیالات کی خانہ جنگی جاری تھی۔ تصور جیسے ٹی وی اسکرین بن گیا جس پر بٹن دبانے سے کھٹا کھٹ تصویریں بدل جاتی تھیں۔ صائمہ، انارکلی، چھیاسی ہزار، خواب اور سراب سب گڈمڈ ہوگئے تھے۔

دوپہر تک میں "حقیقت ساز" کے دفتر میں فون کو گھورتا رہا اور توپ صاحب میری پراسرار خاموشی پر تشویش میں مبتلا رہے۔ صائمہ نے کہا تھا کہ مجھے فون مت کرنا، دوپہر تک میری ڈیوٹی ہے۔ اس کے بعد ہی میں نوشی کو ساتھ لے کر نکلوں گی۔ اُمید ہے، اس کا پتا چلانا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ ضرور ریلوے کوارٹرز میں رہتی ہوگی۔

توپ صاحب نے مجھے بہت سے مفید مشورے دیے۔ مثلاً یہ کہ صائمہ سے شادی کرلو تاکہ تمہارا دماغ درست ہوجائے۔ یہ عشق تو تمہارے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے گا۔ جب میں نے نفی میں سرہلایا تو انہوں نے مجھے پہلے ایک ماہرِ نفسیات سے اور پھر روحانی عملیات کے ایک ایسے سنیاسی باوا سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا جو شاہ جنات کے علاوہ عشق کا بھوت اُتارنے کا بھی خاصا تجربہ رکھتے تھے۔

جب بھی فون کی گھنٹی بجی، میں نے توپ صاحب سے پہلے ریسیور اُٹھایا۔ صائمہ کی کال ڈھائی بجے موصول ہوئی۔

میں نے چلّا کے کہا "کیا ہوا؟"

اس نے مردہ آواز میں کہا "کچھ نہیں۔ متولہ وہی تھی۔ ڈبل رول میں۔"

"کیا؟" میں نے چیخ کر کہا "تم پاگل ہوگئی ہو کیا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "پاگل تو تم ہو رہے ہو۔ بھئی مبارک ہو بزنل صاحب، آپ کا گوہرِ نایاب ہاتھ آگیا۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"میرے ساتھ کھڑی ہے۔ بات کروگے؟"

"نہیں۔ دیکھو تم کہاں ہو؟ کہاں سے بات کررہی ہو؟"

"نیچے سے۔ تمہارے آفس کے نیچے پی سی او ہے۔ وہ کار میں بیٹھی ہے۔"

میں نے ریسیور پھینکا اور ایک جست میں توپ صاحب کو عبور کرگیا۔ اگر وہ سرنیچا نہ کرتے تو میں منہ کے بل گرتا اور ان کے سرِ عزیز پر فٹ بال کی طرح کک لگتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔

O☆O

عاشق علی معشوق نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "امجد علی صاحب، غضب خدا کا، اتنی آسانی سے آپ نے پچاس ہزار کا چیک کاٹ

دیا۔ میں کہتا ہوں' اب بھی وقت ہے' چیک کینسل کردیں۔"

امجد علی نے نفی میں سرہلایا۔ "ایک تو یہ بات ہے اصول کی۔ میں شرط ہار گیا ہوں۔"

"آپ نہیں جانتے اسے۔"

میں نے کہا "عاشق علی معشوق صاحب! یہ آپ کو بھی نہیں جانتے تھے پھر بھی انہوں نے آپ پر اعتبار کیا۔"

امجد علی نے کہا "دوسری بات یہ کہ میں اس رقم کو پبلسٹی کی مد میں ڈال سکتا ہوں۔ پوسٹر ریلیز کردیا ہے نا آپ نے؟"

"پوسٹر تو کل ہی لگ گئے تھے۔ آج اخبارات میں اشتہار بھی ہے۔" عاشق علی معشوق نے کہا "بڑی سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "دعوت نامے محدود تعداد میں جاری کئے جائیں۔ صرف انہی کو جن کے لیے میں کہوں۔ قبل از وقت کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ آپ باقی انتظامات مکمل کرلیں۔ میں اسکرپٹ پر کام کررہا ہوں۔ پہلا شاٹ ہی اوکے ہونا چاہئے۔ ری ٹیک کی گنجائش نہیں ہے۔"

"ریہرسل کیسی جارہی ہے؟" امجد علی نے کہا۔

"اے ون۔ ڈاکٹر صائمہ میں اداکاری کی صلاحیت بھی اتنی ہی زبردست ہے جتنی ہدایت کاری کی۔" میں نے کہا۔

عاشق علی معشوق نے ایک آہ بھری۔ "اب تو بقول شاعر "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" ہم کیا کہیں بھائی۔ تمہیں غلط کہہ سکتا ہے کوئی۔"

"ایک شخص کہہ رہا ہے ابھی۔" میں نے کہا "ظالم خاں نام ہے اس کا۔ میں ذرا اس کی جورو کے بھائی سے بات کرلوں۔ ساری خدائی...."

عاشق علی معشوق نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ میرا دماغ واقعی چل پڑا تھا اور بالکل صحیح سمت میں۔

حق نواز کھوکھر نے نمبر ملتے ہی کہا "بزدل صاحب! یہ سب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کہیں یہ معاملہ اُلٹا میرے گلے نہ پڑ جائے۔"

"اس سے مجھے کیا ملے گا؟ تمہیں تکلیف میں ڈال کے۔"

وہ ہنسا "آپ کو ملیں گے دس ہزار۔"

میں نے کہا "تمہیں بھی ترقی ملے گی اور یار' ہم تو کبھی کبھی مارتے ہیں اتنا لمبا ہاتھ۔ اناڑی شکاری ہیں نا۔ اتفاق سے خود ہی مچھلی پھنس جائے تو اور بات ہے۔ آپ لوگ جہاں جال پھیلاتے ہو' شکاری شکار۔ اصل فائدہ تو تمہارا ہی ہے۔"

"دراصل کسی تھانے میں یہ سب پہلے کبھی ہوا نہیں۔ افسرانِ بالا تو مکھی پر مکھی مارنے کے عادی ہیں۔ الزام نہ آجائے مجھ پر کہ..."

"تم اس کی فکر مت کرو۔ فرض کرو میں ایس پی صاحب کو بھی لے جاؤں ساتھ۔ وہ بھی ایک عینی گواہ بن جائیں گے۔"

"اگر ایسا ہوجائے تو کیا بات ہے۔" وہ خوش ہو کے بولا۔

"ہوجائے گا۔" میں نے کہا "بس تم اپنے جیجا جی سے کہہ دینا کہ نقد لے کر آئیں ساتھ۔ ادھار نہیں چلے گا۔"

"اس کی فکر آپ مت کریں۔ ان کا ضامن میں...."

ایس پی کو فون کرنے کے بعد میں نے اپنے فلیٹ کا رخ کیا جہاں بند دروازوں کے پیچھے ڈاکٹر صائمہ بڑی محنت سے انارکلی کو ریہرسل کرا رہی تھی۔ اس لڑکی میں بڑی صلاحیت تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے ڈائیلاگ بہت اچھی طرح یاد کئے تھے۔ اس کا شین قاف بھی درست تھا اور ڈائیلاگ ڈلیوری کے ساتھ آہستہ آہستہ اس نے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور چہرے کے تاثرات میں تغیر و تبدل پر بھی عبور حاصل کرلیا تھا۔

وہ شیطان کی خالہ جس نے پہلے دن مجھے حدود آرڈیننس کے تحت اندر کرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' میرے بیڈ پر پھسکڑا مارے اپنا پاندان کھولے بیٹھی تھی۔ اسے انارکلی کے ساتھ دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا مگر میں دل کو سمجھاتا تھا کہ گلوں کے ساتھ خار بھی ہوتے ہیں۔

میں نے کہا "انارکلی! میں تمہارے تابناک مستقبل کی پیش گوئی کرتا ہوں لیکن اس کا انحصار تمہاری آج کی کامیابی پر ہے۔ تم نے یہ مشکل اسکرین ٹیسٹ پاس کرلیا تو سمجھو...."

"اے بیٹا! کچھ مجھ نگوڑی کو بھی تو سمجھاؤ۔ یہ فلموں والے کیا دیں گے آخر؟" خالہ نے ابھی سے انارکلی کے بزنس منیجر کے فرائض سنبھال لیے تھے۔

انارکلی نے غصے سے کہا "کیا فضول باتیں کرتی ہو خالہ!"

"لو یہ فضول بات ہے؟ کیسا یہ سچ ہے بیٹا کہ بے بی کفن باندھ کے جائے گی۔ اللہ میری توبہ!" بڑی بی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"کفن میں تو ہم سب جائیں گے خالہ۔ تم کو پسند نہیں تو وصیت کردینا کہ شادی کا بنارسی جوڑا پہنایا جائے۔" میں نے جھلا کے کہا۔

صائمہ نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ "کیسی ہے تیاری جناب؟"

"سب کے سامنے بتاؤں؟ بڑی قیامت ڈھا رہی ہو لال جوڑے میں۔"

اس نے لال ہو کے کہا "میں انارکلی کی بات کررہی تھی۔"

"اچھا اچھا۔ ابھی کیا ہے جب پورا میک اپ ہوگا اور میک اپ کرنے والے ہوں گے پروفیشنل۔ پھر دیکھنا رنگ انارکلی کا۔"

انارکلی خوش ہوئی۔ "میں کیسے شکریہ ادا کروں آپ کا۔"

"بتائیں گے وقت آنے پر۔ شکریہ ادا کرنے کے طریقے بہت ہیں۔" میں نے کہا "اب میں جارہا ہوں آخری بار انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے۔ شام کو آؤں گا۔ تیار رہنا۔ کسی چیز کی ضرورت ہے تو ابھی بتادو۔"

عاشق علی معشوق نے کسی منجھے ہوئے ہدایت کار کی طرح

سارے انتظامات اپنے مشیر امور ظلمیات اور معاونِ خصوصی جناب تفنگ چنگیزی مدیر اعلیٰ روزنامہ حقیقت ساز یعنی توپ صاحب کی مدد سے کیے تھے چنانچہ خامی کوئی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اب سارا دارومدار انارکلی پر تھا کہ کہیں وہ عین وقت پر نروس نہ ہو جائے یا ڈائیلاگ نہ بھول جائے۔

ظالم خاں کو مجبوراً ایس پی کے ساتھ آنا پڑا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ معاملہ اس حد تک ڈرامائی ہو جائے گا کہ افسرانِ بالا بقلم خود اس کا ڈراپ سین دیکھنے پہنچ جائیں گے۔ چیدہ چیدہ اخبارات کے چند رپورٹرز کے ساتھ امجد علی اور عاشق علی معشوق آٹھ بجے پہنچے۔

حق نواز کھوکھر نے شام ہی سے شوٹنگ کے لیے سازگار ماحول کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے تھانے کی بیشتر نفری کو اِدھر اُدھر کر دیا۔ سختی سے تاکید کرنے کے بعد کہ دس بجے سے پہلے کوئی تھانے کا رخ نہ کرے۔ ہم سب پچھلی طرف سے کھڑکی کے راستے اس کے کمرے میں پہنچے اور خاموش بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے ایک ٹی وی تھا جس کے اسکرین پر ہم حوالات کے واحد قیدی شہزادہ گلفام کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ اس کے لیے ویڈیو کیمرہ چھت میں انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا اور کیبل براہِ راست ٹی وی تک باہر باہر سے لایا گیا تھا۔

انارکلی کے ساتھ صائمہ ٹھیک آٹھ بجے پہنچ گئی۔ ملحقہ کمرے میں عاشق علی معشوق کے ساتھ آنے والی ایک خاتون نے انارکلی کے رول کو فائنل ٹچ دیا اور میک اپ کے بعد ساڑھے آٹھ بجے گرین سگنل دیا۔ صائمہ نے اس کی بہت ہمت بندھائی تھی چنانچہ کفن پہن کے بالکل قبر سے نکلنے والی لاش کی طرح نظر آنے کے باوجود وہ گھبرائی ہوئی نہیں لگتی تھی۔

اس ایک کمرے کے سوا جہاں ناظرین موجود تھے، تھانے کی ہر لائٹ ساڑھے آٹھ بجے گُل کر دی گئی۔ وڈیو کیمرہ گھپ اندھیرے میں بھی تصویر اُتار سکتا تھا۔ یہ تصویر اتنی روشن اور واضح تو نہیں تھی مگر جس حد تک انسانی آنکھ اندھیرے میں دیکھتی ہے، اس سے کہیں زیادہ کیمرہ دکھا رہا تھا۔ ویسے بھی اس کارروائی کا مقصد مجرم کا اعترافِ جرم ریکارڈ کرنا تھا اور اس کی آواز زیادہ اہم تھی۔ تاہم اس کی شبیہہ بھی صاف پہچانی جاتی تھی۔

حق نواز نے تھانیدارانہ لہجے میں چلّانا شروع کیا۔ "اوئے یہ کیا مصیبت ہے، لائٹ کیوں چلی گئی ہے؟"

ایک کانسٹیبل تھانے کے درِ خاص پر استادہ تھا اور اسے حکم تھا کہ گورنر بھی آئے تو وہیں روک دے۔ اس نے چلّا کے جواب دیا "بتی چلی گئی ہے سرجی۔ سارے علاقے کی۔"

"اوئے کھوتے! فیوز دیکھا ہے؟ کوئی لالٹین، موم بتی ہے؟"

"لالٹین اور موم بتی تو نہیں ہے سرجی۔"

"پھر کیا ہے یہاں؟ یہ تھانہ ہے کہ چنڈو خانہ۔ باقی سب چلے گئے ہیں ڈاکوؤں کا گھیرا ڈالنے، ہمیں مصیبت میں ڈال گئے ہیں۔"

حق نواز برآمدے میں کھڑا ہو کے چلّانے لگا۔ "میں اکیلا یہاں کیا کروں اندھیرے میں؟"

"سرجی! ہوشیار رہیں۔ آج کل سانپ بھی بہت نظر آرہے ہیں اس علاقے میں۔"

"چپ سانپ کے بچے۔" کھوکھر نے بیزاری سے کہا "ابھی کوئی واردات ہو جائے، افسر چھاپا مارنے آجائیں تو۔"

"سرجی! آپ بھی چلے جائیں۔ تھانے کی ساری نفری کے ساتھ آپ ہوں گے تو ڈاکو جرأت نہ کریں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں۔ خیال کرنا، اس نمونے کا جو حوالات میں ہے۔"

"فکر ہی نہ کریں آپ سرجی۔ تھاں گولی مار دوں گا، میں اگر اس نے باہر قدم نکالا۔ اس کا کوئی حمایتی آیا تو اسے بھی ڈک دوں گا۔" سپاہی نے بات کرتے کرتے اچانک چیخ ماری۔ "سرجی! ہوشیار..."

"کیا ہو گیا..."

"سانپ اتنا لمبا سرجی۔ ابھی اندر گیا ہے۔ اِدھر میرے پاس سے گزر کے۔ اللہ جی میری توبہ۔"

"وہم ہو گا تمہارا۔" حق نواز بولا "میں آتا ہوں ابھی آدھے پونے گھنٹے میں۔"

توپ صاحب نے میری پیٹھ تھپکی۔ "شاباش، بڑا اچھا اسکرپٹ ہے۔"

میں نے انہیں گھور کے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "پان کی پیک کے سب چھینٹے مجھ پر پڑ رہے ہیں۔"

ٹھیک پانچ منٹ بعد گھپ اندھیرے میں ایک سفید ہیولا سا نظر آیا۔ یہ انارکلی تھی۔ اس نے کفن پہن رکھا تھا مگر اس کا چہرہ یوں کھلا ہوا تھا جیسے لواحقین کو آخری دیدار کے لیے بلاتے وقت کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سفرِ آخرت شروع ہوتا ہے۔

انارکلی کے ایک ہاتھ میں موم بتی تھی جس کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ زیادہ پُرآسیب نظر آرہا تھا۔ یہ میک اپ کا بھی کمال تھا اور انارکلی کی اداکاری کا بھی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر نیچی نیچی آنکھوں سے یوں دیکھتی چل رہی تھی جیسے کوئی نیند میں چلتا ہے۔ چلنے سے زیادہ یہ ہوا پر سبک قدموں سے تیرنے کا عمل تھا۔ محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے پیر زمین کو نہیں چھو رہے ہیں۔

اس کے دوسرے ہاتھ میں چار فٹ لمبا بل کھاتا سانپ تھا۔ یہ سانپ کسی چیونٹی سے زیادہ بے ضرر تھا اور شاید کاٹتا جانتا ہی نہ ہو کیونکہ مدت سے یہ ایک سپیرے کی پٹاری میں بند تھا۔ ظاہر ہے، اس کے زہریلے دانت پہلے ہی نکالے جا چکے تھے۔ اس کے باوجود انارکلی جیسی لڑکی کے لیے یہ بہت ہمت اور حوصلے کی بات تھی اور میرا یقین ہے کہ فلمی دنیا میں آج تک کسی نے اس سے زیادہ مشکل اسکرین ٹیسٹ نہیں دیا ہو گا۔ اس کی اداکاری دیکھ کے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا مگر صائمہ دو بار میری پسلی میں انگلی چبھو کے

میرے کان میں کہہ چکی تھی کہ یہ سب اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔
باقی سب کے سامنے میں اسے کوئی مناسب جواب نہیں دے سکتا تھا۔ حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ ہی نہ تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اگر انارکلی میں اداکارانہ صلاحیت نہ ہوتی تو صائمہ سر پیٹ لیتی مگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوتے۔
روشنی کا مختصر سا دائرہ برآمدے میں جھلملایا اور شاید اس نے حوالات میں بے چین ہونے والے گلفام کو متوجہ کیا جو تاریکی' خاموشی اور تنہائی میں ویسے ہی خوف کا شکار تھا۔ اب اسے دوسرے کیمرے نے فوکس کرلیا تھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی نے تصویر کو قدرے صاف کردیا۔
وہ چند سیکنڈ پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ "تم.... کون.... ہو"
انارکلی بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔
"کون.... کون ہو تم.... یہ.... یہ سانپ...." وہ ایک دم پیچھے ہٹا۔ اس کی حالت خوف اور دہشت سے غیر ہوگئی تھی۔ وہ حوالات کی پچھلی دیوار سے جالگا تھا اور بے چینی سے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کو آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔
"تم.... تاج.... تاج بی بی!" وہ ہذیانی انداز میں چلّایا۔
انارکلی نے بھیانک سرگوشی میں کہا "گلفام.... میں تیرے ساتھ جانے کے لیے آئی ہوں۔ اپنی قبر سے نکل کے۔ دیکھ یہ مٹی میری قبر کی ہے۔"
گلفام چلّانے لگا۔ "بچاؤ.... کوئی بچاؤ۔ سانپ.... بھوت.... تھانیدار صاحب!"
"جتنا شور چاہے کر گلفام.... میری آواز کسی نے نہیں سُنی تھی تو تیری کون سُنے گا۔"
انارکلی اب حوالات کے باہر ہی رک گئی تھی۔
گلفام کے حلق سے بے ربط آوازوں کا شور ٹوٹے ہوئے جملوں کی صورت میں نکل رہا تھا۔ "تاج بی بی.... خدا کے لیے.... کیا چاہتی ہو تم...."
حوالات کے دروازے کا تالا پہلے ہی کھول دیا گیا تھا مگر گلفام کو معلوم نہ تھا۔ معلوم ہوتا تب بھی فرار ہونا اس کے بس میں نہ تھا۔ اب بڑی خاموشی سے کوئی آواز کیے بغیر انارکلی نے کنڈی کو کھسکایا اور دروازے سے یوں حوالات میں داخل ہوئی کہ لگتا تھا' وہ کسی روح کی طرح سلاخوں میں سے گزر گئی ہے۔
گلفام نے دہشت میں حلق سے عجیب سی آواز نکالی۔ "تاج بی بی.... مجھے معاف کرو.... معاف کردو مجھے.... خدا کے لیے.... آ.... یہ سانپ.... اسے دور رکھو...."
"سانپ؟ کہاں ہے سانپ...."
"یہ.... تمہارے ہاتھ میں.... تاج بی بی!" گلفام چلّایا۔
"میرے ہاتھ میں.... یہ تو موم بتی ہے اور تو کچھ بھی نہیں ہے۔" گلفام کی حالت ابتر ہوگئی۔ وہ سمجھا کہ جیسے سنتری نے صرف سانپ کو اندر آتے دیکھا' ایسے ہی وہ صرف تاج بی بی کو دیکھ رہا ہے۔ سنتری کسی روح کو کیسے دیکھ سکتا تھا مگر وہ روح کے ساتھ ایک عذاب ناک موت کو بھی دیکھ رہا ہے۔
"تاج بی بی.... تاج بی بی..... تمہیں اللہ رسولؐ کا واسطہ؛
..... وہ دہشت زدہ ہو کے حوالات کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔
انارکلی رک گئی۔ ٹی وی کیمرے پر اس کی صورت پر پھیلی ہوئی روشنی کا تاثر بہت بھرپور تھا۔ ایک لمحے کے لیے خود میرے جسم میں خوف کی ٹھنڈی لہر دوڑ گئی اور میرا خیال ہے' باقی سب لوگ بھی اس منظر میں اتنے ہی منہمک تھے جتنے ٹی وی کے کسی ڈرامے کے ناظرین گردوپیش سے بے خبر ہو کے منظر کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔
"ایسا کیوں کیا تھا تم نے گلفام؟ تم تو مجھے ساتھ لے جانا چاہتے تھے پھر مجھے اکیلا کیوں روانہ کردیا؟"
"مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں گنہگار ہوں۔ مجرم ہوں تمہارا۔"
"تم تو محبت کرتے تھے مجھ سے پھر مجھے قتل کیوں کردیا تم نے؟"
"مجھے.... مجھے ڈر تھا کہ تم اسے سب بتادوگی۔ اپنے شوہر کو.... اور مجھے انتقام کے جذبات نے اندھا کردیا تھا۔ میں پاگل ہوگیا تھا۔"
"تم نے جھوٹ بولا تھا نا مجھ سے.... اتنا پیسہ کہاں تھا تمہارے پاس کہ تم مجھے کہیں لے جاکے رکھتے۔ کسی بنگلے میں.... کسی ہوٹل میں۔"
"تاج بی بی.... خدا کے لیے.... سانپ.... سانپ کو ہٹاؤ.... میں بتاتا ہوں.... میں بتاتا ہوں تمہیں۔" وہ کانپتے ہوئے بولا۔
"بار بار سانپ کہاں نظر آرہا ہے تمہیں؟ یہاں تو کوئی بھی سانپ نہیں ہے۔ وہم ہے تمہارا۔"
گلفام کا رنگ کسی لاش کی طرح سفید ہوگیا تھا۔ "تاج بی بی۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ تھانیدار صاحب.... حوالدار.... ارے کوئی ہے؟"
"کوئی تمہاری آواز سُن ہی نہیں سکتا گلفام۔ مجھے بتاؤ' اس روز تم نے کیا کہا تھا مجھ سے؟ بولو...."
"میں.... میں نے کہا تھا.... میرے ساتھ چلو.... ہم لاہور چل کے رہیں گے اور تم نے.... تم نے کہا تھا کہ.... ہم پکڑے جائیں گے.... کب تک چھپ کر رہیں گے.... اور پھر.... تم نے مجھے کہا تھا.... کیا ہم.... باہر نہیں جاسکتے.... بمبئی نہیں جاسکتے.... اور میں نے کہا تھا کیوں.... کیوں نہیں تاج بی بی.... جہاں تم کہوگی وہاں چلے جائیں گے ہم۔ پیسہ میرے سیٹھ کے پاس.... بہت ہے۔ میں جس دن چاہوں اس سے چھین سکتا ہوں.... لاکھوں ہوتے ہیں اس کے پاس.... میں اپنا اور تمہارا پاسپورٹ بنوالوں گا.... فرضی نام سے.... کوئی ہمیں کیسے پکڑے گا.... مگر تم نے انکار کردیا تھا.... تم کو اعتبار نہیں تھا مجھ پر.... تم ڈرتی تھیں اپنے شوہر سے اور اپنے باپ سے.... تم نے کہا تھا کہ وہ بہت ظالم ہیں۔ تم نے مجھے منع کردیا تھا کہ پھر نہ

آؤں....."

"بولو گلفام.... چپ کیوں ہو گئے... اس کے بعد کیا ہوا تھا..."

"میں.... میں نے وہ پوسٹر دیکھ لیا۔ اس میں تمہاری تصویر تھی..... مجھے یقین نہ آیا... مگر وہ تم تھیں... میں نے تم سے بات بھی کی تھی... مگر تم نے جھوٹ بولا تھا.... انکار کر دیا تھا.... غصے میں... میں تمہارے باپ کے پاس چلا گیا.... اس نے بھی مجھ پر یقین نہیں کیا.... اس نے گالیاں دیں مجھے.... کہا کہ میں تجھے گولی مار دوں گا دھوکے باز.... بدنام کرنا چاہتا ہے میری بیٹی کو... اس کے لیے پوسٹر چھاپ کے لایا ہے پریس سے... میں سب سمجھتا ہوں اس بدمعاشی کو... میں اور مشتعل ہو گیا... میں نے وہ پوسٹر اس وقت دروازے سے اندر ڈال دیا جب تمہارا شوہر اندر تھا... یہ اس کی غیرت کے منہ پر طمانچہ تھا۔ اس نے تم سے پوچھا مگر تم نے اس کے سامنے بھی انکار کر دیا..... یہ کہا کہ تصویر کسی اور کی ہے۔"

"میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا گلفام۔ وہ میری تصویر نہیں تھی۔ وہ لڑکی انارکلی تھی۔"

"انارکلی!" گلفام کا جیسے سانس رُک گیا۔ "کون انارکلی؟"

"رضیہ بانو ہے اس کا نام۔ فلم میں انارکلی۔" وہ سپاٹ، کھوکھلے اور زندگی سے عاری لہجے میں کسی روبوٹ کی طرح بات کر رہی تھی اور اس کی آواز بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بے جان تھا اور آنکھیں بے نور لگتی تھیں۔ میک اپ میں اس کی آنکھوں کے اندر جو کنٹیکٹ لینس لگائے گئے تھے وہ دھندلے اور غیر شفاف تھے۔ بالکل کسی نابینا کے قرنیہ کی طرح۔

"تم..... یہ تم نے.... مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا تھا؟" گلفام کی آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔

"یہ تو مجھے اب معلوم ہوا ہے، اس وقت کہاں معلوم تھا۔ اب میں ایک روح ہوں، مجھ پر ہر راز آشکار ہو چکا ہے۔" انارکلی نے کہا "میں انکار ہی کر سکتی تھی۔ اس وقت میں تم کو انارکلی کی جگہ تاج بی بی نظر آ رہی تھی۔ جیسے اس وقت تم کو میرے ہاتھ میں سانپ نظر آ رہا ہے حالانکہ میرا ہاتھ خالی ہے۔"

"یہ..... یہ کیا ہے پھر.... دیکھو.... یہ سانپ کیسے پھنکار رہا ہے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔ یہاں صرف تم ہو یا میں.... مجھے بھی تمہارے سوا کون دیکھ سکتا ہے۔"

"مجھے..... مجھے معاف کر دو خدا کے لیے۔" وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"ایک بار اعتراف کر لو اپنے جرم کا میرے سامنے۔ کہہ دو کہ تم دھوکا دے رہے تھے مجھے... تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے۔ یہ محبت نہیں ہوس تھی۔ تم ڈاکا ڈال کے، قتل کر کے مجھے رسوائی کے غار میں دھکیل دیتے۔ کیا یہ محبت تھی تمہاری؟"

"میں..... گناہ گار ہوں.... مجرم ہوں تمہارا.... مجھے معاف کر دو تاج بی بی۔" وہ دیوانہ وار ہکلاتے ہوئے بولا۔

"میں معاف کر دوں گی تمہیں لیکن میرے سامنے ایک بار اپنے ہر جرم کا اعتراف کر لو۔ صرف میرے سامنے۔ میرے سوا نہ کوئی دیکھنے والا ہے، نہ سُننے والا۔" انارکلی نے اسی لہجے میں کہا۔

خوف سے قریب المرگ گلفام نے سب بتا دیا، اپنے ہر جرم کا اعتراف کر لیا۔ یہ بھی مان لیا کہ اس کی نیت بہت پہلے سے خراب تھی اور وہ اپنے سیٹھ کو قتل کر کے کہیں بھاگ جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ کسی دن رقم زیادہ ہو تو وہ لمبا ہاتھ مار کے نکل جائے۔ پھر اچانک اسے وہ پوسٹر مل گیا اور اس نے کوشش کی کہ کسی طرح تاج بی بی کو اپنا لے۔ ناکامی نے اسے مشتعل کیا اور جب وہ بلیک میلنگ میں بھی ناکام رہا تو اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ پوسٹر تاج بی بی کے گھر میں ڈال دینے کے بعد اس کو خیال آیا کہ اس نے کتنی بڑی اور خطرناک غلطی کی ہے۔ مولوی نعمت اللہ غصے میں پاگل ہو کے تاج بی بی کو مار ڈالے گا۔ وہ لوٹ کر گیا تاکہ موقع ملے تو پوسٹر واپس لے آئے مگر اس وقت تک صورتِ حال اس کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ اس نے تاج بی بی کے چیخنے چلّانے کی آواز سُنی۔ مولوی نعمت اللہ اس کو مار رہا تھا اور وہ انکار کر رہی تھی کہ تصویر اس کی نہیں ہے۔ اس کا کسی فلم سے کیا تعلق۔ مولوی شک میں پڑ گیا۔ تاج بی بی کے اعتماد نے اس کے یقین کو متزلزل کر دیا۔ وہ اسے کمرے میں بند کر کے یہ سب تاج بی بی

Scanned By: ATA-UL-MUSTAFA 0333-4585215

SCANNED BY: ATA-UL-MUSTAFA

... کے باپ کو بتانے گیا۔ موقع پاتے ہی گلفام پھر تاج بی بی کے پاس پہنچا۔ اس نے دستک دی۔ تاج بی بی سمجھتی تھی کہ وہی خرابی کا ذمے دار ہے۔ اس نے اندر سے تالے کی ڈپلی کیٹ چابی باہر پھینک دی اور گلفام کو اندر بلالیا۔ وہ اسے قتل کر دینا چاہتی تھی۔ گلفام کے اندر جاتے ہی تاج بی بی نے اس پر چھری سے وار کیا۔ گلفام نے خود کو بچاتے ہوئے تاج بی بی کو دھکا دیا۔ اس کا سر چارپائی سے لگا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے چکرا گئی مگر اس نے گلفام کو دھمکی دی کہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ میں نعمت اللہ کو سب کچھ بتادوں گی پھر وہ جو چاہے کرے۔ گلفام ڈر گیا۔ اس نے تاج بی بی کو گلا گھونٹ کے خاموش کر دیا اور گھر کو پھر باہر سے تالا لگا کے نکل گیا۔ بعد میں نعمت اللہ اپنے سسر کا دیا ہوا ریوالور لے کر پہنچا اور اس نے تالا کھولتے ہی زمین پر پڑی ہوئی تاج بی بی پر دو فائر کر دیے۔ جب اس نے حرکت نہیں کی تو وہ چونکا اور اس نے جھک کے تاج بی بی کو دیکھا۔ پوسٹرا بھی اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ فائر کی آواز سن کے لوگ جمع ہو گئے اور وہ "رنگے ہاتھوں" پکڑا گیا۔

یہ سین بہت لمبا تھا۔ گلفام نے جو کچھ بتایا ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں بتایا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک روح سے مخاطب ہے اور تاج بی بی اپنی قبر سے نکل کے آئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں بڑا خطرناک سانپ تھا چنانچہ وہ قریب جاتے ہوئے ڈرتا تھا ورنہ شاید وہ تصدیق کرتا کہ تاج بی بی درحقیقت روح ہے یا نہیں۔ اس بات نے جاہل اور بے عقیدہ گلفام کو زیادہ دہشت زدہ کر دیا تھا کہ تاج بی بی کسی کو نظر نہیں آئی تھی مگر سنتری نے سانپ دیکھا تھا اور اب تاج بی بی کی روح کہہ رہی تھی کہ اس کے ہاتھ میں کوئی سانپ نہیں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ تھانے میں کوئی نہیں اور اس کے اعترافِ جرم کو ایک روح کے سوا کوئی بھی نہیں سن رہا ہے۔

اس سین کا دلچسپ اختتام حق نواز کھوکھر نے کیا۔ وہ سیدھا حوالات میں پہنچا اور اس نے گلفام کو گالی دے کر کہا "یہ کیا ہنگامہ کر رکھا ہے بلاوجہ؟"

وہ چلانے لگا "سر جی! وہ تاج بی بی..... اس کی روح... دیکھیں... سانپ ہے اس کے ہاتھ میں۔ آپ کو ڈس لے گا۔"

حق نواز نے پلٹ کے دیکھا اور گلفام کے ایک جھانپڑ مارا۔ "کیا ہے یہاں پاگل کے بچے۔"

اسی وقت مین سوئچ آن کر دیا گیا اور لائٹ آگئی۔ "یہ... آپ کے بالکل پیچھے... دیکھیں وہ جا رہی ہے..... وہ کھلے دروازے سے نکل رہی ہے۔" گلفام چلانے لگا۔ "وہ اسی راستے سے اندر آئی تھی۔"

"کون آئی تھی... تیری ماں... دروازے میں تو تالا پڑا ہوا تھا۔" حق نواز کھوکھر نے اسے دھکا دیا "چل بیٹھ آرام سے۔ آج رات تو نے سچ نہ بولا تو صبح تجھے بھی گاڑ دیں گے تاج بی بی کے ساتھ۔"

وہ حوالات کی سلاخوں سے سر ٹکرانے لگا "تھانیدار صاحب! میں بتادوں گا... میں سب بتادوں گا... میں نے تاج بی بی کو بھی بتادیا تھا سب۔"

○☆○

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھالیا۔ "جی' میں بزدل ہوں۔"

"تم واقعی بزدل ہو۔" صائمہ ہنسی۔ "میں تو سمجھی تھی کہ تم بیہوش ہونے والے ہو۔"

"میں کیا... ایس پی صاحب کی اور اس ظالم خاں کی صورت دیکھی تھی تم نے۔ کیسی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ان کے چہروں پر۔" میں نے کہا۔

"پریس کانفرنس کیسی رہی؟"

"زبردست! تہلکہ خیز' سنسنی خیز' قیامت خیز۔ عاشق علی معشوق کی فلم "خواب اور سراب" کی ہیروئن انارکلی کا نمودار ہونا اتنا ہی بڑا دھماکا تھا جتنا بڑا پہلے ایٹم بم کا۔"

"آخری دس ہزار وصول کر لیے ظالم خاں سے؟" وہ ہنسی۔

"آخری کیوں؟ یار زندہ صحبت باقی۔ اس کے سالے کی کنفرمیشن ہو گی تو کیا میں اسے چھوڑ دوں گا۔ جو کارنامہ تم نے سر انجام دیا اس کی خوشی میں آج ڈنر میری طرف سے۔ جہاں تم کہو۔ شیرٹن' آواری ناور۔"

"نہیں۔ بتاؤ برتن وغیرہ تو ہیں نا تمہارے فلیٹ میں؟"

"کیا مطلب؟ ویسے تو سب کچھ ہے۔" جانے بوجھتے میں نے یہ نہیں کہا کہ جو نیلم چھوڑ گئی تھی۔

"پھر آج میں کھانا پکاؤں گی۔ سب سامان لے کر میں پہنچتی ہوں تمہارے فلیٹ پر۔"

"اے لڑکی..... یہ ثابت کرنے کی کوشش مت کرو کہ تم بہت اچھی بیوی بن سکتی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ہو....."

"مگر میں بھی تو معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم... اچھے شوہر ہو یا نہیں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں ریسیور رکھ کے اُٹھا۔ توپ صاحب نے پیک اُگل کے سر غڑاپ سے اندر کیا۔ "ارے میاں بزدل! وہ قطعہ اور کالم....."

میں رُک گیا۔ "جناب تفنگ چنگیزی صاحب۔" میں نے کہا "میں یہ اخبار خریدنا چاہتا ہوں۔ چھیاسی ہزار میں سودا منظور ہے تو بتائیے۔ کل سے میں مدیر اور آپ کل سے لکھیں گے کالم اور قطعہ۔ خدا حافظ۔"

جب میں نیچے پہنچا تو مجھے اپنی موٹر سائیکل لہولہان نظر آئی۔ توپ صاحب کی پیک اس کی سیٹ پر گری تھی۔ اگر مجھے فلیٹ پر پہنچنے کی جلدی نہ ہوتی تو میں یقیناً واپس جا کے انہیں بھی نیچے گرا دیتا لیکن اس وقت تو میں نے کک لگائی اور سیٹ صاف کیے بغیر ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اب مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ میں اچھا شوہر بھی بنوں گا۔ بزدل ہونے کے باوجود۔